
دستِ انتقام

بار اول ۔۔۔ 199[illegible] ۔۔۔ روپے ☆ مطبوعہ ۔ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

ناشر: کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس نمبر 23 رمضان چیمبرز ملوریا اسٹریٹ۔ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی 1

بدی کی ہر راہ بربادی ہی کی طرف جاتی ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے اور ازل سے ہوتا آرہا ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کی کچھ نہ کچھ سزا اس دنیا میں بھی ضرور ملتی ہے

تلاش گمشدہ

گمشدگی کی رپورٹ لائلپور کے ایک تھانے میں درج کرائی گئی تھی۔ تفتیشی افسر اے۔ایس۔آئی فیض محمد گمشدہ نوجوان کو تلاش کرتا ہوا ہمارے قصبے میں پہنچ گیا تھا لیکن آگے اُسے کوئی سُراغ نہیں مل رہا تھا۔ وہ جب ہمارے تھانے میں پہنچا تو خاصا تھکا ہُوا تھا۔ مَیں نے اس کے کھانے پینے کا بندوبست کیا اور جب وہ کچھ تازہ دم ہُوا تو اُس سے گمشدہ نوجوان کے بارے میں استفسار کیا۔

فیض محمد میانوالی کا رہنے والا تھا۔ عمر اُس کی تیس بتّیس کے لگ بھگ ہوگی۔ خاصا مضبوط اور لمبا تڑنگا جوان تھا۔ اُس نے بتایا کہ گمشدگی کی رپورٹ چار پانچ روز پہلے درج کروائی گئی تھی۔

گمشدہ نوجوان کا نام حبیب احمد تھا۔ عمر پچیس سال، رنگ گورا، بال سیاہ، مانگ درمیان سے نکالتا تھا۔ قد پانچ فٹ نو انچ، آنکھیں بھوری، بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر مسّا، وزن ایک سو چالیس پونڈ کے لگ بھگ، غیر شادی شدہ، تعلیم یافتہ، چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ وہ لائلپور کے ایک بہت بڑے کلاتھ اسٹور پر ملازمت کرتا تھا اور آخری بار سفید قمیص، سُرمئی پتلون اور سیاہ بُوٹوں میں دیکھا گیا تھا۔

کلاتھ اسٹور کے مالک کا بیان تھا کہ حبیب احمد نے ۱۲ مارچ کو تین دن کی چھٹی لی تھی۔ غالباً اُس روز بدھ تھا۔ حبیب احمد نے جمعرات، جمعہ اور ہفتے کی چھٹی لی تھی۔ واضح طور پر وہ اتوار کی چھٹی کو ساتھ ملانا چاہتا تھا اور پیر کو ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اُس نے مختلف لوگوں کو چھٹی کی مختلف وجوہ بتائی تھیں۔ کلاتھ اسٹور کے مالک کے مطابق وہ اپنے کسی بیمار رشتے دار کی عیادت کے لیے شیخوپورہ جانا چاہتا تھا۔ گھر والوں کو اُس نے یہ بتایا تھا کہ وہ انٹرویو دینے لاہور جا رہا ہے۔ اُس کے ایک لنگوٹیا دوست کے مطابق حبیب ایک لڑکی سے محبّت کرتا تھا اور اُس کو تفریح کرانے کہیں لے گیا تھا۔

فیض محمد کی تفتیش یہ ظاہر کرتی تھی کہ حبیب احمد اکیلا بس پر سوار ہُوا تھا۔ اُس کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں تھی۔ فیض محمد کا بیان تھا کہ حبیب احمد کی گمشدگی کی مدّت کے دوران پورے لائلپور میں کسی لڑکی کی گمشدگی یا اغوا کی رپورٹ درج نہیں کروائی گئی تھی۔ حبیب احمد کے محلّے کی بھی کوئی لڑکی غائب نہیں ہوئی تھی۔ حبیب احمد کے دوست نے جس کا نام اجمل تھا، بڑے وثوق سے کہا تھا کہ حبیب احمد اپنی محبوبہ کو تفریح کرانے کہیں لے گیا تھا۔ اُس نے لڑکی کا نام بھی بتایا تھا جو بقول اُس کے زرینہ تھا۔

حبیب احمد ۱۲ مارچ کو گھر سے روانہ ہُوا تھا۔ اُس کی جیب میں سو روپے سے کچھ اوپر رقم تھی اور ایک چھوٹا سا بیگ ساتھ تھا۔ جس میں دو جوڑے کپڑے اور چند ضروری چیزیں تھیں۔ سو روپے اُس زمانے میں خاصی بڑی رقم تھی۔ تیس چالیس روپے میں ایک چھوٹی فیملی کا پورے مہینے کا راشن آجاتا تھا۔

فیض محمد نے زرینہ نامی لڑکی کا کھوج لگانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اُسے کوئی ایسی زرینہ نہیں مل سکی تھی جس کا حبیب احمد سے کوئی تعلق ثابت ہو سکتا۔ لڑکی کا ذکر کلاتھ اسٹور پر کام کرنے والے دوسرے لوگوں نے بھی کیا تھا۔ ایک درمیانے قد کی لڑکی کبھی اکیلی اور کبھی کسی سہیلی کے ہمراہ دُکان پر آتی تھی اور حبیب احمد کے سوا کسی سے کپڑا نہیں خریدتی تھی۔ دیگر ملازموں کے بیان کے مطابق وہ حبیب احمد کے ساتھ خاص ادا سے بات کرتی تھی۔ شکل و صورت کی اتنی اچھی نہیں تھی لیکن لباس دیدہ زیب پہنتی تھی اور جسمانی اعتبار سے خاصی پُرکشش تھی۔ اس لڑکی کا نام کسی کو معلوم نہیں تھا اور نہ ہی اس کا کوئی سراغ ملا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہی زرینہ ہو... یا زرینہ کوئی دوسری لڑکی ہو۔

گمشدگی کی رپورٹ حبیب احمد کے باپ ظہیر احمد نے ۱۷ مارچ کو درج کرائی تھی۔

"ملک صاحب! بندہ اس قصبے تک صحیح سلامت پہنچا تھا۔" فیض محمد نے کہا "یہ بالکل پکّی بات ہے، مَیں نے پوری تسلّی کر لی ہے... یا تو اِدھر سے وہ کہیں اور چلا گیا ہے یا ابھی اِدھر ہی ہے۔"

"یہ تمہارا اندازہ ہے یا تمہیں اُس کے یہاں پہنچنے کا کوئی ثبوت ملا ہے؟"

"پکّا ثبوت ملا ہے۔ وہ خان بس سروس کی بس میں یہاں پہنچا تھا۔ بس کنڈکٹر اُسے اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ اُس کی دُکان سے دو تین مرتبہ کپڑا بھی خرید چکا ہے۔ دونوں کی آپس میں سلام دُعا بھی ہُوئی تھی۔"

"اس لڑکی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" مَیں نے پوچھا "ہو سکتا ہے کہ دونوں نے آپس میں چوری چھپے شادی کر لی ہو اور یہاں رہائش اختیار کر لی ہو۔"

"لڑکی کے بارے میں مجھے کوئی ثبوت نہیں ملا۔" اُس نے



کہا "اُس کا سارا قصہ ابھی زبانی کلامی ہے۔ حبیب کے گھر والوں نے لڑکی کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی ہے یا تو وہ لڑکی کو واقعی نہیں جانتے اور یا وہ اُس کی پردہ پوشی کرنا چاہتے ہیں۔ حیرانی اس بات کی ہے کہ لڑکی کا بالکل کوئی سُراغ نہیں ملا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے علاقے کی رہنے والی ہو اور کبھی کبھار لائلپور آتی رہتی ہو۔"

"کوئی خاندانی دُشمنی کا معاملہ تو نہیں ہے؟"

"ابھی تک تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔" اُس نے جواب دیا پھر روپوش نوجوان کی ایک تصویر نکال کر مجھے دی "آپ حبیب احمد کی تصویر اپنے پاس رکھ لیں اور اس نوجوان کے بارے میں کچھ چھان بین کریں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی بازار میں یا سڑک پر چلتا پھرتا نظر آ جائے۔ اس کے گھر والے بہت پریشان ہیں۔ یہ تین بہنوں اور دو بھائیوں میں سب سے بڑا ہے۔ اس کے باپ کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے، روزانہ تھانے کے چکر لگاتا ہے۔"

"مَیں کوشش کروں گا۔ اگر یہ نوجوان اس قصبے میں ہُوا تو ہماری نظروں سے چھپا ہُوا نہیں رہ سکتا۔ اس کا چال چلن کیسا ہے اور اُٹھنا بیٹھنا کیسے لوگوں میں ہے؟"

"چال چلن کے متعلق مجھے ابھی تک کوئی خراب رپورٹ نہیں ملی۔ پڑھا لکھا نوجوان ہے اور تقریباً ہر شخص نے اس کے بارے میں اچھی رائے دی ہے۔ خوش اخلاق ہے، خاموش طبیعت ہے اور اچھے لوگوں میں اُٹھتا بیٹھتا ہے۔"

مَیں نے ضروری باتیں نوٹ کر لیں۔ اے۔ ایس۔ آئی فیض محمد ایک رات ہمارے پاس رہ کر واپس چلا گیا۔

پانچ چھ روز کے بعد ہمیں ایس پی علاقہ کی طرف سے حبیب احمد کے بارے میں باقاعدہ تفتیش کرنے اور مفصل رپورٹ ارسال کرنے کی ہدایت موصول ہو گئی۔

فیض محمد کے جانے کے بعد مَیں نے تھانے کے عملے کو حبیب احمد کی تصویر دکھانے کے بعد یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ اس شکل و صُورت کے آدمی پر نظر رکھیں لیکن اس معاملے پر کوئی خصوصی توجہ نہیں دی تھی کیونکہ میرا خیال یہ تھا کہ روپوش نوجوان یا تو کسی حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا یا اُس نے زرینہ نامی لڑکی سے خُفیہ شادی کر کے کسی نئے شہر میں اپنی دُنیا آباد کر لی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ اُس کی گمشدگی میں کوئی جُرم نظر نہیں آتا تھا۔ بہرحال ایس پی کی ہدایت موصول ہونے کے بعد مَیں نے اس معاملے پر خصوصی توجہ دینا شروع کر دی۔

تین روز کے اندر میرے آدمیوں نے اُس تانگے والے کا پتا چلا لیا جس نے بس اسٹینڈ سے حبیب احمد کو اُٹھایا تھا۔ تانگے والا نوجوان شخص تھا اور سینڈو کے نام سے مشہور تھا۔ مَیں نے ایک حوالدار کو ساتھ لیا اور اڈّے پر جا کر سینڈو کے تانگے میں جا بیٹھا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ کچھ روز پہلے تم نے اس آدمی کو شہر پہنچایا تھا۔" مَیں نے اُسے حبیب احمد کی تصویر دکھائی "تو ہمیں اُس مکان پر لے چلو، جہاں یہ شخص اُترا تھا۔"

"تصویر تو جناب مَیں پہلے بھی دیکھ چُکا ہوں۔" سینڈو نے کہا "سواری بھی مجھے یاد ہے لیکن یہ یاد نہیں رہا کہ سواری کس جگہ پر اُتری تھی۔ تانگے میں تین سواریاں اور بھی تھیں۔ جو سواری جہاں کہتی تھی، وہاں تانگا روک کر اُسے اُتار دیتا تھا۔"

مَیں نے پوچھا "کیا چاروں سواریاں راستے میں اُتر گئی تھیں؟"

"اللہ آپ کا بھلا کرے جناب! ایک سواری تو اڈّے تک گئی تھی، باقی تین راستے میں اُتر گئی تھیں۔"

"ٹھیک ہے گھوڑے کو چابک دکھاؤ اور ہمیں تو اڈّے تک لے چلو۔ راستے میں تم نے جہاں جہاں سواریاں اُتاری تھیں، وہاں رُک کے چلنا۔" تانگے کا پہلا اسٹاپ گنجان آبادی کے قریب تھا۔ سینڈو تانگا روکتے ہوئے بولا "لو جی یاد آ گیا۔ اس جگہ جو سواری اُتری تھی، وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اس کے پاس ایک گٹھری بھی تھی۔ بڑی مشکل سے اُترا تھا۔" اس نے تانگے کو آگے بڑھایا اور تھوڑی دیر بعد دوسرے اسٹاپ پر جا رُکا "لو جی ملک جی! آپ کی سواری اس جگہ پر اُتری تھی۔ اُس نے مجھ سے کوئی پتا بھی پوچھا تھا مگر مجھے یاد نہیں رہا۔ اُس نے ہاتھ میں کاغذ پکڑا ہُوا تھا جس پر شاید پتا لکھا تھا۔"

"اس نے کسی کا نام لیا تھا یا مکان کا نمبر پوچھا تھا؟"

"شاید نمبر ہی پوچھا تھا۔"

"تانگے سے اُتر کر وہ کس طرف گیا تھا؟"

اُس نے بائیں ہاتھ والی ایک گلی کی طرف اشارہ کیا۔ بولا "اس کا رُخ اس گلی کی طرف تھا۔ آگے اللہ جانے۔"

مَیں نے تانگے والے کو فارغ کر دیا اور حوالدار کے ہمراہ مذکورہ گلی میں داخل ہو گیا۔ وہ نیم پختہ گلی تقریباً سنسان پڑی تھی۔ تقریباً پچاس قدم دُور کونے پر ایک حلوائی کی دُکان تھی۔ دُکان کے باہر ایک بینچ رکھی تھی جس پر دو یا تین آدمی بیٹھے تھے۔ ایک شخص ہمیں دیکھ کر بینچ سے اُٹھ گیا اور دُکاندار کو پیسے دے کر ایک طرف چل پڑا۔ وہ درمیانے قد کا نوجوان تھا۔

"ملک صاحب! یہ آدمی مجھے کچھ مشکوک معلوم ہوتا ہے۔" حوالدار نے کہا "تو روکوں اُسے؟"

"جانے دو۔" مَیں نے کہا "ایسے مشکوک آدمی ہر گلی میں ہوتے ہیں۔" نوجوان داہنی طرف والی گلی میں مُڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

مَیں نے دُکاندار اور گاہکوں کو حبیب احمد کی تصویر دکھا کر پوچھا کہ اُنھوں نے اس شکل و صُورت کا آدمی تو نہیں دیکھا۔ گاہکوں نے تصویر کو اچھی طرح دیکھے بغیر ہی انکار میں سر ہلا دیا۔

دُکاندار بھاری جسم کا آدمی تھا۔ اُس نے نیلی دھوتی کے اُوپر فقط بنیان پہن رکھی تھی۔ وہ تصویر کا معائنہ کرتے ہوئے بولا "آدمی تو باہر کا ہے پر شکل کچھ دیکھی بھالی لگتی ہے۔" اُس نے اندر کی طرف مُنہ کر کے آواز لگائی "او نے جیلے... ذرا اِدھر تے آ۔"

ایک اٹھارہ اُنیس سالہ نوجوان جو دُکان کے تاریک گوشے میں مٹھائی کا تھال سجا رہا تھا، دھوتی کے پلّو سے ہاتھ پونچھتا ہُوا باہر آ گیا اور ہماری طرف دیکھنے لگا۔

"پُتر! یہ تصویر تو دیکھ ذرا۔" دُکاندار نے لڑکے سے کہا "مَیں نے اس بندے کو کہیں دیکھا ہے۔"

"آہو جی! بُھل گئے او۔" لڑکے نے کہا "ایس بندے نے دو سیر مٹھیائی خریدی سی تے چوہدری فرمان علی دا پتا وی پُچھیا سی۔"

"اچھا... اچھا یاد آ گیا۔" دُکاندار نے کہا "پچھلے مہینے یہ آدمی ہماری دُکان پر آیا تھا۔ اُس نے دو سیر برفی اور میسو خریدا تھا۔ اس کے بعد چوہدری فرمان علی کی کوٹھی کا پتا پوچھ کر چلا گیا تھا۔"

مَیں نے اُس سے چوہدری فرمان علی کی کوٹھی کا پتا پوچھا اور آگے بڑھ گیا۔

فرمان منزل آبادی کے تقریباً کنارے پر تھی۔ آگے ہرے بھرے کھیت نظر آ رہے تھے۔ آبادی سے ملحق جو کھیت تھا اس میں سبزیاں اُگی ہُوئی تھیں۔ فرمان منزل خاصی بڑی کوٹھی تھی۔ ایک حصّے میں باغ نظر آ رہا تھا۔ میری دستک کے جواب میں ایک سفید ریش بوڑھا باہر آیا۔ وہ ملازم معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ چوہدری فرمان علی کہیں کام سے گئے ہوئے ہیں اور شام سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔

"چوہدری صاحب کا کوئی بیٹا گھر میں ہو تو اُسے بُلا لاؤ۔" مَیں نے کہا۔

بوڑھے کے ہونٹوں پر عاجزانہ مُسکراہٹ نمودار ہو گئی، بولا۔ "چوہدری صاحب کی کوئی اولاد نہیں ہے جی۔"

"اچھا! کیا چوہدری صاحب نے شادی نہیں کی یا اولاد ہی نہیں ہُوئی؟"

"شادی بھی کی تھی اور اولاد بھی ہُوئی تھی۔" بوڑھے نے جواب دیا "دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی، دُشمنوں نے انھیں قتل کر دیا تھا۔ یہ دس سال پُرانی بات ہے۔ وہ ایک شادی سے واپس آ رہے تھے۔ رات کا وقت تھا، راستے میں ایک سنسان جگہ پر دس بارہ مسلّح آدمیوں نے انھیں گھیر لیا اور سب کو ختم کر دیا۔ چوہدری صاحب پہلے واپس آ گئے تھے، اس لیے بچ گئے۔"

"گھر میں کوئی اور بڑا ہو تو اُس کو بُلا لاؤ۔"

"جناب! گھر میں مرد کوئی نہیں ہے۔ چوہدری صاحب کی بوڑھی ماں ہے، اُس کی نظر کمزور ہے۔ ایک چھوٹی بہن ہے، اگر حکم کریں تو اُسے بُلا لاؤں، اُس کے بچے اسکول گئے ہوئے ہیں۔"

"ایسا کرو، اُس سے یہ پوچھ کر آؤ کہ بیس بائیس دن پہلے اُن کے گھر لائلپور سے کوئی مہمان آیا تھا؟"

بوڑھا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک چالیس بیالیس سالہ عورت دروازے پر آئی۔ اُس نے رنگین چادر اوڑھ رکھی تھی اور بھاری جسم کی رُعب دار عورت تھی۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ وہ چوہدری فرمان علی کی چھوٹی بہن تھی۔

"ہمارے گھر میں لائلپور سے کوئی مہمان نہیں آیا۔" اُس کا لہجہ سخت تھا۔ "آپ کس کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"اس کا نام حبیب احمد ہے۔" مَیں نے کہا "اُدھر جو حلوائی ہے، اُس نے بتایا ہے کہ اس شخص نے آپ کی کوٹھی کا پتا پوچھا تھا۔ یہ مارچ کی تیرہ تاریخ کی بات ہے۔"

"اُس نے فرمان منزل کا پتا پوچھا ہوگا۔" عورت ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی "یہ علاقہ فرمان منزل کے نام سے مشہور ہے۔ اس علاقے میں جو بھی نیا آدمی آتا ہے، وہ فرمان منزل کا پتا پوچھتا ہُوا آتا ہے۔"

بات ختم کرتے ہی اُس نے ہمارے مُنہ پر دروازہ بند کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حبیب احمد اسی علاقے کے کسی گھر آیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ مَیں نے سوچا، ہو سکتا ہے کہ وہ پُراسرار لڑکی، جس کا نام زرینہ بتایا جاتا ہے، اسی علاقے کی رہنے والی ہو اور حبیب احمد اُسی سے ملنے وہاں آیا ہو۔

اُسی لمحے ایک بکری کا بچّہ قلانچیں بھرتا ہُوا ایک دروازے سے نکلا۔ وہ خاصی ترنگ میں معلوم ہوتا تھا اور خوب اُچھل کود مچا رہا تھا۔ اس کے پیچھے ہی ایک بُوڑھی عورت گلی میں نمودار ہُوئی اور ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے بکری کے بچّے کو قابو کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ حوالدار نے دوڑ کر بچّے کو گود میں اُٹھا لیا اور عورت کی طرف بڑھا۔

"جیتے رہو پُتر!" عورت نے حوالدار کو دُعا دی "اللہ حیاتی دیوے۔ اب اس کو اندر بھی پہنچا دو۔ میرے ہاتھوں سے تو یہ پھر چھوٹ جائے گا۔ میرے تو گھٹنے گوڈے بالکل ہی رہ گئے ہیں۔"

حوالدار بچّے کو لے کر صحن میں گُھس گیا۔

مَیں نے بوڑھی عورت سے پوچھا "اماں جی! اس گلی میں کوئی زرینہ نام کی لڑکی بھی رہتی ہے؟"

"میرا تو اب دماغ بھی کام نہیں کرتا سب کچھ نکل بھلا گیا اے سو لیسے سب خیر تو ہے نا؟"

"ہاں سب خیر ہی ہے" میں نے کہا "ہم نے سُنا تھا کہ زرینہ نام کی ایک لڑکی اس گلی میں رہتی ہے اُس کا گھر تلاش کر رہے ہیں۔ اُس کے گھر میں لائلپور سے ایک مہمان آیا ہُوا ہے ہم اُس سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"میری بیٹی کو شاید پتا ہو" عورت نے کہا "میں اُس سے پوچھتی ہُوں۔ اندر آ جاؤ۔"

صحن خاصا بڑا تھا۔ ایک طرف نیم کے پیڑ کے نیچے ایک بھینس اور پانچ چھ بکریاں بندھی ہُوئی تھیں۔ میں دروازے کے قریب ہی رُک گیا۔ عورت اپنی بیٹی کو بُلا لائی۔ وہ پڑھی لکھی معلوم ہوتی تھی۔

"یہ میری بیٹی حمیداں ہے" عورت نے کہا "اس کو پتا ہوگا زرینہ کا۔"

"آپ کو کون سی زرینہ کا پتا چاہیے؟" حمیداں نے پوچھا۔ "اس محلے میں تو دو تین زرینہ رہتی ہیں۔"

"یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں ہے" میں نے کہا "جس زرینہ کی ہمیں تلاش ہے اُس کی عمر بیس سال کے قریب ہوگی۔ وہ کبھی کبھی لائلپور جاتی رہتی ہے۔"

"ایک زرینہ تو چھوٹی ہے" حمیداں سوچتے ہوتے بولی "اُس کی عمر تو بارہ تیرہ سال ہوگی۔ دوسری اور تیسری زرینہ کی عمریں بائیس اور چوبیس سال کے قریب ہوں گی، ان میں سے کوئی ہوسکتی ہے۔"

ہم نے دونوں کے پتے پوچھے اور وہاں سے رخصت ہوگئے۔ پہلی زرینہ اسی گلی میں تین یا چار مکان چھوڑ کر رہتی تھی۔ اُس کے باپ کا نام حمیداں نے اسماعیل بتایا تھا۔ ہم نے پہلے اسی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھولنے والا ایک بھاری بھرکم شخص تھا۔ اُس نے بڑی بڑی مونچھیں رکھی ہُوئی تھیں اور اُس کی گردن پر چربی کی دو تین تہیں چڑھی ہُوئی تھیں۔

"ہاں جناب! حکم کرو۔" اُس کی آواز بھاری اور پھنسی پھنسی سی تھی۔

"میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں۔۔۔"

"تعارف تے مٹی پاؤ جناب! کم دی گل کرو، کی حکم اے؟"

"پا شاؤ! بڑے اوکھے بول رئے او" حوالدار نے کہا۔

"تھانیدار صاحب نوں اپنی گل تے مکا لین دیو۔"

"او کاکا حوالدار! توں اک پاسے ای کھلوتا رہ۔ ہاں جناب! حکم کرو تھانیدار صاحب۔"

"آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اساں وی تہاڈی برلوری دے بندے آں۔ ملک غلام محمد کھوکھر۔"

"کھوکھر صاحب! کوئی چوبیس پچیس روز پہلے آپ کے گھر میں لائلپور سے کوئی مہمان آیا تھا؟"

"ناں جی! ہمارے گھر کوئی مہمان نہیں آیا۔ نہ لائلپور سے اور نہ شیخوپورہ سے، اہور گل کرو۔"

"آپ کے گھر میں زرینہ نام کی کوئی لڑکی رہتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

اُس کے چہرے پر برہمی نمودار ہوگئی، بولا "ہو زرینہ میری بیٹی ہے آپ کو اُس سے کیا کام ہے؟"

"جس آدمی کو ہم تلاش کر رہے ہیں اُس کی ایک رشتے دار کا نام بھی زرینہ ہے۔ اُس آدمی کا نام حبیب احمد ہے۔"

"معافی دیو جناب! اسی کسی حبیب احمد کو نہیں جانتے ہو، نہ چنگی طراں پچھ پرتیت کر کے آیا کرو۔"

اُس نے دھڑام سے دروازہ بند کر دیا۔

"بڑا بد دماغ آدمی ہے" حوالدار نے کہا "اخلاق کی تو اسے ہوا بھی نہیں لگی۔"

"اپنے پیشے سے مجبور معلوم ہوتا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ بابا وی گرم تے بابے دیاں گوییاں وی گرم۔"

دوسری زرینہ کا گھر فرمان منزل سے آگے ایک گلی میں تھا جو اپنی طرف مُڑ جاتی تھی۔ خاصا بڑا مکان تھا۔ کمرے تو تین چار ہی تھے مگر صحن بہت بڑا تھا۔ مکانوں کی وہ قطار آبادی کی آخری قطار تھی۔ پچھلے حصے میں کثیر تعداد گھنے درختوں کی نظر آ رہی تھی۔ دروازہ کھولنے والی ایک چالیس بیالیس سال کی فربہ اندام عورت تھی۔ اُس نے چُست اور بھڑک دار لباس پہنا ہُوا تھا۔ گھنے سیاہ بال سلیقے سے گُندھے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر مِسّی کی تہ اور آنکھوں میں کاجل کا رنگ نمایاں تھا۔ وہ سُرخ و سفید رنگت والی ایک پُرکشش عورت تھی اور خاصی تُند مزاج بھی نظر آتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر ایک لہر سی آ کر چلی گئی۔

رسمی کلمات کے بعد میں نے اپنا تعارف کرایا پھر کہا "ہمیں معلوم ہُوا ہے کہ چوبیس پچیس روز پہلے آپ کے ہاں لائلپور سے ایک مہمان آیا تھا!"

"جی؟" وہ چونک کر بولی "مہمان! کس مہمان کی بات کر رہے ہیں آپ؟ مہمان تو آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"جس مہمان کی میں بات کر رہا ہوں اُس کا نام حبیب احمد ہے، وہ پچھلے جھنگ۔۔۔"

"ہم۔۔۔ میں کسی حبیب احمد کو نہیں جانتی!" عورت نے تیز لہجے میں کہا "لائلپور میں میرا ایک بھائی رہتا ہے۔ وہ اور اُس کے بیوی بچے اِدھر آتے رہتے ہیں اور بھی دو چار رشتے دار ہیں ہمارے لائلپور میں لیکن اس نام کا کوئی نہیں ہے" بات ختم کرتے ہی اُس نے دروازہ بند کرنے کا ارادہ کیا۔

"آپ کے بھائی کا کیا نام ہے؟" میں نے پوچھا "اور وہ کیا کام کرتا ہے؟"

"اُس کا نام منظور حسین ہے۔ اُدھر بھوانہ بازار میں اُس کی اپنی دُکان ہے۔ بات کیا ہے؟"

میں نے جیب سے نوٹ بُک نکالی اور اُس پر منظور حسین کا نام اور پتا نوٹ کر لیا۔ اس عورت کا انداز مجھے شک میں ڈال رہا تھا۔ گلی میں چونکہ سناٹا تھا اس لیے ہماری آوازیں سُن کر آس پاس کے ایک دو دروازے کُھل گئے تھے۔

"کیا آپ کی بیٹی کا نام زرینہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟" اس کے چہرے پر اُلجھن بھی پائی جاتی تھی اور غصہ بھی "ہم غیر مردوں کے سامنے اپنی بیٹیوں کے نام نہیں لیا کرتے۔" اُس نے سامنے والے دروازے کی طرف دیکھا جس کی آڑ میں سے ایک ادھیڑ عمر عورت جھانک رہی تھی۔ "لو جی، نہ کوئی گل نہ بات، دروازہ کھڑکایا اور لڑکیوں کے نام پوچھنے شروع کر دیے۔ تھانیدار صاحب! ہم عزت دار لوگ ہیں، اس محلے میں ایسے ویسے لوگ نہیں رہتے۔"

"بی بی! آپ اپنے آدمی کو باہر بھیج دیں" میں نے قدرے سختی سے کہا "میں عزت دار اور بازاری آدمی میں فرق کرنا خوب جانتا ہوں۔ میرا کام ہی یہی ہے۔"

"میرا آدمی فوت ہو چکا ہے" عورت نے کہا "آپ جلدی بات ختم کریں، مجھے اور بھی کام ہیں۔"

"آپ نے اپنی بیٹی کا نام نہیں بتایا" میں نے کہا "لیکن میں جانتا ہوں کہ اُس کا نام زرینہ ہی ہے۔ کیا میں یہ سمجھ لوں کہ آپ کوئی بات چھپانا چاہتی ہیں؟"

"مجھے کیا ضرورت ہے کوئی بات چھپانے کی؟"

"آپ کی بیٹی لائلپور تو جاتی رہتی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"تھانیدار صاحب! میں اپنی بیٹی کے بارے میں نہ کوئی بات سُننا چاہتی ہوں اور نہ کرنا چاہتی ہوں" عورت نے سختی سے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

بظاہر وہ ایک طبعی سا ردِعمل تھا۔ کوئی عورت اپنی نوجوان بیٹی کے بارے میں اس قسم کی گفتگو پسند نہیں کر سکتی لیکن اس عورت کے رویّے میں کوئی خاص بات تھی جو مجھے شک میں ڈال رہی تھی۔ لہٰذا میں نے پڑوسیوں سے اُس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا سب سے مناسب سمجھا۔ سامنے والا دروازہ بند ہوگیا تھا۔ اگلے دروازے میں ایک معمر عورت کھڑی تھی۔ میں نے اُسے سلام کیا اور کہا کہ میں اُس سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ اُس کے بال سفید ہو چکے تھے تاہم صحت اچھی نظر آتی تھی۔ اُس نے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ہمیں ایک سادہ سی بیٹھک میں لے گئی۔

"کیا معاملہ ہے؟" اُس نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا "کیا نصیراں کی کُڑی گھر سے نٹھ گئی ہے؟"

"سب خیر ہے" میں نے کہا "نصیراں کی لڑکی کا نام کیا ہے؟"

"زرینہ نام ہے، بڑی فیشنی کُڑی ہے۔ رولیے ماں بھی کم نہیں ہے۔"

ایک سفید ریش بوڑھا حقّہ ہاتھ میں پکڑے کمرے میں داخل ہوا اور سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ اُس کی نظر کمزور معلوم ہوتی تھی۔ عورت نے بتایا کہ وہ اُس کا شوہر علم دین ہے۔

"کیوں جی! ساڈے محلّے وچ کوئی واردات ہوگئی ہے؟" بوڑھے علم دین نے پوچھا۔

"نصیراں کی کُڑی زرینہ کا چکر ہے" عورت نے اپنے شوہر کو خبر دی "معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چن چڑھا آئی ہے۔ یہ تھانیدار صاحب اُسی کے بارے میں پچھ پرتیت کرتے پھر رہے ہیں۔"

ابھی تک میری ساری تفتیش اندازے کی بنا پر تھی۔ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ حبیب احمد اسی محلّے میں وارد ہُوا تھا لیکن یہ معلوم کرنا ابھی باقی تھا کہ آیا وہ زرینہ نامی کسی لڑکی سے ملنے وہاں آیا تھا یا کسی اور کام سے آیا تھا۔ کمرے کے دروازے میں ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکا بھی آ ٹھہرا تھا۔

میں نے جیب سے حبیب احمد کی تصویر نکال کر معمر عورت کو دکھائی اور کہا "چوبیس پچیس روز پہلے یہ آدمی لائلپور سے یہاں آیا تھا۔ ہوسکتا ہے آپ نے اس کو گلی میں آتے جاتے دیکھا ہو۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ شخص کس کے گھر میں ٹھہرا تھا۔"

معمر عورت نے تصویر لے کر غور سے اُسے دیکھا، بولی۔ "نصیراں کے گھر اک پروہنا آیا تو تھا۔ سُنا تھا کہ وہ بھی لائلپور سے آیا تھا۔ پتا نہیں یہ تھا یا کوئی اور تھا۔ امیر احمد! ذرا دیکھ تو اس تصویر کو۔"

دروازے میں کھڑا لڑکا آگے آیا اور تصویر پر نظر ڈالتے ہی بولا "آہو جی! یہ وہی پروہنا ہے۔"

ایک مسئلہ حل ہوگیا تھا گویا چکر عشق ہی کا تھا۔

میں نے لڑکے سے پوچھا "برخوردار امیر احمد! کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ آدمی نصیراں بیگم کے گھر ٹھہرا ہُوا تھا؟"

"آہو جی، چنگی طراں یقین ہے جی" لڑکے نے جواب دیا "میں اس باؤ کو چنگی طراں پہچانتا ہوں۔ میں نے اس کے ساتھ گل بات بھی کی تھی۔ یہ ماسی نصیراں کے گھر میں ہی ٹھہرا ہُوا تھا۔"

میں نے تصویر جیب میں رکھ لی اور معمر عورت سے پوچھا "یہ نصیراں بیگم کیسی عورت ہے؟"

"کچھ نہ پوچھیں جی! وہ کیا کہتے ہیں، اسبتول تے کج نہ پھرول۔ جب سے نصیراں کا آدمی فوت ہوا ہے، اُس دن سے اُس کو پَر لگ گئے ہیں۔ اصل رنگ رُوپ تو اُس نے آدمی کے مرنے کے بعد نکالا ہے۔"

"رحمتے! کسی کی بُرائی نہیں کرنا چاہیے۔" بوڑھے نے کہا "کوئی اپنے گھر میں کچھ بھی کرتا رہے، ہمیں کیا!"

"میں کسی کی بُرائی نہیں کر رہی۔" رحمتے نے جواب دیا "تھانیدار کی بات کا جواب دے رہی ہوں۔ تُسی ذرا چُپ بیٹھو، سارا چکر زرینہ کا ہے۔ اُس کی دیکھا دیکھی محلے کی دوسری لڑکیوں کی عادتیں بھی خراب ہوں گی۔"

"یہ حبیب احمد ان کا کیا لگتا ہے؟" میں نے پوچھا "کوئی رشتے دار ہے یا ملنے جُلنے والا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ہے جی، زرینہ کے پیچھے آیا ہوگا۔ یہ لڑکی بہت آوارہ ہے۔ پہلے بھی ایک لڑکے کو لائلپور سے اپنے پیچھے لگا لائی تھی۔ نصیراں نے اُسے بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا تھا۔"

"حبیب احمد کتنے دن یہاں رہا تھا؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے لیکن نصیراں نے اُسے ایک رات سے زیادہ نہیں رہنے دیا ہوگا۔" قدرے توقف کے بعد اُس نے کہا "جب ماں کے لچھن ٹھیک نہیں ہوں گے تو بیٹی کیسے ٹھیک ہوگی۔ چوہدری فرمان علی کا اُن کے گھر بہت آنا جانا ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ دونوں کو آپس میں شادی کر لینا چاہیے۔" بوڑھے علم دین نے کہا "جوڑ بُرا نہیں ہے۔"

"کون سے جوڑ کی بات کر رہے ہو؟" رحمتے نے کہا "نصیراں نے خورشید بیگم کو بتایا تھا کہ چوہدری فرمان علی اُس کی بیٹی زرینہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ اگر چوہدری فرمان علی زرینہ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اُسے حبیب احمد کا آنا یقیناً ناگوار گزرا ہوگا۔ میں علم دین کے گھر سے رخصت ہو گیا اور چند اور پڑوسیوں سے حبیب احمد کے بارے میں پوچھا۔ کچھ نے لاعلمی ظاہر کی اور کچھ نے کہا کہ اُنھوں نے ایک اجنبی کو نصیراں بیگم کے گھر آتے دیکھا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ حبیب احمد گیا کہاں تھا۔ پڑوسیوں نے یہ بھی کہا تھا کہ زرینہ کئی روز سے گھر میں نظر نہیں آ رہی تھی اور نصیراں بیگم کا کہنا تھا کہ وہ لائلپور گئی ہوئی تھی۔

اگلے روز میں نے ایک اے۔ایس۔آئی کو ساتھ لیا اور بس کے ذریعے لائلپور پہنچ گیا۔ صرف ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ پہلے ہم اُس تھانے میں گئے جس میں حبیب احمد کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی گئی تھی۔

اے۔ایس۔آئی فیض محمد بڑے تپاک سے ہمیں ملا اور ہماری خاطر مدارات بھی کی۔ میں نے اُسے حبیب احمد کے بارے میں اپنی تفتیش سے آگاہ کیا اور بتایا کہ ہمیں زرینہ کا سُراغ بھی مل گیا ہے۔

"اور آپ کا خیال ہے کہ دونوں نے شادی کر لی ہے؟" میری بات ختم ہونے کے بعد فیض محمد نے کہا "اور چھپ کر کہیں رہ رہے ہیں؟"

"ہاں، بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا "لیکن اصل حقیقت حبیب احمد یا زرینہ سے ملنے کے بعد ہی معلوم ہوگی۔ زرینہ کا ایک ماموں یہاں رہتا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ زرینہ آج کل اُس کے پاس رہ رہی ہے۔"

اُس نے مجھ سے پتا پوچھا اور تھوڑی دیر بعد تانگا منگوا لیا۔ مکان تلاش کرنے میں ہمیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

دروازہ ایک ادھیڑ عمر عورت نے کھولا۔ وہ زرینہ کی ممانی تھی۔ میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ زرینہ نے حال ہی میں ایک اسکول میں ملازمت کر لی ہے اور اس وقت اسکول گئی ہوئی ہے، وہ دو بجے کے بعد واپس آتی ہے۔

"بات کیا ہے جی؟" عورت نے پوچھا "آپ زرینہ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"

"فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا "میں دو بجے کے بعد آ جاؤں گا۔"

میں سادہ لباس میں تھا لیکن اے۔ایس۔آئی فیض محمد وردی میں تھا، اس لیے عورت کا پریشان ہونا لازمی تھا۔ دو بجے کے بعد میں اکیلا ہی وہاں آیا۔ زرینہ کی ممانی نے اپنے شوہر منظور حسین کو بھی گھر میں بلا رکھا تھا۔ وہ پچاس پچپن سال کا خالص کاروباری آدمی تھا۔ اُس نے مجھے بیٹھک میں بٹھایا اور رسمی بات چیت کے بعد پوچھا کہ میں کیوں زرینہ سے ملنا چاہتا ہوں۔

میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا "آپ اپنی بھانجی کو بلائیں، ساری باتیں آپ کے سامنے ہوں گی۔ ہمیں ایک شخص کے بارے میں معلومات درکار ہیں اور زرینہ اُس شخص کو جانتی ہے۔"

منظور حسین نے پریشان نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، بولا "جاؤ، بلاؤ اُسے۔"

تھوڑی دیر بعد زرینہ اپنی ممانی کے ہمراہ جھجکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

وہ درمیانے قد اور سانولے رنگ کی ایک پُرکشش لڑکی تھی۔ اُس نے مہین سا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا اور اپنے جسم کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز کو خوب سمجھتی ہے۔ اُس کے ماموں نے میرا تعارف کرایا اور کہا "میں اُس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

وہ خاموشی سے اپنی ممانی کے پاس بیٹھ گئی۔

"بی بی! میں تمھارے گھر گیا تھا اور تمھاری ماں سے ملا تھا۔" میں نے کہا "وہاں سے پتا چلا کہ تم لائلپور آئی ہوئی ہو، اس لیے ادھر آنا پڑا۔ تمھیں یاد ہوگا کہ پچھلے مہینے کی تیرہ تاریخ کو تمھارے ہاں ایک مہمان آیا تھا۔ وہ لائلپور کا رہنے والا ہے اور ایک کلاتھ اسٹور پر کام کرتا ہے۔"

اُس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کس مہمان کا ذکر کر رہا ہوں۔

"اُس مہمان کا نام حبیب احمد ہے۔" میں نے مزید کہا "میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کتنے دن تمھارے گھر میں رہا تھا؟"

"ج... جی، وہ صرف ایک رات ہمارے ہاں رہا تھا۔" زرینہ نے جواب دیا۔

"زرینہ بی بی! کیا حبیب احمد یہاں بھی تم سے ملنے آتا ہے؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

اگر وہ پہلے ہی سوال کا جواب نفی میں دیتی تو بات مشکل ہو جاتی۔

"یہاں کوئی نہیں آتا جی۔" منظور حسین کی بیوی نے کہا "ہم کسی حبیب احمد کو نہیں جانتے۔"

"میں نے آپ سے نہیں زرینہ بی بی سے سوال کیا ہے۔"

زرینہ نے کہا "اُس روز کے بعد میری حبیب احمد سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

منظور حسین نے غصیلی نظروں سے اپنی بھانجی کی طرف دیکھا۔ اُسے غالباً حبیب احمد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

"کیا حبیب احمد پہلے بھی کبھی تمھارے گھر آیا تھا؟"

"نن... نہیں، پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔" زرینہ نے کن انکھیوں سے اپنے ماموں کی طرف دیکھا۔

"گزشتہ مہینے وہ کس سلسلے میں تم سے ملنے آیا تھا؟"

منظور حسین نے ایک بار پھر غصیلی نظروں سے اپنی بھانجی کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

"کون ہے یہ حبیب احمد؟" منظور حسین کی بیوی نے زرینہ سے پوچھا "تمھارا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"وہ... وہ ہمارا دُور کا رشتے دار ہے۔"

"ہونہہ... دُور کا رشتے دار ہے۔" منظور حسین کی بیوی نے ہاتھ لہرایا "نزدیک کے رشتے داروں سے تو تم لوگوں نے کبھی تعلق واسطہ نہیں رکھا، دُور کے رشتے داروں سے بڑی محبت ہے تم لوگوں کو۔"

"ممانی جان! یہ باتیں آپ بعد میں بھی کر سکتی ہیں۔" زرینہ نے تُنکی سے کہا، پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولی "تھانیدار صاحب! حبیب احمد ملنے کے لیے ہمارے گھر آیا تھا اور مل کر واپس چلا گیا تھا۔ میں آپ کے ان سوالات کا مقصد نہیں سمجھی۔ میں نے کوئی جُرم نہیں کیا۔ مجھے یہ سوالات پسند نہیں ہیں۔"

"بی بی! بات یہ ہے کہ حبیب احمد کے باپ نے اپنے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی ہے۔ ۱۳ مارچ کو رات کے وقت وہ تمھارے گھر پہنچا تھا۔ اُس نے اپنے مالک سے تین دن کی چھٹی لی تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کم از کم تین راتیں تمھارے گھر میں گزارنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن تمھارا کہنا ہے کہ وہ ایک رات رہ کر واپس چلا گیا تھا مگر وہ اپنے گھر نہیں پہنچا، نہ ہی اُس کے بعد کسی نے اُسے دیکھا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کہاں غائب ہو گیا ہے۔"

میری بات سُن کر وہ فکر مند نظر آنے لگی۔ اُسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ حبیب احمد اپنے گھر نہیں پہنچا تھا۔

"یہ... یہ بات تو میں نے پہلی دفعہ سُنی ہے۔" اُس نے کہا "م... میں تو سمجھی تھی کہ اُس نے نوکری چھوڑ دی ہے۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کلاتھ اسٹور پر اُس کا پتا کرنے گئی تھی۔

"زرینہ بی بی! کیا وہ تمھارے گھر سے خوش گیا تھا یا کسی بات پر ناراضگی ہو گئی تھی؟"

"کک... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اُس نے خودکشی کر لی ہوگی؟"

"یہ بات تو تم ہی بتا سکتی ہو۔" میں نے کہا "کیا اُس نے کبھی خودکشی کی دھمکی دی تھی؟"

زرینہ نے پریشان نظروں سے اپنی ممانی کی طرف دیکھا پھر بولی۔ "وہ... وہ ایسا ہے تو نہیں لل... لیکن اُس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اُس روز وہ کسی سے ملے بغیر گھر سے چلا گیا تھا۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ تمھیں اُس کے جانے کا پتا نہیں چلا؟"

"ہاں، وہ صبح صبح اُٹھ کر چلا گیا تھا۔ امی کو اُس کا آنا اچھا نہیں لگا تھا اور اُنھوں نے اُس کے مُنہ پر یہ بات کہہ دی تھی۔ ہم تو... میرا مطلب ہے کہ حبیب رات ہی کو واپس جانا چاہتا تھا مگر امی نے اُسے روک لیا تھا۔"

میرے ذہن میں خدشے نے سر اُبھارا۔ اس نے اصل بات چھپانے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ زرینہ کی ماں نصیراں بیگم نے چوہدری فرمان علی کے تعاون سے حبیب احمد کو ٹھکانے لگا دیا ہو۔ زرینہ یہ کہتے کہتے رُک گئی تھی کہ وہ رات ہی کو حبیب احمد کے ہمراہ جانے پر تُل گئی تھی۔ نصیراں بیگم

تھا اپنی عزت بچانے کے لیے حبیب احمد کو روک لیا ہوگا اور پھر یقیناً چوہدری فرمان علی سے اس معاملے پر مشورہ کیا ہوگا۔

زرینہ کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ حبیب احمد سے محبت کرتی تھی اور اُسے پانے کے لیے خاصی قربانی دے سکتی تھی۔ مزید سوالات کرنے پر مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ اپنی ماں سے ناراض تھی اور فقط حبیب احمد کی خاطر لائلپور میں مقیم تھی۔

"زرینہ بی بی! بات یہ ہے کہ ہمیں بھی حبیب احمد کی تلاش ہے اور تمھیں بھی ہے۔ اس لیے اگر تم چاہتی ہو کہ ہم اس مقصد میں کامیاب ہوں تو تم ہمیں پوری تفصیل سے ساری بات بتاؤ۔"

قدرے تامل کے بعد وہ تفصیل بتانے پر راضی ہوگئی۔

اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں ایک خود پسند عورت ہے اور دولت جمع کرنا اُس کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ دولت کی خاطر وہ اُسے بھی داؤ پر لگا سکتی ہے۔ اُن کے پڑوس میں ایک خوشحال زمیندار رہتا ہے جس کا نام چوہدری فرمان علی ہے، وہ زرینہ کے باپ کا دوست ہے اور کبھی کبھار خیریت پوچھنے اُن کے گھر آ جاتا ہے۔ اُس کے بیوی بچے ایک حادثے میں ہلاک ہو چکے ہیں۔

وہ جب بھی اُن کے گھر آتا نصیراں بیگم اپنی بیٹی کو بناؤ سنگھار کرنے کی ہدایت کرتی اور اُسی سے چوہدری فرمان علی کی خدمت کرواتی۔ زرینہ نے اس بات کو بُرا محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ماں یہ کیوں چاہتی ہے کہ وہ بن سنور کر چوہدری فرمان کے سامنے جائے۔

"امّی! مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔" ایک روز وہ حرفِ شکایت زبان پر لے آئی۔ "چاچا جی کیا سوچتے ہوں گے۔ آپ خود ہی اُن کو لسی پانی دے دیا کریں۔"

"تم تو بالکل ہی بچی لڑکی ہو۔" نصیراں بیگم نے کہا۔ "بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ چوہدری صاحب اچھے آدمی ہیں۔ تمھاری تو ہر وقت تعریف کرتے ہیں اور دیکھو آئندہ اُنھیں چاچا جی نہیں کہنا۔"

"کیوں؟" زرینہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ ابا کے دوست ہیں۔ اُنھیں چاچا جی نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟"

"چوہدری صاحب کہا کرو۔ ابھی تو وہ جوان ہیں۔ تمھارے ابا سے تو بہت چھوٹے ہیں۔"

"لیکن پھر بھی کیا ضرورت ہے چوہدری صاحب کہنے کی؟"

"ہے ضرورت۔" نصیراں بیگم نے ڈانٹ کر کہا۔ "تمھیں پتا ہے کہ چوہدری صاحب کتنی بڑی جائداد کے مالک ہیں؟"

"مجھے کیا ضرورت ہے پتا کرنے کی۔" زرینہ نے کہا۔ "وہ اپنی جائداد ہمارے نام لگانے سے تو رہے۔"

"یہی تو ساری بات ہے جو تمھاری سمجھ میں نہیں آتی۔ انسان سمجھ داری سے کام لے تو جائداد بھی نام لگ سکتی ہے۔ چوہدری صاحب آج کل بہت پریشان ہیں۔ اُنھیں گھر کا آرام چاہیے، جائداد کا وارث چاہیے۔"

ان باتوں سے زرینہ نے صرف اتنا اندازہ لگایا کہ اُس کی ماں چوہدری فرمان علی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ یہ بات اُسے بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ اُس کی ماں اپنی نہیں، اُس کی شادی چوہدری سے کرنا چاہتی ہے۔ وہ پڑھی لکھی لڑکی ہے، ایک بوڑھے سے شادی کرنے پر قطعاً تیار نہیں۔ ماں کے ارادے سے آگاہ ہونے کے بعد اُس نے اپنی شادی کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ اُس کے خیال میں یہی ایک بہتر صورت تھی۔ وہ ماں کی مرضی کے آگے سر جھکانے یا مایوس ہونے پر تیار نہیں تھی۔

حبیب احمد سے مراسم استوار کرنے میں بھی یہی ضرورت پیشِ نظر تھی۔ یہ ایک الگ کہانی ہے کہ دونوں کی پہلی ملاقات کس طرح ہوئی تھی اور کتنے مراحل طے کرنے کے بعد محبت میں تبدیل ہوئی تھی۔ زرینہ نے بتایا کہ حبیب احمد ایک شریف النفس اور خود دار نوجوان ہے۔ وہ اگرچہ ایک کپڑے کی دکان پر سیلز مین ہے لیکن اُس کے اندر ترقی کا جذبہ موجود ہے۔

زرینہ نے اپنی ماں سے اُس کا ذکر کیا۔ نصیراں بیگم نے پہلے تو بیٹی کو بُری طرح جھاڑ دیا اور گھر میں پابند کرنے کی کوشش کی لیکن زرینہ سرکشی پر اُتر آئی۔ اُس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اس قسم کی پابندی ہرگز قبول نہیں کرے گی۔ اس پر نصیراں بیگم نے اُس سے کہا کہ وہ کسی روز حبیب احمد کو گھر بلائے۔ زرینہ کو معلوم نہیں تھا کہ ماں کے دل میں کیا ہے۔ اُس نے حبیب احمد کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔

جس روز حبیب احمد اُن کے گھر پہنچا اُسی روز اتفاق سے نصیراں بیگم نے چوہدری فرمان علی کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔

حبیب احمد نے تقریباً رات کے آٹھ بجے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُس وقت دونوں ماں بیٹی، چوہدری فرمان علی کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں۔ زرینہ نے مجھے بتایا کہ اُس کی ماں نے اُسے اُس کی مرضی کے خلاف چوہدری فرمان علی کے قریب بٹھایا تھا اور چوہدری بھی مونچھوں کو خوب خضاب لگا کر آیا تھا۔ دروازہ نصیراں بیگم نے کھولا اور حبیب احمد کو تعارف کے بعد سیدھی کھانے کے کمرے میں لے گئی۔ شاید وہ اس حرکت سے زرینہ اور حبیب احمد کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنا چاہتی تھی یا حبیب احمد کو اُس کی کم مائیگی کا احساس دلانا چاہتی تھی۔

زرینہ نے حبیب احمد کو دیکھا تو گھبراہٹ، خوشی اور اُلجھن کا شکار ہوگئی۔ اُس نے کھانا چھوڑ دیا اور حبیب احمد کو دوسرے کمرے میں لے جانا چاہا۔

نصیراں بیگم نے چالاکی سے کہا۔ "اُدھر کہاں لے جا رہی ہو مہمان کو۔ بے چارہ بھوکا ہوگا، سفر سے آیا ہے۔ اِدھر ہی بٹھاؤ، کھانا کھاؤ، اس کے کم لگے۔"

"اچھا، آپ بیٹھیں۔" زرینہ نے کہا۔ وہ اچھی خاصی نروس ہو رہی تھی۔ "میں آپ کے لیے پلیٹ لاتی ہوں۔"

حبیب احمد نے تکلفاً کہا۔ "آپ لوگ کوئی زحمت نہ کریں، میں ابھی کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

"چلو، اپنا ہی گھر ہے، جب چاہے کھا لینا۔" نصیراں بیگم نے کہا۔ "یہیں بیٹھ جاؤ۔"

دسترخوان نیچے بچھا ہوا تھا۔ حبیب احمد نے اپنا بیگ نیچے رکھ دیا اور ایک طرف ہو کر دری پر بیٹھ گیا۔

زرینہ فطری حجاب کی وجہ سے ماں اور چوہدری کے سامنے حبیب احمد کے ساتھ کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔ نصیراں بیگم نے البتہ حبیب احمد کو نظر انداز کر دیا اور چوہدری کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی۔ حبیب احمد اس محفل میں الگ تھلگ بیٹھا سبکی محسوس کرتا رہا۔ وہ راستے بھر یہ سوچتا رہا تھا کہ ہونے والے سسرال میں اُس کی خوب آؤ بھگت ہوگی مگر وہاں اُسے اچھوت کی طرح ایک طرف بٹھا دیا گیا تھا۔

کھانے کے بعد چوہدری فرمان علی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور حبیب احمد سے پوچھا۔ "برخوردار، تم کام کیا کرتے ہو؟"

نصیراں بیگم اُس کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑی۔ "بے چارہ کپڑے کی دکان میں نوکر ہے۔"

اس کا طرزِ تکلم تحقیر آمیز تھا۔ حبیب احمد کو یہ سوال اور جواب بہت بُرا لگا۔

کچھ دیر بعد چوہدری فرمان علی اُٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔

نصیراں بیگم نے برتن وغیرہ سمیٹنے کے بعد حبیب احمد سے کہا۔ "شکل و صورت سے تو بڑے سمجھ دار نظر آتے ہو مگر تمھارا طریقہ ... آیا تم رشتہ مانگنے آئے ہو... یا قربانی کا بکرا خریدنے ..."

حبیب احمد نصیراں بیگم کے جارحانہ انداز سے گھبرا کر بولا۔ "میں ... آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"تم اتنے بھی بھولے نہیں ہو، میاں۔ رشتے کی بات چیت کے لیے بڑے آتے ہیں۔"

"امّی! آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ ..." زرینہ نے ماں کو یاد دلانا چاہا۔

"تم خاموش بیٹھی رہو۔" نصیراں بیگم نے ڈانٹا۔ "ایک ہمارا زمانہ تھا کہ لڑکیاں اپنے رشتے کی بات سُن کر چھپتی پھرتی تھیں۔ تمھارا باپ زندہ ہوتا تو تمھاری اس حرکت پر تمھارے ٹکڑے کر دیتا۔"

حبیب احمد نے کہا۔ "زرینہ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں اس لیے چلا آیا۔"

"میاں، تمھیں چاہیے تھا کہ کسی ماں بہن کو ساتھ لے کر آتے۔"

"میں معافی چاہتا ہوں، اگلی دفعہ اپنی والدہ کو ساتھ لے آؤں گا۔"

"اب کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کو لانے کی۔ میں نے جو دیکھنا تھا دیکھ لیا۔ تم نے چوہدری صاحب کے سامنے ہماری ناک کٹوا دی۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے کہ میری ہیرے جیسی بیٹی کو کسی عزت دار خاندان کا رشتہ نہیں مل سکتا۔"

"خالہ! آپ زیادتی کر رہی ہیں۔" حبیب احمد نے کہا۔ "ہم بھی عزت دار لوگ ہیں۔"

"واہ جی واہ! تم تو شادی سے پہلے ہی آنکھیں دکھانے لگے، بعد میں کیا ہوگا۔"

"امّی! زیادتی آپ کی ہے۔" زرینہ نے کہا۔ "آپ کو اس طرح بات نہیں کرنا چاہیے۔ حبیب میرے کہنے پر آئے ہیں اور آپ ہی نے مجھے کہا تھا کہ آپ انھیں دیکھنا چاہتی ہیں، اس میں ان کی کیا غلطی ہے؟"

اس بات پر ماں بیٹی میں خوب جھگڑا ہوا۔

حبیب احمد خاموش تماشائی بنا بیٹھا رہا۔ اُس سے کسی نے کھانے کو بھی نہیں پوچھا تھا۔

رات کے دس بجے نصیراں بیگم نے اُس سے پوچھا۔ "تم ابھی واپس جاؤ گے یا کل صبح؟"

"ابھی کیسے جائیں گے۔" زرینہ نے کہا۔ "اس وقت کوئی بس نہیں ملے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔" حبیب احمد نے کہا۔ "بس نہ ملی تو میں ویٹنگ روم میں رات گزار لوں گا۔"

"آپ ایسے نہیں جائیں گے۔" زرینہ نے کہا۔ "بیٹھیں، میں آپ کے لیے کھانا لاتی ہوں۔"

"ہائے ہائے، تُو خواہ مخواہ اس کے پیروں کی زنجیر بن رہی ہے۔ بے چارے کو صبح نوکری پر جانا ہوگا۔ بسیں ساری رات چلتی ہیں، کوئی نہ کوئی بس مل ہی جائے گی۔"

"آپ نہیں جائیں گے۔" زرینہ نے حبیب احمد کو اپنے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھ کر کہا۔ "یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آپ نے تو ابھی تک ایک گلاس پانی بھی نہیں پیا۔"

"تو چل یہاں سے۔" نصیراں بیگم نے زرینہ کو بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ "بڑی آئی مہمان نواز کہیں کی۔ برخوردار، تم اس احمق

لڑکی کے پیچھے اپنی زندگی خراب نہ کرو۔ میں چوہدری فرمان علی کو زبان دے چکی ہوں۔"

"جی!" حبیب احمد نے کہا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ کیا زرینہ کی چوہدری فرمان علی کے بیٹے سے منگنی ہو گئی ہے؟"

"امی! آپ کو میرا جواب اچھی طرح معلوم ہے۔"

"ہمارے خاندان میں لڑکیوں سے سوال جواب نہیں کیا جاتا۔ شادی کا فیصلہ ہمیشہ بڑے کرتے ہیں۔"

"میں انسان ہوں، بھیڑ بکری نہیں ہوں۔" زرینہ نے کہا۔ "تعلیم یافتہ بھی ہوں۔ حبیب! آپ ذرا رکیں، میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔"

"تیری یہ جرأت!" نصیراں بیگم نے اس کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ "اگر تو نے گھر سے نکلنے کا نام لیا تو میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔ مجھے کمزور نہ سمجھنا۔"

"میں بھی کمزور نہیں ہوں۔" زرینہ اپنا گال سہلاتے ہوئے بولی۔ "آپ مجھے قید نہیں کر سکتیں۔ میں دو دن، چار دن یا دس دن کے بعد اس گھر سے چلی جاؤں گی۔ آپ کب تک مجھ پر پہرے بٹھائیں گی۔"

بات بڑھتی دیکھ کر نصیراں بیگم نرم پڑ گئی۔ وہ نہ صرف حبیب کے لیے کھانا نکال لائی بلکہ اُسے روک بھی لیا۔ زرینہ نے مجھے بتایا کہ اُسے ماں کی اس تبدیلی پر زیادہ تعجب نہیں ہوا کیونکہ اُسے یقین تھا کہ وہ اپنی ضد سے ماں کو جھکنے پر مجبور کر سکتی تھی۔

اگلی صبح حبیب احمد اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ شاید وہ رات کے جھگڑے کی وجہ سے صبح ہی صبح اُٹھ کر چلا گیا تھا۔ زرینہ کو یقین نہیں آیا۔ اُسے حبیب سے ایسی توقع نہیں تھی لیکن وہ حقیقت کو جھٹلا بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے ماں سے پوچھا کہ کیا حبیب اُسے بتا کر گیا تھا۔

"نہیں۔" نصیراں بیگم نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ میرے اُٹھنے سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ باہر کا دروازہ چوپٹ کھلا پڑا تھا۔ ایسا بے مروّت شخص میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کم از کم ہمارے اُٹھنے کا انتظار ہی کر لیتا اور تو اور، جاتے وقت اپنی مٹھائی بھی ساتھ لے گیا۔"

"مجھے تو یقین نہیں آ رہا، وہ مجھے بتائے بغیر کیسے چلے گئے۔"

"تم ابھی نادان ہو۔ ان باتوں کو سمجھنا آتنا آسان نہیں ہے۔ چوہدری صاحب نے جاتے وقت کہا تھا کہ لڑکا قابلِ اعتبار نظر نہیں آتا، اس سے ہوشیار رہنا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ وہ گھر کی کوئی چیز نہ اُٹھا لے گیا ہو۔"

زرینہ نے مجھے بتایا کہ اُسے حبیب احمد کے خاموشی سے چلے جانے کا بہت صدمہ ہوا۔ وہ سارا دن روتی رہی اور تین روز تک اپنی ماں سے بات نہیں کی۔ پھر وہ حبیب احمد سے ملنے کی آس میں لائلپور آ گئی اور ایک پرائمری اسکول میں ملازمت کر لی۔

ساری بات سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ حبیب احمد نصیراں بیگم کے گھر سے باہر نہیں گیا تھا۔ اُس کے ساتھ یقیناً کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا یا نصیراں بیگم نے چوہدری فرمان علی کے تعاون سے اُسے قتل کر دیا تھا اور لاش کو راتوں رات ٹھکانے لگا دیا تھا۔

میں نے زرینہ سے پوچھا کہ اگلی صبح وہ کتنے بجے بیدار ہوئی تھی۔

اس نے جواب دیا کہ وہ تقریباً سات بجے اُٹھی تھی۔ اُس کی ماں اُس سے پہلے اُٹھ گئی تھی۔

"صبح جب تم نے اپنی ماں کو دیکھا تو کیا اُس کے چہرے پر بے خوابی یا تھکن کے نشانات موجود تھے؟"

اُس نے میرے سوال پر غور کیا پھر بولی۔ "میں نے امی کے چہرے پر غور نہیں کیا تھا لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ ناشتے کے بعد امی نے سر درد کی شکایت کی تھی اور اپنے کمرے میں جا کر سو گئی تھیں اور تقریباً دو بجے تک سوتی رہی تھیں۔"

میں نے زرینہ کو ہدایت کی کہ وہ ایک آدھ روز کے اندر قصبے میں پہنچ جائے۔ ہمیں اُس کے بیان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میری بات سُن کر وہ پریشان نظر آنے لگی۔

اگلے دو روز تک میں اُن بسوں کے ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں سے پوچھ گچھ کرتا رہا جو چودہ مارچ کی صبح قصبے سے گزری تھیں۔ میری تفتیش کے مطابق صبح کے سات بجے تک کل چھ بسیں وہاں سے گزری تھیں۔ اُن بسوں کے ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں نے حبیب احمد کی تصویر دیکھی اور پورے وثوق کے ساتھ مجھے بتایا کہ وہ شخص اُن کی بسوں میں سوار نہیں ہوا تھا۔ صبح کے وقت زیادہ رش نہیں ہوتا اس لیے اِکّا دُکّا مسافر نظر میں آئے بغیر نہیں رہتے خصوصاً بابو ٹائپ کا آدمی فوراً نظر میں آ جاتا ہے۔ صبح کے وقت کوئی ٹرین وہاں سے نہیں گزرتی تھی۔ نیز لائلپور وغیرہ جانے والے مسافر ٹرین میں سفر بھی نہیں کرتے تھے کیونکہ ٹرین دُگنا وقت لگاتی تھی۔

حبیب احمد کا باپ شریف احمد دو تین مرتبہ میرے پاس آ چکا تھا۔ وہ خاصا معمر شخص تھا اور اپنے نوجوان بیٹے کی گمشدگی کے باعث سخت پریشان تھا۔ میں اُسے کسی قسم کی تسلی دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا کیونکہ میرا اندازہ خوش کُن نہیں تھا۔

اس اثنا میں میں نے دو سادہ لباس سپاہیوں کو چوہدری فرمان علی اور نصیراں بیگم کے گھر کی نگرانی پر مامور کر دیا تھا۔

تیسرے یا چوتھے روز چوہدری فرمان علی مجھ سے ملنے کے لیے تھانے پہنچ گیا۔

رسمی کلمات کے بعد اُس نے کہا۔ "ملک صاحب! میں ایک عزّت دار زمیندار ہوں اور ہر سال حکومت کو لگان ادا کرتا ہوں اور سرکاری ملازموں کو جو تنخواہیں ملتی ہیں، اُن میں ہمارا پیسہ بھی شامل ہوتا ہے۔"

وہ پینتالیس چھیالیس سال کا ایک صحت مند شخص تھا۔ بوسکی کی قمیص، واسکٹ اور قراقلی ٹوپی میں وہ واقعی ایک روایتی زمیندار لگ رہا تھا۔ مونچھیں اُس نے خاصی موٹی موٹی پال رکھی تھیں۔

"چوہدری صاحب! سیدھا سیدھا یہ کہیں نا کہ ہم آپ کے نوکر ہیں۔"

"ملک صاحب! میں نے سچی بات کی ہے۔ آپ اس کا جو مرضی مطلب نکال لیں۔ ہم حکومت کو اس لیے لگان دیتے ہیں کہ وہ ہماری عزّت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کرے گی۔"

"اس میں کیا شک ہے چوہدری صاحب!" میں نے کہا۔ "آپ اصل بات کریں، معاملہ کیا ہے؟"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے آدمی لوگوں کو ہراساں کرتے پھر رہے ہیں۔" اُس نے کہا۔ "ہمارے علاقے میں نصیراں بیگم نامی ایک بیوہ عورت رہتی ہے۔ اُس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کئی روز سے اُسے اور اُس کی بیٹی کو پریشان کر رہے ہیں۔ آپ کے دو آدمی ہر وقت اُس کے گھر کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں۔ میرا ارادہ اِن ہی صاحب سے بات کرنے کا تھا لیکن میں نے سوچا کیوں نہ پہلے آپ ہی سے بات کر لی جائے۔ ملک صاحب! نصیراں بیگم کا شوہر میرا دوست تھا، اس لیے اُس کی دیکھ بھال میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اگر آپ اُس کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں تو میں حاضر ہوں بلکہ مجھے یاد آیا کہ آپ ہماری حویلی بھی آنے والے تھے۔"

"چوہدری صاحب! اچھا ہُوا آپ یہاں آ گئے ورنہ میں خود ہی آپ کے پاس آنے والا تھا۔ آپ کی یہ اطلاع غلط ہے کہ ہم نصیراں بیگم اور اُس کی جوان بیٹی کو پریشان کر رہے ہیں۔ ہمارے آدمی تو سارے قصبے میں منڈلاتے پھرتے ہیں، کچھ وردی میں ہوتے ہیں اور کچھ سادہ لباس میں۔ قصبے میں گشت کرنا اُن کی ڈیوٹی ہے۔ آپ لوگ سوتے ہیں اور وہ جاگتے ہیں۔ تاکہ کوئی شخص آپ کی جان و مال کی طرف بُری نظر سے نہ دیکھے۔ ویسے میں نصیراں بیگم اور اُس کی بیٹی سے ملا تھا، کچھ سوالات بھی کیے تھے مگر پریشان وغیرہ بالکل نہیں کیا۔"

"بہرحال! میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ دوبارہ اُس کا دروازہ نہ کھٹکھٹائیں۔" اُس کے لہجے میں تحکم پایا جاتا تھا۔ "نصیراں بیگم کا اُس نوجوان سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کی آپ کو تلاش ہے۔"

"چوہدری صاحب! ہم بلاضرورت کسی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے اور ضرورت پڑنے پر بڑی سی کا دروازہ کھٹکھٹانے سے بھی نہیں گھبراتے۔ آپ کی درخواست مناسب نہیں ہے۔"

"حضور! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے درخواست نہیں کی، آپ کو اطلاع دی ہے۔"

میں نے اُس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "چوہدری صاحب! تیرہ مارچ کو آپ رات کے کھانے پر نصیراں بیگم کے گھر پر مدعو تھے۔ کھانے کے دوران نصیراں بیگم کے گھر لائلپور سے ایک مہمان آیا تھا۔ اس کا نام حبیب احمد تھا۔ وہ نوجوان اُس روز سے لاپتا ہے۔ نہ تو اپنے گھر پہنچا ہے اور نہ ہی کسی دوسری جگہ اُس کا سُراغ ملا ہے۔"

"میں نے اس شخص کو دیکھا تھا۔" چوہدری فرمان علی نے کہا۔ "نصیراں بیگم نے مجھے بتایا ہے کہ وہ شخص اگلے روز واپس چلا گیا تھا۔ اب یہ اُس کی ذمے داری نہیں ہے کہ وہ کہاں گیا، گھر گیا یا اُس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔"

"بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ حبیب احمد نصیراں بیگم کے گھر سے چلا گیا تھا۔"

"عجیب بات کرتے ہیں آپ بھی۔ وہ انسان تھا، کسی چھچھوندر کا بچہ نہیں تھا۔ اگر وہ نصیراں بیگم کے گھر میں ہوتا تو پورے محلّے کو خبر ہوتی۔"

میں نے چوہدری کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ زندہ ہوتا تو یقیناً پورے محلّے کو خبر ہوتی۔"

اُس کے چہرے پر ایک لہر سی آ کر چلی گئی، بولا "تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نصیراں بیگم نے اُسے قتل کر دیا ہے؟"

"اُسے کسی کا تعاون بھی حاصل رہا ہوگا۔"

"آپ کچھ زیادہ ہی ذہین بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ بولنے میں احتیاط سے کام لیں، کسی کو قاتل قرار دینے سے قبل مقتول کا ہونا بہت ضروری ہے۔"

"چوہدری صاحب! یہی چیز ہمارے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے لیکن آپ خاطر جمع رکھیں، مقتول کی لاش بھی برآمد ہو جائے گی۔ اس بات کی میں پوری تسلی کر چکا ہوں کہ حبیب احمد اپنے پیروں پر چل کر نصیراں بیگم کے گھر سے باہر نہیں گیا۔ زرینہ نے مجھے بتایا ہے کہ چودہ مارچ کی صبح جب وہ بیدار ہوئی تو حبیب احمد اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ بقول نصیراں بیگم وہ علی الصباح کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکل گیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ مٹھائی بھی واپس لے گیا تھا جو اُن کے لیے لایا تھا۔ چودہ مارچ کی صبح یہاں سے جتنی بسیں گزری تھیں، میں اُن کے ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں سے مل چکا ہوں، کسی نے حبیب احمد کو اپنی بس میں سوار ہوتے نہیں دیکھا۔ میرے آدمی صبح سویرے اٹھنے والے لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کر چکے ہیں، کسی نے حبیب احمد کو گلی میں چلتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ نصیراں بیگم نے حبیب احمد کو قتل کر دیا ہے۔"

"چوہدری صاحب! آپ کو یہ بات ضرور معلوم ہوگی ... کہ حبیب احمد کا زرینہ سے کیا تعلق تھا اور وہ کس سلسلے میں اُن کے گھر آیا تھا؟"

"میں نے سُنا تھا کہ وہ احمق کا بچہ زرینہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"یہ دو طرفہ معاملہ تھا۔ زرینہ بھی اُس سے شادی کرنا چاہتی تھی کیونکہ اُس کی ماں اُسے ایک بوڑھے کے پلے باندھنا چاہتی تھی... دولت کی خاطر... میرے خیال میں احمق کا بچہ اس بوڑھے کو کہنا چاہیے جو دولت کے زور پر..."

چوہدری کا چہرہ سُرخ ہو گیا، بولا "یہ ... یہ لغو بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟"

"یہ تھانہ ہے چوہدری صاحب! ہم اپنے ذرائع معلومات اتنی آسانی سے نہیں بتایا کرتے۔ آپ کو یہ بات ضرور معلوم ہوگی کہ حبیب احمد زرینہ کے بُلانے پر اُن کے ہاں آیا تھا مگر نصیراں بیگم کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ اُس نے حبیب احمد کو ذلیل کر کے گھر سے نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن زرینہ، ماں کے مقابلے پر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے صاف کہہ دیا کہ اگر حبیب احمد کو گھر سے نکالا گیا تو وہ بھی اُس کے ساتھ گھر سے نکل جائے گی۔ جوان بیٹی گھر سے بھاگنے کی دھمکی دے دے تو اُوپر تلے بھی نیچے ہو جایا کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نصیراں بیگم، بیٹی کی دھمکی سُن کر نرم پڑ گئی تھی لیکن وہ ہمت والی عورت ہے۔ اُس نے حبیب احمد کو روک لیا اور صبح ہونے سے پہلے اُسے ٹھکانے لگا دیا۔"

چوہدری قدرے نرم پڑ گیا، بولا "ملک صاحب! مجھے آپ کی تھیوری سے اتفاق نہیں ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ حبیب احمد نے محبت میں ناکام ہونے کے بعد خودکشی کر لی ہوگی۔"

"میں یہ بھی سوچ چکا ہوں۔ خودکشی کرنے والوں کی لاشوں کو لوگ غائب نہیں کیا کرتے۔"

چوہدری فرمان علی جب تھانے سے نکلا تو وہ کچھ پریشان نظر آتا تھا۔ وہ اپنے پرائیویٹ تانگے میں آیا تھا۔ خاصا سجا ہوا تانگا تھا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے جو باہر ہی ٹھہرے رہے تھے۔

اگلے روز میں نے عدالت سے سرچ وارنٹ حاصل کیا اور نصف درجن آدمیوں کے ہمراہ نصیراں بیگم کے گھر پہنچ گیا۔ میرے آدمیوں نے مکان کو گھیرے میں لے لیا۔ میں نے انھیں ہدایت کر دی تھی کہ کوئی شخص مکان سے باہر نہ جائے۔ اُس وقت صبح کے دس بجے تھے اور مرد کاموں پر گئے ہوئے تھے۔

نصیراں بیگم خاصی دھڑلے والی عورت تھی۔ وہ میری کوئی بات سُننے پر تیار نہیں تھی۔ میں نے اُسے سرچ وارنٹ دکھایا اور کہا کہ ہم عدالت کی اجازت سے اُس کے مکان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ اُس نے ایک ڈنڈا اُٹھا لیا اور کہا کہ جو شخص آگے بڑھا، وہ اُس کی ٹانگیں توڑ دے گی۔ دروازے کا ایک پٹ بند تھا اور دوسرے حصے کے سامنے وہ خود کھڑی تھی۔ اُس کا شور سُن کر گلی میں لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔

میں نے بند دروازے کو کندھا مار کر کھولا اور اپنے دو آدمیوں سمیت اندر داخل ہو گیا۔

نصیراں بیگم نے دو تین بار ڈنڈا چلایا۔ ایک آدھ چوٹ مجھے بھی لگی لیکن پھر حوالدار نے اُس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا اور کہا "اماں جی! ان ڈنڈوں سے ہماری ٹانگیں نہیں ٹوٹ سکتیں۔ آپ اپنی ہڈیوں کی فکر کریں۔ ہم قانون کے بندے ہیں اور قانون کے ساتھ ڈنڈوں سے نہیں لڑا جا سکتا۔"

نصیراں بیگم نے بے بسی کے عالم میں ہمیں بددُعائیں دینا شروع کر دیں۔

جب ہم اندر داخل ہوتے تو میں نے ایک شخص کو کمرے سے نکل کر پچھلی طرف جاتے دیکھا۔ وہ خاصا عجلت میں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُسے آواز دی تو اُس نے ٹھہرنے کے بجائے رفتار تیز کر دی اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اپنا ریوالور نکال لیا اور تیزی سے اُس کے پیچھے دوڑا۔ ساتھ ہی میں نے سیٹی بھی بجائی تاکہ باہر والے سپاہی ہوشیار ہو جائیں۔ جب میں عمارت کا کونا مڑا تو مذکورہ شخص درمیانی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ باہر سے سیٹی کا جواب آ گیا تھا۔ اس لیے وہ پڑوسیوں کے صحن میں کودنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اُس کی جوتیاں نیچے گر گئی تھیں اور دھوتی کی وجہ سے وہ اُوپر چڑھنے میں دقت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اُس کی دھوتی کے پچھلے حصے میں ہاتھ ڈال کر اُسے جھٹکا دیا تو وہ بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا زمین پر آن گرا۔ آدمی وہ خاصا جاندار تھا۔ نیچے گرنے کے باوجود اُس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ تیزی سے اُٹھا، پوری قوت سے مجھے دھکا دیا اور دھوتی سنبھالتا ہوا مرکزی دروازے کی طرف بھاگا۔

مجھے یاد ہے کہ اُس نے بڑک بھی ماری تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جوانی میں کبڈی کھیلتا رہا تھا۔ دروازے کے سامنے حوالدار نے اُسے پکڑنے کی کوشش کی۔ اُس نے نہایت مہارت سے حوالدار کو جھانسا دیا اور اُسے اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ دروازے کے باہر جو سپاہی کھڑا تھا، وہ یہ صورتِ حال دیکھ کر اندر آ گیا اور جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

"ہٹ جا اوئے میرے رستے سے۔" مذکورہ شخص نے ایک اور بڑک ماری۔

سپاہی اگرچہ کمزور تھا مگر وہ اُس سے لپٹ گیا۔ اتنے میں میں بھی اُس کے سر پر پہنچ گیا اور تھوڑی سی کشمکش کے بعد اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ اس دوران میں حوالدار نے اپنی ہزیمت کا بدلہ بھی لے لیا تھا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" میں نے پوچھا۔

"نام میرا... چوہدری محمد الیاس گھمن ہے۔" اُس نے ہانپتے ہوئے جواب دیا "میں... میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں تھانیدار! ہتھکڑیاں کھول دے، نہیں تو تیرے حق میں اچھا نہ ہوگا۔"

"بلے اوئے چوہدری گھمن!" حوالدار نے کہا "نام تیرا بہت ہے گھمن گھیریاں تو خوب لگاتا ہے۔"

"چوہدری! یہ ہتھکڑیاں اب اتنی آسانی سے نہیں کھلیں گی۔" میں نے کہا "تم کارِ سرکاری میں مزاحمت کے مرتکب ہوئے ہو، پولیس پر حملہ آور ہوئے ہو اور ہمیں دھمکی دی ہے، اس لیے ہم تمھیں گرفتار کر رہے ہیں۔ ہمیں پتا ہے کہ تم بہت بڑے چوہدری ہو لیکن قانون سے بڑے نہیں ہو۔"

وہ ہمیں دھمکیاں دیتا رہا لیکن میں نے کوئی پروا نہیں کی۔ ... ان کے اندر زرینہ کے علاوہ ایک ادھیڑ عمر ملازمہ بھی تھی میں نے

عورتوں کو برآمدے میں بٹھا دیا، چوہدری الیاس گھمن کو حوالدار کے سپرد کیا اور خود ایک آدمی کے ہمراہ مکان کی تلاشی لینا شروع کر دی۔

مکان کا صحن خاصا بڑا تھا اور اُس کے ایک حصّے میں سبزیاں اُگی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ کسی لاش کو دفن کرنے کے لیے وہ جگہ بڑی مناسب تھی۔ زمین نرم تھی جسے کھودنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ نصیراں بیگم جیسی مضبوط عورت یہ کام تنہا بھی کر سکتی تھی۔ جیسا کہ زرینہ نے مجھے بتایا تھا کہ چودہ مارچ کے روز ناشتے کے بعد اُس کی ماں سو گئی تھی اور دوپہر کے بعد اُٹھی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ رات کو جاگتی رہی تھی۔

مکان کے اندر سے مجھے کوئی خاص چیز نہیں ملی جو واردات پر روشنی ڈالتی۔ میں نے ایک اے ایس آئی کو جو باہر ڈیوٹی پر مامور تھا، اندر بُلایا۔ خانہ تلاشی کا کام اُس کے سپرد کیا اور خود گھر والوں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ میں نے بیٹھک میں ڈیرا جمالیا اور پہلے زرینہ کو اندر بُلایا۔ وہ ہماری کارروائی کی وجہ سے خاصی پریشان تھی۔

"زرینہ بی بی! یہ کارروائی ہمیں مجبوراً کرنا پڑی ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "ہماری تفتیش یہ ظاہر کرتی ہے کہ حبیب احمد اس گھر سے باہر نہیں گیا۔ تم ذرا سوچ کر بتاؤ، چودہ مارچ والے روز تم نے اپنے باغیچے میں کوئی غیر معمولی بات تو نہیں دیکھی؟ کوئی تازہ کھدی ہوئی جگہ تمھاری نظروں میں تو نہیں آئی؟"

"گگ... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حبیب کو کسی نے قتل کر کے باغیچے میں دفن کر دیا ہے؟"

"فی الحال میرا یہی اندازہ ہے اور میں اسی لائن پر تفتیش کر رہا ہوں۔"

"میں آپ کے سوال کا صحیح جواب نہیں دے سکتی۔ باغیچے میں کھدائی وغیرہ تو اکثر ہوتی رہتی ہے۔"

"تم ایسا کرو کہ باغیچے میں جا کر اس بات پر غور کرو۔ ممکن ہے کہ بے خیالی میں دیکھی ہوئی کوئی بات تمھیں یاد آ جائے لیکن جانے سے پہلے ایک سوال کا جواب دیتی جاؤ۔ تم بتا چکی ہو کہ حبیب احمد تیرہ تاریخ کو تمھارے ہاں آیا تھا، اُس روز چوہدری فرمان علی تمھارے ہاں کھانے پر مدعو تھا۔ یہ بتاؤ کہ فرمان علی کے جانے کے بعد کوئی اور شخص تمھارے گھر آیا تھا؟"

وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ امی نے ماسی فاتاں کو کسی کو بُلانے کے لیے بھیجا تھا۔ اُس کی واپسی تک میں سو چکی تھی یا شاید مجھے اُس کی واپسی کا پتا نہیں چلا تھا۔"

میں نے اُسے بھیج دیا اور ماسی فاتاں کو اندر بُلا لیا۔ وہ ادھیڑ عمر کی ایک ہوشیار عورت نظر آتی تھی۔ اُس نے کھدر کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن رکھے تھے۔ میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ وہ نصیراں بیگم کے پاس ہی رہتی ہے۔ اُس کے تین بچے ہیں، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ لڑکیاں شادی شدہ ہیں اور لڑکا باپ کے ساتھ لاہور میں رہتا ہے، دونوں وہاں کوئی چھوٹا موٹا کام کرتے ہیں۔

"ماسی فاتاں! پچھلے مہینے یہاں لائلپور سے ایک مہمان آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس روز چوہدری فرمان علی کی ادھر دعوت بھی تھی۔ تمھیں وہ مہمان یاد ہے نا؟ اُس کا نام حبیب تھا۔"

"آہو جی! اچھی طرح یاد ہے۔ اگلے دن وہ سویرے سویرے اُٹھ کر چلا گیا تھا۔" اُس نے جواب دیا۔

"رات کو جب چوہدری چلا گیا تھا تو نصیراں بی بی کا اپنی بیٹی سے جھگڑا ہُوا تھا؟"

"آہو جی! ہُوا تو تھا پر تھوڑی دیر بعد مُک مکا ہو گیا تھا۔"

"مُک مکا کے بعد نصیراں بی بی نے تمھیں کسی کو بُلانے کے لیے بھیجا تھا، یاد ہے نا تمھیں؟"

اُس نے جواب دینے میں تھوڑا تامل کیا پھر بولی۔ "بھیجا تو تھا پر میں بھول بھلا گئی ہوں۔"

"دیکھ ماسی فاتاں! اگر تجھے یہاں یہ بات یاد نہیں آئے گی تو ہم تجھے تھانے لے چلیں گے۔ وہاں لوگوں کو بڑی پُرانی پُرانی باتیں یاد آ جاتی ہیں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ یہیں پر یہ بات یاد کر لو۔"

"تھانیدار جی! میں غریب عورت ہوں۔ میں نے نصیراں بی بی کا نمک کھایا ہے۔ اُس نے مجھے یہ بات بتانے سے منع کیا تھا، اگر میں نے سچ بولا تو وہ مجھے نوکری سے جواب دے دے گی۔"

"سچ تو تمھیں بولنا ہی پڑے گا، خود بتا دو گی تو اچھی رہو گی۔ میں تمھاری مالکن سے اس بات کا ذکر نہیں کروں گا۔"

تھوڑے سے دھمکانے کے بعد وہ سچ بولنے پر تیار ہو گئی۔ اُس نے بتایا کہ تیرہ مارچ کی رات وہ چوہدری الیاس گھمن کو بُلانے گئی تھی۔ چوہدری الیاس کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ فوراً چلا آیا تھا اور نصیراں بیگم کی ہدایت پر پچھلے دروازے سے آیا تھا۔

"اس کے بعد کیا ہُوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"دونوں خاموشی سے بیٹھک میں چلے گئے تھے اور میں سونے کے لیے چھت پر چلی گئی تھی۔ میرا کمرا چھت پر ہے۔ سیڑھیاں پچھلی طرف ہیں۔"

"رات کو تم نے کوئی شور وغیرہ تو نہیں سُنا؟" میں نے پوچھا۔ "یا کسی کو کیاریوں میں کھدائی وغیرہ کرتے تو نہیں دیکھا؟ چھت سے تو پورا صحن نظر آتا ہو گا۔"

اُس نے جواب دینے میں ایک بار پھر تامل کیا۔ میں نے سختی سے کہا۔ "ماسی فاتاں! اگر میں نے تمھیں حوالات میں بند کر دیا تو یاد رکھو کوئی تمھاری ضمانت دینے بھی نہیں آئے گا۔"

"م... میرا خیال ہے جی کہ میں نے باغیچے میں کسی کو مٹی کھودتے دیکھی تھا۔" اُس نے جواب دیا۔ "اُس وقت میں سو چکی تھی مگر کسی چلنے کی آواز سُن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اُٹھ کر نیچے دیکھا تو کوئی باغیچے میں مٹی کھود رہا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں اُس کی شکل نہیں دیکھ سکی۔ میں نے نیچے جا کر پتا کرنے کا ارادہ کیا لیکن پھر میں نے نصیراں بی بی کو اُس طرف جاتے دیکھا۔ وہ مٹی کھودنے والے کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگی، اس لیے میں نیچے نہیں گئی۔"

میں نے اُس سے وہ جگہ پوچھی جہاں اُس نے کسی نامعلوم شخص کو کھدائی کرتے دیکھا تھا اور اُسے الگ کمرے میں بٹھا دیا۔ پھر چوہدری گھمن کو اپنے پاس بُلا لیا۔ وہ ہنوز دھمکیاں دے رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "چوہدری گھمن! اس عورت سے یعنی نصیراں بیگم سے تمھارا کیا رشتہ ہے؟"

اُس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ "وہی جو تمھارے باپ کا تمھاری ماں سے تھا۔"

مجھے غصّہ تو بہت آیا مگر میں ضبط کر گیا۔ "تمھارا مطلب ہے تم دونوں کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہے؟"

"ملک صفدر حیات! تم نے بڑی غلط جگہ پر ہاتھ ڈالا ہے۔" اُس نے کہا۔ "ہمارے خاندان پر تو بڑے بڑے انگریز افسر بھی ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اب بھی موقع ہے، یہ ہتھکڑیاں کھول دو، میں تمھاری غلطی معاف کر دوں گا۔"

"انگریز سات سمندر پار سے آئے تھے چوہدری گھمن! انھیں اس ملک کی مٹی کا تجربہ نہیں تھا۔ وہ آدمی کو نہیں اُس کی زمین کو جانتے تھے لیکن میں اس مٹی کا بندہ ہُوں۔ میں جب میراثی کو دیکھتا ہوں تو اُسے پہچان لیتا ہوں۔ یہ ہتھکڑی اب تمھارے ہاتھ سے پھانسی سے اُترے گی۔ ایک بات میں تمھیں بتا دوں، تھوڑی دیر کے اندر ڈپٹی کمشنر اور ایس پی صاحب پہنچنے والے ہیں۔ لاش اُن کے سامنے برآمد ہو گی۔ میں نے ابھی کام نہیں کیا۔"

لاش کا ذکر سُنتے ہی اُس کے چہرے کا رنگ یک لخت فق ہو گیا۔ بولا۔ "گگ... کس لاش کی بات کر رہے ہو؟"

"ذرا صبر کرو، ابھی پتا چل جائے گا کہ میں کس لاش کی بات کر رہا ہوں اور یہ بھی سُن لو جس عورت کو تم نے اپنی بیوی بنایا ہے، وہی تمھارے خلاف گواہی دے گی۔"

"ملک صاحب! میں ان باتوں سے ڈرنے والا آدمی نہیں ہُوں۔"

جو اے ایس آئی خانہ تلاشی لے رہا تھا، اُس نے تین چیزیں میرے سامنے رکھ دیں۔ ایک خون آلود چادر اور ایک خون آلود تکیے کا غلاف تھا۔ دونوں چیزیں بوسکی کے کپڑے کی تھیں اور اُن پر کشیدہ کاری کی ہُوئی تھی۔ تیسری چیز مردانہ بوٹوں کا ایک جوڑا تھا۔

"جناب! یہ بوٹوں کا جوڑا حبیب احمد کا معلوم ہوتا ہے۔" اے ایس آئی نے کہا۔ "ہماری اطلاع کے مطابق جب وہ گھر سے نکلا تھا تو اس نے ایسے ہی بُوٹ پہن رکھے تھے اور اس چادر اور غلاف پر یہ خون کے دھبّے ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ حبیب احمد کو سوتے میں قتل کیا گیا تھا۔" میں نے اے ایس آئی سے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ ایک آدمی کو فوراً لائلپور بھیجو۔ اس سے کہو کہ وہ اے ایس آئی فیض محمد کو اور حبیب احمد کے باپ کو فوراً بُلا لائے۔ دو آدمیوں کو اس واردات کی تفصیل بتا کر ضلع ہیڈ کوارٹر روانہ کر دو۔ اُن سے کہنا کہ وہ ایس پی علاقہ اور ڈپٹی کمشنر سے یہاں آنے کی درخواست کریں۔ میں اُن کی موجودگی میں لاش برآمد کرنا چاہتا ہوں۔ اُن سے کہنا کہ وہ اخباری نمائندوں کو بھی اس امر کی اطلاع دے دیں اور تیسری بات یہ ہے کہ کسی فوٹوگرافر کا انتظام بھی کر لو۔"

اُن چیزوں کو دیکھ کر اور میری باتوں کو سُن کر الیاس گھمن پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ جب اے ایس آئی جانے لگا تو وہ ہوش میں آتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب! ایک منٹ... ایک منٹ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ میری عرض تو سُن لیں، معاملہ یہیں پر طے ہو سکتا ہے، اتنے لوگوں کو جمع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

اے ایس آئی رُک گیا۔ میں نے کہا۔ "بولو، میں سُن رہا ہُوں۔"

"حضور! آدمی تو مرتے ہی رہتے ہیں۔" اُس نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ "اور مرنے والے واپس نہیں آیا کرتے۔ جو کچھ ہو چکا ہے، اُس پر مٹی ڈالیں اور حکم کریں کہ آپ کو کتنی رقم چاہیے۔ پانچ ہزار؟ دس ہزار؟ پندرہ ہزار؟ جو زبان سے گرمی ہو گئی ہے، اُسے معاف کر دیں اور مجھے اپنا خادم سمجھیں۔"

"بات سُن او نے چوہدری گھمن! میں نے کبھی لاشوں کا سودا نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "حبیب احمد ایک غریب باپ کا بیٹا تھا، اس کے بڑھاپے کا سہارا تھا۔ وہ ایک بوڑھی ماں کی آنکھوں کا تارا بھی تھا۔ اس کی تین بہنیں اور دو بھائی ہیں، وہ سب اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں۔ وہ ابھی تک حبیب احمد کو زندہ سمجھتے ہیں۔ چوہدری گھمن! ذرا سوچو، جب جوان بیٹے کی لاش گھر پہنچے گی تو بوڑھے ماں باپ کا کیا حال ہو گا۔ بہنوں اور بھائیوں پر کیسی قیامت ٹوٹ پڑے گی اور تم کہتے ہو کہ مٹی ڈالو... نہیں

”چوہدری، یہ اتنی معمولی بات نہیں ہے۔“

”ملک صاحب! ام... میرا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ ”یہاں اگر کوئی واردات ہوئی ہے تو اس کی ذمے دار نصیراں بیگم ہے۔ یہ اسی کا مکان ہے۔“

میں نے اے ایس آئی کو بھیج دیا اور نصیراں بیگم کو بھی کمرے میں بلا لیا۔

”نصیراں بیگم! یہ چوہدری الیاس گھمن کا کہنا ہے کہ تم اس کی بیوی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”کیا یہ سچ ہے؟“ نصیراں بیگم کی خون آلود چادر اور بوٹوں پر نظر نہیں پڑی تھی۔

ابھی میری بات بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ میں نے چوہدری فرمان علی کو برآمدے میں داخل ہوتے دیکھا لیکن الیاس گھمن اور نصیراں بیگم کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ میرا سوال چوہدری فرمان علی نے سن لیا تھا اور وہ برآمدے میں ہی ٹھٹک گیا تھا۔ غالباً وہ نصیراں بیگم کا جواب سننا چاہتا تھا۔

”ہاں، ٹھیک کہا ہے چوہدری الیاس نے۔“ نصیراں بیگم نے کہا۔ ”آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے؟“

”ملک صاحب کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔“ چوہدری فرمان کمرے میں قدم رکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یہ معاملہ کب ہوا ہے؟“

”اوہ... چوہدری صاحب! آپ!“ نصیراں بیگم گھبرا کر بولی۔ ”آپ کب آئے ہیں؟ میں تو آپ کی طرف آدمی بھجوانا چاہتی تھی۔ مم... مگر یہ تھانیدار صاحب نے ہمارے گھر کی ناکا بندی کر رکھی ہے۔“

چوہدری فرمان علی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اب ہمارے گھر آدمی بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ آدمی تو تجھے گھر داخل گیا ہے۔“

”اوہ... !“ اس کی ہتھکڑی پر نظر پڑی۔ ”ملک صاحب! یہ ہتھکڑی کس خوشی میں؟“

”بیٹھیں۔“ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اچھا ہوا آپ آ گئے۔ مجھے چند معتبر گواہوں کی ضرورت بھی تھی۔“ پھر میں نے نصیراں بیگم سے کہا۔ ”نصیراں بیگم! یہ چوہدری گھمن کہتا ہے کہ حبیب احمد کو تم نے قتل کیا ہے۔ ہم نے یہ خون آلود چادر، یہ تکیے کا غلاف اور حبیب احمد کے بوٹ اسی کے اشارے پر برآمد کیے ہیں۔“

نصیراں بیگم نے مذکورہ چیزوں کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر خوف اتر آیا۔

”ملک صاحب! جھوٹ نہ بولیں۔ یہ... یہ چیزیں آپ کا آدمی اندر سے نکال کر لایا ہے۔“ گھمن نے کہا۔

”گھمن صاحب...!“ نصیراں بیگم نے پھٹی پھٹی نظروں سے الیاس گھمن کی طرف دیکھا۔ ”مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی۔ آ... آپ اتنے بودے اور کھوکھلے ہیں اندر سے۔“

”تم... نصیراں بیگم! یقین کرو میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔“ میں نے جلتی پر تیل ڈالا اور کہا کہ الیاس گھمن نے مجھے وہ جگہ بھی بتا دی ہے جہاں حبیب احمد کی لاش دفن ہے نیز جگہ کی نشاندہی بھی کر دی۔ یہ سن کر نصیراں بیگم کو یقین ہو گیا کہ الیاس گھمن نے اس کے خلاف بیان دیا تھا۔

”اگر یہ بات ہے تو اب مجھے سچ بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“ نصیراں بیگم نے چیخ کر کہا۔ ”میں اس معاملے میں بالکل بے قصور ہوں۔ حبیب احمد کا قاتل یہی ہے۔“ اس نے الیاس گھمن کی طرف اشارہ کیا۔ ”آپ نے اسے صحیح ہتھکڑی لگائی ہے۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ حبیب احمد کو ڈرا دھمکا کر گھر سے نکال دیا جائے لیکن اس نے میرے منع کرنے کے باوجود اسے قتل کر دیا۔“

دونوں نے ایک دوسرے پر الزام تراشی شروع کر دی۔ میں نے نصیراں بیگم کے ہاتھوں میں بھی ہتھکڑی ڈلوا دی اور دونوں کو الگ الگ کر دیا۔

تقریباً ڈیڑھ بجے ایس پی علاقہ موقع پر پہنچ گئے۔ اس اثنا میں حبیب احمد کا بوڑھا باپ اے ایس آئی فیض محمد اپنے تھانیدار کے ہمراہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ ان تمام لوگوں کی موجودگی میں میں نے باغیچے کی کھدائی کروا کے حبیب احمد کی لاش برآمد کر لی۔ اس کا بیگ اور مٹھائی کا ڈبا بھی گڑھے میں سے برآمد ہو گیا۔

جوان بیٹے کی لاش کو دیکھ کر بوڑھے باپ کا جو حال ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔

بعد تفتیش یہ پتا چلا کہ حبیب احمد کو سوتے میں ہلاک کیا گیا تھا۔ قتل چوہدری الیاس گھمن نے کیا تھا مگر نصیراں بیگم کی مرضی اس میں شامل تھی۔

چوہدری فرمان علی کے بیان سے پتا چلا کہ وہ نصیراں بیگم سے شادی میں دلچسپی رکھتا تھا لیکن نصیراں بیگم چوہدری الیاس گھمن سے خفیہ شادی کر چکی تھی، اس لیے وہ چاہتی تھی کہ چوہدری فرمان علی اس کی بیٹی زرینہ سے شادی کر لے۔ وہ شاطر عورت دونوں چوہدریوں کو بے وقوف بنا رہی تھی اور ان سے خطیر رقم اینٹھ چکی تھی۔ چوہدری فرمان علی، زرینہ سے شادی پر راضی نہیں تھا۔ بقول اس کے اسے ایک فتنے دار بیوی کی ضرورت تھی۔

عدالت نے چوہدری الیاس گھمن کو سزائے موت اور نصیراں بیگم کو دس سال قیدِ سخت کی سزا دی تھی۔



عزت دار

بعض لوگ ایک چھوٹی سی بات کو برسوں یاد رکھتے ہیں اور بدلے کے انتظار میں اپنی زندگی کو عذاب بنائے رکھتے ہیں حالانکہ سوشل معاملات میں بھول جانا اور معاف کر دینا انجام کے لحاظ سے زیادہ بہتر ثابت ہوتا ہے۔ پھر بھی بعض باتیں بھلانا مشکل ہوتی ہیں اور بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جو معمولی کانٹا چبھ جانے جیسی چھوٹی سی بات کو یاد رکھتے ہیں۔ اُسے اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور اُسے ہر وقت یاد کرتے رہتے ہیں۔

یہ واقعہ بھی ایک ایسی ہی چھوٹی سی بات سے شروع ہوا تھا۔ سردیوں کے دن تھے اور گلیاں و بازار جلدی سنسان ہو جاتے تھے۔ رات کے آٹھ اور نو بجے کے درمیان مجھے ایک قتل کی اطلاع ملی۔ میں چند آدمیوں کو ساتھ لے کر موقع پر پہنچ گیا۔ لاش حویلی کے وسیع صحن کے ایک کونے میں پڑی تھی۔ صحن کچا تھا۔ ایک طرف چھپّر



کے نیچے نصف درجن کے قریب مویشی بندھے ہوئے تھے۔ جن میں چند بھینسیں، بیل اور بکریاں شامل تھیں۔ دوسری طرف چارے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کونے میں جلانے والی لکڑیاں رکھی تھیں۔ جن کے قریب ہی پل اور پنجالیاں پڑی تھیں۔ لکڑیوں کے قریب ایک کھرلی اور ہمری پڑی تھی۔ کھرلی سے چند قدم پرے عقبی دروازہ تھا جو غالباً مویشیوں کے لانے لے جانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ حویلی میں کہرام مچا ہوا تھا۔

لاش کھرلی کے پاس پڑی تھی۔ آلۂ قتل بھی وہیں پڑا تھا۔ وہ ایک گنڈاسا تھا جس پر خون لگا ہوا تھا۔

میں نے لالٹینوں کی روشنی میں لاش کا معائنہ کیا۔ مقتول نے شلوار قمیص اور سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ اُس کے جسم کا زیادہ حصہ کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ سرسری معائنے کے دوران مجھے اُس کے جسم پر دو کاری زخم نظر آئے۔ ایک بائیں آنکھ اور کان کے درمیان تھا اور دوسرا گردن پر۔ چند معمولی زخم انگلیوں پر بھی موجود تھے۔ غالباً یہ زخم وار روکنے کے نتیجے میں آئے تھے۔ اُس کے سر کے آس پاس کثیر مقدار میں خون پھیلا ہوا تھا۔

جائے واردات کی مکمل رپورٹ تیار کرنے کے بعد میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔

مقتول کا نام فاروق اور عمر چھتیس سال معلوم ہوئی۔ وہ گوبو ٹھا اور غیر شادی شدہ تھا۔ حویلی اُس کی اپنی تھی جس میں وہ اپنی ماں، دو بہنوں اور ایک بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ باپ فوت ہو چکا تھا۔ زمینوں کا کام چھوٹا بھائی منظور حسین سنبھالتا تھا۔ فاروق کے بارے میں معلوم ہوا کہ اُسے زمینداری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کچھ عرصہ تک لاہور میں ملازمت بھی کرتا رہا تھا۔ اس نے کئی جگہوں پر ملازمت کی تھی لیکن سال ڈیڑھ سال سے زیادہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ تفتیش کے دوران مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ادبی ذوق کا مالک تھا اور لاہور میں قیام کے دوران ادبی محفلوں میں بھی جایا کرتا تھا۔ اُس نے اپنے قصبے میں بھی ایک ادبی مجلس بنا رکھی تھی، جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔

اُس کے بارے میں عام رپورٹ یہ تھی کہ وہ ایک خاموش طبیعت اور صلح پسند شخص تھا۔ اُس کے اندر زمینداروں والی بھوں بہاں بالکل نہیں تھی۔ نہ ہی اُس کا کوئی دشمن تھا۔ ایسے بے ضرر شخص کے وحشیانہ قتل پر ہر شخص حیران تھا۔ یہ فاروق حسین کا سرسری خاکہ تھا جو تفتیش کے دوران مجھے معلوم ہوا۔

وہ سردیوں کی رات تھی اور لوگ اپنے گھروں میں انگیٹھیوں کے سامنے یا لحافوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس ٹھٹھرتی ہوئی رات میں فاروق حسین باہر کیا کر رہا تھا۔ کیا وہ اکیلا تھا یا اُس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟ گھر والوں نے مجھے بتایا کہ جب وہ چیخنے کی آواز سن کر باہر نکلے تو پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ قاتل یا تو دیوار پھاند کر اندر داخل ہوا تھا اور اپنا کام کر کے دروازے کے راستے باہر نکل گیا تھا اور یا فاروق حسین نے خود اُسے اندر بلایا تھا۔

باہر کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں اندر جا بیٹھا اور پہلے فاروق حسین کی ماں سے کچھ سوالات کیے۔ اُس کا نام قمری بی تھا۔ وہ پچپن چھپن برس کی ایک مضبوط اور حوصلہ مند عورت تھی۔ کچھ پڑھی لکھی بھی تھی لیکن اس وقت اُس کا غم سے بُرا حال تھا۔ میں نے اُسے صبر کی تلقین کی پھر پوچھا کہ اتنی سردی میں اُس کا بیٹا باہر کیوں گیا تھا؟

"ہمیں تو کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب باہر گیا ہے۔" اُس نے جواب دیا۔ "ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر سو گیا ہے۔ سات بجے کے قریب ہم نے کھانا کھایا۔ باقی بچے تو پہلے اُٹھ کر چلے گئے مگر فاروق بہتر دیر تک بیٹھا رہا۔ وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر کھانا کھاتا تھا۔ کبھی کبھی تو کھاتے کھاتے سوچوں میں گم ہو جاتا تھا۔ آج میں نے کڑھی پکائی تھی۔ فاروق کو کڑھی بہت پسند تھی۔" اُس کی آواز بھرا گئی۔ "لیکن اس نے اپنی پسند کی کبھی فرمائش نہیں کی تھی، جو سامنے رکھ دو کھا لیتا تھا۔ کھانا کھاتے کھاتے کہنے لگا۔ ماں! آج میرا کڑھی کھانے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔ بڑی مزیدار کڑھی پکائی ہے تم نے۔ میں نے کہا۔ تیری ماں جو ہوئی۔ مجھے تیرے دل کی بات معلوم نہ ہو گی تو اور کس کو ہو گی۔

کھانے کے بعد وہ اسی کمرے میں بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھتا رہا۔ اُس کے بعد اُدھر پچھلی طرف اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے برتن سمیٹے، چند چھوٹے موٹے کام نمٹائے اور جا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ میری چھوٹی بیٹی سعیدہ میرے ساتھ والے بستر پر سوتی ہے۔ وہ کچھ دیر تک میرے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ پھر میری آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد سعیدہ نے میرا کندھا ہلایا اور گھبرا کر کہنے لگی کہ باہر سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی ہے۔ میں نے کہا کہ کسی بکری نے آواز نکالی ہو گی یا بلیاں لڑ رہی ہوں گی۔

منظور حسین اور اس کی بیوی ہمارے ساتھ والے کمرے میں سوتے ہیں۔ چیخنے کی آواز منظور نے بھی سُنی تھی۔ وہ بھاگا بھاگا میرے کمرے میں آیا اور لالٹین اُٹھا کر باہر چلا گیا۔ ہم بھی اُس کے پیچھے باہر صحن میں پہنچ گئے۔ پہلے تو ہمیں کچھ نظر نہ آیا۔ باہر کا دروازہ کھلا دیکھ کر منظور آگے بڑھا تو اُس کی نظر بھائی کی لاش پر پڑی۔ وہ خون میں لت پت پڑا تھا۔ کسی ظالم نے اُسے ذبح کر ڈالا تھا۔"

اُس نے اپنے بیٹے کے قاتل کو لعن طعن کرنا شروع کر دی۔ جب وہ ذرا رُکی تو میں نے پوچھا۔ "فاروق حسین کی کسی سے دشمنی تو نہیں تھی؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ آپ پورے محلے سے پوچھ لیں، ہر شخص میرے لال کی تعریف کرے گا۔ بہت مسکین قسم کا آدمی تھا۔ اُس نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔"

"آپ کے خیال میں وہ اس سردی میں باہر کیا کرنے گیا تھا؟"

اُس نے جواب دینے میں تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا اظہار کیا، پھر

بولی۔ "پتا نہیں، ہو سکتا ہے ٹہلنے گیا ہو۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کوئی بات چھپا رہی تھی۔ "آپ کا چھوٹا بیٹا تو شادی شدہ ہے۔" میں نے کہا۔ "فاروق حسین کی ابھی تک شادی کیوں نہیں ہوئی تھی؟"

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی، پھر بولی۔ "تھانیدار صاحب! جب اولاد پڑھ لکھ جاتی ہے تو پھر اُس کی پسند اُن پڑھ ماں باپ کی سمجھ سے باہر ہو جاتی ہے۔ فاروق کی شادی تو آج سے پندرہ سال پہلے ہی ہو جاتی لیکن... شاید قدرت کو منظور نہیں تھا۔ اُسے کوئی لڑکی پسند نہیں آتی تھی۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسی لڑکی کو پسند کرتا ہو جسے آپ نے ناپسند کر دیا ہو۔"

"تھانیدار صاحب! میں کسی کی بہو بیٹی کا نام نہیں بدنام کرنا چاہتی۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی لڑکی بیچ میں ضرور تھی مگر وہ اُس کا نام نہیں لینا چاہتی تھی۔ میں نے اُس سے کچھ اور سوالات کیے مگر کوئی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جو قتل کے محرک پر روشنی ڈالتی۔ میں نے اُسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور اُس کے بیٹے منظور حسین کو بلا لیا۔

وہ ستائیس اٹھائیس برس کا ایک تنومند شخص تھا۔ اُس نے بچھو مار کر مونچھیں رکھی ہوئی تھیں اور پہلوانوں کی طرح کہنیاں نکال کر چلتا تھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ کہیں یہ جائیداد کا چکر نہ ہو۔ منظور حسین نے جائیداد کی خاطر بھائی کو ٹھکانے نہ لگا دیا ہو۔

"منظور حسین! مجھے تمہارے بھائی کی موت پر بہت دُکھ ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ظاہر ہے کہ جتنا دُکھ تم کو ہوا ہے اُتنا کسی کو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تمہارا بھائی اور تمہارا بازو تھا۔ میں تم سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ بہت سوچ کر اور اطمینان سے جواب دینا۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے قتل کا سراغ لگانے میں کچھ مدد ملے۔ تمہاری ماں نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے چیخنے کی آواز سنی تھی اور سب سے پہلے تم باہر گئے تھے۔ باہر تم نے کیا دیکھا تھا؟"

"ملک صاحب! باہر کافی اندھیرا تھا۔" اُس نے اطمینان سے کہا۔ "میں لالٹین لے کر باہر گیا اور اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا پچھلے دروازے کی طرف گیا۔ میرے دل میں یہ خیال تھا کہ کوئی مویشی چوری نہ ہو گیا ہو۔ پچھلا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ میں نے لالٹین اونچی کر کے مویشیوں کی طرف نگاہ ڈالی تو وہ سب ٹھیک ٹھاک تھے۔ پھر میں نے دوسری طرف روشنی ڈالی تو کھرلی کے پاس مجھے بھائی فاروق کی لاش پڑی ہوئی دکھائی دی۔"

یہ بات وضاحت طلب تھی۔ اُس نے کتنی دور سے لاش کو دیکھا تھا اور کیا وہاں سے لاش کی شناخت کی جا سکتی تھی؟ اُس نے میری ہدایت پر لالٹین لے لی اور میرے ہمراہ جائے واردات پر پہنچ گیا۔ باہر خاصی سردی تھی اور ایک سپاہی دروازے کے پاس ڈیوٹی دے رہا تھا۔

میں عقبی دروازے کے پاس پہنچ کر ٹھہر گیا اور منظور حسین سے پوچھا۔ "وہ کون سی جگہ ہے جہاں کھڑے ہو کر تم نے پہلے مویشیوں کی طرف اور پھر کھرلی کی طرف دیکھا تھا؟"

میں نے دیکھا میرے اس سوال پر اُس نے اُلجھن محسوس کی تھی۔ تاہم وہ لالٹین لیے ہوئے آگے بڑھا اور دروازے سے پانچ چھ قدم آگے جا کر کھڑا ہو گیا۔ "یہ ہے وہ جگہ۔" اُس نے جواب دیا۔

وہاں سے مویشیوں کا چھپر بائیں جانب اور لوندھی ہوئی کھرلی دائیں جانب تھی۔ میں اُس کے قریب جا ٹھہرا اور لالٹین اُس کے ہاتھ سے لے کے باری باری دونوں طرف دیکھا۔ مویشی تو صاف نظر آتے تھے مگر وہ جگہ جہاں لاش پڑی تھی، صاف نظر نہیں آتی تھی۔ کھرلی وہاں سے سات آٹھ قدم کے فاصلے پر تھی۔ وہاں سے کھرلی کے پاس کوئی چیز پڑی ہوئی تو نظر آ سکتی تھی۔ یہ بھی اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہاں کوئی انسان پڑا ہے مگر اُس کی شناخت مشکل تھی۔

"منظور حسین کیا تم نے یہاں کھڑے کھڑے اندازہ کر لیا تھا کہ کھرلی کے پاس تمہارے بھائی کی لاش پڑی ہے؟"

"اندازہ تو مجھے یہیں سے ہو گیا تھا لیکن شکل میں نے آگے جا کر دیکھی تھی۔"

وہ میرے سوال کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ "منظور حسین! میں نے سُنا ہے کہ تمہارا بھائی بہت صلح پسند اور شریف آدمی تھا۔ اُس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ تمہارے خیال میں اُس کے قتل میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

"آپ کے اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ بھائی فاروق کا ویسے تو کوئی دشمن نہیں تھا مگر دلوں کا حال کون جانے۔ انسان کے جہاں سو بھن ہوتے ہیں، وہاں ایک آدھ دشمن بھی ہوتا ہے۔"

"جائیداد اور زمینوں کا انتظام کس کے ہاتھ میں ہے؟"

"ملک صاحب! میرا بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا لیکن اُس کا مزاج بہت مختلف تھا۔ اُسے زمینداری کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ ہی وہ یہ کام کر سکتا تھا۔ اصولاً تو جائیداد کا سارا انتظام بڑے بھائی کو سنبھالنا چاہیے تھا لیکن عملاً یہ سب کچھ میرے ہاتھ میں ہے۔ میں سات آٹھ جماعتوں سے زیادہ نہیں پڑھا ہوں مگر زمینوں کا انتظام سنبھالنے میں مجھے کبھی مشکل پیش نہیں آئی۔"

"چونکہ تمہارا بھائی زمینوں میں دلچسپی نہیں لیتا تھا، اس لیے اُسے کم از کم یہ دلچسپی تو ضرور ہو گی کہ اُس کا حصہ اُسے مل جائے۔ یعنی اُس کے حصے کی زمین کی قیمت مل جائے۔"

"اُس نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ اگر وہ اپنا حصہ مانگتا تو میں کبھی انکار نہ کرتا۔"

"منظور حسین! کیا تمہارا بھائی اکثر رات کو باہر آ کر بیٹھتا تھا یا آج پہلا موقع تھا؟"

اس بات کا جواب دینے میں اُس نے قدرے توقف کیا، پھر بولا۔

نہ مجھے کسی کی جاسوسی کرنے کی عادت نہیں ہے۔ نہ ہی مجھے یہ معلوم ہے کہ بھائی فاروق رات کو کہاں جاتا تھا اور کہاں بیٹھتا تھا؟"

میرے استفسار پر منظور حسین نے مجھے اپنے بھائی کا کمرہ دکھایا کمرے میں زیادہ فرنیچر نہیں تھا۔ بستر کے علاوہ ایک میز، ایک الماری اور دو تین کرسیاں بھی تھیں۔ میز کے قریب ایک چھوٹا سا شیلف بھی تھا جس میں مختلف موضوعات کی کتابیں رکھی تھیں، چند کتابیں میز پر بھی پڑی تھیں۔ میں نے ایک کتاب اٹھا کر دیکھی۔ وہ غالباً نفسیات یا فلسفے کی کتاب تھی۔ کمرے میں تین دروازے تھے۔ ایک دروازہ گلی کی طرف، ایک صحن کی طرف اور ایک کسی اندرونی کمرے کی طرف کھلتا تھا۔ بستر پر سفید کھیس بچھا ہوا تھا جس پر کوئی شکن نہیں تھی۔ گویا بستر کو استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ پائینتی کی طرف تہ کی ہوئی رضائی رکھی تھی۔

میں نے منظور حسین سے کہا کہ وہ چند منٹ کے لیے اپنی بیوی کو میرے پاس بھیج دے۔ میں اس سے چند باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ پہلے تو تھوڑا جز بز ہوا پھر میرے تیور دیکھ کر اپنی بیوی اور بڑی بہن کو بلا لایا۔ اس کی بیوی کا نام خیر النسا اور بہن کا نام نذیر بیگم تھا۔ دونوں نے گرم شالیں اوڑھ رکھی تھیں اور گھونگٹ نکالے ہوئے تھے۔

میں نے منظور حسین کو باہر بھیج دیا اور خیر النساء سے پوچھا "بی بی! کیا تم نے بھی چیخنے کی آواز سنی تھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا، بولی "نہیں جی! میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔ میں سو چکی تھی۔"

میں نے پوچھا "اس وقت تمہارا شوہر کہاں تھا؟"

"وہ سونے سے پہلے مویشیوں کو دیکھنے اور دروازے بند کرنے چلے گئے تھے، جب واپس آئے تو میں سو چکی تھی۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ منظور حسین نے پورا سچ نہیں بولا تھا اگر وہ مویشیوں کو دیکھنے اور دروازے بند کرنے باہر گیا تھا تو اس نے یقیناً فاروق کو کھری پہ بیٹھے ہوئے دیکھا ہوگا۔

میں نے نذیر بیگم سے پوچھا "کیا تم نے بھی چیخنے کی آواز سنی تھی؟"

"میں نے چیخنے کی آواز تو نہیں سنی لیکن جب سعیدہ نے بتایا کہ باہر سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی ہے تو میری نیند اڑ گئی تھی۔"

میں نے پوچھا "تمہارا بھائی منظور حسین اس کے کتنی دیر بعد تمہارے کمرے میں آیا تھا؟"

اس نے کچھ دیر سوچا پھر بولی "شاید دو تین منٹ بعد آیا ہوگا۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ کوئی بھی شخص گنڈاسے کے دو وار کرنے کے بعد دو منٹ کے اندر کمرے میں پہنچ سکتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ منظور حسین کو پوچھ گچھ کے لیے حراست میں لے لینا چاہیے۔ ابتدائی علامتیں اسی کی طرف اشارہ کر رہی تھیں لیکن پھر میں نے سوچا کہ مزید تفتیش کے بعد ہی ایسا کرنا مناسب ہوگا۔

حویلی سے فارغ ہو کر جب میں باہر نکلا تو اے ایس آئی نے مجھے بتایا "ملک صاحب! مجھے ایک سراغ ملا ہے۔"

وہ میری ہدایت پر آس پاس کے لوگوں سے پوچھ گچھ کرتا رہا تھا میں نے پوچھا "کیا سراغ ملا ہے؟"

"ادھر ایک شخص شاہ دین نام کا رہتا ہے۔" اے ایس آئی نے کہا "اس کا کہنا ہے کہ حویلی میں شور اٹھنے سے تھوڑی دیر پہلے اس نے ایک عورت کو گلی میں تیز تیز چلتے دیکھا تھا۔"

"اچھا! اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ گلی میں تیز چلنا کوئی جرم تو نہیں ہے۔"

"شاہ دین کا خیال ہے کہ وہ مشکوک عورت ہے۔"

"اچھا! آؤ تمہارے شاہ دین سے بھی دو باتیں کر لیتے ہیں۔"

شاہ دین کا گھر اسی گلی میں تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک آسودہ حال کاروباری شخص تھا۔ اس نے کھچڑی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور شکل و صورت سے بڑا باخبر شخص لگتا تھا۔ اس نے ہمیں بڑے تپاک سے بیٹھک میں بٹھایا اور اپنی عورت کو حکم دیا کہ گرم گرم دودھ اور پتیسے لے آئے۔

"شاہ جی! تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا "میں اس عورت کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں جسے آپ نے گلی میں تیز تیز چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیا آپ اس عورت کو جانتے ہیں؟"

"سردی کا موسم ہے ملک صاحب! گرم پانی کے بجائے دودھ پینا زیادہ بہتر ہے۔ میں چائے کو گرم پانی کہتا ہوں۔ آپ نے کون سا روز روز آنا ہے۔" وہ اپنی کرسی پر آگے جھکا اور گھٹنوں پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے بولا "ملک صاحب! وہ بڑی فتنہ ہے۔ ہے تو عورت لیکن اگر وہ ابھی آپ کے سامنے آجائے تو آپ کہیں گے کہ یہ تو کوئی بیس اکیس سال کی کنواری لڑکی ہے۔ حالانکہ دو شادیاں کر چکی ہے۔ ایک لڑکا پہلے شوہر سے ہے۔ اس کی عمر اس وقت بارہ تیرہ سال ہوگی۔ دوسرے شوہر سے ایک لڑکی ہے۔ وہ بھی تین چار سال کی ہو چکی ہے۔ اب تیسرے شوہر کی تلاش میں ہے۔ تیس بتیس سال سے کم کی نہیں ہوگی لیکن اب بھی جب بن ٹھن کر باہر نکلتی ہے تو میرے جیسے بڈھے گرد بھی کبھی کبھی بانگیں دینا شروع کر دیتے ہیں۔"

وہ خاصا دل پھینک شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس کے پڑوس میں ماتم بپا تھا اور اسے عاشقانہ باتیں سوجھ رہی تھیں۔ میں نے اسے ٹٹولنے کے خیال سے کہا "شاہ جی! شرع میں کیا شرم، پیغام بھیج دیں۔"

وہ مزید کھلتے ہوئے بولا "ملک جی! ذرا ہولے... یاد شاؤ ذرا ہولی گل کرو، جے ووہٹی نوں پتا چل گیا تے بھانڈے کھڑکا دے گی۔"

اے ایس آئی نے طنزیہ لہجے میں کہا "تے فیر تسی بانگاں تے ای گزارا کرو۔"

میں اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا "شاہ جی! اس لڑکی

یا عورت کا قتل کے معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"تعلق تو ملک جی آپ کو تلاش کرنا ہے مگر معاملہ بڑا گہرا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ فاروق حسین اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر بات کسی وجہ سے بن نہ سکی۔"

"اس لڑکی کا نام کیا ہے اور رہتی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نام اس کا شاہدہ شکور ہے اور ساتھ والی گلی میں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی پتیسا اور دودھ کے دو گلاس لے آئی۔

"ملک جی! اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔" شاہ دین نے اپنی بیوی کے جانے کے بعد کہا "اور آپ ایسا کریں کہ شاہدہ شکور کے گھر جانے سے پہلے ماسی غفوراں سے بات کر لیں۔ وہ محلے کی ہر بات کی خبر رکھتی ہے۔ اصل کہانی آپ کو ماسی غفوراں سے معلوم ہوگی۔ اس کا ادھر سے تیسرا دروازہ ہے۔"

اس کی باتوں میں مجھے کوئی وزن معلوم نہ ہوا۔ ہم نے دودھ پیا اور شاہدہ شکور کے گھر کا راستہ پوچھ کر وہاں سے رخصت ہو گئے حویلی میں لوگوں کی آمد جاری تھی اور اندر سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے ماسی غفوراں کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا اور دوسری گلی میں شاہدہ شکور کے دروازے پر پہنچ گیا۔

دستک کے جواب میں ایک خوش شکل ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا۔ اس نے گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا کہ میں شاہدہ شکور سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

"وہ گھر میں نہیں ہے۔" عورت نے کہا "میں اس کی ماں ہوں۔ آپ کو جو کچھ پوچھنا ہو مجھ سے پوچھیں۔"

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ آپ کی بیٹی کہاں گئی ہوئی ہے؟"

عورت نے ناگواری سے کہا "آپ کو اس سے کیا مطلب۔ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ غیر مردوں کو اپنی بہو بیٹیوں کی باتیں بتانا پسند نہیں کرتے۔ میری بیٹی سے آپ کو کیا کام ہے؟"

"خالہ! ہم بے مقصد کسی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے ہیں۔ آپ کے محلے میں فاروق حسین نامی ایک شخص قتل ہو گیا ہے۔ کسی نے ہمیں بتایا ہے کہ واردات کے وقت اس نے آپ کی بیٹی کو گلی سے گزرتے دیکھا تھا۔"

عورت بھڑک اٹھی بولی "کیا نام ہے اس کمینے کا؟ آپ کی بہن کے بارے میں وہ یہ بات کہتا تو میں دیکھتی کہ آپ کس طرح اس بات کو برداشت کرتے۔ آپ ذرا اس کو میرے سامنے تو لائیں۔ میں نے اس کا منہ نہ توڑ دیا تو میرا نام بدل دینا۔ ان لوگوں کو شرم نہیں آتی دوسروں کی بہو بیٹیوں کو [illegible]۔ ذلیل کہیں کے۔ اب گلیوں میں چلنا بھی گناہ ہو گیا۔"

وہ خاصی منہ پھٹ عورت تھی۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا "بی بی! زیادہ شور نہ مچاؤ۔ انسان کی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ہم تمہاری بیٹی سے صرف یہ پوچھنا چاہتے کہ اس نے کسی مشکوک آدمی کو گلی میں سے گزرتے ہوئے تو نہیں دیکھا۔ وہ اس وقت ہے کہاں؟"

"کسی ذلیل نے بکواس کی ہے۔ میری بیٹی تو شام سے اپنے ماموں کے گھر گئی ہوئی ہے اور ہم شریف لوگ ہیں۔ آپ دوبارہ ہمارے دروازے پر نہ آئیں۔ ہمارا مشکوک لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

وہ عورت بقول شخصے پروں پہ پانی نہیں پڑنے دیتی تھی۔ میں اس کے ساتھ سخت رویہ بھی اختیار کر سکتا تھا مگر اس کا کوئی جواز نہیں تھا وہ لڑکی کے ماموں یعنی اپنے بھائی کے گھر کا پتا بتانے پر بھی تیار نہیں تھی۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا کہ وہ چند دنوں سے شاہدہ شکور کے ماموں کا پتا معلوم کر کے وہاں جائے اور صرف یہ پوچھ کر واپس آجائے کہ لڑکی وہاں موجود ہے یا نہیں۔

اگلے روز میں مقتول کے کئی دوستوں اور رشتے داروں سے ملا اور مختلف زاویوں سے پوچھ گچھ کی۔ سب سے پہلے میں قتل کے محرک کا تعین کرنا چاہتا تھا۔ جہاں تک فاروق حسین کے کردار کا تعلق تھا اس کے بارے میں سب کی ایک رائے تھی۔ فاروق حسین نہایت نرم مزاج اور خوش اخلاق شخص تھا۔

جن لوگوں سے میں نے پوچھ گچھ کی ان میں فاروق کا ایک رازدار دوست بھی تھا۔ اس کا نام سلیمان شیخ تھا۔ وہ فاروق کا لنگوٹیا یار تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ گریجویشن کیا تھا اور کچھ عرصہ لاہور میں بھی اکٹھے رہے تھے۔ سلیمان شیخ بھی فاروق کی طرح ادبی ذوق کا مالک تھا اور مقامی ادبی انجمن کا عہدیدار بھی تھا۔ اس نے فاروق کے بارے میں جو تفصیل بتائی وہ میں اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اس تفصیل میں کچھ ایسی باتیں بھی شامل ہیں جو مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوئی تھیں۔

سلیمان شیخ نے مجھے بتایا کہ فاروق ایک نفیس قسم کا آدمی تھا نرم مزاج ہمدرد اور اپنے خیالوں میں گم رہنے والا۔ وہ اوسط درجے کے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی زمینوں سے معقول آمدن ہو جاتی تھی اور وہ ضرورت کی ہر چیز خریدنے کی استطاعت رکھتا تھا۔

گریجویشن کے بعد سلیمان شیخ نے فاروق سے کہا "فاروق! تمہارے تو عیش ہیں۔ اب تم باپ دادا کی زمینوں کی کمائی کھاؤ اور کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کر کے سکون کی زندگی گزارو۔ نہ نوکری کی ضرورت اور نہ فکرِ معاش۔ رات دن فرصت ہی فرصت۔ خواہ ادب کی خدمت کرو اور خواہ اپنی۔"

فاروق نے پُرتاسف انداز میں سر ہلایا اور بولا "شیخ! تم بڑے غلط زاویے سے زندگی کو دیکھتے ہو۔ تم ان لوگوں میں سے ہو جو یہ سمجھتے

ہیں کہ انسان کے پاس بہت ساری فرصت اور بہت ساری دولت ہو تو وہ عیش کی زندگی گزار سکتا ہے۔ مجھے اس قسم کے بورژوائی نظریات سے سخت نفرت ہے۔ ایک بات تو بتاؤ! میں اپنے باپ دادا کی زمینوں کی کمائی کیوں کھاؤں؟ میرا اُس کمائی پر کیا حق ہے؟"

"حق! بھئی وہ تمہاری موروثی جائداد ہے۔ تمہارا اُس پر حق نہیں ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟"

فاروق حسین عام زندگی میں بہت خاموش طبیعت آدمی تھا لیکن اگر ذکر اُس کے پسندیدہ موضوع کا ہوتا تو وہ گھنٹوں بولتا چلا جاتا۔ اُس کی زبان رُکنے کا نام ہی نہ لیتی۔

"شیخ! ایک بات یاد رکھو تم اچھے ادیب کبھی نہیں بن سکتے۔ تمہارا مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ تم باہر کی آواز سُننے کے بجائے اندر کی آواز سُنتے ہو۔ میں نے زمین کی نہیں زمین کی کمائی کی بات کی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں نہ ذہنی طور پر زمیندار ہوں اور نہ عملی طور پر۔ یعنی زمینوں کے معاملے میں میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ نہ ہل چلا سکتا ہوں اور نہ نگرانی کر سکتا ہوں۔ ایسی صورت میں مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں زمین کی کمائی کھاؤں؟"

"پیارے یہ سب کھاتے ہیں۔ جاگیردار شہروں میں عیش کرتے ہیں۔ کاشتکاری کسان کرتا ہے عیش جاگیردار کرتا ہے۔ ایک آدمی سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"بات فرق کی نہیں اصول کی ہے۔ میں خود کام کروں گا۔ ملازمت کروں گا اور اپنی محنت کی کمائی کھاؤں گا۔"

"فاروق! تمھارے اندر اچھے ادیب کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ تم ملازمت کرنے کے بجائے اچھے ادب سے معاشرے کی خدمت کرو۔ اس شاندار کام کے عوض اپنی زمین کی کمائی کھانا کوئی بُری بات نہیں ہے۔"

"یہ خود کو دھوکا دینے والی بات ہے جو شخص اپنی خدمت نہیں کر سکتا وہ معاشرے کی خدمت بھی نہیں کر سکتا۔"

سلیمان شیخ نے مجھے بتایا کہ اُسی زمانے میں ایک لڑکی نے اُن کی ادبی محفل میں آنا جانا شروع کیا۔ وہ درمیانے قد کی نہایت حسین لڑکی تھی۔ بے باک اور ذہین بھی تھی۔ غالباً فرسٹ یا سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ کبھی کبھار افسانہ یا مضمون بھی لکھ کر لاتی تھی اور دوسروں کے افسانوں پر تنقید بڑی عمدہ کرتی تھی۔

فاروق کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ کوئی لڑکی اُسے متاثر نہیں کر سکتی لیکن اس ادبی ذوق رکھنے والی لڑکی نے چند دنوں کے اندر فاروق کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔

ادبی محفل مختلف جگہوں پر ہوتی تھی۔ کبھی ایک ممبر کے گھر میں اور کبھی دوسرے ممبر کے گھر میں۔ ایک شام محفل فاروق کے گھر میں تھی۔ فاروق نے سلیمان شیخ سے کہا کہ وہ رات کا کھانا اُس کے ساتھ کھائے اور کسی

طرح شاہدہ کو بھی کھانے پر آمادہ کرے۔ جی ہاں وہ لڑکی شاہدہ شکور ہی تھی۔ انجمن کے ممبران میں شاہدہ کے علاوہ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ اُس شام ایک لڑکی نہیں آئی تھی۔

جب سلیمان نے شاہدہ کو فاروق کی طرف سے کھانے کی دعوت دی تو اُس نے پہلے انکار کیا پھر کہا کہ وہ کھانے کے لیے رُک جائے گی بشرطیکہ دوسری لڑکی کو بھی کھانے کی دعوت دی جائے۔ لہٰذا دوسری لڑکی کو بھی کھانے کی دعوت دی گئی اور اُس نے دعوت قبول بھی کر لی تھی۔ لیکن کھانے کے دوران اُس کا بھائی اُسے بلانے آگیا اور وہ کھانا ادھورا چھوڑ کر اُٹھ گئی۔ یوں فاروق کی شاہدہ سے علیحدگی میں بات کرنے کی خواہش پوری ہو گئی۔

کھانے کے بعد سلیمان بھی اِدھر اُدھر ہو گیا۔ یا تو شاہدہ کو اس بات کا احساس نہ ہوا اور یا وہ دانستہ انجان بن گئی۔ فاروق اُس کے ساتھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ شاہدہ نے بہترین سامعہ ہونے کا ثبوت دیا اور بڑی دلچسپی کے ساتھ فاروق کی باتیں سنتی رہی۔ اس اثنا میں شاہدہ کی ماں اُس کے گھر پہنچ گئی۔ وہ شاہدہ کی تاخیر کے باعث فکر مند ہو گئی تھی۔

فاروق نے اُس کا اپنے گھر والوں سے تعارف کرایا۔ اُس کی خاطر مدارات کی اور اپنی خوش اخلاقی سے اُسے خوب متاثر کیا۔ اس کے بعد شاہدہ نے وقتاً فوقتاً اُس کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔

ایک روز فاروق نے سلیمان سے کہا "شیخ! میرا خیال تھا کہ میں زندگی بھر شادی نہیں کر سکوں گا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں شادی سے متنفر تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ میرے مزاج کو سمجھنے والی کوئی لڑکی نہیں مل سکے گی لیکن اب میں یہ بات نہیں کہہ سکتا۔"

سلیمان شیخ نے اُسے شوخ نظروں سے گھورا۔ بولا "معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی زلفوں نے تمھیں اسیر کر لیا ہے۔ کیا میں اُس خوش نصیب کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"مذاق مت کرو۔" فاروق نے کہا "تم اُسے اچھی طرح جانتے ہو۔ میں شاہدہ شکور کی بات کر رہا ہوں۔"

سلیمان شیخ نے مجھے بتایا کہ اُسے یہ بات سُن کر تھوڑا سا تعجب ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ شاہدہ شکور ذہین بھی تھی اور حسین بھی لیکن اُس کے بارے میں بعض ایسی باتیں سُننے میں آئی تھیں جو اچھی نہیں تھیں۔ وہ خاصی آزاد خیال تھی اور کئی اور لوگوں سے بھی اُس کے مراسم تھے۔

سلیمان شیخ نے کہا کہ وہ فاروق کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا اُس نے محتاط لفظوں میں کہا "فاروق! شاہدہ لڑکی تو بہت اچھی ہے لیکن پھر بھی دیکھ لو... یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ وہ صرف تمھاری بیوی ہی نہیں ہوگی تمھارے بچوں کی ماں بھی ہوگی۔ اس لیے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح چھان بین کر لو۔"

فاروق نے ہنس کر کہا "شیخ! میں تمھارا مطلب اچھی طرح سمجھتا

ہوں۔ تم یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ شاہدہ اور لوگوں سے بھی ملتی جلتی ہے؟ تم از کم میرے لیے ایسی بات سوچنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ فی الوقت شاہدہ اپنے معاملات میں آزاد ہے۔ جس طرح وہ دوسروں سے ملتی ہے اُسی طرح مجھ سے بھی ملتی ہے۔ اگر اُس کا دوسروں سے ملنا بُرا ہے تو مجھ سے ملنا بھی بُرا ہے۔ یعنی میں بھی اُتنا ہی بُرا ہوں۔"

"یہ تصویر کا ایک رُخ ہے فاروق!"

"بات یہ ہے کہ کوئی بندہ پرفیکٹ نہیں ہوتا جب ہم کسی انسان کو پسند کرتے ہیں تو ہمیں اُس کی چند خامیاں بھی قبول کرنا پڑتی ہیں۔ دیکھنے والی بات یہ ہوتی ہے کہ اُس کی اچھائیاں زیادہ ہیں یا برائیاں۔"

"خیر تم اپنے معاملات کو زیادہ بہتر سمجھتے ہو۔ یہ رضامندی یک طرفہ ہے یا دو طرفہ؟"

"ہے تو دو طرفہ ہی۔" فاروق نے کہا "لیکن ابھی تک اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہمت نہیں پڑتی۔"

"اس موضوع پر خود بات کرنا مناسب نہ ہوگا۔" سلیمان شیخ نے کہا "اپنی ماں کو اُس کے گھر بھیج دو۔"

"شاید یہی کرنا پڑے گا۔ میں چاہتا تھا کہ پہلے شاہدہ سے اُس کی مرضی معلوم کر لوں۔"

"ویسے تو تم دانشور بنتے ہو لیکن ابھی تک یہ اندازہ نہیں کر سکے کہ شاہدہ کی تمھارے بارے میں رائے کیا ہے۔"

سلیمان شیخ نے بتایا کہ اس کے چند روز بعد فاروق کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور ٹانگ میں فریکچر ہو گیا۔ وہ دو ڈھائی مہینے اسپتال میں پڑا رہا۔ شاہدہ دو تین مرتبہ اُس کی بیمار پرسی کرنے اسپتال گئی اور پھل وغیرہ بھی لے گئی۔ اس بات سے فاروق کے اس یقین کو اور تقویت حاصل ہوئی کہ شاہدہ اُسے پسند کرتی ہے۔

فاروق کا فریکچر تو ٹھیک ہو گیا لیکن بائیں ٹانگ میں تھوڑا سا لنگ پیدا ہو گیا۔ جب وہ چلتا تھا تو دیکھنے والے کو اُس کے لنگ کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

اسپتال سے گھر آنے کے چند ہفتے بعد فاروق نے اپنی ماں کو شاہدہ کے گھر بھیج دیا۔ شاہدہ کی ماں سردار بیگم نے کہا کہ وہ سوچ کر جواب دے گی۔ ایک مہینے کے بعد فاروق نے پھر اپنی ماں کو بھیجا۔ اس دفعہ بھی گول مول جواب ملا۔

اس کے چند روز بعد شاہدہ نے فاروق سے کہا "فاروق! آپ اپنی امی کو بار بار زحمت دیتے ہیں؟"

فاروق اپنے ذاتی معاملات میں کم گو اور شرمیلا تھا بولا "میرا خیال ہے کہ میری ماں میری پسند کو سمجھ گئی ہیں مگر تمھاری ماں کو تمھاری پسند کا اندازہ نہیں ہوا۔"

"کیا اپنی پسند کی چیز کو باندھ کر رکھنا ضروری ہے؟"

"باندھنا بہت غیر ادبی لفظ ہے۔" فاروق نے کہا "اپنی پسند کی چیز کو دوسروں کی دسترس سے بچانے کے لیے ایک مضبوط تعلق بہت ضروری ہے اور زندگی کے تقاضے پورے کرنے بھی ضروری ہیں۔"

"فاروق! میں نے آپ کو ہمیشہ ایک محترم دوست کی نظر سے دیکھا ہے۔ میں کہیں بھی رہوں میرا دل آپ کے ساتھ رہے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ہمارا احترام کا تعلق ہمیشہ قائم رہے گا لیکن جو چیز آپ چاہتے ہیں وہ نہیں ہو سکے گی۔ آپ اس خیال کو دل سے نکال دیں۔"

فاروق کو اس جواب سے سخت دھچکا پہنچا۔ اُسے اپنے خوابوں کا محل چکنا چور ہوتا محسوس ہوا۔

"شاہدہ! تم سے ملنے سے پہلے میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" اُس نے ہولے سے کہا "کیونکہ میرا خیال تھا کہ مجھے اپنے مزاج کی لڑکی کبھی نہیں مل سکے گی لیکن جب تم سے ملاقات ہوئی تو میں نے تمھیں عطیۂ الٰہی سمجھا لیکن... بہرحال محبت کو پابند نہیں کیا جا سکتا۔ میں شادی کا خیال تو دل سے نکال سکتا ہوں مگر تمھارا خیال دل سے نہیں نکال سکتا۔"

شاہدہ کی بعض قریبی سہیلیوں نے بتایا کہ شاہدہ شروع میں فاروق سے شادی کے بارے میں سنجیدہ تھی۔ اُس نے اشارتاً فاروق کو مشورہ دیا کہ چونکہ وہ زمینداری کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا لہٰذا اپنا حصہ الگ کر لے۔ اس پر فاروق نے کہا کہ وہ ماں اور بہنوں کی موجودگی میں جائداد کا حصہ مانگنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اُس نے اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اپنی زندگی خود بنانا چاہتا ہے۔

شاہدہ کی ایک سہیلی نے جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا بتایا کہ شاہدہ کو فاروق کے ان نظریات سے بڑی مایوسی ہوئی اور اُس نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا۔

شاہدہ نے کسی کے سامنے یہ بھی کہا کہ وہ ایک تہی دست اور لنگڑے فلسفی کے ساتھ شادی کر کے اپنی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتی۔ یہ بات ادبی حلقے میں خاصی مشہور ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ شاہدہ نے بعد میں اس بات کی تردید کی اور کہا کہ اُس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔

سلیمان شیخ نے مجھے بتایا کہ جب فاروق نے یہ بات کی تو وہ چُپ سا ہو گیا۔ اُس کا چہرہ بتاتا تھا کہ اُسے اس بات سے سخت صدمہ پہنچا تھا لیکن اُس نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ شاہدہ ان باتوں کے باوجود اُس سے ملتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ فاروق سے باتیں کرنے سے بڑا سکون ملتا ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ شاہدہ چناب سے لاہور چلی گئی اور تقریباً تین سال تک وہاں رہی۔ اس دوران میں فاروق بھی لاہور چلا گیا اور وہاں ملازمت کر لی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اُسے شاہدہ کی کشش وہاں لے گئی تھی۔ سلیمان شیخ نے بتایا کہ چھٹی کے بعد فاروق لاہور کی سڑکوں اور بازاروں میں بے مقصد گھومتا پھرتا تھا۔ کبھی کبھی اُسے کسی ساتھ لے جاتا تھا۔ اُس نے کبھی شاہدہ

کا نام تو نہیں لیا تھا لیکن سلیمان بخوبی دیکھ سکتا تھا کہ اس کی ویران آنکھیں کسی کی تلاش میں تھیں۔ اگر شاہدہ سے ملتی جلتی شکل کی کوئی لڑکی اُسے نظر آجاتی تو فوراً اُس کی طرف متوجہ ہو جاتا۔

وہ تقریباً پانچ سال لاہور رہا۔ جب واپس آیا تو اُسے پتا چلا کہ شاہدہ دو سال پہلے واپس آگئی تھی۔

لاہور سے واپسی پر شاہدہ ایک دو سالہ بچہ بھی ساتھ لائی تھی۔ بچے کے بارے میں اُس نے یہ کہا تھا کہ وہ اُس کے ایک کزن کا تھا جس کی بیوی بچے کی ولادت کے دوران انتقال کر گئی تھی لیکن عام افواہ یہ تھی کہ وہ شاہدہ کا اپنا بچہ تھا۔ کچھ کا کہنا تھا کہ وہ اُس کا ناجائز بچہ تھا اور کچھ یہ کہتے تھے کہ اُس نے کسی دولت مند اور شادی شدہ شخص سے خفیہ شادی کر لی تھی جس نے کچھ عرصے کے بعد اُسے طلاق دے دی تھی۔

شاہدہ کو جب فاروق کی آمد کا پتا چلا تو وہ فوراً اُس سے ملنے پہنچ گئی۔ بچے کو بھی ساتھ لے گئی۔ دونوں دو بچھڑے ہوئے دوستوں کی طرح ملے۔

فاروق نے کہا: "شاہدہ! میں نے کچھ افواہیں سُنی ہیں۔"

"لوگ بکتے ہیں۔" شاہدہ اُس کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔ "یہ بچہ میرے چچا زاد بھائی کا ہے۔ اُس کی بیوی ڈیلیوری کے دوران فوت ہو گئی تھی۔ لوگوں کو دوسروں کی عزت اُچھالنے میں مزہ آتا ہے۔"

دونوں خوب باتیں کرتے رہے۔ پھر فاروق نے پوچھا: "شاہدہ! تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

شاہدہ نے ٹالنے والے انداز میں کہا: "کیا شادی کرنا ضروری ہے؟"

"ضروری تو ہے۔" فاروق نے کہا۔ "شادی کے بغیر انسان کی تکمیل نہیں ہوتی۔"

شاہدہ نے شوخی سے کہا: "پھر تو آپ کو فوراً شادی کر لینا چاہیے۔"

فاروق نے سنجیدگی سے پوچھا: "کیا میں اسے مذاق سمجھوں یا اپنی امی کو تمھارے گھر بھیج دوں؟"

شاہدہ دو سالہ بچے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی: "اب میں اس اسٹیج سے گزر چکی ہوں اور خود ہی فیصلہ کر سکتی ہوں۔"

اُس نے جس انداز سے بچے کی طرف دیکھا تھا اور جس انداز میں بات کی تھی اُس نے فاروق کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ شاید وہ تمام افواہیں سچی تھیں جو بستی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ شاہدہ کا اپنا بچہ تھا۔ فاروق نے غور سے بچے کی طرف دیکھا تو اُسے کئی مشابہتیں نظر آئیں۔ لیکن وہ عجیب آدمی تھا یا اُس کی اپنی کوئی مصلحت تھی کہ اس نے اتنا کچھ جان لینے کے باوجود شاہدہ کو شادی کا پیغام دیا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ شاہدہ کو خوشی خوشی وہ پیغام قبول کر لینا چاہیے تھا۔ معاشرے میں اُس کی جو بدنامی ہو رہی تھی، اُس پر پردہ پڑ جاتا لیکن اُس نے اس دفعہ بھی انکار کر دیا۔ حالانکہ کہنا اُس کا یہ تھا کہ اُسے فاروق کے پاس بہت سکون ملتا ہے۔

ایک شخص نے کہا کہ جہاں سے پیسہ ملتا ہے وہیں سے سکون بھی ملتا ہے لیکن سوال یہ تھا کہ اگر شاہدہ فاروق سے مالی فائدہ اُٹھا رہی تھی تو اُس نے اس سے شادی کیوں نہ کر لی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شاہدہ کو اپنے حسن کا خوب اندازہ تھا اور وہ کسی دولت مند سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ فاروق کے نظریات یا اس کی ذہانت سے خائف تھی۔

سلیمان شیخ نے مجھے بتایا کہ اب شاہدہ کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہو گیا تھا۔ اُس کے ملنے والوں میں زیادہ تر بڑی عمر کے صاحبِ حیثیت لوگ تھے۔ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اُس کی خوبصورتی اور کشش میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ جس بچے کو وہ اپنے کزن کا بچہ کہتی تھی اُس کا نام جمیل تھا اور وہ شاہدہ کو امی کہتا تھا۔ شاہدہ اکثر فاروق سے کہتی رہتی تھی کہ اب وہ شادی نہیں کرے گی اور جمیل کو بڑا آدمی بنائے گی۔

لیکن ایک روز فاروق نے حیرت سے یہ خبر سُنی کہ شاہدہ نے عنایت حسین نامی ایک دولت مند شخص سے شادی کر لی ہے۔ عنایت حسین ایک چالیس سالہ کاروباری شخص تھا۔ اُس کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی اور بچہ کوئی نہیں تھا۔ وہ معمولی پڑھا لکھا ٹرانسپورٹر تھا اور پرانی وضع کا آدمی تھا۔ شاہدہ اور عنایت حسین کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں تھا۔ سلیمان شیخ نے کہا کہ دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر پہلوٹے حور میں لنگور کا تصور ذہن میں اُبھرتا تھا۔ عنایت حسین ایک قدامت پسند مذہبی آدمی تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ اُس نے شادی کے بعد شاہدہ کو گھر میں پابند کر دیا تھا لیکن عنایت حسین کے قریبی لوگوں سے پتا چلا کہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ عنایت حسین شاہدہ کو بہت چاہتا تھا اور اُس کی خواہشات کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اُس نے شاہدہ پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ شادی کے بعد شاہدہ نے خود ہی اپنی بیرونی سرگرمیاں محدود کر دی تھیں۔ خاص طور پر اُس نے فاروق سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا تھا۔

سلیمان شیخ نے مجھے بتایا کہ شاہدہ کی شادی کے چند ہفتے بعد فاروق اچانک لاہور چلا گیا۔ اُسے شاہدہ کی شادی کا یقیناً افسوس ہوا تھا لیکن اُس نے کسی کے سامنے اپنے دُکھ کا اظہار نہیں کیا تھا۔

سلیمان شیخ کا خیال تھا کہ شاید وہ اپنے غم کو بھلانے کے لیے لاہور چلا گیا تھا۔ بہ حال سات آٹھ ماہ لاہور میں رہنے کے بعد وہ واپس آگیا۔

پھر ایک حیرت انگیز بات ہوئی۔ واپس آنے کے بعد اُس نے عنایت حسین سے ملنا جلنا شروع کر دیا۔ وہ اُس کے دفتر میں اُس سے ملتا تھا — کئی مرتبہ عنایت حسین کو اُس کے گھر آتے جاتے دیکھا گیا تھا۔ وہ تنہا آتا تھا۔ اپنی بیوی شاہدہ کو کبھی ساتھ نہیں لاتا تھا اور غالباً شاہدہ کو ان ملاقاتوں کا علم بھی نہیں تھا۔

پھر ایک اور حیرت انگیز بات ہوئی۔ فاروق سے ملاقاتوں کے چند ہفتے بعد عنایت حسین نے شاہدہ کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ اُس وقت وہ ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی۔

سلیمان شیخ نے مجھے بتایا کہ عدت گزارنے کے بعد شاہدہ سب سے پہلے فاروق سے ملنے گئی۔ پھر از سرِ نو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک شخص نے بتایا کہ شاہدہ کی طلاق کے بعد اُس کے پرانے شناساؤں کے چہروں پر ایک بار پھر رونق آگئی۔ کچھ عرصے کے بعد عنایت حسین بھی شاہدہ کے گھر جاتا دیکھا گیا۔ بعض لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ عنایت حسین کو اپنے فیصلے پر افسوس ہوا تھا اور وہ شاہدہ کو دوبارہ اپنے گھر میں بسانا چاہتا تھا۔ ایک روز سلیمان شیخ نے فاروق سے پوچھا کہ اب شاہدہ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا وہ ایک لنگڑے فلاسفر کو اپنا شریکِ حیات بنانے پر تیار ہوئی ہے یا نہیں؟

"ہاں اُس کے خیالات میں خاصی تبدیلی آئی ہے۔" فاروق نے جواب دیا۔ "اب وہ میرے بارے میں سنجیدہ نظر آتی ہے لیکن ابھی کچھ اور وقت لگے گا۔"

"اگر وہ سنجیدہ نظر آتی ہے تو ایک بار پھر پیغام دے ڈالو —" سلیمان شیخ نے کہا: "دیر مت کرو۔"

فاروق کے ہونٹوں پر پُراسرار مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا: "نہیں! اب یہ پیغام اُس کی طرف سے آئے گا اور جانتے ہو کیا؟ میں فقط یہ ایک جملہ سننے کے لیے زندہ ہوں۔ اگر مجھے یہ جملہ سننے کی اُمید نہ ہوتی تو میں برسوں پہلے اس دُنیا سے رخصت ہو گیا ہوتا۔"

"یعنی تم یہ چاہتے ہو کہ شاہدہ تمھارے پاس آئے اور تمھارا ہاتھ تھام کر کہے۔ فاروق! میں تمھارے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میری غلطیاں بھول جاؤ اور مجھے سہاگن بنا دو۔"

وہ ہوئے ہوئے سر ہلانے لگا۔ بولا: "میرے کان برسوں سے یہ بات سُننے کے لیے بے چین ہیں۔"

"فاروق! میں نے اتنا ثابت قدم کسی کو نہیں دیکھا۔ میں تمھاری داستانِ محبت ضرور لکھوں گا۔"

"ابھی انتظار کرو۔" فاروق نے کہا: "اس محبت کا انجام تمھاری توقع کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔"

"فاروق! ایک بات تو بتاؤ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاہدہ کی طلاق تمھاری سازش کا نتیجہ ہے۔"

"تم نے وہ مقولہ نہیں سنا کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔"

"مجھے تمھارا مقولہ بھی یاد ہے۔ تم نے کہا تھا کہ محبت کو پابند نہیں کیا جا سکتا۔"

"پابند تو نہیں کیا جا سکتا مگر سیدھا راستہ تو دکھایا جا سکتا ہے۔ بھٹکی ہوئی محبت کو اُس کی منزل تو دکھائی جا سکتی ہے۔"

سلیمان شیخ نے کہا کہ آخری دنوں میں فاروق عجیب باتیں کرنے لگ گیا تھا۔ اس کی بیشتر باتیں سلیمان کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ لیکن یہ بات یقینی تھی کہ شاہدہ اب اُس کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ دو بچوں کی وجہ سے لوگ اس سے کترانے لگے تھے۔

یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد میں عنایت حسین سے ملا۔ وہ بھاری جسم کا ایک ٹھیٹ کاروباری شخص تھا۔ اُس نے بڑی بڑی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں اور پہلوانوں کی طرح چلتا تھا۔ اُس کا دفتر لاریوں کے اڈے کے پاس تھا۔ دفتر ایک کمرے پر مشتمل تھا جس میں ایک پرانی میز اور چند لکڑی کی کرسیوں کے علاوہ ایک چارپائی بھی موجود تھی۔ ایک کونے میں چند پرانے ٹائر اور بسوں کے ناکارہ پُرزے پڑے تھے۔

عنایت حسین نے اُٹھ کر میرا استقبال کیا اور اپنی کرسی میرے لیے خالی کر دی۔ "جی بسم اللہ، جی بسم اللہ۔" اُس نے کہا: "تشریف رکھو جناب! آج تو ہماری کوٹھری میں بھی رونق ہو گئی۔ اوکاکا!" اُس نے باہر کی طرف منہ کر کے آواز لگائی: "تھانیدار صاحب کے لیے دھیان سے چائے بنوا لا۔ دو چار پیڑے ڈلوا دینا اُس میں اور گرما گرم جلیبیاں بھی لیتے آنا۔"

میں نے کہا: "عنایت حسین! تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں دو چار باتیں پوچھنے آیا ہوں۔ کھانے پینے کی کوئی حاجت نہیں ہے مجھے۔ میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔"

"او مولوی جی! آپ کا نام کون نہیں جانتا۔ جناب! لسی پیتے پیتے باتیں بھی ہو جائیں گی۔"

میں اُس کی کرسی پر جا بیٹھا۔ وہاں وہی ایک کام کی کرسی تھی۔ بازو اُس کا بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ کمرے میں ڈرائیور اور کنڈکٹر ٹائپ کے دو تین آدمی بیٹھے تھے جو ایک ایک کر کے باہر چلے گئے۔

میں نے عنایت حسین کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "عنایت حسین! میں فاروق کے قتل کے سلسلے میں تمھارے پاس آیا ہوں۔ میں نے سُنا ہے کہ تمھارا اُس سے کوئی تنازع چل رہا تھا۔"

اُس کے چہرے پر سنجیدگی نمودار ہو گئی۔ بلکہ وہ قدرے فکرمند بھی نظر آنے لگا۔

"نہیں جناب ملک صاحب! کسی نے آپ کو غلط انفارمیشن دی ہے۔ میرا فاروق سے کوئی تنازع نہیں تھا۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ تم نے اُس کی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

وہ تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر بولا: "ملک صاحب! آپ میرے ملنے جلنے والوں سے پوچھ لیں۔ میں کھرا آدمی ہوں اور کھری بات کرتا ہوں۔ میں نے اپنی بیوی کو جو طلاق دی ہے اُس کی

وجہ کچھ اور تھی۔"

"کیا وجہ تھی؟" میں نے پوچھا۔

وہ پھر چپ ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ ایک طویل توقف کے بعد اُس نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ آپ یہ بات پوچھے بغیر میری جان نہیں چھوڑیں گے۔ اس لیے آئیں میرے ساتھ۔ اس بات کا جواب میں آپ کو گھر چل کر دوں گا۔" اُس نے میز کی دراز سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر ایک چمڑے کے بیگ میں ڈال لیں۔ میں اُس کے ساتھ دفتر سے باہر آگیا۔ برآمدے میں چارپائی پر دو ہی ڈرائیور اور کنڈیکٹر بیٹھے تھے جو میرے آنے سے پہلے اندر بیٹھے تھے۔ عنایت حسین نے ایک شخص کو آواز دے کر کہا "او بے تدیرے! میں تھوڑی دیر کے لیے گھر جا رہا ہوں۔ سرگودھے سے بتی چونتی آنے والی ہو گی۔ اُس کے کنڈیکٹر سے پیسے لے کر رکھ لینا اور ہاں، وہ کاکا لسی اور جلیبیاں لینے گیا ہوا ہے۔ وہ تم لوگ کھا پی لینا۔"

اُس کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم تانگے پر بیٹھ کر وہاں پہنچ گئے۔ ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر فکرمندی سے بولی "پتر جیتے، خیر تو ہے؟"

"خیر ہے ماں، خیر ہے۔" عنایت حسین نے کہا "ملک صاحب ملنے آئے ہیں۔ جیراں کے ہاتھ کوئی مٹھائی اندر بھیج دینا۔ آؤ جی ملک صاحب! آؤ جناب، یہ آپ کا اپنا گھر ہے جناب! یہ میری ماں ہے۔"

میں نے بوڑھی عورت کو سلام کیا اور آراستہ بیٹھک میں جا بیٹھا۔ عنایت حسین نے ایک مقفل الماری کھولی اور اندر سے ایک کاغذ نکال کر مجھے تھما دیا "یہ ہے جناب، طلاق کی وجہ۔" اُس نے کہا "میں نے یہ سرٹیفکیٹ اس سے پہلے کسی کو نہیں دکھایا۔"

وہ برتھ سرٹیفکیٹ تھا اور لاہور کے ایک اسپتال سے جاری کیا گیا تھا۔ اس سرٹیفکیٹ کے مطابق جمیل شاہدہ کا بیٹا تھا جو فلاں فلاں تاریخ کو مذکورہ اسپتال میں تولد ہوا تھا۔ ولدیت کے خانے میں نجم الدین نیمی کا نام درج تھا۔

میں ساری بات سمجھ تو گیا لیکن میں نے پوچھا "اس سرٹیفکیٹ کا کیا مطلب ہے؟"

"جناب بات یہ ہے کہ پانچ سوا پانچ سال پہلے جب میں نے شاہدہ کے ساتھ شادی کی تو اس کے ساتھ یہ بچہ جمیل بھی تھا۔ اس وقت اس کی عمر سات آٹھ سال کے قریب ہو گی۔ شاہدہ نے مجھے بتایا کہ وہ اُس کے کسی چچا زاد بھائی کا بیٹا ہے جسے اس نے ماں بن کر پالا ہے۔ جمیل کی ماں کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ زچگی کے دوران مر گئی تھی۔ میں نے کہا، کوئی بات نہیں، بچوں سے گھر میں رونق ہوتی ہے۔ جمیل کے بارے میں میں نے بعض افواہیں سنیں لیکن شاہدہ نے حلفاً کہا کہ جمیل اُس کا بیٹا نہیں ہے ملک صاحب! اگر وہ سچ بول دیتی تو مجھے اس پر کوئی شک نہ ہوتا۔ میں بوڑھا آدمی ہوں، اُس کے بیٹے کو بھی قبول کر لیتا لیکن اس نے جھوٹ بول کر خود ہی اپنی پوزیشن خراب کر لی۔"

"یہ سرٹیفکیٹ آپ کو کس نے دیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

میری توقع کے مطابق اس نے جواب دیا "یہ سرٹیفکیٹ مجھے فاروق نے لا کر دیا تھا۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ اس سرٹیفکیٹ میں جو کچھ لکھا ہے، ٹھیک ہے؟"

"ملک صاحب! میں زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں لیکن اللہ نے مجھے عقل ضرور دی ہے۔ میں اتنی بڑی بات بغیر ثبوت کے نہیں مان سکتا تھا۔ میں یہ سرٹیفکیٹ اور شاہدہ کی تصویر لے کر لاہور گیا اور وہاں اسپتال کے عملے سے اس کیس کے بارے میں دریافت کیا۔ جس نرس اور ڈاکٹر نے کیس کیا تھا، انھوں نے شاہدہ کی تصویر دیکھ کر سرٹیفکیٹ کی تصدیق کی۔ واپس آ کر میں نے شاہدہ سے جواب طلبی کی۔ جب اسے پتا چلا کہ میں لاہور گیا تھا اور اسپتال سے اُس کے کیس کے بارے میں پوچھا تھا تو اُس کا پارہ چڑھ گیا اور اس نے سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیا۔ میں نے اُس کی ماں کو بلایا اور ساری بات اُس کے سامنے رکھی۔ وہ بیٹی سے بھی دو ہاتھ آگے نکلی۔ وہ اصل حقیقت پہلے ہی جانتی تھی۔ دونوں نے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے گھر میں طوفان کھڑا کر دیا۔ جناب! میں کاروباری آدمی ہوں۔ عورتوں کے مکر و فریب میرے بس کا کھیل نہیں۔ میں نے حق مہر اور طلاق نامہ شاہدہ کے ہاتھ پر رکھا اور اُسے رخصت کر دیا۔ انسان شادی اپنے آرام کے لیے کرتا ہے، مصیبت میں پڑنے کے لیے نہیں کرتا۔"

"عنایت حسین! کیا آپ نے شاہدہ کو یہ بات بتائی تھی کہ برتھ سرٹیفکیٹ آپ کو فاروق نے لا کر دیا تھا؟"

"میں فتنہ پرور آدمی نہیں ہوں۔ فاروق نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں شاہدہ کے سامنے اُس کا ذکر نہیں کروں گا۔ میں نے اپنا وعدہ پوری طرح نبھایا اور فاروق کا شاہدہ کے سامنے ذکر نہیں کیا۔"

"آپ کو یہ بات تو معلوم ہی ہو گی کہ شاہدہ شادی سے پہلے فاروق سے ملا کرتی تھی اور طلاق کے بعد بھی ملتی رہی تھی؟"

"مجھے شادی سے پہلے کے حالات کا کچھ علم نہیں۔" اُس نے جواب دیا "البتہ طلاق کے بعد مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ فاروق سے ملتی رہتی تھی۔"

"آپ کو اس بات پر غصہ تو ضرور آیا ہو گا اور آپ کو یہ بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ فاروق نے آپ کو کیوں اپنی بیوی سے بدظن کیا تھا؟"

"ملک صاحب! اُس نے جو کچھ مجھے بتایا، اُس میں کوئی غلطی نہیں تھی لہٰذا میں اُس پر بدظنی کا الزام نہیں لگاؤں گا۔ البتہ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ اُس کا کھیل کچھ اور تھا۔"

ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اور ایک ٹرے میز پر رکھ کر خاموشی سے واپس چلی گئی۔ ٹرے میں دو گلاس لسی کے اور کچھ گھر کی بنی ہوئی مٹھائی رکھی تھی۔

"عنایت حسین! میں نے سنا ہے کہ آپ کو اپنے فیصلے پر افسوس ہوا ہے اور آپ شاہدہ کو دوبارہ اپنے گھر میں آباد کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"نہیں جناب! میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔ پھر آپ جانتے ہی ہیں، طلاق کے بعد بیوی کو واپس لانے کا طریقہ کتنا مکروہ ہے۔"

"کیا آپ کا شاہدہ کے گھر آنا جانا ہے؟"

"ہاں کبھی کبھی اپنی بیٹی کو دیکھنے چلا جاتا ہوں۔"

"کیا آپ فاروق سے بھی ملتے جلتے تھے؟"

"فاروق میرے مزاج کا آدمی نہیں تھا۔ اُس نے اپنا کھیل دکھانے کے لیے مجھ سے میل جول بڑھایا تھا۔ اُس کے بعد نہ وہ مجھ سے ملنے آیا تھا اور نہ میں کبھی اُس سے ملنے گیا تھا۔"

قتل کی واردات فروری میں ہوئی تھی۔ غالباً فروری کے ابتدائی ایام تھے لیکن مجھے تاریخ یاد نہیں رہی۔ یہاں ہم اپنی سہولت کے لیے تین تاریخ فرض کر لیتے ہیں۔

میں نے عنایت حسین سے پوچھا "عنایت حسین! آپ تین فروری کی رات کے آٹھ اور نو بجے کے درمیان کہاں تھے؟"

اُس نے میرے سوال کا مقصد سمجھنے میں تھوڑا سا وقت لیا، پھر بولا "ملک صاحب! کیا آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں؟ آپ کا خیال ہے فاروق کو میں نے قتل کیا ہے؟"

"فی الحال تو میں تفتیش کر رہا ہوں۔ یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ فاروق کو کس نے قتل کیا ہے اور کیوں کیا ہے۔"

"دیکھیں جناب! آپ مجھ پر خواہ مخواہ ہی شک کر رہے ہیں۔" اُس نے کہا، پھر سوچتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے کہ تین تاریخ کو میں لاہور گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے اپنی ایک بس کا فیول انجکشن پمپ مرمت کے لیے دیا ہوا تھا، وہ لینے گیا تھا۔ میرے پاس مرمت کی رسید بھی ہو گی۔ میں نے وہاں سے کچھ سامان بھی خریدا تھا۔"

میں نے اُس سے رسید دکھانے کے لیے کہا۔ وہ اُٹھا اور الماری میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اُس نے کہا کہ وہ رسید دفتر میں ہو گی۔ میں نے اُسے ہدایت کی کہ وہ شام کو تھانے آ کر رسید دکھا جائے۔

وہ بار بار یہی کہتا رہا کہ میں اُس پر بلاوجہ شک کر رہا ہوں۔ اُس کا فاروق کے قتل میں کوئی ہاتھ نہیں ہے لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ الماری میں دیکھنے کے بعد وہ کچھ پریشان سا لگ رہا تھا۔

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ واردات والی رات میں شاہدہ شکور کے گھر گیا تھا اور اُس کی ماں نے جس کا نام سردار بیگم تھا، شور مچا کر ہمیں دروازے سے ہی رخصت کر دیا تھا۔ اگلی صبح اے ایس آئی نے رپورٹ دی کہ شاہدہ اپنے ماموں کے گھر پہنچی ضرور تھی لیکن اُس کے ماموں کے بیان کے مطابق وہ رات کے ساڑھے نو بجے وہاں پہنچی تھی۔ اگلی صبح جب ہم نے اُس سے ملنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ اپنے ماموں زاد بھائی کے ہمراہ کچھ روز کے لیے لاہور چلی گئی ہے۔ اُس کی اس حرکت سے میرے دل میں شک پیدا ہوا۔ اُس کا اچانک لاہور چلے جانا خالی از علت نہیں تھا۔ میں نے دو سادہ لباس آدمیوں کو اُس کے گھر کی نگرانی پر مامور کر دیا اور انھیں تاکید کر دی کہ گھر والوں یا پڑوسیوں کو اس نگرانی کا علم نہیں ہونا چاہیے۔

نو دس روز بعد نگرانی کرنے والوں نے مجھے اطلاع دی کہ شاہدہ لاہور سے واپس آ گئی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ اکیلی واپس آئی تھی اور بہت خاموشی سے گھر پہنچی تھی۔ یہ اطلاع مجھے شام کے وقت ملی۔ میں چار یا پانچ آدمیوں کو ساتھ لے کر اُس کے گھر پہنچ گیا۔ دو آدمیوں کو میں نے پچھلے دروازے پر اور دو کو مکان کے کونے پر کھڑا کر دیا۔ میری دستک کے جواب میں حسبِ سابق شاہدہ کی ماں سردار بیگم نے دروازہ کھولا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے سارے محلے میں ہمارا ہی گھر دیکھ لیا ہے۔" اُس نے تیوری چڑھائی "کیا حکم ہے؟"

"مجھے پتا چلا ہے کہ شاہدہ لاہور سے واپس آ گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اُس سے بات...."

"آ گئی ہے تو کیا ہوا؟ آپ اُس یتیم لڑکی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟ وہ ابھی نہیں مل سکتی، بہت تھکی ہوئی ہے۔"

وہ عورت میری قوتِ برداشت کو آزما رہی تھی۔ میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں، اگر وہ تھکی ہوئی ہے تو ہم کل صبح آ جائیں گے لیکن میرے چار آدمی ادھر گلی میں موجود رہیں گے۔"

شاہدہ اپنی ماں کے پیچھے ہی کھڑی تھی، وہ سامنے آ گئی۔ ماں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے بولی "آپ اندر آ جائیں۔"

بیٹھک میں قدم رکھنے کے بعد میں نے اُس کا جائزہ لیا۔ شاہ دین نے اُس کی عمر تیس بتیس سال بتائی تھی۔ اس کے علاوہ جو حالات میں سن چکا تھا، اُن کے مطابق بھی اُس کی عمر اتنی ہی ہونا چاہیے تھی لیکن میرے سامنے جو لڑکی کھڑی تھی، وہ چوبیس پچیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ وہ سُرخ و سفید رنگت والی انتہائی حسین لڑکی تھی۔ پھر اُس میں کشش اور رعبِ حسن بہت تھا۔ عام آدمی اُس سے نظریں ملا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔

"تشریف رکھیں ملک صاحب!" وہ میرا نام بھی جانتی تھی "امی! ملک صاحب کے لیے چائے بنا لائیں۔"

مجھے بٹھانے کے بعد اُس نے اپنی ماں سے کہا۔ لہجہ تحکمانہ تھا۔ "کچھ کھانے پینے کے لیے بھی لے آئیں۔"

سردار بیگم خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

شاہدہ نے نہایت دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا

اور باہر کے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ اس نے کس ڈھنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ تاہم رنگ شوخ تھا اور لباس خاصا چست تھا۔ اس پر ستم یہ کہ اس کا جسم انتہائی متناسب اور سڈول تھا۔ بیرونی دروازے کی کنڈی لگانے کے بعد اس نے کھڑکیوں کے پردے درست کیے اور اندر کی طرف کھلنے والا دروازہ بھی بند کر دیا۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میری نظریں اس کی حرکات و سکنات کی اسیر ہو گئی تھیں۔ وہ جس طرف جاتی تھی میری نظریں اسی طرف مڑ جاتی تھیں۔ اس کا چہرہ اور جسم ہی خوبصورت نہیں تھا بلکہ ہر جنبش کی اپنی ایک خوبصورتی تھی۔

وہ میری جوانی کا زمانہ تھا اور میرا خوبصورتی سے متاثر ہونا ایک طبعی امر تھا۔ تاہم اس لڑکی نے مجھے متاثر ہی نہیں سحر زدہ بھی کر دیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے میں یہ بھول گیا کہ میں تھانیدار تھا اور ایک قتل کی تفتیش کرنے وہاں آیا تھا۔ میں بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ فاروق نے کیوں زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"جی اب فرمائیے کیا حکم ہے؟" وہ سراپا ناز کسی فرماں بردار کنیز کی طرح میرے بالکل سامنے آن ٹھہری۔

"بیٹھو، میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا لیکن اندر سے کوئی جذبہ یہ کہہ رہا تھا۔ ملک صفدر حیات چھوڑو قتل کی باتیں، کچھ اور باتیں کرو۔ قتل و غارت گری کی باتیں تو تم روزانہ ہی کرتے ہو، آج دل کی باتیں کرو۔

وہ بڑی اپنائیت سے میرے قریب بیٹھ گئی، بولی "آپ وردی میں کتنے شاندار لگتے ہیں۔ بعض تھانیدار تو بہت بونگے لگتے ہیں۔ ان کی بڑھی ہوئی توندیں مجھے بہت بری لگتی ہیں لیکن آپ بہت اسمارٹ ہیں۔"

اپنی تعریف اور وہ بھی ایک حسینہ دلربا کی زبان سے، میں پھسلنا شروع ہو گیا۔ اچانک میری نظر اس کے داہنے ہاتھ پر پڑی۔ اس کی ہتھیلی پر انگوٹھے کے نیچے ایک تازہ زخم کا نشان تھا جو کھرنڈ میں تبدیل ہو رہا تھا۔

"تمہارے ہاتھ پر یہ زخم کیسا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آلو چھیلتے ہوئے چھری لگ گئی تھی۔" اس نے جواب دیا پھر ہاتھ نیچے کرتے ہوئے بولی "امی نے مجھے بتایا ہے کہ آپ پہلے بھی ہمارے گھر آئے تھے اور آپ کو دروازے سے واپس جانا پڑا۔ دراصل امی بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں۔ ذرا سی بات پہ گھبرا جاتی ہیں۔ وردی والوں سے تو انھیں خاص [illegible]"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کرتا مگر کوئی اندرونی جذبہ یہ رکاوٹ بن جاتا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی، چائے کی ٹرے میز پر رکھی اور واپس جانے لگی۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ اپنی بیٹی کی طرف سے نظر چرا رہی تھی۔ شاہدہ میرے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ اگرچہ میں نے یا اس نے ابھی اخلاقی حد کو پار نہیں کیا تھا لیکن دیکھنے والا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ ہم اخلاقی حد کے عین اوپر بیٹھے تھے۔ ذرا سی حرکت اس حد کو پامال کر سکتی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ سردار بیگم اس دن بڑی عزت اور غیرت کی باتیں کر رہی تھی۔ کیا آج اسے اپنی بیٹی کے خطرناک تیور نظر نہیں آتے تھے!

یا دونوں مل کر مجھے بے وقوف بنا رہی تھیں؟ شاید یہی بات تھی۔ میرے اندر چھپا ہوا تھانیدار اٹینشن ہو گیا۔

"سردار بیگم! تم بھی ادھر ہی بیٹھو۔" میں نے کہا "شاہدہ کا یہاں تنہا بیٹھنا ٹھیک نہیں۔"

"نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔" شاہدہ میرے گھٹنے کو چھوتے ہوئے بولی "آپ کوئی غیر تھوڑے ہی ہیں۔"

"ہاں ہاں کوئی بات نہیں۔" سردار بیگم نے کہا "آپ اطمینان سے بات کریں۔ مجھے ذرا باورچی خانے میں کام ہے۔"

یہ سن کر میں سمجھ گیا کہ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ دونوں ماں بیٹی مجھے واقعی بے وقوف بنانا چاہتی تھیں۔

"سردار بیگم! تم ادھر ہی رکو۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا "اور شاہدہ! تم وہاں جا کر بیٹھو۔"

سردار بیگم کی ایک دم تیوری چڑھ گئی، بولی "تم تھانیدار ہو گے اپنے گھر میں۔ یہاں حکم چلانے کی ضرورت...."

شاہدہ نے جلدی سے اس کی بات کاٹی "امی! آپ تو خواہ مخواہ غصے میں آ جاتی ہیں۔ ملک صاحب حکم تھوڑا ہی چلا رہے ہیں، یہ تو جلدی بات ختم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ دو چار منٹ کے لیے بیٹھ جائیں۔"

سردار بیگم نے ہونہہ... کرتے ہوئے سر جھٹکا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ خاصی تند مزاج عورت تھی۔ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتی تھی۔ شاہدہ ذرا سا پرے سرک گئی۔ تھوڑی دیر پہلے جو رومانی ماحول اس کمرے میں پیدا ہو گیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ میں نے دیکھا وہ پری چہرہ اپنی اس ناکامی پر ہونٹ کاٹ کر رہ گئی تھی۔

"شاہدہ! تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے نرم لہجے میں کہا "چند سوالات [illegible] چلا جاؤں گا۔ مجھے یہاں اس لیے بھی آنا پڑا ہے کہ میں نے تمہارے [illegible] فاروق کے مراسم کی بہت باتیں سنی ہیں۔"

"لوگوں کو تو بکواس کرنے کی عادت ہے۔" سردار بیگم نے کہا "[illegible] کی عزت اچھال کر خوش ہوتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے اس کے موڈ کو نارمل کرنے کے لیے کہا "لیکن وہ ایک مشکل کام معلوم ہوتا تھا۔ بعض لوگوں کو جلنے

کی بہت عادت ہوتی ہے۔ شاہدہ بی بی! میں نے سنا ہے کہ فاروق ادبی ذوق رکھنے والا آدمی تھا اور یہاں کی ادبی انجمن کا عہدیدار بھی تھا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بھی اس ادبی انجمن کی رکن تھیں۔"

"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا "لیکن یہ بہت پرانی بات ہو چکی ہے۔ اس زمانے میں مجھے افسانے وغیرہ لکھنے کا بہت شوق تھا اور میں انجمن کے اجلاس میں جایا کرتی تھی۔"

"ہاں عورتوں کے لیے اس قسم کی سرگرمیاں جاری رکھنا بہت مشکل ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ بھی تائیدی انداز میں بات کرے "شادی کے بعد وہ گھر گرہستی کے معاملات میں الجھ جاتی ہیں۔ فاروق اس انجمن کا عہدیدار تھا اور تم رکن تھیں۔ ایسی صورت میں باہمی مراسم ایک طبعی بات ہے۔ فاروق کیسا آدمی تھا؟"

"بحیثیت دوست وہ بہت اچھا انسان تھا لیکن اس کے نظریات عام لوگوں سے بہت مختلف تھے۔"

"ہاں ادیبوں میں یہی خامی ہوتی ہے۔" میں نے چالاکی سے کہا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ فاروق کی مخالفت میں بولتی ہے یا حمایت میں "عجیب عجیب نظریات تخلیق کرتے رہتے ہیں اور دوسروں پر بھی ان نظریات کو مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ فاروق اشتراکی نظریات کا قائل ہو گا۔ مزدوروں اور کسانوں کا حامی۔"

"آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔" اس نے کہا "فاروق ایسا ہی شخص تھا۔ وہ تو اپنے باپ کی جائداد میں سے حصہ لینا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ [illegible] تھا کہ وہ اپنی محنت سے اپنی دنیا تعمیر کرے گا۔"

"ہونہہ... محنت سے۔" سردار بیگم نے کہا "بالکل نکما آدمی تھا۔ [illegible] باتیں کرنا جانتا تھا۔ جس جائداد کو لینے سے انکار کرتا تھا اسی پہ [illegible] رہا تھا۔"

میں نے سردار بیگم کی تائید کرتے ہوئے کہا "میں نے بھی یہی [illegible] ہے۔ زمینوں کی ساری دیکھ بھال اس کا چھوٹا بھائی کرتا ہے۔ [illegible] کو سوائے افسانہ گوئی کے کچھ نہیں آتا تھا۔ میں نے سنا ہے اس کی [illegible] نے شاہدہ کا رشتہ مانگا تھا۔"

"ہاں دو تین دفعہ ہمارے گھر آئی تھی لیکن ہم نے انکار کر دیا تھا۔ [illegible] آمدنی تو ہوتی۔"

میں نے شاہدہ سے کہا "تم فاروق سے اکثر ملتی رہتی تھیں۔ کیا [illegible] نے کبھی براہ راست بھی تم سے شادی کی بات کی تھی؟"

اس سوال کے دو حصے تھے لیکن پہلا حصہ سوال میں شامل نہیں [illegible] اس سے یہ اقرار کروانا چاہتا تھا کہ وہ فاروق سے باقاعدہ ملتی رہتی [illegible] شادی کا سوال ضمنی تھا۔

"جی ہاں... اس نے کئی دفعہ اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔"

"ایک واقفِ حال نے مجھے بتایا ہے کہ فاروق نے صرف تمہاری وجہ سے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔"

"ایسے تو کئی ہوں گے۔" شاہدہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "میں کس کس کے آنسو پونچھتی۔"

بات ختم کرنے کے بعد اس کے چہرے پر خفیف سا احساسِ ندامت نظر آنے لگا۔

میں نے شوخ نظروں سے اسے گھورا پھر کہا "ہاں... کچھ ہستیاں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ انھیں ہر شخص اپنانے کی تمنا کرتا ہے۔ کسی کو اللہ دولتِ دنیا دیتا ہے اور کسی کو دولتِ حسن سے مالا مال کر دیتا ہے۔"

سردار بیگم نے سر جھٹکا اور اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ اس دفعہ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کیونکہ میں شاہدہ کے سحرِ حسن سے آزاد ہو چکا تھا لیکن وہ شوخ ابھی اپنا جادو جگانے پر تلی ہوئی تھی۔ ماں کے جاتے ہی میرے قریب کھسک آئی اور یوں جھک کر چائے بنانے لگی کہ اس کی زلفیں میرے کندھے کو چھونے لگیں۔ میرے اندر ایک بار پھر جذبات کی کشمکش شروع ہو گئی لیکن میں جذبات سے مغلوب نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لہٰذا بظاہر بے خیالی میں اٹھا اور دیوار پر آویزاں ایک تصویر کو دیکھنے لگا۔ مجھے معلوم نہیں کہ شاہدہ نے میرے اس عمل کو محسوس کیا تھا یا نہیں۔ تاہم وہ چپ رہی تھی۔ میں چند لمحے تصویر کے سامنے کھڑا رہا پھر سنگل صوفے پر جا بیٹھا۔

"شاہدہ! میں ذاتی سا سوال کرنا چاہتا ہوں۔ برا نہ منانا۔ تمہاری پہلی شادی کیوں ناکام ہو گئی تھی؟"

اس کا ہاتھ تھوڑا سا کپکپایا۔ اس کے علاوہ اس نے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ قدرے توقف کے بعد بولی "یہ بات آپ کو کس نے بتائی ہے کہ میری پہلی شادی... مم... میرا مطلب ہے کہ میں نے پہلے بھی شادی کی تھی؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ بات دو ہی آدمی جانتے ہیں... یا تمہیں کہنا چاہیے۔ کیونکہ دو میں سے ایک مر چکا ہے۔"

"پتا نہیں آپ کیا بات کر رہے ہیں؟"

"دوسرے آدمی کا نام عنایت حسین ہے۔ یہ بات اس نے مجھے بتائی ہے۔"

"وہ ذلیل آدمی مجھے بدنام کرنے پر تلا ہوا ہے۔" اس کے چہرے پر پہلی بار سختی نمودار ہوئی۔

"یہ تو ہوتا ہی ہے۔" میں نے کہا "طلاق کے بعد بہت کم مرد یا عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش نہیں کرتے۔"

اس نے چونک کر پوچھا "دوسرا آدمی کون تھا؟ کیا آپ کا اشارہ فاروق کی طرف تو نہیں؟"

"ہاں تم ٹھیک سمجھی ہو۔ فاروق بھی یہ بات جانتا تھا۔"

"یقیناً یہ بات اسے عنایت حسین نے بتائی ہوگی۔ جب ہی اس

نے شادی کی ہے۔۔۔"

اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ میں اس بات پر چونکا۔ کیا وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ فاروق نے شادی سے انکار کر دیا تھا؟ میں نے اس بات کو ذہن میں رکھ لیا مگر اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔

"شاہدہ! کیا تم تین فروری کو فاروق سے ملنے گئی تھیں؟"

"م... مجھے یاد نہیں۔" اُس نے چائے کا کپ میری طرف بڑھایا۔

میری نظر ایک بار پھر اُس کے ہاتھ کے کھرنڈ پر پڑی۔ وہ دو ڈھائی انچ لمبا کھرنڈ تھا۔ مجھے خیال آیا کہ چھری سے آلو چھیلتے ہوئے اتنا لمبا زخم نہیں آ سکتا تھا۔

"دیکھو شاہدہ بی بی! اگر تم کوئی بات چھپاؤ گی تو اپنے لیے مشکلات پیدا کر دو گی۔ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ تم تین تاریخ کو شام کے بعد فاروق سے ملنے گئی تھیں۔ تمھاری ماں کا کہنا ہے کہ تین تاریخ کو تم شام کے وقت گھر سے چلی گئی تھیں۔ تمھارے ماموں کا کہنا ہے کہ تم ساڑھے نو بجے ان کے گھر پہنچی تھیں۔ محلے کے تین معتبر آدمیوں نے گواہی دی ہے کہ انھوں نے آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب تمھیں فاروق کی حویلی کے پچھلے دروازے سے نکلتے دیکھا تھا۔" میں نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے تھوڑا سا جھوٹ ملایا۔ "لہٰذا اگر تم سچ نہیں بولو گی تو اپنے لیے پریشانی پیدا کرو گی اور یہ بھی یاد رکھو کہ فاروق کے گھر والوں کی گواہی بھی تمھارے خلاف جا سکتی ہے۔ کیا تم وقوعہ والے روز فاروق سے ملی تھیں؟"

میں نے پہلی بار اُس کے چہرے پر گھبراہٹ دیکھی۔ جب اُس نے بولنے کا ارادہ کیا تو اُس کے خوبصورت ہونٹ کپکپانے لگے: "میں اس معاملے سے دور رہنا چاہتی ہوں۔۔۔ آپ مجھے گواہ تو نہیں بنائیں گے نا؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ بہت کچھ جانتی تھی اور وقوعہ والے روز فاروق سے ملی تھی۔

"مجھ پر بھروسا رکھو۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "میں تمھیں اس معاملے سے دور رکھنے کی پوری کوشش کروں گا لیکن شرط یہ ہے کہ تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔"

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ہولے سے بولی: "فف... فاروق کو عنایت حسین نے قتل کیا ہے۔"

میں نے کسی تعجب کا اظہار کیے بغیر کہا: "میرا بھی یہی خیال تھا۔ تفصیل سے ساری بات بتاؤ۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے واقعات کی کڑیاں ملانے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر بولی: "اس شام فاروق نے کسی اہم کام کے سلسلے میں مجھے حویلی میں بلایا تھا۔ ہم صحن میں کھرلی کے اوپر بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ اچانک ایک شخص دیوار پھاند کر اندر داخل ہوا۔ اُس نے منہ پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا اور اُس کے ہاتھ میں گنڈاسا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اُس کے ڈیل ڈول اور لباس سے اُسے پہچان لیا۔ وہ عنایت تھا۔ میں اُسے دیکھتے ہی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ پیچھے جو کچھ ہوا اُس کا مجھے کچھ پتا نہیں۔"

اُس کے بیان میں کچھ جھول تھا اور چند باتیں وضاحت طلب تھیں۔ میں نے اُس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیا اور کھرنڈ کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا: "یہ زخم کیسے آیا تھا؟"

"م... میں... میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ سبزی کاٹتے ہوئے چھری لگ گئی تھی۔"

"میں وہ چھری دیکھنا چاہتا ہوں جس سے یہ زخم آیا ہے۔"

"کک... کیا آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟"

اسی لمحے سردار بی بی کمرے میں داخل ہوئی اور چیخ کر بولی: "ہائے میں مر گئی... میری بیٹی پر دست درازی کرتے ہوئے تمھیں شرم نہ آئی۔ سمجھ کیا رکھا ہے تم نے؟ میں تو چیخ چیخ کر سارا محلہ اکٹھا کر لوں گی۔ تمھاری وردی نہ اُتروا دی تو میرا نام بھی سردار بیگم نہیں۔ شاہدہ کی بچی! چیختی کیوں نہیں۔ زور زور سے شور مچا۔"

شاہدہ صورتِ حال کو زیادہ سمجھتی تھی: "امی! چپ ہو جائیں!" اُس نے سختی سے کہا۔ "ملک صاحب میرے زخم کا نشان دیکھ رہے ہیں۔ ٹھہریں میں چھری لاتی ہوں۔"

میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اندر گئی اور چار یا پانچ انچ لمبے پھل والی ایک چھری لا کر مجھے دکھائی۔ چھری پر دندانے پڑے ہوئے تھے اور وہ زیادہ تیز نہیں تھی۔

"تم نے اس زخم پر پٹی کس ڈاکٹر سے کروائی تھی؟"

اُس نے تھوڑے سے تامل کے بعد ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کا نام لیا۔ غالباً اُس کا نام ڈاکٹر اسلم تھا۔

میں نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا اور اُٹھتے ہوئے کہا: "تمھیں کل تھوڑی دیر کے لیے تھانے آنا پڑے گا۔"

"تھانے آنا پڑے گا!" اُس نے گھبرا کر کہا۔ "ابھی تو آپ نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ آپ مجھے اس معاملے سے دور رکھیں گے۔ آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے وہ یہیں پر پوچھ لیں نا۔ تھانے میں کیوں بلاتے ہیں؟"

"ملک صاحب! ہم عزت دار لوگ ہیں۔" سردار بیگم اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولی۔ "ہمیں تھانے بلا کر بے عزت نہ کریں۔ میں ذرا کھری عورت ہوں۔ اگر آپ ہمیں پریشان کر کے رشوت وصول کرنا چاہتے ہیں تو صاف بات کریں۔ بولیں! آپ کو کتنے پیسے چاہئیں۔ اس معصوم بچی

کو آپ تھانے میں بلا کر پوچھ گچھ کریں گے تو ہماری کیا عزت رہ جائے گی۔"

"امی! آپ دوسرے کمرے میں جائیں۔" شاہدہ نے کہا۔ "ملک صاحب میری بات سمجھ جائیں گے۔"

سردار بیگم دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی شاہدہ نے میرے سینے پر سر رکھ دیا اور سسکیاں لینے لگی۔ اُس کے آنسوؤں نے میرے ارادے کو ایک بار پھر کمزور کر دیا۔ مجھے اُس پر ترس آنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم تھانے نہ آنا۔ اگر ضرورت پڑی تو میں خود ہی آ جاؤں گا۔"

جب میں جانے لگا تو سردار بیگم نوٹوں کی ایک گڈی لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ "ملک صاحب! یہ رکھ لیں۔ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ ہمیں تھانے کچہری میں لے جا کر ذلیل نہ کریں۔"

"سردار بیگم! مجھے اس کام کی تنخواہ ملتی ہے۔ اسے اپنے پاس ہی رکھو۔"

باہر نکل کر میں نے اے ایس آئی سے کہا کہ جو دو سادہ لباس سپاہی سردار بیگم کے مکان کی نگرانی پر مامور تھے انھیں دوبارہ اسی ڈیوٹی پر لگا دے اور تاکید کر دے کہ وہ شاہدہ کو قصبے سے باہر نہ جانے دیں۔ دوسرا کام میں نے اُس کے سپرد یہ کیا کہ عنایت حسین کو پکڑ کر تھانے پہنچے اور میرے آنے تک اُسے وہاں بٹھائے رکھے۔

یہاں سے فارغ ہو کر میں فاروق حسین کی حویلی جا پہنچا۔ دستک کی آواز پر دروازہ منظور حسین نے کھولا اور مجھے اندر بیٹھک میں لے گیا۔

رسمی کلمات کے بعد میں نے منظور حسین سے کہا: "منظور حسین! معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں اپنے بھائی سے کوئی محبت نہیں تھی اور تم نہیں چاہتے کہ اُس کا قاتل گرفتار ہو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے جناب ملک صاحب؟" اُس نے کہا۔ "میرا ایک ہی تو بھائی تھا۔"

"تو پھر تم نے مجھے پوری بات کیوں نہیں بتائی۔ وقوعہ والی رات کھانے کے بعد تم مویشیوں کو دیکھنے اور دروازے بند کرنے کے لیے باہر نکلے تھے۔ اُس وقت فاروق صحن میں موجود تھا اور اکیلا نہیں تھا لیکن تم نے میرے سوال کے جواب میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ کیا میں اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

اُس نے آنکھیں نیچے کر لیں ہولے سے بولا: "میں نہیں چاہتا تھا کہ مرنے کے بعد میرے بھائی کی عزت پر کوئی حرف آئے۔"

اُس کی بات میں وزن تھا۔ میں نے کہا: "اب دوبارہ ساری بات بتاؤ۔"

"ملک صاحب! میرا بھائی عجیب طبیعت کا آدمی تھا۔ اُسے نہ تو زمینوں کی کوئی پروا تھی اور نہ ہی اپنے مستقبل کی۔ اُس نے اپنی ساری زندگی اس آوارہ لڑکی کے پیچھے ضائع کر دی تھی۔ پتا نہیں اس لڑکی کے کن کن لوگوں سے تعلقات تھے اور اُس نے کتنی شادیاں کی تھیں۔ اُس کا پہلا بیٹا اب بارہ تیرہ سال کا ہو گا لیکن بھائی فاروق کے دل سے اُس کا خیال نہیں جاتا تھا۔ وہ سب کچھ جاننے کے باوجود اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ عنایت حسین سے طلاق لینے کے بعد وہ پھر فاروق کے پیچھے پڑ گئی۔ ہر دوسرے تیسرے روز ملنے آ جاتی تھی۔ گھر میں کوئی اُسے پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس رات بھی وہ دونوں کھرلی پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔"

"اسی لیے تم دور سے ہی سمجھ گئے تھے کہ کھرلی کے پاس تمھارے بھائی کی لاش پڑی ہے۔" میں نے کہا۔ "منظور حسین! مجھے حیرت تو اس بات پر ہے کہ تم نے یہ بات چھپائی کیوں؟"

وہ شرمسار ہوتے ہوئے بولا: "مجھے ماں نے منع کر دیا تھا لیکن یہ بات مجھے بہت چبھ رہی تھی اور میں ایک دو روز میں آپ کے پاس آنے والا تھا۔ اچھا ہوا آپ نے خود ہی یہ بات پوچھ لی۔"

"منظور حسین! تم نے چیخنے کی جو آواز سنی تھی وہ کسی مرد کی تھی یا عورت کی؟"

"وہ مرد کی آواز تھی۔" اُس نے جواب دیا۔ "میرے بھائی کی آواز تھی۔ میں نے اُس کی آواز پہچان لی تھی۔"

"کیا تمھیں پورا یقین ہے کہ تم نے عورت کے چیخنے کی آواز نہیں سنی تھی؟"

"پورا یقین ہے۔ عورت کے چیخنے کی آواز نہیں آئی۔"

"آلۂ قتل یعنی گنڈاسے کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ تمھارا گنڈاسا ہے یا قاتل اُسے اپنے ساتھ لایا تھا؟"

"وہ ہماری حویلی کا گنڈاسا ہے۔ اُس شام میں نے اُسے کھرلی پر پڑے دیکھا تھا۔"

میں نے اُٹھتے ہوئے کہا کہ اگر اُسے کوئی اور بات یاد آئے تو مجھے بتا دے۔

وہاں سے نکل کر میں ڈاکٹر اسلم کے کلینک پر پہنچا۔ اُس ادھیڑ عمر ڈاکٹر سے میری معمولی سی شناسائی تھی۔ اُس کے کلینک میں اُس وقت دو یا تین مریض بیٹھے تھے۔ اُس نے مریضوں کو انتظار کرنے کے لیے کہا اور مجھے اپنے کنسلٹنگ روم میں لے گیا۔

"جی تھانیدار صاحب!" اُس نے خوش دلی سے کہا۔ "کوئی بیماری یا کوئی جرم؟"

"ڈاکٹر صاحب! آپ کو یہ قانون ضرور معلوم ہو گا کہ آپ پولیس رپورٹ کے بغیر کسی زخمی کا علاج نہیں کر سکتے؟"

"یقیناً معلوم ہے۔ یقیناً معلوم ہے۔ کیا کوئی زخمی چور میرے کلینک سے پٹی کروانے کا دعوے دار ہے؟"

"تین فروری کی رات کو ایک لڑکی آپ کے پاس آئی تھی۔ اُس کا دایاں ہاتھ زخمی تھا۔"

اُسے فوراً یاد آ گیا کہ میں کس لڑکی کی بات کر رہا تھا۔ آنکھ دباتے ہوئے بولا: "ملک صاحب! اگر آپ میری جگہ پر ہوتے تو نہ صرف اس لڑکی

کی مرہم پٹی کرتے بلکہ اپنی گاڑی میں اُسے گھر بھی چھوڑ کر آتے اور اُس کا صرف ہاتھ ہی نہیں گھٹنا بھی زخمی تھا۔"

"گھٹنا بھی زخمی تھا!" میں نے آنکھیں پھیلائیں۔ "اُس نے اپنے زخمی ہونے کی وجہ کیا بتائی تھی؟"

"غسل خانے کے فرش پر پھسل گئی تھی اور لوہے کی صابن دانی سے ہاتھ کٹ گیا تھا۔"

"آپ نے اُس کے زخم کا بخوبی معائنہ کیا ہوگا۔" میں نے جیب سے چھری نکال کر اُسے دکھائی۔ "کیا اس چھری سے آلو چھیلنے کے دوران اتنا گہرا زخم آسکتا ہے؟"

اُس نے چھری کا معائنہ کیا۔ اُس کی دھار پر انگوٹھا پھیرا، پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "مشکل... بلکہ ناممکن۔ آلو چھیلتے وقت اِس چھری سے اتنا گہرا زخم نہیں آسکتا۔ ہاں اگر یہ چھری سیدھی پڑی ہو یعنی اس کی دھار اوپر کی طرف ہو اور زور سے اس پر ہاتھ پڑ جائے تو پھر شاید اتنا گہرا زخم آجائے۔ معاملہ کیا ہے؟"

"معاملہ قتل کا ہے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "میں کل کسی وقت آپ کا تحریری بیان لینے آؤں گا۔"

جب میں تھانے پہنچا تو عنایت حسین.... اپنے دو آدمیوں کے ہمراہ تھانے میں موجود تھا اور خاصا فکرمند نظر آتا تھا۔ میں نے اُسے اپنے کمرے میں بلایا اور بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔

"ملک صاحب! آپ کے آدمی مجھے خواہ مخواہ پکڑ لائے ہیں۔" اُس نے احتجاجاً کہا۔ "آپ حکم کرتے تو میں خود حاضر ہو جاتا۔ میں کاروباری آدمی ہوں۔ میری چار بسیں یہاں چلتی ہیں۔ سب لوگ مجھے جانتے ہیں۔"

"میں آپ کی سابق بیوی کے گھر سے آ رہا ہوں۔" میں نے اُس کے شکوے شکایات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "اُس نے آپ پر قتل کا الزام عائد کیا ہے۔"

پریشانی کے باعث اُس کا منہ کھل گیا، بولا۔ "مجھ پر اُس چڑیل نے قتل کا الزام عائد کیا ہے؟"

"اُس کا کہنا ہے کہ وقوعہ والے روز وہ فاروق کے ساتھ اُس کی حویلی کے صحن میں بیٹھی تھی کہ اچانک آپ دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے اور گنڈاسے سے فاروق کو قتل کر دیا۔"

"ملک صاحب! ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ میری فاروق سے..... کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اگر میں نے شاہدہ کی وجہ سے اُسے قتل کرنا ہوتا تو اتنا عرصہ انتظار نہ کرتا اور پھر گواہ کو زندہ نہ چھوڑتا۔ توبہ توبہ... میں کاروباری آدمی ہوں جناب! عزت سے روٹی کماتا ہوں۔ قتل میری لائن نہیں ہے جناب!"

"آپ نے مجھے مرمت کی رسید دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔"

اُس نے جیب سے چند کاغذات نکالتے ہوئے کہا۔

"رسیدیں حاضر ہیں جناب! یہ دیکھیں۔ یہ ورکشاپ کی رسید بھی ہے اور ہوٹل کی بھی۔ دو راتیں ہم نے ہوٹل میں گزاری تھیں۔ دو اور تین فروری کی راتیں۔ چار فروری کو ہم واپس آگئے تھے۔ میرا مکینک بھی میرے ساتھ تھا۔ وہ باہر بیٹھا ہے۔ آپ اُسے بلا کر پوچھ سکتے ہیں۔ یہ پُرزوں کی رسید ہے۔ تین تاریخ کو ہم نے گاڑیوں کے کچھ پُرزے خریدے تھے۔"

رسیدیں اُس کے پاس واقعی موجود تھیں۔ ورکشاپ کی رسید پر دو فروری کی تاریخ درج تھی۔ میرے استفسار پر اُس نے کہا۔ "اس رسید کی وجہ سے اُس دن میں گھبرا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ آپ کہیں گے کہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ دراصل فیول انجکشن پمپ کی پیمنٹ ہم نے دو تاریخ کو کر دی تھی لیکن واپس چار تاریخ کو آئے تھے۔ میرا مکینک عبدالرحمٰن باہر بیٹھا ہے۔ آپ اُسے بلا کر پوچھ لیں۔"

میں نے عبدالرحمٰن مکینک کو اندر بلا کر پوچھا تو اُس نے بھی عنایت حسین کے بیان کی تصدیق کی۔ وہ جھوٹا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ایک حوالدار کو اندر بلایا اور اُسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "تم ابھی اور اسی وقت لاہور چلے جاؤ۔ یہ رسیدیں ساتھ لے جاؤ۔ ان میں ورکشاپ کی رسید ہے، ایک ہوٹل اور ایک اسپیئر پارٹس کی دکان کی ہے۔ تم ان دو آدمیوں کو اچھی طرح دیکھ لو۔ یہ عنایت حسین اور یہ عبدالرحمٰن مکینک ہے۔ ان کا بیان ہے کہ یہ دو، تین اور چار فروری کو لاہور میں تھے۔ ان رسیدوں پر بھی یہی تاریخیں ہیں۔ پتا تم نے یہ کرنا ہے کیا یہ دونوں ان تاریخوں میں وہاں موجود تھے یا نہیں۔"

اس دوران میں، میں عنایت حسین کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا تھا لیکن اُس کے چہرے پر مجھے کوئی فکرمندی نظر نہیں آئی۔

"آپ بڑی خوشی سے تفتیش کریں جناب!" اُس نے کہا۔ "یہاں میرے جاننے والے بھی گواہی دیں گے کہ ان تاریخوں میں، میں یہاں موجود نہیں تھا۔ میرے پڑوسیوں سے پوچھیں، دوستوں سے پوچھ لیں...!"

"آپ فی الحال باہر بیٹھیں۔" میں نے کہا۔ "آج کی رات آپ کو تھانے میں گزارنا پڑے گی۔"

"کیا آپ مجھے گرفتار کر رہے ہیں؟" عنایت حسین نے پوچھا۔

"میں نے حوالات کی بات نہیں کی عنایت حسین! آپ دونوں چارپائیوں پر سوئیں گے اور آپ کو اچھا کھانا ملے گا۔ ہم آپ کو گرفتار نہیں کر رہے۔"

ان کے جانے کے بعد میں نے حوالدار سے رسیدیں لے کر دراز میں رکھ لیں۔

"میں عنایت حسین کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" حوالدار نے کہا۔ "یہ کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ بہت شریف آدمی ہے۔"

اگلی صبح میں نے چار آدمی ساتھ لیے اور سردار بیگم کے

دروازے پر پہنچ گیا۔ ایک سپاہی کو بھیج کر میں نے تانگا بھی منگوا لیا تھا۔ سردار بیگم نے میرے تیور دیکھے تو پریشان ہو گئی۔

میں نے کہا۔ "سردار بیگم! میں تمھاری بیٹی کو فاروق حسین کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آیا ہوں۔ اس سے کہو کہ تیار ہو کر باہر آجائے اور دیکھو... آج کوئی شور نہ مچانا ورنہ اُس کے ساتھ میں تمھیں بھی گرفتار کر لوں گا۔ اگر تم چاہتی ہو کہ یہ کام خاموشی سے ہو جائے تو لڑکی کو باہر بھیج دو۔"

شاہدہ دروازے میں نمودار ہوئی اور بڑی لجاجت سے بولی۔ "ملک صاحب! ایک منٹ کے لیے اندر آجائیں۔"

اُس کا چہرہ خوف کے باعث سفید ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اُس کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ سراپا منت بنی ہوئی تھی۔ مجھے اُس پر ترس تو بہت آیا مگر میں اپنے فرض ... تھا۔ اگر میں اندر چلا جاتا تو مجھے ایک بار پھر جذباتی کشمکش ... چار ہونا پڑتا۔ لہٰذا میں چند قدم پرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا ... کو آگے کر دیا۔ شاہدہ کچھ دیر تک منت سماجت کرتی رہی پھر ... ڈانٹ ڈپٹ سے مجبور ہو کر اپنی ماں کے ساتھ باہر آگئی۔ ... نے سفید چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔

... کی چار سالہ بچی دروازے میں کھڑی ہو کر رونے لگی۔ ... بھائی نے اُسے گود میں اٹھا لیا اور بہلانے کی کوشش ... پڑوسی بھی گھروں سے نکل آئے تھے۔ سردار بیگم نے ... اپنے گھر کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور شاہدہ کے ہمراہ ... ہو گئی۔

... پہنچ کر میں نے دونوں ماں بیٹی کو ایک۔ الگ کمرے ... اور جانے سے پہلے کہا۔ "شاہدہ بی بی! میں ساری حقیقت ... ہوں۔ اب چھپانے کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اپنی ماں سے مشورہ ... بولنے کے لیے تیار رہو۔"

... میں کئی چھوٹے بڑے کام نمٹانے والے باقی تھے۔ جب ... تو بارہ بج چکے تھے۔ میں نے حوالدار کو بھیج کر شاہدہ ... کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں ... سردار بیگم مجھے پیسے چھوڑنے لالچ دینے لگی۔

... نے شاہدہ سے کہا۔ "شاہدہ! اب میں اصل کہانی سُننا چاہتا ہوں۔"

"ملک صاحب! میں بے گناہ ہوں۔" اُس نے کمزور سی آواز میں ... آپ کو بتا چکی ہوں کہ قتل عنایت حسین نے کیا ہے۔ وہ ... پھاند کر اندر آیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں گنڈاسا تھا۔"

"فکر نہیں کرو، عنایت حسین بھی ادھر ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "اُس ... رات تھانے میں گزاری ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم دونوں میں سے اصل قاتل کون ہے۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، جب عنایت حسین دیوار پھاند کر حویلی میں داخل ہوا تو اُس کے ہاتھ میں کیا چیز تھی؟ گنڈاسا یا خنجر؟"

"اُس کے ہاتھ میں گنڈاسا تھا جی! میں نے اچھی طرح دیکھا تھا۔"

قریبی دیوار کھرلی سے چھ سات قدم کے فاصلے پر تھی۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ مداخلت کار نے کھرلی پر پڑا ہوا گنڈاسا اُٹھایا تھا اور شاہدہ کو پتا نہیں چلا تھا۔ لہٰذا یہ بات سراسر جھوٹی تھی کہ کوئی شخص دیوار پھاند کر اندر داخل ہوا تھا۔

"شاہدہ بی بی! یہ بتاؤ کہ جب تم نے ایک پُراسرار شخص کو گنڈاسے سے فاروق پر حملہ کرتے دیکھا تو تم نے چیخیں کیوں نہ ماریں؟"

"ج... جی میں نے چیخیں ماری تھیں۔ بہت زور سے چیخیں ماری تھیں۔"

یہ بھی جھوٹ تھا۔ کسی نے چیخوں کی آواز نہیں سُنی تھی۔

"شاہدہ بی بی! یہ بتاؤ کہ تم نے گلی میں گزرنے والے لوگوں یا پڑوسیوں کو واردات کے بارے میں کیوں نہ بتایا؟"

"م... میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔"

"تم نے اپنے زخم کے بارے میں جھوٹ کیوں بولا؟"

"جھوٹ! م... میں نے جھوٹ تو نہیں بولا۔"

"تم نے مجھے بتایا ہے کہ زخم آلو چھیلنے کے دوران آیا تھا لیکن ڈاکٹر اسلم کو تم نے یہ کہا تھا کہ تم غسل خانے میں پھسل گئی تھیں اور تمھارا ہاتھ لوہے کی صابن دانی سے کٹ گیا تھا۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں جھوٹ ہیں۔ یہ زخم تمھارے ہاتھ پر اُس وقت آیا تھا جب تم نے فاروق پر گنڈاسے سے وار کیا تھا۔ ڈاکٹر اسلم اس بات کی تصدیق کر چکا ہے کہ تمھارے ہاتھ پر چھری سے زخم نہیں آیا۔ تمھارے گھٹنے پر بھی زخم آیا تھا۔ تم دوڑتے وقت گر پڑی تھیں۔ تمھاری یہ بات بھی جھوٹ ہے کہ کوئی آدمی جس نے ڈھاٹا باندھ رکھا تھا دیوار پھاند کر اندر آیا تھا اور اس کے ہاتھ میں گنڈاسا تھا۔ گنڈاسا کھرلی پر پڑا ہوا تھا اور وہ منظور حسین کی ملکیت ہے۔ تمھارا یہ بیان بھی جھوٹا ہے کہ ڈھاٹے والا شخص عنایت حسین تھا۔ عنایت حسین دو، تین اور چار فروری کو لاہور میں تھا۔ ہم اس بات کی تصدیق کر چکے ہیں۔"

وہ کچھ نہیں بولی اور کسی بیمار کی طرح فرش پر بیٹھ گئی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمھاری خانہ تلاشی کے لیے سرچ وارنٹ حاصل کر لیے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمھارے خون آلود کپڑے تمھارے گھر سے برآمد ہو جائیں گے۔ شاہدہ بی بی! تمھارے خلاف قتل عمد کا کیس بنتا ہے۔ تمھارے خلاف کافی سے زیادہ شہادتیں اکٹھی ہو چکی ہیں۔ ان شہادتوں کی بنا پر میں تمھارے خلاف تین سو دو کا پرچہ کاٹ سکتا ہوں۔ مجھے نہیں پتا کہ تم نے فاروق کو وقتی اشتعال کے

تحت قتل کیا ہے یا سوچے سمجھے منصوبے کے تحت۔ اس بات کا فیصلہ میں تمھارا بیان سُننے کے بعد ہی کر سکتا ہوں۔"

میں اُسے سارا دن قانون کی باریکیاں سمجھاتا رہا۔ رات کے دس بجے اس نے اقبالِ جرم کر لیا۔ میں نے اس پر کوئی تشدد نہیں کیا۔ نہ ہی سخت لہجہ اختیار کیا تھا۔

اُس نے روتے ہوئے جو واقعہ میرے سامنے بیان کیا وہ میں اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

شاہدہ نے مجھے بتایا کہ فاروق ایک اچھا انسان اور بہترین دوست تھا۔ اسے وہ اُسے بہت پسند کرتی تھی۔ تاہم وہ اس کے ساتھ شادی پر رضامند نہیں تھی کیونکہ وہ اپنے باپ کے ترکے میں سے حصہ لینے پر تیار نہیں تھا۔ شاہدہ کو ایک اچھا شوہر ہی نہیں ایک پُرآسائش گھر بھی درکار تھا۔ اس لیے وہ فاروق کو پسند کرنے کے باوجود اس سے شادی پر راضی نہ ہوئی۔ اُسے فاروق کی جو بات سب سے اچھی لگی وہ یہ تھی کہ فاروق نے اُس کے انکار اور شادیوں کے باوجود اُس کے لیے دل میں کبھی بغض نہیں رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ محبت اور خلوص کے ساتھ ملتا تھا اور نہ صرف اپنے گھر کے بلکہ دل کے دروازے بھی اُس کے لیے کھلے رکھتا تھا۔ یہ بات شاہدہ کو بہت اچھی لگتی تھی۔

یہ بات واقعی شاہدہ نے کہی تھی کہ وہ ایک تہی دست اور کنگلے فلسفی کے ساتھ شادی کر کے اپنی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتی لیکن فاروق نے اس بات پر کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

شاہدہ نے بتایا کہ فاروق اُسے وقتاً فوقتاً شادی کا پیغام دیتا رہتا تھا لیکن جب اُس کی عنایت حسین سے علیحدگی ہوئی تو فاروق نے شادی کی براہِ راست کوئی بات نہیں کی۔ حالانکہ شاہدہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ فاروق نے صرف اُس کی وجہ سے شادی نہیں کی تھی۔

عنایت حسین سے طلاق پانے کے بعد شاہدہ نے محسوس کیا کہ دو بچوں اور دو طلاقوں کی وجہ سے اب اُسے فاروق سے بہتر کوئی رشتہ نہیں ملے گا۔ لہٰذا وہ اس بات کا انتظار کرتی رہی کہ فاروق اُسے شادی کا پیغام دے اور وہ تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد راضی ہو جائے۔ فاروق کی پُرخلوص اور مثالی محبت نے اُس کے دل میں تھوڑا سا گھمنڈ بھی پیدا کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا جب وہ شادی کے لیے ہاں کرے گی تو گویا فاروق پر احسان کرے گی اور فاروق خوشی سے نہال ہو جائے گا۔

تین فروری کو رات کے آٹھ بجے اُس نے فاروق سے کہا۔ "فاروق! آج میں تمھیں ایک بہت بڑی خوشخبری سنانا چاہتی ہوں۔ بھلا بوجھو تو؟"

فاروق نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ تم نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔" شاہدہ نے کہا۔ "فاروق! میں نے بہت ساری غلطیاں کی ہیں اور بہت سی تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔ اب میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ مجھے تمھارے جیسا پُرخلوص اور محبت کرنے والا انسان نہیں مل سکتا۔" پھر جھوٹے سے اضافہ کیا۔ "میں نے تمھارے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

شاہدہ کا خیال تھا کہ فاروق یہ سُنتے ہی خوشی سے اچھل پڑے گا لیکن اُس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ ایک طویل لمحے تک چپ بیٹھا رہا پھر پوچھا۔ "تم نے فیصلہ کیا ہے یا تم مجھ سے شادی کی درخواست کر رہی ہو؟"

شاہدہ نے فاروق کو اس چھوٹی سی خوشی سے محروم رکھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو فاروق! یہ تمھارا حق ہے کہ میں تم سے شادی کی درخواست کروں۔ کیونکہ میں کئی دفعہ تمھاری درخواست ٹھکرا چکی ہوں۔ لہٰذا میں تم سے شادی کی درخواست کرتی ہوں۔"

یہ سُن کر فاروق کا چہرہ ایک ناقابلِ بیان خوشی سے تمتما اُٹھا۔ "شاہدہ! آج میں بہت خوش ہوں۔" اُس نے کہا۔ "بے انتہا خوش! مجھے یقین تھا کہ میں یہ جملہ ضرور سنوں گا اور اسی یقین کی وجہ سے آج تک زندہ ہوں ورنہ کب کا مر چکا ہوتا۔"

"فاروق! ہمیں یہ شادی بہت خاموشی سے کرنا ہوگی۔ کیونکہ تم جانتے ہی ہو کہ...؟"

"شادی؟" فاروق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کس شادی کی بات کر رہی ہو؟"

"کیا؟" شاہدہ چونکی۔ "فاروق تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"مجھے ایک خوشی اس بات کی ہے کہ تم نے مجھ سے شادی کی درخواست کی ہے۔" فاروق نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا "اور دوسری خوشی... جو بہت بڑی خوشی ہے وہ یہ ہے کہ میں تمھارے ساتھ شادی سے انکار کرتا ہوں۔ تم چیز کیا ہو؟ آوارہ، فلرٹ، ہرجائی، دولت کی پجارن۔ فاروق تمھارے جیسی خود پسند اور حسن فروش عورت سے بہت بلند ہے۔ سمجھیں تم؟"

شاہدہ نے مجھے بتایا کہ وہ یہ سُن کر گنگ ہو گئی۔ اُس پر جنون طاری ہو گیا۔ اُس نے قریب پڑا ہوا گنڈاسا اُٹھا لیا... اور اس کے بعد اُسے کچھ یاد نہیں رہا کہ اُس نے کیا کیا تھا۔

شاہدہ پر دو سال مقدمہ چلا۔ سیشن کورٹ نے اُسے عمر قید کی سزا دی۔ بعد میں ہائی کورٹ نے مجرمہ کی اپیل پر عمر قید کو دس سال قیدِ محض میں تبدیل کر دیا۔



اچھے، برے تو ہر جگہ، ہر طبقے میں پائے جاتے ہیں مگر جاگیردار طبقے میں شریف النفس اور ہمدرد قسم کے لوگ ایک فیصد سے زیادہ نہیں ملتے۔

وہ موسم گرما کی ایک خوشگوار شام تھی۔ میں اپنے سرکاری کوارٹر کے لان میں چند ملنے والوں کے ہمراہ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک شخص جس نے کھیس کی بکل مار رکھی تھی، اندر آیا، جھک کر مجھے سلام کیا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے چادر میں اپنا مُنہ بھی چھپا رکھا تھا۔ تاہم اُس کی گھنی مونچھوں کی جھلک میں نے دیکھ لی تھی۔ گرمیوں کے موسم میں چادر اوڑھنے کا مطلب یہ



تھا کہ وہ دوسروں کے سامنے اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے گفتگو دکاں اس سے اس کی آمد کا مقصد پوچھا۔

اُس نے کسی حال مست شخص کی طرح جواب دیا۔ "بندے کو کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ اطمینان سے فارغ ہو لیں۔ پھر کچھ عرض کروں گا۔ ذرا پردے کی بات ہے۔"

اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ خاصا گھرا بندہ تھا اور کوئی گہری خبر لایا تھا۔ میں نے ملنے والوں کو جلدی فارغ کر دیا اور کھیس پوش کی طرف رُخ کر لیا۔ اُس نے چادر ہٹا کر اپنا چہرہ بے نقاب کر دیا اور اپنی گھنی مونچھوں کا زاویہ درست کرنے لگا۔ شکل اُس کی خاصی خوفناک تھی اور چہرے پر زخم کے دو تین پرانے نشان بھی تھے۔ عمر تیس پینتیس سال کے لگ بھگ تھی اور خاصا جی دار بندہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی چال ڈھال اور وضع قطع سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی سزا یافتہ عادی مجرم تھا۔ اُس نے اپنی لنگی سے ایک پیکٹ نکالا اور میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ اعوان صاحب نے آپ کے لیے نذرانہ بھیجا ہے۔" اُس نے کہا۔ "چوہدری دوست محمد اعوان نے۔ اس میں ایک بوسکی کا جوڑا اور کچھ مٹھائی کے پیسے ہیں۔ اعوان صاحب نے آپ کی خدمت میں سلام بھی عرض کیا ہے۔"

چوہدری دوست محمد اعوان ایک قریبی گاؤں میں رہتا تھا اور خاصا بڑا زمیندار تھا۔

"معاملہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "چوہدریوں نے کوئی بندہ مار دیا ہے یا کسی کی لڑکی اُٹھالی ہے؟"

"ایسی کوئی گل نئیں سرکار! اعوان صاحب بڑے اللہ لوک آدمی ہیں۔ ایسی نیچ حرکتیں کبھی نہیں کرتے۔"

اُس کی شکل جانی پہچانی لگ رہی تھی مگر نام ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "تمھارا نام کیا ہے؟"

"سرکار! نوکر کا نام جلال خان ہے۔"

"ہوں...!" میں نے گہری نظروں سے اُسے گھورا۔ "جلال خان عرف جیلا بدمعاش! تمھیں تو سزا ہو گئی تھی، کب چھوٹے ہو جیل سے؟"

"یہی کوئی دو چار مہینے ہوئے ہیں۔ اب میں نے سارے دھندے چھوڑ دیے ہیں اور اعوان صاحب کی ملازمت کر لی ہے۔"

جاگیردار اپنا رُعب اور دبدبہ برقرار رکھنے کے لیے اس قسم کے چند غنڈے ضرور رکھتے ہیں۔

جیلا بدمعاش تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر بولا۔ "سرکار! آپ نے جھوبے ماچھی کا نام ضرور سنا ہوگا۔ بڑا نامی گرامی ڈاکو ہے۔ آج کل یہ اس علاقے میں آیا ہوا ہے اور واردات کرنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ یہ اعوان صاحب کی حویلی میں بھی واردات کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

اُن دنوں اُس علاقے میں جھوبے ماچھی کا خاصا چرچا تھا۔ وہ کافی عرصے سے وارداتیں کر رہا تھا مگر ابھی تک پولیس کے قابو میں نہیں آیا تھا۔ اُس کی ذات کسی تھانے میں تصویر تھی اور نہ ہی کوئی اُس کا حلیہ جانتا تھا۔

"تم پولیس کے مخبر کب سے بن گئے؟" میں نے جیلے سے کہا۔ "اور چوہدری دوست محمد کو کیسے پتا چلا کہ جھوبا اُن کی حویلی لوٹنے کا ارادہ رکھتا ہے؟"

"کہیں سے پتا چل گیا ہوگا جی! مجھے کیا پتا۔ میں تو اُن کا نوکر ہوں۔ جو اُنھوں نے پیغام دیا وہ میں نے آپ کو پہنچا دیا ہے۔ اعوان صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ انھیں اپنی حفاظت کی کوئی فکر نہیں ہے۔ آپ کو اطلاع اس لیے دے دی ہے کہ اگر جھوبے ماچھی کے دو چار بندے پھنڈر ہو گئے تو ہماری کوئی ذمے داری نہیں ہوگی۔"

"یہ تو ہم بعد میں دیکھیں گے کہ ذمے داری ہے یا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے یہ بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے؟"

"سرکار! جو کچھ مجھے حکم ملا تھا، وہ میں نے عرض کر دیا ہے۔" اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "ویسے لوگوں کا کہنا ہے کہ جھوبا ماچھی چوہدری رستم علی کی حویلی میں دیکھا گیا تھا۔"

چوہدری رستم علی کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ چند سال پہلے چوہدری رستم علی کے ایک آدمی نے چوہدری دوست محمد کے مزارع کی نوجوان لڑکی اُٹھالی تھی اور نوبت قتل و غارت تک پہنچ گئی تھی لیکن کچھ لوگوں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا تھا اور مغویہ کو اُس کے گھر پہنچا دیا تھا مگر دلوں کی رنجش ختم نہیں ہوئی تھی۔ چوہدری دوست محمد کے آدمی موقع کی تاک میں تھے۔

"جیلے! جانے سے پہلے اپنا یہ نذرانہ اُٹھا لو۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "اور میری بات سنو! اگر تمھارے مالک کو چوہدری رستم علی کے گھر سے کوئی خطرہ ہے تو اس کی ضرور کوئی وجہ ہوگی۔ رنجش چوہدری دوست محمد کے دل میں تھی، خطرہ چوہدری رستم علی کو ہونا چاہیے تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگ اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میرے پاس آئے ہو۔ اس لیے کان کھول کر سن لو۔ اگر مجھے کسی واردات کی اطلاع ملی تو میں سب سے پہلے تم کو اندر بند کر دوں گا۔"

"کیا بات ہے ملک صاحب؟" وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔ "آپ تو ناراض ہو گئے۔ میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی۔ چوہدریوں کی دشمنی کا مجھے کیا پتا۔ آپ یہ تحفہ واپس نہ کریں۔ اعوان صاحب نے بڑی محبت سے بھیجا ہے۔ اگر میں تحفہ واپس لے گیا تو اُن کا دل میلا ہو جائے گا۔"

"دل کی تم کوئی فکر نہ کرو۔" میں نے کہا۔ "میں چوہدریوں کے دلوں کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ چوہدری صاحب سے کہہ دینا کہ میں خود اُن کے پاس آؤں گا۔ تم یہ بنڈل اُٹھاؤ اور چلتے بنو۔"

وہ تھوڑی دیر تک مجھے راضی کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر پیکٹ اُٹھا کر رخصت ہو گیا۔

اگلی صبح مجھے ایک مخبر نے خبر دی کہ چوہدری رستم علی کی نوجوان بھانجی جس کا نام ریحانہ تھا، اغوا ہو گئی تھی۔ وہ میٹرک میں پڑھتی تھی اور اپنے پرائیویٹ تانگے میں آتی جاتی تھی۔ اُس کا گاؤں قصبے سے ڈیڑھ دو میل دور تھا۔ مخبر نے یہ بھی بتایا کہ چوہدری رستم علی کی حویلی میں مسلح آدمی اکٹھے ہو رہے ہیں اور وہاں چوہدری دوست محمد کی حویلی پر حملہ کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ دونوں چوہدریوں کے گاؤں الگ الگ تھے۔

میں نے فوراً ایس پی علاقہ کو صورتِ حال کی اطلاع بھجوا دی۔ چھ سات درجن آدمی ایک اے ایس آئی کی نگرانی میں چوہدری دوست محمد کے گاؤں روانہ کر دیے۔ خود میں دو آدمیوں کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہو کر چوہدری رستم علی کی حویلی جا پہنچا۔

چوہدری رستم علی کا نوجوان بیٹا جس کا نام شیر علی تھا، حویلی کے صدر دروازے پر ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ ہمارے گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہماری آمد کی خبر حویلی تک پہنچ چکی تھی۔ شیر علی نہایت گبرو جوان تھا۔ بانکا سجیلا اور خوش شکل۔ اُس نے ہمارے گھوڑے ملازموں کے سپرد کر دیے اور ہمیں بیٹھک میں لے گیا۔ وہاں نصف درجن افراد موجود تھے جو سب کے سب چپ بیٹھے تھے۔ اُن کے چہروں پر برہمی اور غضب ناکی پائی جاتی تھی۔

چوہدری رستم علی نے سلام دعا کے بعد پوچھا۔ "ملک صاحب! آج کدھر کی تیاری ہے؟"

اُس نے اپنی بھانجی کی گمشدگی یا اغوا کی کوئی بات نہیں کی۔ میں نے بھی اس سلسلے میں محتاط رہنا مناسب سمجھا اور کہا۔ "آپ کی خیر خیریت پوچھنے آیا ہوں۔"

"اللہ کا بڑا کرم ہے۔ آپ کو جلدی تو نہیں؟ کھانے دانے کا انتظام کریں؟"

اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ہم سے جلدی جان چھڑانا چاہتا تھا۔

"کوئی جلدی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔ یہاں سے چنی وال جائیں گے۔ وہاں سے ایک واردات کی اطلاع ملی ہے۔"

چنی وال کا نام سن کر سب کے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ یہ چوہدری دوست محمد کے گاؤں کا نام تھا۔ واردات والی بات گپ تھی۔ میں انھیں یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ اگر وہ چوہدری دوست محمد کے گاؤں پر حملے کا منصوبہ بنا رہے تھے تو انھیں محتاط ہو جانا چاہیے۔ پولیس کی موجودگی میں وہ ایسی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔

"چنی وال میں واردات ہو گئی ہے؟" شیر علی نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔ "یا واردات کا خطرہ ہے؟"

میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ "مجھے تفصیل معلوم نہیں ہے۔ جس وقت یہ اطلاع ملی اُس وقت میں تھانے میں موجود نہیں تھا۔ اے ایس آئی اطلاع ملتے ہی پانچ چھ افراد کے ہمراہ اُدھر روانہ ہو گیا۔ روزنامچے میں اطلاع دینے والے کا نام جلال خان لکھا ہے۔ غالباً بلوے کا کیس ہے۔"

شیر علی نے پریشان نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ رستم علی کی حالت اُس شیر کی سی ہو رہی تھی جس کے منہ سے اُس کا شکار چھین لیا گیا ہو۔ واضح طور پر اُنھوں نے اپنے حریف سے انتقام لینے کی زبردست تیاری کر رکھی تھی۔

رستم علی نے ایک ملازم کو لسی لانے کے لیے کہا پھر مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور مضطرب لہجے میں بولا۔ "ملک صاحب! ہمارے ساتھ ہیرا پھیری نہ ڈالیں۔ ہمارے آپ کے ساتھ پرانے تعلقات ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ رہیں گے۔ ہمیں صحیح بات بتائیں۔ بلوے کی رپورٹ چنی وال والوں نے لکھائی ہے اور تفتیش کرنے آپ یہاں آئے ہیں۔ اصل بات کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ دوست محمد نے ہمارے خلاف پرچہ کٹوایا ہے۔ یہ نا یہی بات؟"

"چوہدری صاحب! صحیح بات دونوں طرف سے ہونا چاہیے۔ ہم اتنی دور سے چل کر آپ کے پاس آئے ہیں حالانکہ آنا آپ کو چاہیے تھا۔ یا آپ نے ہم پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا ہے؟"

"بھروسا تو ہم آپ پر ضرور کرتے ہیں اور آپ کو موقع بے موقع تکلیف بھی دیتے رہتے ہیں۔ لیکن... کچھ کام ایسے بھی آن پڑتے ہیں جن میں آپ ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ قانون نے آپ کے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔"

"قانون کی سب کو پابندی کرنا چاہیے چوہدری صاحب!" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "آپ کو بھی کرنا چاہیے۔ اگر آپ قانون کی خلاف ورزی کریں گے تو ہمارے لیے مشکلات پیدا ہوں گی۔

ہماری پہلی وفاداری قانون کے ساتھ ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ آپ ہمیں گھریلو جھگڑوں میں نہ ڈالیں۔ جو بات ہے وہ کھل کر کریں۔ آخر وہ کون سا ایسا کام ہے جس میں ہم آپ کی مدد نہیں کر سکتے؟"

اتنے میں شیر علی بھی ہمارے قریب آ کر ٹھہر گیا تھا وہ بولا۔ "ملک صاحب! معلوم ہوتا ہے کہ خبر آپ تک پہنچ چکی ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ ہماری عورتوں کو چھڑا لائیں گے۔ ہماری ذلت کا بدلہ تو نہیں لے سکیں گے۔ آپ کی کارروائی سے کیا ہو گا۔ دو چار سال مقدمہ چلے گا اور آخر میں مجرم بری ہو جائیں گے۔ آپ کا قانون تو یہی کچھ کر سکتا ہے۔ ملک صاحب! ہمارے سینوں میں جو آگ جل رہی ہے وہ آپ کی کارروائیوں سے ٹھنڈی نہیں ہو سکتی۔"

چوہدری رستم علی نے کہا: "ملک جی! فی الحال آپ اپنے آدمیوں کو واپس بلا لیں۔ ہمیں کل تک کی مہلت چاہیے۔ اس کے بعد ہم آپ کو دو چار آدمیوں کی گرفتاری دے دیں گے۔ آپ کے قانون کا پیٹ بھی بھر جائے گا۔"

مخبر نے مجھے بتایا تھا کہ صرف ایک لڑکی جس کا نام ریحانہ تھا اغوا ہوئی تھی لیکن شیر علی کی بات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اغوا ہونے والیوں کی تعداد ایک سے زیادہ تھی۔

"مجھے صرف ایک لڑکی کے اغوا کی اطلاع ملی ہے۔" میں نے کہا "صحیح صورتِ حال کیا ہے؟"

باپ بیٹے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شیر علی اس طرف چلا گیا جس طرف دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ اُس کے جانے کے بعد چوہدری رستم علی نے قدرے دھیمی آواز میں کہا "ایک میری بھانجی ریحانہ ہے اور دوسری میری بیوی صادقہ بیگم ہے... میری دوسری بیوی!"

وہ کھل کر کوئی بات بتانے پر تیار نہیں تھا۔ ایک بات جاننے کے لیے کئی سوالات کرنا پڑتے تھے۔ کچھ باتیں مجھے اسی وقت معلوم ہو گئیں، کچھ بعد میں معلوم ہوئیں۔ لہٰذا میں آپ کو سوال و جواب کے چکر میں ڈالنے کے بجائے خلاصہ بتا دیتا ہوں۔

ریحانہ کی عمر سولہ سترہ سال کے قریب تھی۔ اُس کا اسکول آٹھ بجے لگتا تھا۔ وہ روزانہ ساڑھے سات بجے گھر سے روانہ ہو جاتی تھی۔ دیہات کے خالص ماحول اور خالص غذاؤں نے اُس کے جسم پر نمایاں اثر کیا تھا۔ وہ خوبصورت اور فربہ اندام تھی اور اپنی عمر سے بڑی لگتی تھی۔ اس کا قد بھی دوسری لڑکیوں سے نکلتا ہوا تھا۔ اُس روز چوہدری رستم علی کی دوسری بیوی صادقہ بیگم بھی اُس کے ساتھ تھی۔ قصبے میں اُس کے کچھ رشتے دار رہتے تھے اور وہ کئی روز سے ریحانہ کے ساتھ جانے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ ریحانہ کی دو ڈھائی بجے چھٹی ہو جاتی تھی۔ چوہدری رستم علی نے اپنی بیوی کو تاکید کر دی تھی کہ وہ ریحانہ کے ساتھ ہی واپس آئے۔

تانگا گھر کا تھا اور ادھیڑ عمر کوچوان جس کا نام صدر دین تھا ایک قابلِ اعتماد شخص تھا۔ وہ چوہدری رستم علی کا پرانا نمک خوار تھا۔ تانگے میں گاؤں کی کچھ دوسری لڑکیاں بھی اسکول جاتی تھیں۔ اُس روز چونکہ تانگے نے صادقہ کو اُس کے رشتے داروں کے گھر سے اٹھانا تھا اس لیے دوسری تین لڑکیاں ایک دوسرے تانگے پر واپس چلی گئیں۔ گاؤں اور قصبے کے درمیان پکی سڑک بنی ہوئی تھی جس پر تانگے اور بیل گاڑیاں عام چلتی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی موٹر بھی نظر آ جاتی تھی۔ اسکول جاتے اور آتے وقت تین چار تانگے ایک ساتھ روانہ ہوتے تھے۔ ان میں لڑکیوں کے علاوہ لڑکے بھی ہوتے تھے۔ اس لیے کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا۔

واپسی میں صادقہ بیگم کو اپنے رشتے داروں کے گھر سے نکلتے نکلتے دیر ہو گئی۔ دوسرے تانگے اس اثنا میں گاؤں پہنچ چکے تھے۔ ریحانہ اور صادقہ بیگم کا تانگا تقریباً چار بجے بغیر سواریوں کے حویلی پہنچا۔ کوچوان زخمی اور نیم بے ہوش پڑا تھا۔ گھوڑا خود ہی تانگے کو لے کر وہاں پہنچا تھا۔

صدر دین نے ہوش میں آنے کے بعد بتایا کہ تین ڈاکوؤں نے جو گھوڑوں پر سوار تھے تانگا زبردستی رکوایا۔ اُسے بری طرح زدوکوب کیا اور دونوں عورتوں کو گھوڑوں پر ڈال کر لے گئے۔ ڈاکوؤں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔

میں نے چوہدری رستم علی سے پوچھا "آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ اغوا میں دوست محمد کا ہاتھ ہے؟"

"ملک صاحب! اتنی جرأت اور کوئی نہیں کر سکتا۔ چوہدری رستم علی کی عزت پر ہاتھ ڈالنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ حرکت دوست محمد کے اشارے پر کی گئی ہے۔ اگر کوئی کمی کمین یہ حرکت کرتا تو ہم اس کو زن بچہ سمیت اُس کے گھر میں بند کر کے اوپر مٹی کا تیل چھڑکتے اور آگ لگا کر اندر ہی بھون ڈالتے۔"

یہ جاگیردارانہ ذہنیت کی بات تھی۔ یہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا ہے صرف بدلے پر مطمئن نہیں ہوتے۔ ان کی سوچ یہ ہے کہ ایک کمزور اور غریب آدمی نے اُن پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کیسے کی۔ یہ لوگ آنکھ کے بدلے آنکھ کے قائل نہیں ہیں۔ اگر کوئی بے حیثیت آدمی ان کا ایک آدمی مار ڈالے تو یہ اُس کے پورے کنبے کو ختم کر ڈالتے ہیں۔ عورتوں اور معصوم بچوں کو بھی نہیں چھوڑتے پھر بھی ان کے سینوں میں بھڑکنے والی آتشِ انتقام پوری طرح سرد نہیں ہوتی۔ ان جاگیرداروں کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ چند سال قبل ملتان کے علاقے میں رونما ہونے والا ایسا ہی ایک واقعہ منظرِ عام پر آیا تھا۔ جس میں چند وحشی جاگیرداروں نے اپنے مخالفین کی بے گناہ عورتوں کو برہنہ کر کے سڑکوں پر پھرایا تھا۔ اس

وقت میرے سامنے بھی ایسا ہی انتقامی مزاج رکھنے والا ایک جاگیردار کھڑا تھا۔

"چوہدری صاحب! یہ تو آپ اندازے کی بات کر رہے ہیں اور اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ڈاکوؤں کی کارروائی بھی ہو سکتی ہے لیکن ہے کہ سنسان سڑک پر بوڑھے کوچوان کے ساتھ دو نوجوان عورتوں کو دیکھ کر ڈاکوؤں نے بغیر کسی پروگرام کے اُنھیں اغوا کر لیا ہو۔ آپ مجھے ایک بات بتائیں۔ آپ کا تانگا پہلی مرتبہ ایک گھنٹا لیٹ ہوا تھا۔ یہ بات چوہدری دوست محمد یا اُس کے آدمیوں کو کیسے معلوم ہو گئی؟"

"ہمارے پاس ایسی باتیں سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ ملک صاحب! دوست محمد کے کسی آدمی نے ہمارا تانگا دیکھ لیا ہو گا۔ ہمارے تانگے اور کوچوان کو سب ہی پہچانتے ہیں۔"

"چلیں میں آپ کی یہ بات مان لیتا ہوں کہ دوست محمد کے کسی آدمی نے آپ کا تانگا پہچان لیا ہو گا اور اُس نے چٹّی والی اطلاع بھجوا دی ہو گی۔ اس کے باوجود اتنے تھوڑے سے وقت میں اغوا کی منصوبہ بندی کرنا بہت مشکل ہے۔ اگر یہ اغوا عام دنوں میں ہوتا تو چوہدری دوست محمد پر شک کیا جا سکتا تھا۔ یا پھر یہ کہنا چاہیے کہ دوست محمد کے آدمی روز گھات لگا کر بیٹھتے تھے اور آپ کا تانگا لیٹ ہونے کے منتظر تھے۔ کل تانگا لیٹ ہوا اور انھیں کام دکھانے کا موقع مل گیا یا پھر وہ..." میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ یا پھر وہ صادقہ بیگم کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ ریحانہ تو روزانہ آتی جاتی تھی۔ صادقہ بیگم پہلی دفعہ نکلی تھی۔ گویا اغوا کنندگان کا اصل ٹارگٹ صادقہ بیگم تھی لیکن کیوں؟ اغوا کنندگان نے اس کو کیوں اغوا کیا تھا؟

"چوہدری صاحب! یہ اغوا کی سیدھی سادی واردات معلوم نہیں ہوتی۔" میں نے کہا "مجھے اس میں کچھ پھیر نظر آتا ہے۔ آپ اس معاملے میں جلدی نہ کریں اور یہ نہ سمجھیں کہ چوہدری دوست محمد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے۔ اُسے کل ہی آپ کی تیاریوں کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ لوگ جوابی کارروائی کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ ان کا آدمی کل شام میرے پاس آیا تھا اور سارے حالات بتا گیا تھا۔ آپ کے آدمی وہاں جائیں گے، دو چار لاشیں اُن کی گریں گی، دو چار آپ کی گریں گی اور باقی آدمی آپ کو لامحالہ اندر بند کرنا پڑیں گے۔ حاصل کچھ بھی نہیں ہو گا۔"

"ملک صاحب! یہ مردوں کا کھیل ہے۔ ہمارے جوان موت سے نہیں ڈرتے۔"

میں نے محسوس کیا کہ اُس کے لہجے میں پہلی سی سختی نہیں رہی تھی۔

"ٹھیک ہے چوہدری صاحب! میں آپ کی بات مانتا ہوں، لیکن زندگی اور موت کا کھیل شروع کرنے سے پہلے انسان کو حقیقت کا پورا علم ہونا چاہیے۔ آپ اپنا آدمی تھانے بھیج دیں اور پہلے پرچہ کٹوا دیں۔ یہ آپ کے حق میں بہتر ہو گا۔ آپ کو مخالف فریق پر قانونی بالادستی حاصل ہو جائے گی۔"

اُس نے اپنے آدمیوں سے مشورہ کیا اور پرچہ کٹوانے پر راضی ہو گیا۔ وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے میں نے کہا کہ میں صدر دین کوچوان سے ملنا چاہتا ہوں۔

"او چھوڑیں جی! اُس جاہل گنوار سے مل کر آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" شیر علی نے کہا "اور وہ ہوش میں بھی نہیں ہے۔ کل سے اُلٹی سیدھی باتیں کر رہا ہے۔ ڈاکوؤں کو دیکھ کر اُس کا دماغ ہی اُلٹ گیا ہے۔"

میں نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے آدمیوں کے ہمراہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ باہر نکل کر ہم نے صدر دین کوچوان کا پتا پوچھا اور ایک لمبا چکر لگا کر اُس کے گھر پہنچ گئے۔

وہ تین کچے کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ ہمارے دستک کے جواب میں ایک بھاری جسم کی ادھیڑ عمر عورت دروازے پر آئی۔ اُس نے کھدر کی میلی سی چادر اوڑھ رکھی تھی اور آنکھیں اُس کی سوجی ہوئی تھیں۔ میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ وہ صدر دین کی بیوی نذیراں تھی۔

"صدر دین کا کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا "چوہدریوں نے بتایا ہے کہ کل وہ ڈاکوؤں کے حملے میں زخمی ہو گیا تھا۔"

"آہو جی چوہدری ٹھیک ہی کہندے نے۔" اُس نے روہانسی آواز میں کہا "ایس پنڈ وچ چوہدریوں دا سکّہ ای چلدا اے۔ اندر آجاؤ جی۔ گریباں وی وی کی زندگی اے۔"

اُس نے ہمارے داخل ہونے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

صدر دین چارپائی پر پڑا دھیمی آواز میں ہائے ہائے کر رہا تھا۔ اُس کا چہرہ سُوجا ہوا تھا۔ ایک آنکھ پھول کر کُپّا ہو رہی تھی۔ اُس کے جسم پر بندھی ہوئی میلی سی پٹی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُسے طبی امداد فراہم نہیں کی گئی تھی۔ کمرے میں ایک سفید ریش بوڑھا بیٹھا حقّہ پی رہا تھا۔ ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی صدر دین کی چوٹوں پر ٹکور کر رہی تھی۔ دوسرے کمرے سے کسی لڑکی کی ہچکیوں کی آواز آ رہی تھی۔

ہمیں دیکھ کر سفید ریش بوڑھا حقّہ ہاتھ میں لیے کھڑا ہو گیا اور عاجزی سے سلام کیا۔ لڑکی ہاتھ روک کر ہمیں دیکھنے لگی۔ میں نے بوڑھے کے سلام کا جواب دیا اور آگے بڑھ کر صدر دین کی چوٹوں کا جائزہ لیا۔ بوڑھا صدر دین کا باپ بدر دین تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ چوہدریوں نے اُس کے بیٹے کی مرہم پٹی کیوں نہیں کروائی۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولا "کوئی بات نہیں جی۔ معمولی چوٹیں ہیں۔ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"بابا جی! یہ معمولی چوٹیں ہیں؟" میں نے حیرانی سے کہا "یہ تو چاروں طرف سے سُوجا پڑا ہے۔ اسے تو اُسی وقت اسپتال بھجوانا

چاہیے تھا۔ حد ہو گئی بے پروائی کی۔"

"تھانیدار صاحب! گریب آدمی اپنی مرجی سے کچھ نہیں کر سکتا۔" بوڑھے بدر دین نے کہا۔ "اساں کو اسپتال جانے کی اجازت نہیں تھی۔ حکیم صاحب نے جو مرہم دی تھی وہ لگا رہے ہیں۔ رب سوہنے دا حکم ہو یا تے بندہ چنگا ہو جاوے گا۔"

اُس کا اشارہ بڑا واضح تھا۔ چوہدری رستم علی نے اُس کے بیٹے کو اسپتال لے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ غالباً وہ نہیں چاہتے تھے کہ بات پولیس تک پہنچے۔ ایسی صورت میں اُنھیں اپنے طور پر طبی امداد کا انتظام کرنا چاہیے تھا کیونکہ صدر دین اُن کا ملازم تھا۔

نذیراں بی بی میرے لیے ایک موڑھا اٹھا لائی اور اپنی بیٹی سے بولی: "سکینہ! تھانیدار ہوراں نوں پکھا جھل۔"

میں موڑھے پر بیٹھ گیا اور صدر دین سے پوچھا: "صدر دین! کیا بات ہوئی تھی؟ تم نے کسی کو پہچانا یا نہیں؟"

"ناں جی! میں نے کسی کو نہیں پہچانا!" اُس نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ "اُنھوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور اچانک ہی جھاڑیوں سے نکل کر سڑک پر آ گئے تھے۔ دو پیچھے کی طرف تھے اور ایک نے آگے کی طرف سے تانگا روکنے کا حکم دیا۔ جناب! میں نے تانگا دوڑانے کی بڑی کوشش کی مگر میری کوئی پیش نہیں چلی۔ دونوں بیبیاں پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ گھوڑا بھی دوسرے گھوڑوں کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے اُگی ہوئی جھاڑیوں میں گھس گیا اور زور زور سے ہنہنانے لگا۔ تانگا رُکتے ہی میں نے نیچے چھلانگ لگائی اور ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ ایک ڈاکو نے گھوڑا میرے اوپر چڑھا دیا۔ میں چوٹ کھا کر کھائی میں گر گیا۔ اتنے میں ڈاکوؤں نے بیبیوں کو اپنے گھوڑوں پر ڈالا اور غائب ہو گئے۔ میں نے اُٹھ کر گھوڑے کو تھپکی دی اور فوراً گاؤں روانہ ہو گیا۔ تھانیدار صاحب! میرا کوئی قصور نہیں ہے جی۔ میں ڈاکوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔"

میں نے حیرت سے اُس کی بات سُنی۔ اُس کے چہرے اور جسم پر جو چوٹیں نظر آ رہی تھیں وہ ایک دفعہ گھوڑا چڑھانے سے نہیں آ سکتی تھیں۔ نیز چہرے پر جو چوٹیں نظر آ رہی تھیں، وہ کسی کند آلے کی چوٹیں معلوم ہوتی تھیں۔ اُس نے پوری بات نہیں بتائی تھی۔

"صدر دین! ڈاکوؤں کے پاس تم نے کوئی ہتھیار وغیرہ بھی دیکھے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک ڈاکو کے ہاتھ میں مجھے پستول نظر آیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے دو کے پاس بھی پستول ہی ہوں۔"

"تم نے اُن کے پاس کوئی لاٹھی یا ڈنڈا وغیرہ تو نہیں دیکھا؟"

"ناں جی! مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔"

میں نے کہا: "تانگا رُکنے کے بعد جب تم نیچے اُترے اور بیبیوں کی مدد کرنے کی کوشش کی تو ایک ڈاکو نے اپنا گھوڑا تم پر چڑھا دیا اور تم کھائی میں جا گرے۔ اُس کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"اُس کے بعد کیا ہونا تھا۔ میں کھائی سے باہر نکلا تو ڈاکو بیبیوں سمیت وہاں سے جا چکے تھے۔"

"صدر دین! یہ تمھارے چہرے پر جو چوٹیں ہیں، یہ کیسے آئی ہیں؟"

وہ کچھ دیر چھت کو گھورتا رہا، پھر بولا: "جناب! یہ چوٹیں بھی قسمت میں لکھی تھیں۔"

قبل اس کے کہ میں اگلا سوال کرتا، اُس کا بوڑھا باپ بولا —

"تھانیدار صاحب! جب نوکر اپنے مالک کی امانت کی حفاظت نہیں کر سکتا تو اُسے چوٹیں تو کھانا ہی پڑتی ہیں۔"

"میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اسے چوہدریوں نے مارا ہے۔"

صدر دین کچھ نہیں بولا۔ میں نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ صدر دین کو جوان کو چوہدریوں نے مارا تھا۔ جبکہ شیر علی نے کہا تھا کہ اُس جاہل کو اسے مل کر ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ صدر دین کا قصور کوئی نہیں تھا لیکن چوہدریوں نے اپنا غصہ تو نکالنا ہی تھا۔

"صدر دین! کیا یہ ٹھیک ہے کہ تمھیں چوہدریوں نے مارا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی گل نہیں جی نا!" اُس نے عاجزی سے کہا۔ "نوکر داں نوں مالک کا غصہ بھی سہنا پڑ سکتا ہے۔"

نذیراں بی بی جو ابھی تک چپ بیٹھی تھی، ایک دم پھٹ پڑی، بولی: "تُسی سانوں کی کھاندے او، ان ظالماں نے شالا ایہناں دی بیڑی بُڈ جائے۔ ہائے وے ربا! تیری کرنی دیاں لیراں لاچھڈیاں نے۔ اللہ کرے ایہناں دی حویلی نوں اگ لگ جاوے ...."

بوڑھے بدر دین نے اُٹھ کر جلدی سے اپنی بہو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بولا: "صبر کر نذیراں بی بی! صبر کر۔ چوہدریوں کے کانوں تک تیری آواز پہنچ گئی تے ساڈی کھوندی عزت وی لیراں ہو جاوے گی۔ صبر کر۔ رب سوہنا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ صبر کرنے والوں کی فریاد سنتا ہے۔"

نذیراں زار و قطار رونے لگی۔ روتے ہوئے بولی: "کسی گل دے تھانیدار سیتے پھرتے او۔ رب نوں کی جواب دیو گے۔ ہائے وے ربا! ایہناں چوہدریاں نوں آپ ہی پُچھ لے۔"

"صدر دین! کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "تم کیوں نہیں کچھ بولتے۔ اگر تم رپٹ نہیں لکھواؤ گے تو ہم کارروائی کیسے کریں گے۔ چوہدریوں نے کیا کیا ہے تمھارے ساتھ؟"

"ہونہہ ... رپٹ!" بوڑھے بدر دین نے کہا۔ "تھانیدار صاحب! رپٹوں سے کیا ہوتا ہے؟ تُسی چوہدریوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اگر ہم نے رپٹ لکھا دی تو کل ہماری لاشیں اُٹھانے والا کوئی نہیں ملے گا۔"

بات وہ ٹھیک کہتا تھا۔ ایک غریب کوچوان کی رپورٹ پر چوہدریوں کے خلاف کارروائی کرنا مشکل کام تھا۔ اوّل تو اُس کے حق میں گواہی دینے والا کوئی نہ ملتا اور دوسری بات یہ کہ چوہدری اُسے اور اُس کے گواہوں کو عدالت تک پہنچنے کی مہلت ہی نہ دیتے۔

میں نے نذیراں بی بی سے پوچھا: "بی بی! یہ لڑکی کا کیا قصہ ہے؟"

"کچھ نہیں! کچھ نہیں!" بوڑھے بدر دین نے جلدی سے کہا۔ "کوئی [illegible] نہیں ہے۔"

نذیراں بی بی بھی کچھ نہیں بولی۔ میں نے صدر دین سے ڈاکوؤں کے حلیے اور گھوڑوں کے رنگ وغیرہ کے بارے میں کچھ سوالات کیے [illegible] وہ کوئی واضح بات نہ بتا سکا۔ اُسے ڈاکوؤں کی گرفتاری سے کوئی [illegible] نہیں تھی۔ بلکہ شاید وہ چوہدریوں کے سلوک کے بعد ریحانہ اور [illegible] بیگم کے اغوا پر خوش تھا۔

جب ہم باہر نکلے تو گھوڑوں کی نگرانی کرنے والا سپاہی ایک [illegible] کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اُس شخص نے ہمیں سلام کیا، اپنا [illegible] علی بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ گاؤں کے پرائمری اسکول [illegible] تھا۔ اُس نے شلوار قمیص کے اوپر کیسری رنگ کی پگڑی باندھ [illegible] ہاتھ میں اُس کے چھڑی تھی۔ اُس کا گھر قریب ہی تھا۔ وہ [illegible] کے ساتھ ہمیں اپنے گھر لے گیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ [illegible] شربت بنا لائے۔

"[illegible] صاحب! میں نے آپ کی بڑی تعریف سُنی تھی۔" اُس [illegible] مجھے آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ اچھا ہوا آج آپ [illegible] میں آپ کی چوہدریوں جیسی خدمت تو نہیں کر سکتا [illegible] خواہش ہے کہ دوپہر کا کھانا آپ میرے غریب خانے [illegible]"

"[illegible] کا شکریہ!" میں نے کہا۔ "ہم زیادہ دیر نہیں رُک سکتے۔ [illegible] پتا ہی ہو گا کہ چوہدری رستم علی کے گھر کی دو عورتیں اغوا ہو گئی [illegible] کا خیال ہے کہ یہ حرکت دوست محمد اعوان کی ہے۔"

[illegible] دیر چپ بیٹھا رہا، پھر پوچھا: "صدر دین نے آپ کو [illegible]؟"

"[illegible] خاص بات نہیں بتائی۔ اُس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے [illegible] نے اُسے بہت مارا ہے۔"

[illegible] نے پُر تاسف انداز میں سر ہلایا، پھر بولا: "کل جس وقت [illegible] پہنچا، اُس وقت میں وہیں تھا۔"

"آپ کے سامنے کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

"[illegible] صاحب! میں یہی بات آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ بات [illegible] غریب آدمی بڑا بے بس ہوتا ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کل جو ظلم میں نے دیکھا ہے اُسے میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ میں اپنا فرض سمجھتے ہوئے سارا قصہ آپ کو سُنا دیتا ہوں۔ آپ اس علاقے کے تھانیدار ہیں۔ اگر آپ اس ظلم کو روکنے کے لیے کچھ کر سکتے ہوں تو ضرور کریں۔ ہم لوگ تو کچھ نہیں کر سکتے۔ شاید یہ سب کچھ ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔"

اُس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ وہ چوہدری رستم علی کے گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا ہے۔ گزشتہ روز صدر دین کوچوان بین کرتا ہوا حویلی پہنچا۔ چوہدری رستم علی، اُس کے دونوں بیٹے اور دیگر افرادِ خانہ شور کی آواز سُن کر صدر دروازے کی طرف بھاگے۔ ماسٹر فیروز علی اُس وقت بیٹھک میں بچوں کو پڑھا رہا تھا۔ وہ بھی صدر دروازے پر پہنچ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ صدر دین کے کپڑوں پر خون لگا ہوا تھا اور وہ سینہ کوبی کر رہا تھا۔ تانگا ایک طرف کھڑا تھا اور گھوڑا ابھی زور زور سے ہنہنا رہا تھا۔

شیر علی نے جب دیکھا کہ تانگا خالی ہے تو اُس نے تیزی سے آگے بڑھ کر صدر دین کا گریبان پکڑ لیا اور اُس سے پوچھا کہ وہ عورتوں کو کہاں چھوڑ آیا ہے۔

صدر دین نے ہاتھ جوڑ دیے اور کانپتے ہوئے بولا: "چوہدری صاحب! بیبیوں کو ڈاکو اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ یہ دیکھیں، اُنھوں نے مجھے بھی زخمی کر دیا ہے۔ میں اکیلا تھا جی! کچھ نہ کر سکا۔"

یہ سُن کر چوہدری رستم علی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے صدر دین کے منہ پر گھونسے اور تھپڑ مارتے ہوئے کہا: "اوئے نمک حرام! اگر تو کمزور تھا تو زندہ کیوں واپس آ گیا؟ تو نے ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے جان کیوں نہ دے دی؟ کون تھے وہ کتے؟ کس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے؟"

"اُنھوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے جی! میں اُن کی شکلیں نہیں دیکھ سکا۔"

شیر علی اندر سے بید کی چھڑی نکال لایا اور صدر دین کو بُری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ صدر دین کی دردناک چیخیں سُن کر پورا گاؤں جمع ہو گیا مگر کسی کو شیر علی کا ہاتھ روکنے کی ہمت نہ ہوئی۔ صدر دین مار کھاتے کھاتے زمین پر گر پڑا۔ اُس کا چہرہ لہولہان ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد چار آدمی صدر دین کو چارپائی پر ڈال کر اُس کے گھر چھوڑ آئے لیکن چوہدریوں کے انتقام کی آگ ابھی سرد نہیں ہوئی تھی۔ رات کے ساڑھے دس بجے چوہدری رستم علی کا چھوٹا بیٹا امیر علی دو آدمیوں کے ہمراہ صدر دین کے گھر پہنچا اور اُس کی بیٹی شریفاں کو اُٹھا کر لے گیا۔

اگلی صبح جب شریفاں گھر پہنچی تو اُس کا سب کچھ اُجڑ چکا تھا۔ ماسٹر فیروز علی نے جب بات ختم کی تو اُس کی آنکھوں سے آنسو

بہہ رہے تھے۔

مجھے یاد آیا کہ صدر دین کے گھر کے اندرونی کمرے سے کسی لڑکی کی ہچکیوں اور سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ لڑکی اپنے باپ کی حالت پر آنسو بہا رہی تھی حالانکہ نذیراں بی بی نے اپنی بیٹی کا ذکر بھی کیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ لڑکی اپنی بربادی پر نوحہ کناں تھی۔

"ملک صاحب! ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔" میرے ایک ساتھی نے کہا۔ "یہ قابلِ دست اندازیِ پولیس کیس ہے۔"

"ہاں ہے تو سہی۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم دیکھ چکے ہو کہ صدر دین یا اُس کا باپ مدعی بننے کے لیے تیار نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ ہمیں کوئی گواہ بھی نہیں ملے گا۔ کیوں جی ماسٹر صاحب! آپ گواہی دیں گے؟"

ماسٹر فیروز علی تامل کرتے ہوئے بولا۔ "میں گواہی دینے کے لیے تیار ہوں لیکن آپ کو میری حفاظت کی ضمانت دینا ہوگی۔"

وہ جانتا تھا کہ میں اُس کی حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکتا تھا۔ لہٰذا وہ گواہی نہیں دے سکتا تھا۔

صدر دین کے حالات سُن کر میرا دل بہت دکھی ہو گیا تھا۔ میرا جی یہ چاہتا تھا کہ رستم علی کے دونوں بیٹوں کو گرفتار کر لوں اور تھانے لے جا کر بند کر دوں لیکن میں جانتا تھا کہ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا بلکہ اس سے صدر دین کے لیے مزید مشکلات پیدا ہوں گی۔ بہرحال میں نے اتنا ضرور کیا کہ صدر دین اور اُس کی بیٹی شریفاں کو اپنی نگرانی میں اسپتال پہنچا دیا۔

گاؤں سے رُخصت ہونے سے پہلے ہم کچھ اور لوگوں سے بھی ملے اور چھورے ماچھی کے بارے میں سُن گُن لینے کی کوشش کی مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ ہمیں اُس کی شکل و صورت یا حُلیے کا کوئی علم نہیں تھا۔ چوہدری رستم علی اپنی وسیع حویلی میں بیسیوں آدمی چھپا سکتا تھا۔

تقریباً ساڑھے تین بجے ایک نوجوان جس نے نفیس لباس اور قراقلی کی ٹوپی پہن رکھی تھی، بڑی شان سے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے تیکھی قسم کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں اور عمر اُس کی کوئی تئیس چوبیس سال کے قریب تھی۔ میں اُس کی شکل دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ چوہدری رستم علی کا چھوٹا بیٹا امیر علی تھا۔

"حاضر ہو سکتا ہوں جناب؟" اُس نے اندر داخل ہونے کے بعد کہا۔

"کون ہو تم؟" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "باہر کھڑے ہو کر اجازت لو۔ جسے دیکھو منہ اُٹھائے چلا آ رہا ہے۔"

اُس نے اپنا تعارف کرانے کی کوشش کی۔ بولا۔ "ملک صاحب! میں چوہدری رُس۔۔۔"

"تم نے سُنا نہیں؟" میں نے اُس کی بات کاٹی۔ "باہر انتظار کرو۔ یہ چوپال نہیں ہے۔ تھانیدار کا کمرہ ہے۔"

وہ باہر چلا گیا۔ اُس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا تھا۔

اُس کو باہر نکالنے کے بعد میں نے حوالدار کو اپنے کمرے میں بلایا اور اونچی آواز میں کہا۔ "حوالدار! ذرا خیال رکھنا۔ چوہدری رستم علی کی حویلی سے اگر کوئی آدمی آئے تو اُسے فوراً میرے پاس بھیج دینا!"

میں نے یہ بات امیر علی کو سُنانے کے لیے کہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ غصے میں واپس چلا جائے۔ حوالدار باہر گیا اور لمحہ بھر بعد امیر علی کو ساتھ لے کر اندر آ گیا۔

"اس کو تو میں نے ابھی ابھی باہر بھیجا تھا۔" میں نے حوالدار سے کہا۔ "تم پھر اسے اندر لے آئے۔"

"یہ چوہدری رستم علی کا بیٹا امیر علی ہے۔" حوالدار نے کہا۔

"اچھا اچھا!" میں نے کہا۔ "تم نے بتایا کیوں نہیں کہ تم چوہدری کے بیٹے ہو۔ بیٹھو۔"

"ملک صاحب! آپ نے تو مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔" اُس نے کہا۔ "میں تو واپس جانے لگا تھا۔"

میں نے حوالدار سے کہا۔ "روزنامچہ وغیرہ لے آؤ۔ امیر علی رپٹ لکھوانے آیا ہے۔"

"ملک صاحب! صبح آپ ہمارے گاؤں آئے تھے مگر آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ بہت افسوس ہوا۔" اُس نے میرے بولنے کا انتظار کیا۔ پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ہمیں پتا چلا ہے کہ آپ نے صدر دین کو یہاں اسپتال میں داخل کرا دیا ہے۔ میں اُس کا نام بھی لکھانا چاہتا ہوں۔ ہمارا خیال ہے کہ اغوا اُس کی بھگت سے ہوا ہے۔ بڑا کمینہ آدمی ہے۔ ہم نے اس پر کبھی شک نہیں کیا تھا۔"

"برخوردار! کوئی عقل کی بات کرو۔" میں نے کہا۔ "صدر دین تمھارا ملازم ہے۔ تمھاری حویلی کا آدمی ہے۔ اگر میں نے اس کا نام رپٹ میں لکھ دیا تو یہ بات تمھارے خلاف جائے گی۔ چوہدری دوسروں کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ واردات حویلی کے ملازموں نے کی ہے۔ اُسے تمھارے ہی آدمیوں کو تمھارے خلاف استعمال کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اپنے ملازموں کو ہمیشہ خوش رکھنا چاہیے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" اُس نے کہا۔ "ویسے سچ پوچھیں تو ہمیں اُس پر غصہ بہت ہے۔"

"سچ کہتے ہو۔" میں نے کہا۔ "غریب آدمی پر سب ہی کو غصہ آتا ہے۔"

حوالدار رجسٹر لے کر میرے کمرے میں پہنچ گیا اور رپورٹ درج کرنے لگا۔ امیر علی سے سوال و جواب کے دوران پتا چلا کہ

صادقہ بیگم اپنے والدین سے ملنے قصبے آئی تھی۔ میں نے اُس کے باپ کا پتا اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ اُس کا نام منظر حسین تھا اور وہ منیاری کی دکان کرتا تھا۔ میرے ذہن میں فوراً یہ سوال پیدا ہوا کہ ایک منیاری فروش کی بیٹی کا اتنے بڑے جاگیردار سے رشتہ کیسے جُڑ گیا؟

امیر علی کو فارغ کرنے کے بعد میں نے کچھ ضروری کام نمٹائے اور پتا پوچھتا ہوا منظر حسین کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے اپنے ساتھ کسی کو نہیں لیا تھا۔ دروازہ ایک بوڑھی عورت نے کھولا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ خاصی پریشان ہے۔ میں نے اُسے سلام کیا اور کہا کہ میں صادقہ بیگم کے کسی رشتے دار سے ملنا چاہتا ہوں۔ عورت نے بتایا کہ وہ صادقہ بیگم کی ماں ہے۔ بعد میں اُس کا نام فاطمہ بی بی معلوم ہوا۔

میری درخواست پر وہ مجھے ایک سادہ سی بیٹھک میں لے گئی تاہم وہ اپنی بیٹی کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ کمرے میں دو افراد اور آ گئے تھے۔ ایک اُس کی بہو اور دوسرا اُس کا بیٹا تھا۔ بیٹے کا نام غالباً شبیر حسین تھا۔

"ماں جی! ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ کی بیٹی صادقہ بیگم کو کل ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا ہے۔ اُس کے ہمراہ چوہدری رستم علی کی بھانجی ریحانہ بھی تھی۔ آپ کی بیٹی کل آپ سے ملنے آئی تھی اور غالباً تین ساڑھے تین بجے ریحانہ کے ہمراہ تانگے میں واپس روانہ ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے امیر علی اغوا کی رپورٹ لکھوا کر گیا ہے۔"

"اچھا!" فاطمہ بی بی نے حیرانی سے کہا۔ "وہ تو کہتے تھے کہ پولیس کو اس معاملے کی خبر نہیں ہونا چاہیے۔"

"کمال ہے!" شبیر حسین نے کہا۔ "آج صبح چوہدری کا آدمی ہمیں تاکید کر گیا تھا کہ یہ بات باہر نہ نکلے۔ اب انھوں نے خود ہی رپورٹ بھی درج کرا دی ہے۔ ان لوگوں کا کوئی دین ایمان نہیں ہے۔"

اُس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی بہن کے سسرال والوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔

میں نے فاطمہ بی بی سے کہا۔ "ماں جی! کل آپ کی بیٹی چھ سات گھنٹے آپ کے پاس رہی تھی۔ آپ نے اُس کی روانگی کے وقت کوئی خاص بات تو محسوس نہیں کی؟ یا کسی مشکوک آدمی کو تانگے کے آس پاس تو نہیں دیکھا؟"

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔" فاطمہ بی بی نے جواب دیا۔ "صادقہ نے دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھایا تھا اور ٹھیک ٹھاک تھی۔ اُس نے دو بجے ہی تانگے کا انتظار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ریحانہ تانگے سے اُتر کر اندر آئی تھی اور کھڑے کھڑے واپس چلی گئی تھی۔ میں نے اُسے بیٹھنے کے لیے بہت کہا تھا مگر وہ کہنے لگی کہ دیر ہو جائے گی۔ صادقہ تو پہلے ہی تیار بیٹھی تھی۔ دونوں جا کر تانگے میں بیٹھ گئیں اور تانگا روانہ ہو گیا۔"

میں نے محسوس کیا کہ فاطمہ بی بی کی بہو کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن شاید اپنی ساس کی موجودگی میں جھجک رہی تھی۔ میں نے اُس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "بی بی! صادقہ خریداری وغیرہ کرنے بھی گئی تھی؟"

"نہیں جی!" اُس نے جواب دیا۔ "میں نے اُسے کہا بھی تھا کہ خریداری کرنے چلتے ہیں مگر وہ راضی نہیں ہوئی۔ بہت چُپ چُپ تھی۔ اُس نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا تھا۔"

"ماں جی! برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟" میں نے فاطمہ بی بی سے پوچھا۔ "آپ نے چوہدریوں کے ساتھ کیسے رشتہ جوڑ لیا؟"

اُس نے افسردگی سے جواب دیا۔ "بس جی! ہونے والی ہو کر رہتی ہے۔ ہم نے کیا رشتہ جوڑنا تھا۔"

تھوڑی دیر بعد شبیر حسین اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ میں دونوں عورتوں سے باتیں کرتا رہا۔ چند لمحوں کے بعد اندر سے کسی بچے کے رونے کی آواز سُنائی دی۔ یہ آواز سُن کر فاطمہ بی بی بھی اندر چلی گئی۔ اس اثنا میں میں بھی رُخصت ہونے کے لیے اُٹھ چکا تھا۔

"تھانیدار صاحب! میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔" فاطمہ بی بی کی بہو نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ صادقہ کی اپنے آدمی سے ان بن ہو گئی ہے۔ کل وہ بہت پریشان تھی۔"

"کیا اُس نے تمھیں ایسی کوئی بات بتائی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے ٹوہ لینے کی بہت کوشش کی تھی مگر اُس نے کچھ نہیں بتایا۔ یہی کہتی تھی کہ سب ٹھیک ہے لیکن جاتے وقت وہ اپنا سارا زیور میرے پاس رکھوا گئی ہے۔ کہتی تھی کسی کو بتانا نہیں۔ گھر میں کسی کو یہ بات معلوم نہیں ہے۔"

وہ یہ بات کر ہی رہی تھی کہ اُس کی ساس ایک شیرخوار بچے کو گود میں اُٹھائے ہوئے واپس آ گئی۔ بچہ رو رہا تھا۔ اس لیے میرا اندازہ ہے کہ ساس نے بہو کی بات نہیں سُنی تھی۔ اُس کی بات نے مجھے شش و پنج میں ڈال دیا۔ اگر صادقہ کی چوہدری رستم علی سے ان بن ہو گئی تھی تو کوئی عجب نہیں کہ اغوا میں اُسی کا ہاتھ ہو۔ ایک امکان اور بھی تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ان بن رستم علی کی پہلی بیوی یا اُس کی اولاد سے ہوئی ہو اور صادقہ نے اپنا مستقبل خطرے میں دیکھ کر زیور اپنی بھابی کی تحویل میں دے دیا ہو۔ ایسی صورت میں اغوا میں شیر علی یا امیر علی کا ہاتھ بھی ہو سکتا تھا لیکن ریحانہ بھی ساتھ تھی۔ غالباً ریحانہ کو اس لیے ساتھ اغوا کر لیا گیا تھا کہ حویلی کے کسی آدمی پر شک نہ جائے۔

اس قسم کے خیالات میں اُلجھے ہوئے میں نے گلی میں قدم رکھا۔ ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ ایک نوجوان جو قریبی مکان کے محرابی دروازے میں کھڑا تھا جلدی سے میری طرف بڑھا۔ اُسے میں پہلے بھی گلی میں دیکھ چکا تھا۔ اُس کی عمر اٹھائیس تیس سال کے لگ بھگ تھی۔

اُس نے مجھے سلام کرنے کے بعد کہا۔ "تھانیدار صاحب! میرا نام ایاز احمد ہے۔ میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں رُک گیا

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا: "آپ لامبا صادقہ بیگم کے اغوا کے بارے میں تفتیش کر رہے ہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس اغوا میں چوہدری رستم علی کی اولاد کا ہاتھ ہے۔"

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا: "اور تمھاری معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟"

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر بولا: "میں صادقہ بیگم کا کزن ہوں اور یہ سامنے ہمارا گھر ہے۔ اگر آپ کو جلدی نہ ہو تو چند منٹ کے لیے اندر تشریف لے آئیں۔ میں آپ کو کچھ تفصیل بتانا چاہتا ہوں۔"

میں نے کچھ سوچ کر یہ سوچا پھر نوجوان کے ہمراہ اندر چلا گیا۔

رسمی کلمات کے بعد آیاز احمد نے کہا: "ملک صاحب! صادقہ میری منگیتر تھی اور اگر رستم علی اُسے اغوا نہ کروالیتا تو اس وقت وہ میری بیوی ہوتی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے پوچھا: "میرا خیال ہے کہ تھانے میں اغوا کی ایسی کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی گئی۔"

"جی ہاں! اُس اغوا کی رپورٹ تھانے میں درج نہیں کروائی گئی تھی۔" اُس نے کہا: "کیونکہ رستم علی نے اپنے بدمعاشوں کے ذریعے صادقہ کے گھر والوں کو خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی۔"

اُس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ وہ واقعہ دو سوا دو سال پہلے پیش آیا تھا۔ صادقہ بیگم اُن دنوں اسکول میں پڑھاتی تھی۔ ایک روز اتفاق سے چوہدری رستم علی نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ اپنی بھانجی ریحانہ کے ساتھ تھی۔ تجھے کیا تھا اور اُسے اسکول چھوڑ کر بازار جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اُس نے صادقہ کو دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اُس کا گرویدہ ہو گیا۔ چند روز تک وہ صادقہ بیگم کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا رہا، پھر اس نے اپنی بھانجی کے ذریعے اُسے کھانے کی دعوت بھجوائی۔ صادقہ کو اس دعوت پر بہت تعجب ہوا۔

"تمھارے ماموں نے میری دعوت کی ہے؟" اُس نے ریحانہ سے پوچھا: "لیکن میں تو اُنھیں نہیں جانتی۔ پھر میں اکیلی کیسے جاسکتی ہوں تمھارے گاؤں!"

"میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔" ریحانہ نے کہا: "ہمارا اپنا تانگا ہے۔ کھانے کے بعد تانگا آپ کو واپس چھوڑ جائے گا۔"

"لیکن کیوں؟" صادقہ نے زور دے کر پوچھا: "تمھارے ماموں نے میری دعوت کیوں کی ہے؟"

"اُنھیں جو شخص اچھا لگتا ہے، وہ اُسے حویلی میں بلانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔"

"ریحانہ! تمیز سے بات کرو۔" صادقہ نے غصے سے کہا: "کیا مطلب ہے تمھارا اس بات سے؟"

"جی! مطلب تو بالکل سیدھا ہے۔ آپ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہیں۔ چند روز پہلے ماموں میرے ساتھ یہاں آئے تھے۔ جب ہمارا تانگا اسکول کے سامنے رُکا تو آپ سامنے سے آ رہی تھیں۔ ماموں نے آپ کو دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔"

صادقہ نے بے اختیار ریحانہ کے مُنہ پر تھپڑ مار دیا۔ غصے سے بولی: "بکواس مت کرو۔ ایسے بے ہودہ ہیں تمھارے ماموں اسکول کی ٹیچروں کو تاکتے ہیں۔ آئندہ اُن کا نام بھی نہ لینا میرے سامنے۔ جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔"

ریحانہ نے گھر جا کر یہ ساری باتیں اپنے ماموں کو بتادیں۔ ایک معمولی ٹیچر کی لن ترانی سُن کر چوہدری رستم علی سخت غصے سے بھر گیا۔ اُس نے ریحانہ سے کہا: "اپنی اُستانی سے کہہ دینا کہ ہماری عنقریب ملاقات ہوگی۔"

صادقہ نے اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اُسے وہم بھی نہیں تھا کہ وہ ایک جاگیردار کی دھمکی تھی۔

اس کے دس بارہ روز کے بعد صادقہ بیگم اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلی لیکن اسکول نہ پہنچ سکی۔ چوہدری رستم علی کے غنڈوں نے اُسے اتنی صفائی کے ساتھ اغوا کیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ گھر والے یہی سمجھتے رہے کہ اُن کی بیٹی اسکول میں بچیوں کو پڑھا رہی ہے۔

دس بجے کے قریب چوہدری رستم علی، صادقہ کے گھر پہنچا اور اُس کے باپ مظہر حسین کو دکان سے بلوا کر اس کو بیٹی کے ہاتھ کا لکھا ہوا رقعہ دیا۔ رقعہ بہت مختصر تھا۔ صادقہ نے لکھا تھا: "پیارے ابا! میں اس وقت چوہدری رستم علی کی حویلی میں ہوں۔ اگر آپ مجھے زندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو گھر کے تمام افراد کے ہمراہ فوراً یہاں پہنچ جائیں۔ محلے والوں کو کچھ نہ بتائیں۔ آپ کی بیٹی صادقہ۔"

مظہر حسین رقعہ پڑھ کر گھبرا گیا۔ اُس نے چوہدری رستم علی سے پوچھا: "چوہدری صاحب! یہ کیا معاملہ ہے؟ صادقہ تو صبح گھر سے اسکول گئی تھی۔ وہ آپ کی حویلی کیسے پہنچ گئی؟"

"مظہر حسین! کبھی کبھی راستے لمبے ہو جایا کرتے ہیں۔" چوہدری رستم علی نے جواب دیا: "اور سنو! سوال جواب میں وقت ضائع نہ کرو۔ تمھاری بیٹی پریشان ہو رہی ہوگی۔ تم لوگ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں نے دو تانگے اور منگوا لیے ہیں۔ باقی باتیں وہاں چل کر کریں گے۔"

پریشان حال مظہر حسین اپنے دو بیٹوں، ایک بہو، ایک بیٹی اور بیوی کے ہمراہ تانگے میں جا بیٹھا۔ چوہدری رستم علی کا اصرار تھا گھر کے سب افراد ساتھ جائیں گے۔

تینوں تانگے حویلی کے بجائے گاؤں کے ایک پختہ مکان کے سامنے پہنچ کر رُک گئے۔ مکان کے باہر نصف درجن مسلح افراد موجود تھے۔ کچھ آدمی بیٹھک میں انتظار کر رہے تھے۔ اُن میں ایک مولوی صاحب بھی تھے۔

چوہدری رستم علی، مظہر حسین اور اُس کی بیوی فاطمہ بی بی کو الگ کمرے میں لے گیا اور اُنھیں بتایا کہ وہ اُن کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اگر

وہ خوشی سے اجازت دے دیں گے تو اُن کی عزت محفوظ رہے گی۔

"چوہدری صاحب! میں عزت دار آدمی ہوں۔" بوڑھے مظہر حسین نے کہا: "میری بیٹی کا اور آپ کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ آپ یہ ظلم نہ کریں اور صادقہ کو ہمارے ساتھ جانے دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

"مظہر حسین! میں نے تمھاری عزت بچانے کے لیے ہی تمھیں یہاں بلایا ہے۔" چوہدری رستم علی نے نخوت سے کہا: "صادقہ نے میری بھانجی کے مُنہ پر تھپڑ مارا تھا اور مجھے گالیاں دی تھیں۔ اب وہ یہاں سے واپس نہیں جائے گی۔ تم شادی پر راضی ہو یا نہ ہو، بیٹی تمھاری یہیں رہے گی۔ اُس کی شادی کر دو گے تو وہ عزت سے رہے گی، نہیں تو ذلت سے رہے گی۔ صادقہ ساتھ والے کمرے میں ہے۔ اُس کے پاس چلے جاؤ اور مشورہ کر لو۔"

اُس نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور خود باہر چلا گیا۔

کمرے میں صادقہ بیگم کے علاوہ دو عورتیں اور بھی تھیں۔ صادقہ کا دہشت سے بُرا حال تھا۔ اُس نے اپنے ماں باپ کو دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فاطمہ بی بی بھی رونے لگی۔

کمرے میں موجود ایک عورت نے فاطمہ بی بی سے کہا: "بہن! یہ تمھاری بیٹی کی خوش نصیبی ہے کہ چوہدری صاحب نے اس کے لیے شادی کا پیغام دیا ہے، ورنہ وہ اسے ایسے ہی اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔ ایسے قصے یہاں بہت ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی لڑکیاں یا تو کچھ کھا کر ہمیشہ کی نیند سو جاتی ہیں یا پھر کسی بازار میں پہنچادی جاتی ہیں جہاں سے وہ کبھی واپس نہیں آسکتیں۔ چپ چاپ ہاں کر دو۔ عزت بنی رہے گی۔"

میاں بیوی کو بیٹی کی عزت بچانے کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک گھنٹے تک سوچ بچار کرنے کے بعد اُنھوں نے ہاں کر دی اور صادقہ بیگم آہوں اور ہچکیوں کے درمیان چوہدری رستم علی کی بیوی بن گئی۔

"جناب! یہ ہے صادقہ بیگم کی شادی کا المیہ۔" ایاز احمد نے بات ختم کرنے کے بعد کہا: "اب کچھ عرصے سے رستم علی کی پہلی بیوی اور اُس کے بیٹوں نے صادقہ کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اغوا کا ڈراما اُنھوں نے ہی رچایا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اُنھوں نے صادقہ کو قتل نہ کر دیا ہو۔"

میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا: "ہم تمھاری فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں تفتیش کو آگے بڑھائیں گے اور مجرموں کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کریں گے۔"

جب میں تھانے پہنچا تو چوہدری دوست محمد کو اپنا منتظر پایا۔ رسمی کلمات کے بعد اُس نے کہا: "ملک صاحب! بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ نے میرا بھیجا ہوا تحفہ واپس کر دیا۔ میں نے کسی غلط نیت سے تو تحفہ نہیں بھیجا تھا۔"

"چوہدری صاحب! آپ کی نیت کا تو مجھے کچھ پتا نہیں، مگر جس کے ہاتھ آپ نے تحفہ بھیجا تھا، وہ بڑا غلط آدمی تھا۔ وہ قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی بات کر رہا تھا۔ بہرحال اس بات کو چھوڑیں، یہ اغوا کا کیا قصہ ہے؟ چوہدری رستم علی نے آپ کے خلاف پرچہ کٹوایا ہے کہ آپ نے اُس کی بھانجی اور بیوی کو اغوا کر وایا ہے۔"

"کیا!" اُس کی حیرانی بہت اصلی تھی: "اُس بڈھے کھوسٹ کی بیوی کو کسی نے اغوا کر کے کیا کرنا تھا؟ ہم نے تو صرف اُس کی بھانجی کے اغوا کی خبر سُنی تھی۔ یہ بیوی کب اغوا ہوئی ہے؟"

"چوہدری صاحب! اگر یہ ایکٹنگ ہے تو بڑی عمدہ ایکٹنگ ہے۔" میں نے کہا: "بہرحال میں آپ کے سوال کا جواب ضرور دوں گا۔ چوہدری رستم علی کی بھانجی اور بیوی کل تین اور چار بجے کے درمیان اغوا کی گئی ہیں۔ دونوں تانگے میں اپنے گاؤں جا رہی تھیں۔ راستے میں تین ڈاکوؤں نے، جنھوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے، اُنھیں اغوا کر لیا۔ چوہدری رستم علی کی بیوی کا نام صادقہ بیگم ہے اور وہ اس کی دوسری بیوی ہے۔ نوجوان اور خوبصورت بھی ہے۔"

"ملک صاحب! میں کوئی متقی پرہیزگار آدمی نہیں ہوں لیکن میں نے کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ اغوا کی اس واردات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے آپ کے اے ایس آئی کو اپنی پوری حویلی دکھا دی ہے۔"

اگرچہ چوہدری دوست محمد میں بھی جاگیرداروں والی خصوصیات موجود تھیں مگر وہ قدرے معقول آدمی تھا اور سوچ سمجھ کر قدم اُٹھاتا تھا۔ مجھے اُس کی بات میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتا تھا۔

"چوہدری صاحب! میں آپ کی بات پر شک نہیں کرتا۔" میں نے کہا: "مگر ہو سکتا ہے کہ آپ کی برادری کے کسی فرد نے آپ کے علم میں لائے بغیر یہ کارروائی کی ہو۔ سب لوگ تو آپ جیسے ٹھنڈے مزاج کے نہیں ہو سکتے۔"

"میں آپ کی سوچ پر پابندی نہیں لگا سکتا۔ تھانیداروں کو اسی طرح سوچنا چاہیے لیکن یہ تو محض اندازہ ہے۔ اندازے تو آدمی سو لگا سکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ ساری بات ہی جھوٹ ہے۔ چوہدری رستم علی کے کسی آدمی نے ہماری دشمنی کو ہوا دینے کے لیے ڈراما رچایا ہے لیکن ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہنی ہوئیں۔ اگر کسی نے بُری نیت سے ہمارے گاؤں کا رُخ کیا تو وہ اپنی بربادی کا خود ذمے دار ہوگا۔"

"میں چوہدری رستم علی کے گاؤں گیا تھا۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ ہم نے معاملے کی تفتیش شروع کر دی ہے اور توقع ہے کہ چار چھ دن میں حقیقت سامنے آجائے گی۔"

چوہدری دوست محمد کچھ دیر بیٹھ کر رخصت ہو گیا۔ اُس کے ہمراہ

چار پانچ آدمی تھے، جو سب کے سب مسلح تھے۔

جو اے ایس آئی اُس کے گاؤں گیا تھا، وہ واپس آ گیا تھا۔ اُسے واردات کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اُس نے ایک کھوجی کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور پولیس کے مخبروں کو بھی چوکنا کر دیا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے بعد کھوجی تھانے میں آیا اور اپنے کھوج کی تفصیل مجھے بتائی۔ اُس کے بیان کے مطابق ڈاکوؤں نے رات ایک غیر آباد ڈیرے پر گزاری تھی۔ اُس ڈیرے پر اُس نے ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اور ریحانہ کی کتابیں پڑی ہوئی دیکھی تھیں۔ ان چیزوں کو اُس نے جوں کا توں وہاں پڑا رہنے دیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی کو ساتھ لیا اور کھوجی کے ہمراہ مذکورہ ڈیرے پر پہنچ گیا۔ وہ جگہ جائے واردات سے چار فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ وہاں چند کچے کوٹھے اور ایک وسیع احاطہ بنا ہوا تھا۔ ایک کوٹھے کے سامنے تھوڑی سی جگہ صاف تھی۔ چونکہ وہ گرمیوں کے دن تھے، اس لیے معلوم یہ ہوتا تھا کہ ڈاکوؤں نے رات باہر گزاری تھی۔ ایک کمرے کے اندر ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اور چند کتابیں پڑی تھیں۔ میں نے چوڑیوں کے ٹکڑے اور کتابیں اپنے قبضے میں کر لیں۔ غالباً کمرے کے اندر عورتوں پر مجرمانہ حملہ کیا گیا تھا۔

کھوجی ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ سامنے چنی وال کو جانے والی کچی سڑک ہے۔ گھوڑوں کا کھرا اس سڑک تک جاتا ہے۔ وہاں سے کھرا دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ دو گھوڑوں کا کھرا چنی وال کی طرف جاتا ہے اور ایک گھوڑے کا کھرا چوہدری رستم علی کے گاؤں کی طرف جاتا ہے۔ چنی وال جانے والے دو گھوڑوں میں سے ایک گھوڑا بغیر سوار کے معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس کا کھرا ہلکا ہے۔"

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ "ڈاکوؤں کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ یعنی کل پانچ افراد اور تین گھوڑے تھے۔ ایسی صورت میں گھوڑا بغیر سوار کے کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اس معاملے میں تو میں اندازہ ہی لگا سکتا ہوں۔" کھوجی نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ عورتوں نے ایک ڈاکو کی نگرانی میں کچی سڑک پر سفر کیا تھا۔ یہ سفر انھوں نے کسی گاڑی یا تانگے پر کیا ہو گا لیکن ان کا کھرا مجھے نہیں مل سکا۔ اب دو گھوڑوں کی کہانی بھی سن لیں۔ یہ دونوں چنی وال کے قریب ایک کنوئیں تک گئے تھے۔ وہاں انھوں نے رُک کر غالباً پانی پیا تھا اور دوسری طرف سے چکر لگا کر سڑک کی طرف نکل گئے تھے۔"

"اور جو گھوڑا چوہدری رستم علی کے گاؤں کی طرف گیا تھا، اُس کا کھرا کہاں تک پہنچتا ہے؟"

"اُس کا کھرا گاؤں میں پہنچ کر غائب ہو گیا۔ یا تو وہ گھوڑا ابھی تک گاؤں میں ہی ہے یا پھر کسی چور راستے سے باہر نکل گیا ہے۔"

"تم نے چوہدری رستم علی کے گاؤں میں کسی سے ان باتوں کا ذکر تو نہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"مجبوراً ذکر کرنا پڑا۔" اُس نے جواب دیا۔ "پہلے اُنھیں چوہدری دوست محمد پر شک تھا، اب یقین ہو گیا ہے۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ بات بگڑ گئی تھی۔ دو گھوڑے چنی وال پہنچے تھے اور پھر واپس چلے گئے تھے۔ ایک گھوڑا چوہدری رستم علی کے گاؤں گیا تھا۔ میرا دھیان زیادہ اس طرف جاتا تھا کہ واردات کرنے والے چوہدری رستم علی کے آدمی تھے لیکن انھوں نے چوہدری دوست محمد پر شبہ ڈالنے کے لیے دو گھوڑے چنی وال بھجوا دیے تھے اور وہ گاؤں کے قریب سے ہو کر واپس آ گئے تھے۔ صورتِ حال اس کے برعکس بھی ہو سکتی تھی۔

ہم نے ڈیرے کا اچھی طرح جائزہ لیا اور ڈاکوؤں کے کھرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کچی سڑک پر پہنچ گئے۔ وہاں سے ایک کچی سڑک چنی وال کی طرف جاتی تھی۔ کھوجی ہمیں کھرے کی تفصیل اور اپنی تھیوری بتاتا جاتا تھا۔ سڑک دور دور تک سنسان پڑی تھی۔ ہم کچی سڑک سے ہوتے ہوئے اُس کنوئیں پر جا پہنچے جہاں سے بقول کھوجی ڈاکوؤں کے گھوڑوں نے پانی پیا تھا۔ کنواں چل رہا تھا اور ایک بوڑھا آدمی گدی پر بیٹھا بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ وہ خاصا عمر رسیدہ تھا اور نظر بھی اُس کی کمزور لگتی تھی۔

میں نے اُسے سلام کیا اور پوچھا کہ گزشتہ صبح کنوئیں پر کون تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ گزشتہ صبح بھی وہی تھا۔

"کل صبح ایک آدمی دو گھوڑوں کے ساتھ یہاں آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اُس نے اپنے گھوڑوں کو پانی بھی پلایا تھا۔ تمھیں اُس کے بارے میں کچھ یاد ہے؟"

"ضرور آیا ہو گا جی۔" اُس نے جواب دیا۔ "ادھر سے بندے بھی پانی پیتے ہیں اور ڈنگر بھی پیتے ہیں۔ کسی کو کوئی روک ٹوک نہیں ہے جی۔ وگدا پانی ہے، جیہڑا مرضی لے پیوے۔"

میں نے چند اور سوالات کیے مگر کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ نظر کے علاوہ اُس کا مشاہدہ بھی کمزور تھا۔

تھانے واپس پہنچ کر میں نے دو چھاپا مار پارٹیاں ترتیب دیں اور اُنھیں مختلف علاقوں کی طرف بھیج دیا۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ اغوا شدہ عورتیں کسی قریبی علاقے میں مقید تھیں۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میں نے امکانی بلوے کی اطلاع ایس پی کو بھجوا دی تھی۔ دوپہر کے بعد ایس پی کے حکم کی تعمیل میں ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر سے بارہ افراد پر مشتمل ایک پارٹی تھانے پہنچ گئی۔ ان کی قیادت ایک سب انسپکٹر کے سپرد تھی۔ ایس پی نے حکم بھیجا تھا کہ بلوے کو سختی سے کچل دیا جائے اور کسی پارٹی کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے۔

سب انسپکٹر کا نام شمشیر خان تھا۔ وہ خاصا دلیر آدمی تھا۔

اُسی شام ایک مخبر نے ہمیں اطلاع دی کہ چوہدری رستم علی نے دس بارہ مسلح افراد تیار کیے ہیں اور چوہدری دوست محمد کی حویلی پر رات کے وقت دھاوا بولنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔

میں نے شمشیر خان سے مشورہ کیا۔ پوچھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

"ملک صاحب! اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟" اُس نے جواب دیا۔ "چنی وال چلتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر رستم علی کے جتھے کا انتظار کریں گے۔ اگر وہ شرافت سے واپس نہ گیا تو پھر وہی کریں گے جو ہمیں کرنا چاہیے۔"

ایس پی کا بھی یہی حکم تھا۔ ہم نے دس بارہ آدمی ساتھ لیے اور روانہ ہو کر چنی وال پہنچ گئے۔

چوہدری دوست محمد نے دو کمرے ہمارے لیے کھلوا دیے اور ہمارے کھانے پینے کا انتظام کرنے کا حکم دے دیا۔

"ملک صاحب! آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔" اُس نے کہا۔ "اللہ کے فضل سے ہم اپنی حفاظت خود کر سکتے ہیں۔ اگر وہ آپ کی وارننگ پر واپس چلا گیا تو مجھے بہت افسوس ہو گا۔"

"چوہدری صاحب! امن امان قائم رکھنا ہماری ڈیوٹی ہے۔ ہم کسی کو قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دے سکتے۔"

رات کے کھانے کے بعد ہم نے مختلف راستوں پر دو دو تین تین سپاہیوں کی ڈیوٹی لگا دی اور ایک نواحی مکان میں ٹھہر گئے۔ رات ساڑھے دس بجے ہمیں چوہدری رستم علی کے جتھے کی آمد کی اطلاع ملی۔ ہم فوراً موقع پر پہنچ گئے۔ جیسا کہ ہمیں اطلاع ملی تھی، چوہدری رستم علی کے ساتھ پندرہ سولہ مسلح آدمی تھے اور سب کے سب گھوڑوں پر تھے۔ اُن میں چوہدری رستم علی کے دونوں بیٹے بھی تھے۔ میری وارننگ پر وہ خاموشی سے واپس چلے گئے۔

اگرچہ اُن کا یہ فعل خلافِ توقع تھا مگر میں نے کوئی خیال نہ کیا اور جا کر سو گیا۔ جاتے وقت اُس نے صرف اتنا کہا تھا۔ "ملک صاحب! آپ ساری عمر اس گاؤں کی رکھوالی نہیں کر سکتے۔" اُس کی اس بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ فی الوقت مصیبت ٹل گئی تھی۔ لہٰذا میرا مطمئن ہونا لازمی امر تھا مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ بات اُس نے ہمیں دھوکا دینے کے لیے کہی تھی۔

رات کے تقریباً ڈیڑھ دو بجے فائرنگ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ فائرنگ کے ساتھ گھوڑوں کے ہنہنانے اور انسانی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ شمشیر خان اور سپاہی بھی بیدار ہو گئے۔ ہم نے نصف سپاہیوں کو ڈیوٹی پر رہنے دیا تھا اور نصف کو آرام کی اجازت دے دی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ رستم علی ہمارے ساتھ دھوکا کر گیا ہے۔" شمشیر خان نے کہا۔ "ہمیں اُس کی بات پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

میں نے باہر نکل کر دیکھا تو حویلی کی طرف سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیے۔ صورتِ حال خاصی سنگین تھی۔ میں نے سپاہیوں کو ساتھ لیا اور تیزی سے حویلی کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی ہم گلی کے کونے پر پہنچے، دوسری طرف سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی ہماری طرف فائر کیا گیا لیکن خوش قسمتی سے کوئی زخمی نہیں ہوا۔ تاریکی کی وجہ سے صورتِ حال کا اندازہ کرنا بہت مشکل تھا۔ میں حملہ آوروں کو وارننگ دینا چاہتا تھا مگر شمشیر خان نے سپاہیوں کو فائرنگ کا حکم دے دیا۔ اُس کے ساتھ ہی نصف درجن رائفلیں شعلے اگلنے لگیں۔ ایک تو ہم وردیوں میں نہیں تھے، دوسرے وہاں اندھیرا بھی تھا۔ چوہدری رستم علی کے آدمی یہی سمجھے کہ ہم مخالف پارٹی کے آدمی تھے۔ وہ میری وارننگ کے باوجود فائرنگ سے باز نہیں آئے۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ دوسری طرف چوہدری دوست محمد کے آدمی مورچہ لگائے بیٹھے تھے اور نکلنے کا وہی ایک راستہ تھا جسے ہم روکے بیٹھے تھے۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور انسانی چیخ و پکار کے درمیان تقریباً پندرہ بیس منٹ تک فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ کچھ سپاہی قریبی مکانوں میں گھس گئے تھے اور تاک تاک کر نشانے لگا رہے۔ شرپسند گھوڑوں پر سوار تھے اور اُنھیں کوئی راستہ فرار کا نظر نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور ہاتھ اُٹھا کر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ اس اثنا میں ڈیوٹی دینے والے سپاہی بھی موقع پر پہنچ چکے تھے۔

جب صورتِ حال قابو میں آئی تو میں نے قریبی گھروں سے لالٹینیں منگوائیں اور نقصانات کا جائزہ لینے لگا۔ تین شرپسند ہلاک اور چار زخمی ہوئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں چوہدری رستم علی کے دونوں بیٹے شامل تھے۔ زخمیوں میں سے دو کی حالت نازک تھی۔ چوہدری رستم علی بھی زخمی ہوا تھا۔ ایک زخمی خاصا لحیم شحیم اور قوی الجثہ نوجوان تھا۔ اُس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ پوچھ گچھ پر پتا چلا کہ وہ جیورا ماچھی تھا۔ زخمیوں کے علاوہ جو آدمی ہم نے گرفتار کیے، اُن کی تعداد چار تھی۔ باقی افراد فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

لاشوں، زخمیوں اور زیرِ حراست افراد کو میں نے شمشیر خان کی نگرانی میں فوراً قصبے روانہ کر دیا اور اُسے تاکید کر دی کہ زخمیوں کو کڑی نگرانی میں اسپتال داخل کروائے کیونکہ زخمی بھی زیرِ حراست تھے اور اُن کے ساتھی اُنھیں چھڑوانے کی کوشش کر سکتے تھے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے باقی سپاہیوں کو ساتھ لیا اور چوہدری دوست محمد کی حویلی جا پہنچا۔ وہاں پچیس تیس آدمی آگ پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ باہر تین لاشیں پڑی تھیں۔ جن میں دو لاشیں ماں اور اُس کے معصوم بچے کی تھیں۔ چوہدری دوست محمد کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ اُس نے گلوگیر لہجے میں بتایا کہ ہلاک ہونے والی

اُس کی بیٹی تھی جو اپنے بچے کو جلتی ہوئی آگ سے نکالنے کی کوشش میں خود بھی جل کر ہلاک ہو گئی تھی۔ تیسری لاش اُس کے نوجوان بھتیجے کی تھی۔ وہ شرپسندوں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ نصف درجن افراد افراتفری اور بھگدڑ کے دوران زخمی ہوئے تھے مگر کوئی شدید زخمی نہیں تھا۔ گاؤں میں ایک تجربہ کار کمپاؤنڈر موجود تھا جو زخمیوں کی مرہم پٹی میں مصروف تھا۔

بعد میں پتا چلا کہ چوہدری رستم علی حویلی کو آگ لگانے کے بعد فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ آگ لگانے میں تو کامیاب ہو گیا لیکن نکل بھاگنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جس راستے کو اُس نے فرار کا آسان اور سیدھا راستہ سمجھا تھا اُس میں ہم حائل ہو گئے تھے۔ اگرچہ مجھے چوہدری دوست محمد کی بیٹی اور اُس کے معصوم بچے کی موت کا بہت صدمہ ہوا تھا مگر میں خوش بھی تھا کیونکہ دو موذی مارے جا چکے تھے اور بڑا موذی گرفتار ہو گیا تھا۔ میں اُسے سخت ترین سزا دلوانا چاہتا تھا۔ میرے پاس شہادتوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

اگلی صبح ایس پی، ڈپٹی کمشنر اور دیگر اعلیٰ حکام نے موقع پر پہنچ کر حالات کا جائزہ لیا۔ ڈی سی نے تمام حالات سننے کے بعد حکم دیا کہ ملزموں کو عبرت ناک سزا دلوانے کے لیے سخت کارروائی کی جائے اور کسی قسم کی نرمی روا نہ رکھی جائے۔

میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا اس لیے ضروری کام نمٹانے کے بعد آرام کرنے گھر چلا گیا۔ شام کو جب میں تیار ہو کر اسپتال پہنچا تو سب سے پہلی خبر مجھے یہ ملی کہ ڈاکٹروں نے جھورے ماچھی کی داہنی ٹانگ کاٹ دی تھی۔ یہ عمل اُس کی جان بچانے کے لیے کیا گیا تھا۔ سو وہ اپنے بستر پر نشہ آور انجکشن کے زیرِ اثر بے ہوش پڑا تھا۔

چوہدری رستم علی اور دیگر دو زخمی قدرے بہتر حالت میں نظر آ رہے تھے۔ اُن کے جسموں کے بیشتر حصے پٹیوں میں لپٹے ہوئے تھے۔

چوہدری رستم علی نے مجھے دیکھ کر کہا "ملک صاحب! میں آپ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اُس کی آواز بڑی مشکل سے نکل رہی تھی مگر اُس کے تکبر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے کمرے میں موجود ڈاکٹر اور اے ایس آئی سے کہا کہ وہ باہر چلے جائیں۔ ڈاکٹر تو فوراً ہی باہر چلا گیا۔ اے ایس آئی نے قدرے تامل کیا۔ پھر میرے اشارے کے بعد باہر چلا گیا۔

"ملک صاحب! میں آپ سے سودے بازی کرنا چاہتا ہوں۔" چوہدری رستم علی نے کہا۔ اُس کی آواز دھیمی مگر لہجہ مستحکم تھا۔ "میرے سات آدمی آپ کی حراست میں موجود ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ چار آدمیوں کو حراست میں رکھیں اور تین کو چھوڑ دیں۔ رپٹ میں بھی چار ہی آدمیوں کا ذکر کریں۔"

"رستم علی! ہماری حراست میں آٹھ آدمی ہیں۔ اپنے آپ کو حراست سے باہر مت سمجھو۔"

میرے لب و لہجے سے اُس کے چہرے پر حیرت ا نمودار ہو گئی۔ بولا "ملک مقصود حیات! ذرا سنبھل کر بات کرو۔ نہیں کس سے بات کر رہے ہو؟"

"بڑی اچھی طرح جانتا ہوں رستم علی! میں اغوا، قتل، آ جیسے کے ملزم سے بات کر رہا ہوں۔"

وہ شاطر آدمی میرا موڈ دیکھ کر غصہ پی گیا۔ قدرے تحمل سے "ملک صاحب! آپ نے بھی یہیں رہنا ہے اور ہم نے بھی یہیں ہے۔ اگر آپ مجھے ظالم سمجھتے ہیں تو یہ بھی سمجھ لیں کہ مجھے کافی سے مل چکی ہے۔ میرے دونوں بیٹے مر چکے ہیں اور میں یہاں بے ہوں۔ میری بڑی چھوٹی سی درخواست ہے۔ آپ میرا اور میرے آدمیوں کا نام ایف آئی آر میں درج نہ کریں۔ اس مہربانی کے عوض جو حکم کریں گے، وہ میں آپ کی جھولی میں ڈال دوں گا۔"

"ابھی مجھے فرصت نہیں ہے۔" میں نے سخت لہجے میں "صدر دین اور اُس کی بیٹی کی مزاج پرسی کرنے جا رہا ہوں۔ تجھے پتا ہو گا کہ تیرے ایک سرکش بیٹے نے صدر دین کو مار مار کر لہو تھا اور دوسرے سورما بیٹے نے اُس کی معصوم بیٹی شریفاں کو اُٹھا اور رات بھر اُس کی چیخیں سن کر قہقہے لگا رہا تھا۔"

"او یار ملک صاحب! کیوں مجھے غصہ دلا رہے ہو۔ خواہ کمیوں کے پیچھے جذباتی ہو رہے ہو۔"

"تف ہے تیری حالت پر رستم علی! تجھے ابھی تک خدا کی یا نہیں آئی۔ ذرا سوچ کہ قدرت نے تیرے بیٹوں کو اُن کے ظلم کی دی ہے۔ کتّے کی موت مر گئے۔ جا دیکھ، مردہ خانے میں اُن کی کیسی چیری پھاڑی ہوئی پڑی ہیں۔ کہاں گیا اُن کا طنطنہ اور د" وہ غصے سے کانپنے لگا۔ "اوئے تھانیدار! تو نے می نہیں دیکھا۔"

میں اُس کے کمرے سے نکل کر جنرل وارڈ میں پہنچ گیا۔ صدر دین ایک بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی بیٹی شریفاں اور بی بھی وہاں موجود تھیں۔ دونوں بستر کے قریب فرش پر بیٹھی تھیں۔

"کیا حال ہے صدر دین؟" میں نے پوچھا۔ "اب تو تم کچھ آ رہے ہو؟"

"اللہ کا بڑا کرم اور آپ کی مہربانی ہے جی۔" اُس نے اُ کوشش کی۔

"لیٹے رہو، لیٹے رہو۔" میں نے کہا۔ "اللہ نے تجھ پر ظلم کر سے بدلہ لے لیا ہے۔ چوہدری رستم علی کے دونوں بیٹے مارے ہیں۔ اُن کی لاشیں مردہ خانے میں پڑی ہیں۔ چوہدری رستم علی کو ہم سات آدمیوں سمیت گرفتار کر لیا ہے۔ وہ اسی اسپتال میں زخمی

"اساں نے کسی کا بُرا نہیں چاہا تھا۔" صدر دین نے کہا۔ "بڑے کہہ گئے ہیں کہ دشمن کی موت پر بھی خوش نہیں ہونا چاہیے۔"

"ملک صاحب! تہاڈی بڑی مہربانی اے جی۔" نذیراں بی بی نے کہا۔ "تسی ساڈے تے بڑا احسان کیتا اے۔"

"تیرا کیا حال ہے شریفاں بی بی؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے میری بات سن کر سر نیچے کر لیا۔ آہستہ سے بولی "ٹھیک ہوں جی۔ ڈاکٹر ہوراں نے دوائی دی ہے۔"

میں نے اُنھیں تسلی دی اور وہاں سے رُخصت ہو گیا۔

اسپتال کے باہر چوہدری رستم علی کے عزیز رشتے دار لاشیں لینے اکٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص جو دوسروں سے معتبر معلوم ہوتا تھا، میرے قریب آیا اور موٹی موٹی رقموں کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے اُسے کہا کہ تھانے میں آ کر بات کرے اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے اسپتال کے اندر پولیس کا سخت پہرا لگا رکھا تھا اور ملزموں سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔

چند روز کے بعد میں نے زخمی ملزمان کو حوالات میں منتقل کر دیا اور عدالت سے اُن کا ریمانڈ لے لیا۔ اس دوران میں چوہدری رستم علی کے آدمی مسلسل میرے پاس آ رہے تھے۔ وہ رشوت، دھمکیوں اور بڑے افسروں کی سفارشوں سے اپنا کام نکالنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن میں اُنھیں ٹالتا رہا اور بالآخر تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۴۸، ۱۵۲، ۳۰۲، ۳۰۷، ۳۶۳، ۴۳۶ اور ۴۵۶ کے تحت مقدمہ درج کر کے پرچہ کاٹ دیا۔

جیسا کہ قارئین جانتے ہیں کہ اس سارے ہنگامے کی ابتدا صادقہ بیگم اور ریحانہ کے اغوا سے ہوئی تھی۔ یہ دونوں عورتیں ہنوز بازیاب نہیں ہوئی تھیں اور نئے ہنگامے کی وجہ سے ہماری توجہ اُس طرف سے ہٹ گئی تھی۔ دس بارہ روز کے بعد مجھے پتا چلا کہ صادقہ بیگم گھر پہنچ گئی ہے لیکن اُس کا ذکر کرنے سے پہلے میں آپ کو جھورے ماچھی کے اقبالِ جرم کے بارے میں کچھ دلچسپ باتیں بتانا چاہتا ہوں۔

یہ لمبا تڑنگا اور قوی الجثہ ڈاکو، جس نے کچھ عرصے سے علاقے میں بڑی دہشت پھیلا رکھی تھی، ٹانگ کٹنے کے بعد بالکل ڈھے گیا تھا۔ وہ ہر وقت پریشان اور کھویا کھویا بیٹھا رہتا تھا۔ اُس سے ہم نے بیشتر پرانی وارداتوں کا اقرار کروا لیا تھا۔ اُس نے دو تین مرتبہ یہ فقرہ کہا کہ وہ چوہدری کی گھر والی کی وجہ سے مار کھا گیا۔ چونکہ ہنگامے کی بنیاد کی وجہ صادقہ بیگم کا اغوا تھا اس لیے میں یہی سمجھا کہ اُس کا یہ فقرہ عمومی نوعیت کا ہے لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ اُس کا مطلب کچھ اور ہے۔

ایک روز پوچھ گچھ کے دوران جب اُس نے یہی فقرہ دُہرایا تو میں نے کہا "جھورے! تم نے پہلے بھی کئی مرتبہ یہ بات کہی ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ تمھارا اشارہ رستم علی کی کون سی بیوی کی طرف ہے؟"

"صادقہ بیگم کی طرف۔" اُس نے جواب دیا۔ "میں اس عورت کی ہمدردی میں اس حال کو پہنچا ہوں۔ ملک صاحب! میں کبھی کسی عورت کے چکر میں نہیں پھنسا تھا۔ میرے اُستاد نے کہا تھا۔ جھورے! عورت کی دو چیزوں سے بچ کر رہنا۔ اُس کے حسن سے اور اُس کے آنسوؤں سے۔ یہ دو چیزیں بڑے بڑوں کا تختہ کر دیتی ہیں۔ ملک صاحب! میں انھی دو چیزوں کے چکر میں پھنس گیا اور آج ایک ٹانگ سے محروم آپ کے تھانے میں بیٹھا ہوں۔"

میرے دل میں تجسس پیدا ہوا۔ میں نے کہا "جھورے! کھل کر بات کرو۔"

اُس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ چوہدری رستم علی سے اُس کی دوستی کو سال سوا سال ہوا ہے۔ پہلے وہ کبھی کبھار حویلی جاتا تھا۔ بعد میں چوہدری نے اُسے حویلی کے اندر ایک کمرہ دے دیا۔ اُس کمرے کا راستہ باہر سے تھا لیکن ایک دروازہ اندر کی طرف بھی کھلتا تھا جو ہمیشہ بند رہتا تھا۔ اندر سے اُس کو کنڈی لگی رہتی تھی اور کبھی استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ ایک روز رات کے بارہ بجے ٹک ٹک کی مدھم آواز سن کر جھورے کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے آواز پر غور کرنے لگا۔ تب اُس نے محسوس کیا کہ ٹک ٹک کی آواز اندرونی دروازے سے آ رہی تھی۔ پہلے اُسے خیال آیا کہ شاید کوئی چوہا دروازے کو کتر رہا تھا لیکن مزید غور کرنے پر اُسے یہ خیال درست نہ لگا۔ وہ دھیرے سے اُٹھا، دروازے کے قریب گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ اچانک اُس نے چوڑیاں کھنکنے کی آواز سنی۔ اُس نے ہولے سے پوچھا کہ اُدھر کون ہے۔

اس کے ساتھ ہی دروازہ تھوڑا سا کھلا اور جھورے نے ایک نسوانی آواز سنی "جھورے! میں چوہدرانی ہوں۔ صادقہ بیگم... میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔"

جھورے کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ چوہدرانی آدھی رات کے وقت اُس سے کیا بات کرنا چاہتی تھی۔ اُسے صادقہ بیگم کی پوری کہانی معلوم نہیں تھی۔ تاہم اس نے اتنا سن رکھا تھا کہ صادقہ بیگم چوہدری کی دوسری بیوی ہے اور نوجوان اور خوبصورت بھی۔ اُس کے دل میں شک پیدا ہوا۔ بوڑھے شوہر کی نوجوان بیوی نے رات کے بارہ بجے اُس کے دروازے پر کیوں دستک دی تھی؟

"چوہدرانی! مجھے تو بات کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن یہ سوچ لو کہ کہیں چوہدری نہ جاگ جائے۔"

"میں پکا بندوبست کر کے آئی ہوں۔" صادقہ بیگم نے دروازہ پورا کھول دیا۔ "تم کوئی فکر نہیں کرو۔"

جھورے نے دیکھا کہ صادقہ بیگم کے بال کھلے ہوئے تھے اور

اُس کا حسین چہرہ تاریکی میں بھی دمک رہا تھا۔

"جھورے! میں اپنی عزت کو خطرے میں ڈال کر تمھارے پاس آئی ہوں۔" اُس نے کہا۔ "لیکن یہ بات سُن لو کہ میں کسی بُری نیت سے نہیں آئی ہوں۔ میں نے تمھاری دلیری کے بہت قصے سُنے ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ تم زبان کے پکّے ہو۔ وعدہ کرتے ہو تو پوری طرح نبھاتے بھی ہو۔ میں بہت دکھی عورت ہوں۔ اس حویلی میں مجھ پر بہت ظلم ہوا ہے۔ اگر تم میری بات کو راز رکھنے اور میری مدد کرنے کا وعدہ کرو تو میں بات آگے بڑھاؤں۔"

جھورے نے کہا کہ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ صادقہ بیگم سے کہتا۔ "بی بی! اپنا راستہ ناپو۔ میں اس قسم کے وعدے نہیں کیا کرتا" لیکن رات کی تنہائی میں ایک نوجوان عورت کے قرب نے اُس کے دل کو نرم کر دیا۔ اُس نے صادقہ بیگم کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔

صادقہ بیگم نے درمیانی دروازہ بند کر دیا اور جھورے کی چارپائی پر جا بیٹھی۔ جھورا کھڑا رہا۔

"بیٹھ جاؤ۔" صادقہ بیگم نے کہا اور جھورا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ قدآور ڈاکو حیرت سے اُس عورت کو گھور رہا تھا جو تاریکی اور تنہائی کے باوجود اُس سے ذرا بھی مرعوب نظر نہیں آتی تھی۔

"جھورے! کہنے کو تو میں سونے چاندی میں کھیلتی ہوں اور مجھے دُنیا کی ہر نعمت میسّر ہے مگر میں اندر سے بہت دکھی ہوں۔ اس حویلی میں قیدیوں کی سی زندگی گزار رہی ہوں۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ چوہدری مجھے اغوا کر کے لایا تھا اور میری مرضی کے خلاف زبردستی میرے ساتھ شادی کی تھی۔"

اُس نے اپنے اغوا کا سارا واقعہ جھورے کو بتایا۔

"چوہدرانی! جو کچھ ہو چکا ہے اُسے بدلا نہیں جا سکتا۔" جھورے نے کہا۔ "چوہدری تمھیں کبھی آزاد نہیں کرے گا۔"

"ہاں میں جانتی ہوں۔ چوہدری تو یہی چاہتا ہے کہ میں اس حویلی میں گُھل گُھل کر مر جاؤں لیکن میں نے اپنے دل میں عہد لیا ہے کہ میں چوہدری سے اپنی ذلت کا انتقام ضرور لوں گی۔ چوہدری سے اور اس کی بھانجی ریحانہ سے۔ کیونکہ ریحانہ نے اپنے ماموں کو میرے خلاف بھڑکایا تھا۔ سچ پوچھو تو میں اسی ایک اُمید پر زندہ ہوں۔ ورنہ کب کی خودکشی کر چکی ہوتی اور اس انتقام کے لیے مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں چوہدری کو قتل کر دوں؟" جھورے نے پوچھا۔

"نہیں، میں چوہدری کو زندہ رکھ کر ذلیل کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے تم سے مفت مدد نہیں چاہیے۔ میں تمھاری محنت کا معاوضہ تمھیں دوں گی۔ جو کام میں تم سے لینا چاہتی ہوں وہ تمھارے لیے بہت آسان ہے۔"

"کچھ پتا تو چلے کہ کام کیا ہے؟"

"جھورے! میں اکثر تمھیں چُھپ کر دیکھتی رہتی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھارا پیشہ ڈکیتی ہے مگر میرا دل کہتا ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ تم دلیر اور وعدہ وفا کرنے والے مرد ہو۔ میں جو منصوبہ تمھیں بتانے والی ہوں اُس پر میں کئی مہینوں سے غور کر رہی ہوں۔ بہت سیدھا سادہ منصوبہ ہے۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھے اور ریحانہ کو اغوا کر لو۔ موقع میں تمھیں فراہم کر دوں گی۔"

"تمھیں اور ریحانہ کو اغوا کر لوں! لیکن اغوا کے بعد کیا ہوگا؟"

"مجھے معلوم ہے کہ تمھارا جتھا بہت مضبوط ہے۔ تم اس کام کے لیے تین آدمی تیار کرو۔ اُنھیں ساری بات سمجھا دینا۔ یہ نہ بتانا کہ منصوبہ میں نے بنایا ہے مگر اُنھیں یہ سمجھا دینا کہ وہ میرے ساتھ کوئی زیادتی نہ کریں اور جب میں چاہوں مجھے جانے دیں۔ ریحانہ خوبصورت لڑکی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تمھارا کوئی آدمی ریحانہ کے ساتھ شادی کر لے یا کسی بڈّھے کے ساتھ اُس کی شادی کر دے۔"

"جس طرح چوہدری نے تمھارے ساتھ کیا تھا؟"

"ہاں میں یہی چاہتی ہوں۔ میرے انتقام کی آگ تو اسی طرح ٹھنڈی ہو سکتی ہے۔ دوسری بات میں یہ چاہتی ہوں کہ اغوا کا شک چوہدری دوست پر جائے۔ ان دونوں چوہدریوں کی آپس میں بڑی سخت دشمنی ہے۔ شک کی وجہ سے دونوں کا آپس میں ضرور ٹکراؤ ہو گا۔"

جھورا اُس کی باتیں سُن کر حیران ہو رہا تھا۔ اُس نے پوچھا۔ "اور دونوں کا اغوا کس طرح ہو گا؟"

"میں کسی روز قصبے جاؤں گی اور ریحانہ کے ساتھ تانگے میں واپس آؤں گی۔ میں تمھیں اپنے پروگرام کے بارے میں دو چار روز پہلے بتا دوں گی۔ تم اپنے آدمیوں کو سمجھا دینا۔ وہ راستے میں سے ہمیں اغوا کر لیں۔"

جھورے نے کہا۔ "ایک بات ذہن میں رکھ لو۔ جن آدمیوں کو میں اس کام پر لگاؤں گا، وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہوں گے۔"

"یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔" صادقہ بیگم نے کہا۔ "تم اُنھیں میرے بارے میں سمجھا دینا۔"

جھورے نے کہا کہ وہ سوچ کر جواب دے گا۔ صادقہ بیگم نے کچھ رقم جھورے کو دی اور جس راستے سے آئی تھی اُسی راستے سے واپس چلی گئی۔ اس کے بعد اُس نے ہر دوسرے تیسرے روز رات کے وقت جھورے سے ملنا شروع کر دیا۔ جھورا اُس کی مدد کرنے پر تیار ہو گیا۔ وہ دونوں کئی ہفتوں تک منصوبے کی اونچ نیچ پر غور کرتے رہے۔ صادقہ بیگم نے وقتاً فوقتاً جھورے کو پیسے بھی دینا شروع کر دیے۔ پروگرام یہ بنا کہ دونوں عورتوں کو اغوا کے فوراً بعد لاہور پہنچا دیا جائے گا اور الگ الگ رکھا جائے گا۔

جب جھورے نے بات ختم کی تو میں نے پوچھا۔ "کیا تم بھی اغوا کی کارروائی میں شامل تھے؟"

"نہیں، میں اس کارروائی میں شامل نہیں ہوا تھا۔" اُس نے جواب دیا۔ "میں اغوا کے وقت حویلی میں موجود رہنا چاہتا تھا تاکہ چوہدری کو مجھ پر ذرا سا بھی شک نہ ہو۔"

"تمھارے جن آدمیوں نے ریحانہ کو اغوا کیا ہے اُن کا ٹھکانہ کہاں ہے؟"

"تینوں ضلع ملتان کے رہنے والے ہیں۔ میری ان سے معمولی سی جان پہچان تھی۔ وہ لوگ اتفاق سے مجھے مل گئے تھے۔ میرا ان سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ریحانہ کو ملتان لے گئے ہوں گے۔ مجھے اچھی طرح معلوم نہیں ہے۔" قدرے توقف کے بعد اُس نے کہا۔ "ملک صاحب! سچ پوچھیں تو میں نے صادقہ بیگم کا کام کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر اُس کے آنسوؤں نے میرا بیڑا غرق کر دیا۔ اُس نے ایسے دردناک طریقے سے اپنی کہانی سنائی کہ میرے جیسا پتھر دل بندہ بھی موم ہو گیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اُس کے انتقام سے اتنی تباہی ہو گی تو میں کبھی اُس کا ساتھ نہ دیتا۔ اُستاد نے سچ کہا تھا عورت کا حسن اور اُس کے آنسو بڑے بڑوں کا تختہ کر دیتے ہیں۔ ہائے کتنے آدمی اس عورت کے انتقام کے چکر میں قبروں میں جا پڑے، کتنے جیل میں ہیں اور میں جو شیر کی طرح گرجتا اور گھوڑے کی طرح دوڑتا تھا لنگڑا ہو کر آپ کے سامنے پڑا ہوں۔ لیکن ... ساری مقدر کی بات ہے۔ یہ بربادی میری قسمت میں لکھی تھی۔"

"جھورے! کیا تم سچ کہتے ہو کہ تمھیں اُن تین اغوا کرنے والوں کا کچھ معلوم نہیں ہے؟"

"بالکل سچ کہتا ہوں۔ اگر جھوٹ بولنا ہوتا تو ساری بات ہی نہ بتاتا۔" اُس نے دونوں ہاتھ جوڑے۔ "اگر اللہ نے مجھ پہ کرم کیا اور میں اس مصیبت سے چھوٹ گیا تو باقی زندگی کسی اللہ والے کی خدمت کرتے ہوئے گزار دوں گا۔"

"ہاں... بچّو! اب تو تم اللہ والے کو ہی ڈھونڈو گے۔" میں نے کہا۔ "اب ٹانگ سے کیا خاک وارداتیں کرو گے۔ مزہ تو جب تھا کہ دونوں ٹانگوں کے ہوتے ہوئے کسی اللہ کے بندے کی خدمت کرتے۔"

وہ اپنی ادھوری ٹانگ کو دیکھ کر رونے لگا۔ بولا۔ "جب یہ سلامت تھی تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اللہ اپنی دی ہوئی واپس لے لے گا۔ میرے جیسے نامرادوں کو کچھ کھو کر ہی سمجھ آتی ہے۔ صاحب! میری آپ سے ایک التجا ہے۔ آپ مجھے وعدہ معاف گواہ بنا لیں۔ میں چوہدری کا سارا کچا چٹھا عدالت میں بتا دوں گا۔ مجھے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہے۔ میں نے چوریاں اور ڈکیتیاں ضرور کی ہیں مگر آج تک کسی آدمی کو قتل نہیں کیا۔ آپ کی بڑی مہربانی، مجھے وعدہ معاف گواہ بنا لیں۔"

میں نے اُسے جواب دیا کہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔

اُسی شام میں سادہ لباس میں صادقہ کے گھر پہنچ گیا۔ اُس کا ملازم گھر میں ہی تھا۔ وہ ایک سادہ طبیعت معمّر شخص تھا۔ اُس نے مجھے بیٹھک میں بٹھایا اور بتایا کہ اُس کی بیٹی ظالموں کے چنگل سے چھوٹ کر گھر پہنچ گئی ہے۔

"میں اُسی سے ملنے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اُسے یہاں بلائیں۔"

وہ اندر گیا اور صادقہ بیگم کو بلا لایا۔ اُس نے شوخ رنگ کا ریشمی سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ چھبیس ستائیس سال کی ایک حسین خاتون تھی۔ تاہم اُس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا رعب اور پختگی پائی جاتی تھی۔ یہ پختگی اُن حالات کی مرہونِ منت معلوم ہوتی تھی جن سے وہ گزر کر آئی تھی۔ اُس نے مجھے سلام کیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے رسمی کلمات کے بعد کہا۔ "صادقہ بیگم! میں اغوا کی کہانی سُننے آیا ہوں۔"

وہ چند لمحوں تک سر جھکائے بیٹھی رہی، پھر بولی۔ "بس جی! اللہ کے فضل اور ماں باپ کی دعاؤں کے طفیل بچ کر اپنے گھر آ گئی ہوں۔ ڈاکوؤں نے ہمارا جو حشر کیا ہے، اُسے میں ہی جانتی ہوں۔ کوئی شریف لڑکی اپنی زبان سے یہ کہانی نہیں سُنا سکتی۔"

"کہانی تو تمھیں سُنانا ہی پڑے گی۔ کیونکہ یہ پولیس کیس ہے اور ریحانہ ابھی ڈاکوؤں کے قبضے میں ہے۔"

اُس کی ایکٹنگ قابلِ دید تھی۔ اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ سارا منصوبہ اُس دُبلی پتلی خاتون کا بنایا ہوا تھا۔

"آپ کو یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ ہمیں کب اور کس طرح اغوا کیا گیا تھا۔" اُس نے کہا۔ "باقی جو واقعات ہیں وہ میں آپ کو مختصراً بتا دیتی ہوں۔ ڈاکو تعداد میں تین تھے۔ اُن کے پاس ریوالور اور خنجر تھے۔ تانگے سے اغوا کرنے کے بعد وہ ہمیں ایک ویران سے ڈیرے پر لے گئے اور ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ اُن کی شکلیں بڑی خوفناک تھیں۔ انھوں نے ہمیں دھمکی دی تھی کہ اگر ہم نے شور مچایا تو وہ ہمیں قتل کر دیں گے۔ پہلی رات ہم نے اُس کوٹھری میں گزاری۔ میں یہ نہیں بتا سکتی کہ اُنھوں نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور کیسی کیسی اذیتیں ہمیں دی تھیں۔ اگلی صبح اُنھوں نے ہمیں دیہاتی عورتوں جیسے سُوتی کپڑے پہننے کو دیے۔ بالوں میں دھول ڈال کر اُنھیں خراب کر دیا اور مُنہ ہاتھ دھونے کی اجازت نہیں دی۔ وہ اپنے گھوڑے رات ہی کو کہیں چھوڑ آئے تھے۔ ہم نے اُن کے حکم پر موٹی چادروں کے گھونگٹ نکال لیے اور اُن کے ہمراہ بس میں سوار ہو گئے۔ کئی روز تک وہ ہمیں مختلف شہروں میں پھراتے رہے۔ ان میں چک جھمرہ، لائلپور، شیخوپورہ، سانگلہ ہل اور لاہور شامل تھے۔ وہ ہمیں زیادہ تر ہوٹلوں میں رکھتے تھے۔ لاہور اسٹیشن پر مجھے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ وہ ہمیں ٹرین میں سوار کرانے کے لیے اسٹیشن پر لے گئے تھے۔ میں بھیڑ میں موقع پا کر فرار ہو گئی۔ ریحانہ کا مجھے کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔"

"صادقہ بیگم! کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہاری اس کہانی پر یقین کر لوں گا؟" میں نے کہا۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی، بولی "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

کمرے میں اُس کے ماں باپ کے علاوہ اُس کی بھابی بھی موجود تھی۔ وہ سب بھی میری بات سن کر پریشان ہو گئے تھے۔ وہ لوگ صادقہ کے منصوبے سے بے خبر معلوم ہوتے تھے۔

میں نے صادقہ بیگم سے پوچھا "بی بی! جھورے ماچھی کو جانتی ہو؟"

"جی... جی! نام تو سنا ہوا لگتا ہے۔ اس نام کا ایک آدمی..... شاید ہماری حویلی میں رہتا تھا۔"

"یہ نام تو اُس مشہور ڈاکو کا نہیں جسے آپ نے چوہدری رستم علی کے ہمراہ گرفتار کیا ہے؟" مظہر حسین نے کہا۔

"ہاں میں اُسی مشہور ڈاکو کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے صادقہ بیگم کو گھورتے ہوئے کہا "لیکن کچھ لوگ ڈاکوؤں کو بھی چکر دے جاتے ہیں۔ صادقہ بی بی! میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

اُس کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی نظر آنے لگی، بولی "پتا نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"جھورا ماچھی جنی وال کے جوہے میں زخمی ہو گیا تھا۔" میں نے مزید کہا "ڈاکٹروں نے اُس کی داہنی ٹانگ کاٹ دی ہے۔ ٹانگ کٹنے کے بعد اُس کی کایا پلٹ گئی ہے۔ یہ سمجھ لیں کہ بھیڑیا بھیڑ بن گیا ہے۔ اُس نے جھوٹ اور ڈکیتی سے توبہ کر لی ہے، ہر وقت اللہ کو یاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اس مقدمے سے بری ہو گیا تو باقی زندگی کسی اللہ والے کے قدموں میں گزار دے گا۔"

صادقہ بیگم مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بولی "پھر تو ٹانگ کا کٹنا اُس کے حق میں اچھا ہی ہوا۔"

"لیکن تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوا۔" میں نے کہا "اُس نے سچ بول دیا ہے۔"

"تھانیدار صاحب! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" فاطمہ بی بی نے کہا "میری بیٹی کا اُس ڈاکو سے کیا تعلق؟"

"جب دو آدمی ایک ہی کشتی میں سوار ہوں یا ایک ہی حویلی میں رہتے ہوں تو تعلق ہو ہی جاتا ہے۔"

صادقہ بیگم کچھ نہیں بولی۔ میں نے دیکھا اُس نے اپنی پریشانی پر قابو پا لیا تھا۔

"صادقہ بیگم! کیا یہ سچ ہے کہ اغوا کا منصوبہ تم نے بنایا تھا اور جھورے ماچھی نے اُس پر عمل درآمد کرایا تھا؟"

اُس نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا "جی نہیں، یہ جھوٹ ہے۔ مجھے کسی منصوبے کا علم نہیں ہے۔"

"کیا تم جھورے ماچھی کی زبانی سارا قصہ سننا پسند کرو گی؟"

"ہرگز پسند نہیں کروں گی لیکن اگر آپ اصرار کریں گے تو سن [illegible] گی۔ پر یقین نہیں کروں گی۔ اگر آپ مجھے کسی الزام کے تحت گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو میں حاضر ہوں لیکن ایک بات سوچ لیں۔ جھورا ماچھی بدنام ڈاکو ہے۔ کیا آپ کے خیال میں عدالت میرے مقابلے میں اُس کے بیان کو زیادہ صائب سمجھے گی؟"

اُس کی خود اعتمادی قابلِ رشک تھی۔ اُس کے چہرے پر [illegible] کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"ملک صاحب! معاملہ کیا ہے؟" مظفر حسین نے پریشانی میں پوچھا "آپ میری بیٹی پر کس قسم کا الزام لگانے کی کوشش کر [illegible]"

صادقہ بیگم میرے بولنے سے پہلے بول پڑی "ملک صاحب! اگر آپ مجھے ایک ڈاکو کے بیان پر کسی جرم میں ملوث کرنا چاہتے ہیں تو بے شک مجھے گرفتار کر لیں لیکن میں اپنی زبان سے کسی جرم کا [illegible] نہیں کروں گی۔ میں جو اذیتیں برداشت کر چکی ہوں اُن میں کچھ [illegible] لیکن ایک بات بتائیں، کیا آپ کسی جاگیردار کو ایسے ہی جرم پر گرفتار کر سکتے ہیں؟"

میری آنکھوں کے سامنے شریفاں کے اغوا کا واقعہ گھوم [illegible] حقیقت معلوم ہونے کے باوجود ہم نے چوہدری رستم علی کے [illegible] ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ اپنی اس کمزوری کا اعتراف میں آج کر رہا ہوں [illegible] وقت میں یہ اعتراف کرنے پر تیار نہیں تھا۔ میں نے صادقہ بیگم [illegible] کہا "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ چوہدری رستم علی اس وقت حوالات میں بند ہے۔ چاہو تو چل کر خود دیکھ لو۔"

اُس نے بڑی جرأت سے میری طرف دیکھا اور نہایت [illegible] لہجے میں بولی "ملک صاحب! اس میں آپ کا نہیں اُس شخص کا کمال [illegible] جس نے ان سانپ جیسے دشمن گرگوں کی گرفتاری کے حالات پیدا کیے [illegible] کا اس میں واقعی کوئی کمال نہیں ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ مجھے [illegible] کرنا چاہتے ہیں تو بخوشی گرفتار کر لیں۔ میرا مشن پورا ہو چکا ہے۔"

میں اُٹھا اور سلام کر کے رُخصت ہو گیا۔

چوہدری رستم علی اور اُس کے ساتھیوں پر کئی سال تک [illegible] چلا۔ انھوں نے سپریم کورٹ تک اپیل کی مگر سزا سے نہ بچ [illegible] چوہدری رستم علی سمیت تین ملزموں کو عمر قید اور باقیوں کو مختلف [illegible] سزائیں ہو گئیں۔ صادقہ بیگم نے دوبارہ حویلی کا رُخ نہیں کیا اور [illegible] کے ذریعے خلع حاصل کر لیا۔ ریحانہ کا کچھ پتا نہیں چلا۔

یہ دُنیا کھوکھلی چشموں کے لیے ایک تماشا، ایک عشرت گاہ اور ایک ایسا حسین و دل کش خواب ہے، جس سے محروم ہونا اُنھیں پسند نہیں لیکن اُن کے لیے جو چشمِ بینا رکھتے ہیں، یہ ایک عبرت گاہ سے زیادہ کچھ نہیں۔

[illegible] کی ایک عبرت انگیز داستان

دولت مند

بڈھا دنیا سے رخصت ہو جائے تو ناخلف اولاد اطمینان کا سانس لیتی ہے کہ ایک کھانستی ہوئی دائم المرض کا بوجھ کندھوں سے اُتر گیا۔ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ عنقریب اُن پر بھی وہ وقت آنے والا ہے اور یہ بھی



بھول جاتے ہیں کہ اُن کا عیش و آرام اسی بڈھے کا مرہونِ منت ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ رخصت ہونے والے نے وہ دولت جائز طریقوں سے کمائی تھی یا ناجائز طریقوں سے۔

آج میں آپ کے سامنے ایک ایسے ہی بوڑھے شخص کا احوال پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اُس کی عمر پچھتر اور اسّی کے درمیان تھی۔ وہ اپنی اولاد سے سخت پریشان تھا اور کئی بار تھانے میں آچکا تھا۔ وہ اپنی اولاد کی زیادتیاں بیان کرنے کے بعد ہمیشہ رونے لگتا تھا۔ اُس کا نام اورنگ زیب عباسی تھا۔ اُس نے اپنی فعال زندگی میں جتنی دولت کمائی تھی اُتنی ہی نفرت بھی کمائی تھی۔ اُس میں بے شمار خوبیاں بھی تھیں اور خرابیاں بھی۔ دو خرابیاں بہت نمایاں تھیں۔ پہلی خرابی یہ تھی کہ اُسے طیش بہت جلدی آجاتا تھا۔ طیش کی حالت میں اُس پر جنون طاری ہو جاتا تھا۔ پھر وہ بھول جاتا تھا کہ اُس کے سامنے کون ہے۔ کوئی قابلِ احترام ہستی ہے یا کوئی قابلِ شفقت بچہ ہے۔ اُس کی بدزبانی اور گالیاں اچھے خاصے آدمی کو اُس سے متنفر کر دیتی تھیں۔ اُسے اپنی اس بُرائی کا بخوبی احساس تھا مگر اُس پر قابو پانا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ خصوصاً بڑھاپے میں اور ناخلف اولاد کی موجودگی میں اس عادت سے چھٹکارا پانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

دوسری برائی اُس کی یہ تھی کہ اُس نے ناجائز ذرائع سے دولت کمائی تھی۔ بہرحال، کوئی انسان نہ تو مکمل اچھائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور نہ ہی مکمل برائیوں کا۔ ان باتوں سے قطع نظر اولاد کا بہرصورت یہ فرض ہے کہ وہ والدین کی بڑھاپے میں خدمت کرے۔

اورنگ زیب عباسی سے میری پہلی ملاقات اسپتال میں ہوئی تھی۔

رات کے نو دس بجے مجھے اطلاع ملی کہ ایک بوڑھے شخص کو اُس کے گھر والوں نے زہر دے دیا ہے اور وہ جاں کنی کے عالم میں اسپتال میں پڑا ہے۔ میں دو آدمیوں کو ساتھ لے کر فوراً اسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر مریض کا معدہ صاف کرنے کے عمل میں مصروف تھے اس لیے ہمیں انتظار کرنا پڑا۔ اسپتال میں عباسی کے چند رشتے دار موجود تھے اور خاصے پریشان نظر آرہے تھے۔

ایک باریش شخص جس کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی مجھے ایک طرف لے گیا اور رسمی کلمات کے بعد بولا: "تھانیدار صاحب! میرا نام انور عباسی ہے۔ میں عباسی صاحب کا بیٹا ہوں۔"

میں نے حیرت سے اُس کا جائزہ لیا۔ اُس کا لباس معمولی، رنگ سانولا، بال زیادہ تر سفید اور صحت خاصی کمزور تھی۔ اُس کے چہرے پر فقر و فاقے کی علامات پائی جاتی تھیں، حالاں کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ عباسی ایک دولت مند شخص ہے۔

"میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ابا جی کو اُن کی بیوی نے زہر دیا ہے۔" انور عباسی نے کہا۔ "آپ اُسے گرفتار کرلیں، ان شاء اللہ سب کچھ اگل دے گی۔ اس کارروائی میں اُس کا بیٹا بھی شامل ہے۔"

میں نے تعجب سے اُس کی بات سنی اور پوچھا: "تمھارا مطلب ہے کہ یہ حرکت تمھاری ماں اور تمھارے بھائی کی ہے؟"

"جناب! کہاں کی ماں اور کہاں کا بھائی!" اُس نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا: "ابا جی کے دو ہی شوق ہیں۔ شادیاں کرنا اور طلاقیں دینا۔ اس عورت کا چھٹا ساتواں نمبر ہوگا۔ سرور جان اس کا نام ہے۔ لڑکے کا نام عالمگیر ہے۔ ساتھ ہی لائی تھی لیکن ابا جی اُسے اپنا بیٹا بتلاتے ہیں۔ سرور جان بھی یہی کہتی ہے۔"

"انور عباسی! مجھے تمھارے ابا جی کے شجرۂ نسب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ زہر تمھاری سوتیلی ماں یا سوتیلے بھائی نے دیا ہے؟"

"ثبوت تو کوئی نہیں ہے جی۔" اُس نے جواب دیا۔ "لیکن ظاہر ہے کہ جس نے کھانا پکایا یا جس نے کھانا کھلایا، زہر بھی اُسی نے دیا ہوگا اور... یہ اس عورت کو سوتیلی ماں کہنا تو ناپسند نہیں کرتا۔ یہ عمر میں مجھ سے دو تین سال چھوٹی ہی ہوگی۔"

"کس نے کھانا پکایا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "اور کس نے کھلایا تھا؟"

"مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "ابا جی نے ہمیں حویلی بدر کر رکھا ہے۔ ہم حویلی میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ ہم دو بھائی ہیں اور ایک ہماری بہن ہے۔ ہماری ماں بہت بوڑھی اور ضعیف ہے۔"

"حویلی میں کون رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"حویلی میں آج کل عالمگیر، اُس کی بیوی میمونہ اور اُس کی سوتیلی بہن شگفتہ رہتی ہے۔ شاید ایک بوڑھی ملازمہ بھی ہے۔ شگفتہ کی ماں کو بھی ابا جی طلاق دے چکے ہیں۔ اس کی ماں کا نام نور بی بی ہے۔ اُس نے دوسرا آدمی کر لیا ہے۔ شگفتہ ان کے ساتھ ملی ہوئی ہے، سرور جان اور اُس کے خاندان کے ساتھ۔"

"خاصا پیچیدہ سلسلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "تم نے بتایا ہے کہ حویلی میں عالمگیر، اُس کی بیوی میمونہ اور اس کی سوتیلی بہن شگفتہ رہتی ہے۔ سرور جان کا نام تم نے نہیں لیا۔ یہ عورت کہاں رہتی ہے؟"

"یہ ایک الگ کہانی ہے۔ سرور جان آج کل ایک اور شخص کے ساتھ رہ رہی ہے۔ ابا جی کے ساتھ اس کی اَن بن ہوگئی ہے لیکن چوری چھپے حویلی بھی جاتی ہے بلکہ زیادہ تر اُدھر ہی رہتی ہے۔"

"اور تم کہاں رہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں اپنی ماں کے ساتھ الگ رہتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "اُدھر نوربس کے محلے میں ہمارا ایک چھوٹا سا مکان ہے۔"

ڈاکٹر نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ اورنگ زیب عباسی زہر خورانی کا شکار ہوا ہے، لیکن اُس وقت وہ بیان دینے کے قابل نہیں تھا۔ اُس پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ میں اپنے آدمیوں کے ہمراہ اُس کی حویلی پہنچ گیا۔ اُس وقت رات کافی ہو چکی تھی اور حویلی کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ مکینوں کو بیدار کرنے کے لیے ہمیں خاصے زور سے دستک دینا پڑی۔ دس پندرہ منٹ کے بعد اندر بتی روشن ہوگئی اور اندر سے ایک اونگھتی ہوئی آواز سنائی دی: "اس وقت کون ہماری نیند خراب کرنے آگیا؟" بولنے والا کوئی نوجوان تھا۔

"جا دیکھ تو سہی۔" کسی عورت نے کہا۔ "ضرور کوئی اسپتال سے آیا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ تیرا باپ مر گیا ہوگا۔"

اُن کا لہجہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔ رات کے سناٹے میں اُن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی، لیکن انھیں غالباً اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔

"پھر تو سونا نصیب نہیں ہوگا۔" نوجوان نے کہا۔ "ابا جی صبح تک انتظار کر لیتے تو کیا حرج تھا۔"

اے ایس آئی میری طرف دیکھ کر کہنے لگا: "ملک صاحب! اِسے کہتے ہیں ... یہ حال ہے آج کل کی اولاد کا۔ ماں باپ تو ان کے آسائش کے لیے جان ہلکان کر ڈالتے ہیں اور یہ ہیں کہ اُن کی موت سے ان کے آرام میں خلل پیدا ہوتا ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد نوجوان نے پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھولا۔ عورت اُس کے پیچھے تھی۔

ان دونوں کی مختصر گفتگو سننے کے بعد میں بہت غصے میں تھا۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے نوجوان کو ایک طرف دھکیلا اور اپنے آدمیوں کو اندر داخل ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر گھس گیا۔

"یہ ... یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" عورت چلائی۔ "باہر کھڑے ... کچھ خوفِ خدا کریں۔"

نوجوان کی عمر پچیس تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ حلیے کی ... میں نے دیکھا، وہ لمبے قد کا خاصا مضبوط نوجوان تھا۔ اُس ... پاجامہ پہن رکھا تھا۔ عورت کی عمر پچاس سال سے اوپر نظر ... وہ خاصی تند مزاج عورت معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسلسل بولے چلی ...

"قتل کی تفتیش کرنے آئے ہیں۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "... کی ضرورت نہیں ہے۔ گھر کے اندر جتنے افراد ہیں انھیں ایک ... کوئی شخص بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔"

عورت نے چیخ کر کہا: "اس وقت آپ حویلی سے چلے جائیں، جو کچھ پوچھنا ہے صبح آکر پوچھیں۔ ہم لوگ آرام کر رہے ہیں۔"

میں نے ایک سپاہی سے کہا: "فوراً تھانے جاؤ اور چھ سات آدمی ساتھ لے کر جلدی واپس آؤ۔"

"حضورِ والا، مسئلہ کیا ہے؟" نوجوان نے اکڑ کر پوچھا۔

میں نے اُس کا گریبان مضبوطی سے پکڑ کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کہا: "بچّو! مسئلہ تو تم بڑی اچھی طرح سمجھتے ہو۔ انجان بننے کی کوشش مت کرو۔ نام کیا ہے تمھارا؟"

"دیکھیں جناب! آپ گریبان چھوڑ کر بات کریں۔ میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔ میرا نام عالمگیر عباسی ہے۔"

"کچھ بتا تو چلے کہ بات کیا ہے۔" عورت نے کہا۔ "آپ میرے بچے پر کیوں ظلم کر رہے ہیں؟"

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سرور جان تھی۔ اورنگ زیب عباسی کی چھٹی یا ساتویں بیوی۔

"تمھارا باپ کہاں ہے؟" میں نے عالمگیر سے پوچھا۔

"ابا جی تو اسپتال میں ہیں۔" اُس نے جواب دیا۔ "اُن کی طبیعت خراب ہے۔ ہم نے خود انھیں اسپتال میں داخل کروایا ہے۔"

میں انھیں اندر لے گیا اور بیٹھک میں بٹھا دیا۔ اس اثنا میں دیگر افراد بھی بیدار ہو چکے تھے۔ میں نے اُن سب کو بھی بیٹھک میں جمع کر لیا۔ وہ تعداد میں سات آٹھ تھے۔ اُن میں عالمگیر کی بیوی میمونہ، سوتیلی بہن شگفتہ، ایک بوڑھی ملازمہ، ایک دو سالہ بچہ اور ایک پینتیس چھتیس سالہ مرد شامل تھا۔ اُس کا نام اشتیاق علی معلوم ہوا۔ اُس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ ملازم ہے لیکن وہ حویلی کے ایک کمرے سے برآمد ہوا تھا اور ملازم نہیں لگتا تھا۔

میں نے اے ایس آئی کے ہمراہ سب سے پہلے باورچی خانہ چیک کیا۔ وہاں تمام برتن دھلے ہوئے رکھے تھے۔ دو ہانڈیوں میں تھوڑا تھوڑا سالن موجود تھا۔ چنگیر میں چند کچی پکی روٹیاں بھی پڑی تھیں۔

اے ایس آئی نے کہا: "ملک صاحب! ہمیں کھانے کا نمونہ لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے محفوظ کر لینا چاہیے۔"

لیکن میرے خیال میں اُس کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ اگر سارے کھانے میں زہر ہوتا تو گھر کے تمام افراد پر اُس کا اثر ہوتا۔ واضح طور پر زہر عباسی کے کھانے یا پینے کی کسی چیز میں ملایا گیا تھا اور زہر ملانے والے نے بقیہ کو ناپھینک دیا تھا اور احتیاطاً تمام برتن دھو ڈالے تھے۔ لہٰذا ہانڈیوں کے سالن کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے لے جانا فضول ہی تھا۔ میرے استفسار پر گھر والوں نے بتایا کہ کھانا ملازمہ نے پکایا تھا اور سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا تھا۔ سب میں عباسی کے علاوہ تین افراد شامل تھے یعنی شگفتہ، عالمگیر اور اس کی بیوی میمونہ۔ سرور جان کا کہنا تھا کہ وہ اُس وقت گھر پہنچی تھی جب اہلِ خانہ کھانا کھا چکے تھے لیکن اُس کا بیان درست معلوم نہیں ہوتا تھا۔

میں نے شگفتہ سے پوچھا: "تمھارے ابا نے کھانے کے بعد دودھ پیا تھا یا چائے؟"

اس کی شکل وصورت واجبی سی تھی، عمر تئیس چوبیس سال کے قریب تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ خاموش طبیعت مگر باشعور لڑکی تھی۔

"دودھ پیا تھا۔" اُس نے جواب دیا: "دودھ کے ساتھ دوائی بھی کھائی تھی۔ کوئی طاقت کی دوائی ہے۔ روز ہی کھاتے ہیں۔ اس کے دس منٹ بعد انھوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ اُن کے پیٹ میں مروڑ اُٹھ رہے ہیں۔ اللہ جانے اچانک کیا ہوا تھا۔ ہم نے انھیں اسپتال پہنچا دیا۔"

میں نے پوچھا: "دودھ کس نے انھیں دیا تھا؟"

"میں نے دیا تھا۔ بھابی نے گرم کر کے گلاس میں ڈال دیا اور میں نے لے جا کر اُن کی میز پر رکھ دیا۔"

میں نے میمونہ سے پوچھا: "جب تم نے دودھ گرم کیا، اس وقت باورچی خانے میں کون کون تھا؟"

"بس رحمتے تھی اور میں تھی۔" اُس نے جواب دیا: "رحمتے برتن دھو رہی تھی۔ میں نے دودھ گرم کر کے رکھا ہی تھا کہ مُنّا رونے لگا۔ میں مُنّے کو دیکھنے چلی گئی اور خالہ سے کہا کہ وہ شگفتہ کے ہاتھ ابا کو دودھ بھجوا دیں۔"

رحمتے اُن کی ملازمہ تھی اور خالہ وہ اپنی ساس کو کہتی تھی، گویا اس وقت سرور جان بھی گھر میں موجود تھی۔ میں نے شگفتہ سے پوچھا: "تمھارے ابا اپنی دوائیں کہاں رکھتے ہیں؟"

"اپنے کمرے میں الماری کے اندر۔" اُس نے جواب دیا: "انھوں نے کوئی غلط گولی کھا لی ہوگی۔ الماری بھری پڑی ہے دوائیوں سے۔ پتا نہیں کس زمانے کی دوائیں پڑی ہیں۔"

میں نے عباسی کی خواب گاہ میں جا کر اُس کی دیواری الماری کا جائزہ لیا۔ لڑکی ٹھیک ہی کہتی تھی۔ وہاں بے شمار دوائیں رکھی تھیں۔ گولیاں، شربت، حکیمی معجونیں، کشتے اور جانے کیا کیا۔ کچھ نئی دوائیں تھیں، کچھ پرانی تھیں۔ ہر چیز پر گرد جمی ہوئی تھی۔ دوائیوں کے علاوہ چند فائلیں اور کئی متفرق چیزیں اس الماری میں پڑی تھیں۔

"ابا اس الماری کو ہمیشہ تالا لگا کر رکھتے ہیں۔" شگفتہ نے مزید کہا: "آج اچانک تکلیف کی وجہ سے تالا لگانا بھول گئے۔ ہمیں ان کی کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے۔ نہ صفائی کرنے کی اور نہ دوا نکالنے کی۔"

گھر والوں کو یہ تو یقیناً معلوم ہوگا کہ عباسی کون سی دوا کس وقت کھاتا ہے۔ میں نے سوچا، ممکن ہے کہ ان میں سے کسی نے دوا بدل دی ہو یا کسی کشتے میں زہر ملا دیا ہو، چوں کہ الماری کھلی تھی، اس لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ زہر آلود دوا یا کشتہ اپنی جگہ پر [illegible] ہوگا۔

میں نے عباسی کی خواب گاہ کو سیل کر دیا اور عالمگیر اور [illegible] کو پوچھ گچھ کے لیے اپنے ساتھ تھانے لے گیا، تاہم میں عباسی کو سنے بغیر اُن پر کوئی دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

اگلے روز گیارہ بارہ بجے کے قریب ایک بوڑھا شخص انور کے ہمراہ تھانے پہنچا۔ وہ خاصا قد آور اور بھاری بھرکم شخص تھا۔ [illegible] کی چال میں نقاہت پائی جاتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے کمرے میں [illegible] ہوا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اپنے وقت میں خاصا بارعب شخص رہا ہوگا۔

اُس نے پاٹ دار آواز میں سلام کیا، پھر بولا: "تھانے دار [illegible] میرا نام اورنگ زیب عباسی ہے۔ مجھے صبح ہی پتا چلا ہے کہ آپ نے [illegible] بیٹے کو گرفتار کر لیا ہے۔ میں اسی سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوا [illegible]"

"ہم نے ابھی تک کسی کو گرفتار نہیں کیا۔" میں نے جواب [illegible] "ہمیں بتایا گیا تھا کہ آپ کو زہر دیا گیا ہے۔ میں پوچھ گچھ کے لیے آپ کی [illegible] تھا۔ وہاں سے میں آپ کی بیوی اور بیٹے کو پوچھ گچھ کے لیے تھانے لا[illegible] انھوں نے رات تھانے میں گزاری ہے۔ بقیہ کارروائی آپ کے بیان کے [illegible] کی جائے گی۔"

"میری کوئی بیوی نہیں ہے۔ میں اپنے بچے کی خاطر یہاں آیا ہوں۔ مجھے اجازت نہیں مل رہی تھی لیکن میں زبردستی چلا آیا ہوں۔ بہت مشکل [illegible] یہاں پہنچا ہوں، ملک صاحب! اولاد کی محبت بہت بڑی چیز ہے۔" اس [illegible] شروع کر دیا: "اولاد کیسی بھی ہو، انسان اُس کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا ... میرے بیٹے کو بلائیں۔ میں اسے دیکھ کر تسلی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی بڑی [illegible] ہوگی۔ میں رات بھر اُس کے لیے تڑپتا رہا ہوں۔"

مجھے اُس کے بیٹے کی باتیں یاد آ گئیں۔ اُسے تو اپنے باپ کی [illegible] سے زیادہ اپنے آرام کی فکر تھی، اور باپ اُس کی تکلیف کے خیال سے [illegible] رات تڑپتا رہا تھا۔

اُس کی باتیں سُن کر انور عباسی کے چہرے پر ناگواری نمودار ہو گئی۔

"ابا جی! ہم بھی آپ ہی کی اولاد ہیں۔"

تب ہی مجھے یاد آیا کہ انور عباسی کو حویلی میں داخل ہونے کی اجازت [illegible] تھی۔ عجیب تضاد تھا۔ عباسی جس بیٹے کے لیے تڑپ رہا تھا، وہ تو حویلی میں آ[illegible] رہا تھا اور جس بیٹے کو اُس نے حویلی بدر کر رکھا تھا، اُس نے ساری رات اسپ[illegible] میں باپ کی تیمار داری کرتے گزار دی تھی۔

"عباسی صاحب! میں نے سنا ہے کہ اس بیٹے کو حویلی میں داخل[illegible] کی اجازت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ملک صاحب! میں کیا کروں! یہ لوگ جب بھی حویلی میں آتے ہیں فساد شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے چھ بچے ہیں۔ اس کی چھوٹی بہن آمنہ کے

بچے ہیں۔ اُس سے چھوٹا بھائی اکمل ہے۔ وہ آوارہ ہے۔ چوروں، بدمعاشوں میں اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ دو دفعہ جیل جا چکا ہے۔ میں اس عمر میں ان لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"ہونہہ ... ابا جی نے ساری عمر بھی ہمارے لیے کچھ نہیں کیا۔" انور عباسی نے ہولے سے کہا۔

"تھانے دار صاحب! یہ بڑے الجھے ہوئے مسئلے ہیں۔" عباسی نے کہا۔ "آپ میرے بیٹے کو بلوائیں۔"

"عباسی صاحب! یہ زہر کا کیا مسئلہ ہے؟" میں نے پوچھا: "رات کو آپ کے ایک دوست نے رپٹ لکھوائی ہے کہ آپ کے گھر والوں نے آپ کو کھانے میں زہر دے دیا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی یہی بتایا ہے۔"

"مجھے کسی نے زہر نہیں دیا۔ میں نے غلطی سے کوئی غلط دوا کھا لی تھی۔"

اس کے اس بیان کے ساتھ ہی ہمارا کام ختم ہو گیا۔ میں نے اُس کی بیوی اور بیٹے کو جانے کی اجازت دے دی۔

اس کے سات آٹھ ماہ بعد عباسی ایک بار پھر تھانے آیا اور کہا کہ وہ ایک رپٹ درج کرانا چاہتا ہے۔ اُس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا جس نے اپنا نام افضل بتایا۔

"ملک صاحب! مجھے اپنے رشتے داروں سے جان کا خطرہ ہے۔" عباسی نے کہا: "میں رپٹ لکھوانے آیا ہوں۔"

"آپ کو کون کون سے رشتے داروں سے جان کا خطرہ ہے؟" میں نے پوچھا: "اُن کے نام کیا ہیں؟"

"کوئی ایک ہو تو نام بتاؤں۔ سب کے سب جائداد کے چکر میں میری جان کے دشمن ہوئے ہیں۔"

"گویا آپ کو اپنے ورثا سے خطرہ ہے۔ یعنی اپنی اولاد اور اپنی بیویوں سے۔ آپ کے بچے کتنے ہیں؟"

"تیرہ چودہ کے قریب ہوں گے۔" اُس نے جواب دیا۔ اُسے صحیح تعداد معلوم نہیں تھی۔ سب کے نام بھی یاد نہیں تھے۔ بقول اُس کے وہ اُس کی پانچ بیویوں کی اولادیں تھیں، جن میں سے چار کو وہ طلاق دے چکا تھا۔ سرور جان پانچویں اور آخری بیوی تھی۔ اُس سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ دونوں ہی شادی شدہ تھے۔ بیٹی کا نام رضیہ تھا۔ اُس کا سسرال شیخوپورہ میں تھا۔ اُس کے بھائی عالمگیر کا ذکر آپ سُن چکے ہیں۔

عباسی کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ عالمگیر اور رضیہ کو شبہے سے بالا رکھنا چاہتا تھا۔ اُسے زیادہ خطرہ سرور جان اور اُس کے رشتے داروں سے تھا۔ اسی طرح دیگر چار بیویوں اور اُن کی درجن بھر اولاد سے بھی اُسے خطرہ تھا۔ یہ سب حویلی سے باہر رہتے تھے اور نصف درجن سے زیادہ دوسرے علاقوں میں رہتے تھے۔ مجھے اُن سب کے نام یاد نہیں رہے۔ نہ ہی اُن کا بعد کے واقعات میں کوئی خاص دخل ہے۔

عباسی کے اصرار پر میں نے رپٹ درج کر لی، لیکن میرے خیال میں ایک اسی سالہ بوڑھے کو کوئی احمق ہی قتل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ بہرحال، اس رپٹ کی بنیاد پر میں متعلقہ لوگوں سے مل کر اورنگ زیب عباسی اور اُس کی بیوی کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا رہا۔

عباسی، حکومت کے ایک ایسے محکمے میں ملازم رہ چکا تھا جہاں مختلف طریقوں سے ناجائز دولت اکٹھی کرنے کے بے شمار مواقع تھے۔ محکمے کا ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ عباسی کی عمر سے آپ نے اس بات کا اندازہ لگایا ہوگا کہ اُس کا زمانۂ ملازمت انگریزی دورِ حکومت میں تھا۔ اُس کی تمام شادیاں بھی اُسی زمانے کی تھیں۔

اس قسم کی کہانیوں میں واقعات کی ترتیب کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ واقعات کو اُن کی اصل ترتیب کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے کہانی اپنی دلچسپی کھو دیتی ہے اور غیر ضروری طوالت بھی اختیار کر جاتی ہے۔ لہٰذا میں ایک اہم واقعے کو چھوڑ کر تھوڑی سی بیک گراؤنڈ بتانا چاہتا ہوں۔

عباسی کے پرانے ساتھیوں نے اُس کے متعلق بتایا کہ وہ اپنے وقت میں بہت دبنگ اور بارعب شخص تھا۔ کوئی شخص دس سیکنڈ تک اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے محکمے میں وہ واحد شخص تھا جو انگریز افسروں کے ساتھ انھی کے لہجے میں بات کرتا تھا۔ اُس کے ماتحت اُس کی موجودگی میں کرسی پر بیٹھنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ غصے میں کسی کو ڈانٹتا تھا تو اُس کے دفتر کی دیواریں تک ہل جاتی تھیں۔ اُس نے ناجائز دولت بہت کمائی، مگر اپنے کام کے ساتھ کبھی ناانصافی نہیں کی۔ وہ دس بارہ گھنٹے روزانہ کام کرتا تھا اور اپنے ماتحتوں سے بھی پورا کام لیتا تھا۔

سخت طبیعت ہونے کے باوجود وہ حُسن پرست شخص تھا اور یہی اُس کی نصف درجن شادیوں اور طلاقوں کی بنیادی وجہ تھی۔ بتانے والوں نے مجھے بتایا کہ وہ بڑے اہتمام سے شادی کرتا تھا، مگر کچھ ہی عرصے کے بعد بیوی پر ظلم شروع کر دیتا تھا۔ بالآخر عورت یا تو خود ہی اُس کا گھر چھوڑ کر چلی جاتی تھی یا وہ اُسے طلاق دے کر گھر سے نکال دیتا تھا۔ اس دوران میں وہ دو تین بچوں کی ماں بن چکی ہوتی تھی۔ کچھ عورتوں نے دوسری شادیاں کر لیں اور کچھ صلح کی امید پر انتظار کرتی رہیں۔ انور عباسی کی ماں عائشہ بی بی بھی ایسی عورت تھی۔ اُس نے عباسی سے علیحدگی کے بعد اپنی زندگی بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دی تھی۔ اب اُس کی عمر بھی پچھتر سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ اُس کے تین بچے، دو لڑکے اور ایک لڑکی، پل تو گئے تھے مگر معاشرے میں کوئی مقام حاصل نہیں کر سکے تھے۔ اُن کی مالی حالت عباسی کے نوکروں سے بھی بدتر تھی۔

ایک معمر شخص نے مجھے بتایا کہ عائشہ بی بی سے شادی کے بعد جب عباسی کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا تو اُس نے داتا گنج بخش کے مزار پر جا کر اولاد کے لیے منّت مانی تھی۔ مذکورہ شخص نے بڑے دُکھ سے مجھے بتایا کہ اسی اولاد کو اُس نے اپنی آنکھوں سے بھیک مانگتے دیکھا ہے جب کہ اُن کا باپ مُجروں اور تماشوں میں دولت لٹاتا پھرتا تھا۔ چھوٹی عمر میں وہ بچے

باپ سے ایسا خوف کھاتے تھے کہ اُس کے سائے سے بھی دور بھاگتے تھے۔

اس ضمن میں میں نے واقعات تو بے شمار سُنے، مگر میں ایک واقعہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

ایک صبح عائشہ بی بی کے گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ بھوک سے بچے بے حال ہو رہے تھے۔ ان دنوں انور عباسی کی عمر بارہ تیرہ برس کے لگ بھگ تھی۔ ماں نے انور اور آمنہ سے کہا کہ وہ اپنے باپ سے کچھ پیسے مانگ لائیں۔ بچے اکیلے جاتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ ماں اُن کے ساتھ ہو لی اور عباسی کے مکان سے کچھ دور رُک کر بچوں کو آگے بھیج دیا۔ حویلی عباسی نے بعد میں خریدی تھی۔ اُن دنوں وہ ایک عام سے مکان میں رہتا تھا۔ وہ رات کا وقت تھا۔ بچے ڈرتے جھجکتے باپ کے گھر تک تو پہنچ گئے مگر دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک ملازم نے بچوں کو مشکوک حالت میں دروازے کے پاس کھڑے دیکھا تو انھیں پکڑ کر اندر لے گیا۔ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ عباسی کے بچے ہیں۔ بچے بہ وجہ خوف کچھ بول نہ سکے۔

ملازم انھیں ایک نوجوان عورت کے پاس لے گیا جس نے خاصا بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا۔

"بی بی جی! یہ بچے چوری کی نیت سے دروازے کے پاس چھپ کر کھڑے تھے۔" ملازم نے کہا "اگر میری نظر نہ پڑتی تو یہ کوئی قیمتی چیز لے کر چمپت ہو جاتے۔ شکل سے بھی چور لگتے ہیں۔"

عورت نے دونوں کے منہ پر تڑاخ تڑاخ تھپڑ رسید کیے اور پوچھا "کون ہو تم؟ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟"

آمنہ رونے لگی۔ اُس کی عمر اُس وقت آٹھ نو سال تھی۔

"ہم ابا سے ملنے آئے ہیں۔" انور نے جواب دیا۔ "ہم چور نہیں ہیں۔ ابا کے بیٹے ہیں۔"

"ابا کے لاڈلے... یہاں گھر میں تیرا ابا کہاں سے آ گیا؟"

"کیا ہو رہا ہے؟" دوسرے کمرے سے عباسی کی گونج دار آواز سنائی دی۔ "کون ہیں یہ بچے؟"

یہ دو چور بچے ہیں۔ عورت نے دونوں کے کان پکڑے اور ہاتھ کھینچتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی۔ "یہ چوری کے ارادے سے گھر میں گھسے تھے۔ اگر شیرو نہ دیکھ لیتا تو یہ کوئی چیز لے کر بھاگ جاتے۔"

عباسی نے اپنے ہی بچوں کو دیکھا تو بجائے نرمی کے اُس کا پارہ چڑھ گیا۔ غصے سے بولا "کیوں آئے ہو یہاں؟ کس نے بھیجا ہے؟ ماں کہاں ہے تمھاری؟"

بچے خوف سے کانپنے لگے۔ انور نے ڈرتے ڈرتے کہا "امی اُدھر دور کھڑی ہیں۔ انھوں نے بھیجا..."

ابھی اُس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ عباسی نے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا اور وہ فرش پر گر گیا۔

"ہوں... تیری ماں اُدھر کھڑی ہے۔" اُس نے کہا "اُس نے ضرور تجھے چوری کرنے یہاں بھیجا ہے۔"

"ابا... ابا، گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔" آمنہ نے روتے ہوئے کہا "امی نے کہا تھا کہ ابا سے کچھ پیسے لے آؤ۔"

"یہ... یہ آپ کے بچے ہیں؟" عورت نے گھبرا کر پوچھا "انھوں نے مجھے بتایا ہی نہیں۔"

"گھر میں کھانے کو نہیں ہے۔" عباسی نے کہا "کیا کرتی رہتی ہے تمھاری ماں؟ کیوں نہیں کما کے کھلاتی تمھیں؟ نکل جاؤ یہاں سے۔ اگر میں نے دوبارہ تم دونوں کو یہاں دیکھ لیا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

بچے اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگے۔ عورت کو ترس آ گیا۔ اُس نے دو چاندی کے روپے اندر سے نکال کر انور کے ہاتھ پر رکھے اور کہا "یہ لو، یہ اپنی امی کو دے دینا۔"

"رکو!" عباسی نے تحکمانہ لہجے میں کہا "پیسے واپس کر دو۔ ان کو ایک دفعہ پیسے دے دیے تو یہ بار بار یہاں آئیں گے، اور یہ بات مجھے پسند نہیں ہے۔"

"رہنے دیں۔" عورت نے اصرار کیا "بے چارے بھوکے ہیں۔ کیسے سنگ دل باپ ہیں آپ۔"

عباسی قدرے نرم پڑ گیا، بولا "ٹھیک ہے، رکھ لو یہ پیسے۔ لیکن آئندہ اِدھر کا رُخ نہ کرنا۔"

اُس زمانے کے دو روپے آج کے دو سو روپے سے بھی زیادہ قیمتی تھے۔ انور نے چاندی کے اُن روپوں کو مٹھی میں دبایا اور اپنی بہن کے ہمراہ فی الفور وہاں سے نکل گیا۔ مار کھانے کے باوجود دونوں خوش تھے۔

اس بات کو چالیس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ آمنہ اور انور عباسی کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی لیکن باپ کے گھر کے دروازے اُن پر ہنوز بند تھے۔

آپ میں سے اکثر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔ کوئی باپ اپنی اولاد کے معاملے میں اتنا سنگ دل نہیں ہو سکتا لیکن یقین کریں عباسی ایسا ہی شخص تھا۔ بعد میں اُس نے اپنے ان بچوں کی مالی مدد بھی کی تھی۔ یہ بات خود عباسی نے مجھے بتائی تھی۔ اُس نے آمنہ کی شادی پر پورا جہیز دیا۔ انور اور اُس کو کاروبار کرنے کے لیے رقم دی لیکن دونوں کا کاروبار فیل ہو گیا۔ عباسی نے کہا دونوں لڑکے نااہل تھے، اس لیے کاروبار نہیں چل سکا۔ لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کاروبار کی ناکامی میں لڑکوں کی نااہلی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جس پیسے سے کاروبار شروع کیا گیا تھا، وہ حرام کا پیسہ تھا۔ ناجائز ذرائع سے حاصل کیا ہوا پیسہ... ایسے پیسے کا کاروبار تو فیل ہی ہونا تھا۔

عباسی کی دوسری بیویوں کے قصے بھی میں نے سنے۔ ہر قصہ اپنی جگہ ایک الگ کہانی ہے۔ ان بیویوں نے عباسی کو ایک سنگ دل اور نفس پرست انسان قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ایسے شخص کو سرِ عام پھانسی پر لٹکا دینا

چاہیے۔ انھیں تعجب اس بات پر تھا کہ ایسے شخص کو اللہ نے کیوں ڈھیل دے رکھی تھی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ عباسی صحت اور تندرستی کے دنوں میں ایک تند مزاج اور ظالم شخص تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بیویوں کی پٹائی تو اُس کے معمولات میں شامل تھی۔ اس کے باوجود وہ ہر چند سال بعد ایک نئی عورت بیاہ لاتا تھا۔ اس فن میں وہ خاصا ماہر تھا۔

اب میں آپ کو اس کی آخری شادی کا احوال سناتا ہوں۔ یہ شادی اُس کی زندگی میں بڑی اہمیت کی حامل تھی۔

وہ غالباً ۱۹۳۰ء یا اُس سے پہلے کا زمانہ تھا اور جنگ زیب عباسی اُن دنوں لاہور میں متعین تھا اور خاصے عروج پر تھا۔ اگرچہ اُس وقت اُس کی عمر پچپن چھپن سال کے قریب تھی تاہم وہ ایک خوش شکل اسمارٹ اور بارعب شخص تھا۔ ہر وقت سوٹ اور فیلٹ ہیٹ میں نظر آتا تھا۔

ایک روز اُسے سرکاری کام کے سلسلے میں کچہری جانا پڑا۔ وہاں اُس نے ایک حسین اور پُرکشش لڑکی کو پولیس کی تحویل میں دیکھا۔ لڑکی کی عمر بیس بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ دو سپاہیوں کی نگرانی میں سیشن کورٹ کے [illegible] لائی گئی تھی۔ اُس کی پریشانی اور بے بسی اُس کے حسن میں اضافہ کر رہی تھی۔

عباسی نے لڑکی کو دیکھا اور دیکھتے ہی اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ اُس وقت اُس کے ساتھ اُس کا ایک اسسٹنٹ اور ایک وکیل بھی تھا۔ وہ ایک اہم سرکاری کیس میں پیش ہونے کے لیے وہاں آئے تھے۔

عباسی لڑکی کو دیکھ کر رُک گیا۔ وکیل اور اسسٹنٹ بھی رُک گئے۔

عباسی نے سپاہی سے پوچھا کہ لڑکی کو کس جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔

"جناب! یہ بڑی خطرناک عورت ہے۔" سپاہی نے جواب دیا "اس نے اپنے آشنا کی مدد سے اپنے شوہر کو قتل کر دیا ہے۔ ہم اسے عدالت میں پیش کرنے کے لیے لائے ہیں۔ دیکھنے میں یہ بہت بھولی لگتی ہے...."

"اس کا آشنا کدھر ہے؟" عباسی نے پوچھا۔

"وہ موقع سے فرار ہو گیا تھا۔" سپاہی نے جواب دیا "یہ اُس کا نام نہیں بتاتی۔ ہم نے سارے طریقے آزما کر دیکھ لیے ہیں۔ بڑی سخت جان ہے۔ کہتی ہے کہ خود سولی پر چڑھ جاؤں گی پر اُس کا نام نہیں بتاؤں گی۔"

"پھر تو یہ بڑی بہادر لڑکی ہے۔" عباسی نے کہا، پھر پوچھا "کیا تم نے واقعی اپنے شوہر کو قتل کر دیا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔" لڑکی نے رحم طلب نظروں سے عباسی کی طرف دیکھا "میں نے اپنے شوہر کو قتل نہیں کیا۔"

اتنے میں لڑکی کا وکیل بھی قریب پہنچ گیا۔

عباسی نے اُس سے کہا "اے مسٹر! تم نے ابھی تک اس کی ضمانت کیوں نہیں کروائی ہے؟"

وکیل، عباسی کے لب و لہجے اور رکھ رکھاؤ سے مرعوب ہو گیا۔ بولا "سر! امید ہے کہ آج ضمانت ہو جائے گی۔"

"ضمانت کے کاغذات تیار ہیں؟" عباسی نے پوچھا۔

وکیل نے فائل دکھائی، بولا "یس سر! کاغذات تیار ہیں لیکن اس کا ضمانتی ابھی تک نہیں آیا۔"

"وہ... وہ آنے ہی والا ہو گا۔" لڑکی نے کہا "میری ماں نے کہا تھا کہ وہ ضمانتی ساتھ لے کر آئے گی۔"

"بھول جاؤ اُس کو۔" عباسی نے کہا "آؤ میرے ساتھ، میں تمھاری ضمانت دوں گا۔"

اُس وقت جج ابھی چیمبر میں بیٹھا تھا۔ عباسی نے وکیل کو ساتھ لیا اور بڑے رُعب سے چلتا ہوا جج کے چیمبر میں گھس گیا۔ دروازے پر متعین چپراسی نے نہ صرف یہ کہ عباسی کو روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہاتھ اُٹھا کر سلام بھی کیا۔

سیشن جج ہندو تھا۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر عباسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

عباسی نے جج کو سلام کیا، کرسی پر بیٹھنے کے بعد اپنا تعارف کرایا اور بولا "جج صاحب! میں ایک چھوٹے سے کام کے سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔"

"حکم کریں عباسی صاحب!" جج نے کہا "میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

اپنی سیٹ پر متمکن سیشن جج بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتا مگر مذکورہ جج، عباسی سے فوراً ہی متاثر ہو گیا تھا۔ اگرچہ عباسی کا محکمہ اور عہدہ بھی خاصا اہم تھا مگر اصل جادو اُس کی آنکھوں میں، اُس کی خود اعتمادی میں اور اُس کی گفتگو میں تھا۔

اُس نے وکیل سے، جو ہنوز کھڑا تھا، ضمانت کے کاغذات لیے اور جج کے سامنے رکھتے ہوئے بولا "میں اس لڑکی کی ضمانت کروانا چاہتا ہوں۔ کاغذات تیار ہیں، صرف میرے دستخط ہونے باقی ہیں۔"

دلچسپ بات یہ تھی کہ عباسی کو اس وقت تک لڑکی کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔

جج نے کاغذات پر نظر ڈالی اور بولا "عباسی صاحب! آپ تھوڑا انتظار کر لیں، عدالت کی کارروائی شروع ہونے میں چند منٹ باقی ہیں۔ میں سب سے پہلے اسی کیس کو نمٹا دوں گا۔ وکیلِ استغاثہ کا موقف سننا بھی ضروری ہے۔"

"میں وکیلِ استغاثہ کو یہیں بلوا لیتا ہوں۔" عباسی نے کہا، پھر لڑکی کے وکیل سے مخاطب ہو کر بولا "جلدی سے وکیلِ استغاثہ اور لڑکی

کو اندر بلا لاؤ۔ جج صاحب کا وقت بہت قیمتی ہے۔"

اُس نے جج کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ وکیل جلدی سے باہر گیا اور دونوں پارٹیوں کو اندر بلا لایا۔

عباسی نے سپاہیوں کو ڈانٹ کر باہر بھیج دیا اور جج سے کہا "یہ معصوم لڑکی آپ کی بیٹیوں کے برابر ہے۔ پولیس نے اس پر تشدد اور زیادتی کی ہے۔ اس کے جسم کے نازک حصّوں پر تشدد کے نشانات موجود ہیں۔ آپ حکم کریں تو یہ لڑکی آپ کو تشدد کے نشانات دکھانے پر تیار ہے۔ آپ نہ صرف ایک جج ہیں بلکہ عمر میں اس کے باپ کے برابر ہیں۔ انصاف کی خاطر یہ لڑکی آپ کو اپنا جسم دکھانے کے لیے تیار ہے۔"

معزز جج یہ بات سُن کر پریشان ہو گیا۔ لڑکی نظریں جھکائے معصومیت کی تصویر بنی جج کے سامنے کھڑی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ جج کے اشارے کی منتظر ہو لیکن یہ بات ظاہر تھی کہ جج ایسا مطالبہ نہیں کر سکتا تھا۔

عباسی نے محض نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا، جو ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔ بوڑھا جج لڑکی کے حسن اور عباسی کی باتوں سے متاثر ہو گیا۔ وکیلِ استغاثہ نے ملزمہ کا ریمانڈ حاصل کرنے کے لیے دلائل دینا شروع کر دیے لیکن جج نے دلائل مسترد کرتے ہوئے لڑکی کو عباسی کی ضمانت پر رہا کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

عباسی لڑکی کے ہمراہ باہر نکلا تو اُس کا اپنا وکیل پریشان کھڑا تھا۔

"سر! جلدی کریں۔" اُس نے کہا۔ "ہمارے کیس کی آواز پڑ چکی ہو گی۔"

"آج میں عدالت میں پیش نہیں ہو سکتا۔" عباسی نے کہا۔ "جا کر ہفتے دس دن کی تاریخ لے لو۔"

اس اثنا میں لڑکی کی ماں بھی عدالت میں پہنچ چکی تھی۔ اتفاق سے اُسے کوئی ضمانتی نہیں مل سکا تھا۔ جب اُسے پتا چلا کہ ایک نیک دل شخص نے اُس کی بیٹی کی ضمانت کروا دی ہے تو خوشی سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے عباسی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ کسی دن اُن کے گھر آئے اور انھیں خدمت کا موقع دے۔

"میں ابھی تمھارے ساتھ چل رہا ہوں۔" عباسی نے کہا۔ "میں تمھیں اس کیس کے سلسلے میں بہت سی باتیں سمجھانا چاہتا ہوں۔"

عورت ہچکچانے لگی، بولی۔ "دراصل بات یہ ہے کہ ہماری رہائش کسی اچھے علاقے میں نہیں ہے۔۔۔"

عباسی تو عورت کی وضع قطع دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اُس نے کہا۔ "اے، مجھ سے کیا چھپاتی ہو۔ میں تو آدمی کی بو اسونگھ کر بتا دیتا ہوں کہ وہ کس علاقے کا رہنے والا ہے۔ تم ٹکسالی کی رہنے والی ہو نا؟"

"جی۔۔۔ جی ہاں، آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔" عورت نے کہا۔ "ہم وہیں کے رہنے والے ہیں۔ وہ جگہ آپ جیسے شریف لوگوں کے لائق نہیں۔ عنقریب وہ علاقہ چھوڑنے والے ہیں۔ پھر آپ کی دعوت کریں گے۔"

"دعوت کو جہنم میں ڈالو۔ میں تمھاری بیٹی کے لیے پریشان ہوں۔ میرے ساتھ۔"

اُس نے تانگا کیا اور ماں بیٹی کے ہمراہ اُن کے گھر پہنچ گیا۔ جیسے سازندگیاں بھی تھیں اور اُن کے بجانے والے بھی تھے۔ وہ سب کار کو فر دیکھ کر مرعوب ہو گئے اور جھک جھک کر اُسے سلام کرنے لگے۔ عباسی نے عورت کو کھانا تیار کرنے کا حکم دیا اور لڑکی کے ساتھ ایک الگ کمرے میں جا بیٹھا۔

"ہوں۔۔۔" اُس نے لڑکی کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بتا کہ تیرا نام کیا ہے؟"

"میرا نام سرور جان ہے۔" لڑکی نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

عباسی یہ نام سُن کر پھڑک اُٹھا۔ "واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ کیا خوب نام ہے۔ تم واقعی سرورِ جاں ہو۔ دل خوش کر دیا۔ دوسری بات یہ بتاؤ کہ کیا قصّہ ہے؟ کیا تم نے واقعی اپنے شوہر کو قتل کیا ہے یا تم بے گناہ ہو؟"

لڑکی سچ بولنے میں متأمل تھی۔ عباسی نے اُسے یقین دلایا کہ وہ اُس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ گھبرائے بغیر ساری بات بتا دے، وہ اُسے بچا لے گا۔

سرور جان نے اعتراف کیا کہ اُس نے محسن علی نامی ایک نوجوان کے ساتھ مل کر اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا۔ اُس کے شوہر کا نام کبیر احمد تھا۔ وہ عزّت کی زندگی گزارنا چاہتی تھی، اس لیے اُس نے کبیر احمد کے ساتھ شادی کی تھی۔ کبیر احمد نے خود کو بہت امیر کبیر ظاہر کیا تھا مگر شادی کے بعد پتا چلا کہ وہ ایک معمولی خاندان کا فرد تھا اور اُس کی آمدنی بھی اتنی نہیں تھی جتنی اُس نے بتائی تھی۔ اُس کے رشتے دار پرانے خیالات کے تنگ نظر لوگ تھے۔ اُن کی شہ پر کبیر احمد نے سرور جان پر پابندیاں لگانا شروع کر دیں اور اپنے رشتے داروں سے ملنے جلنے سے بھی روکنا شروع کر دیا۔ شوہر کے سلوک سے تنگ آ کر سرور جان نے محسن علی کی مدد سے اُسے قتل کر دیا۔ محسن علی جائے واردات پر کوئی نشان چھوڑے بغیر غائب ہو گیا اور سرور جان پکڑی گئی۔

پولیس کیس کی تفتیش کر رہی تھی، اور ابھی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا تھا۔

"سرور جان! جو کچھ تم نے بتایا ہے، اُس کے پیشِ نظر تمھارا بچنا محال نظر آتا ہے۔" عباسی نے کہا۔ "سزائے موت نہ بھی ہوئی تو عمر قید ہو جائے گی لیکن میں تمھیں ایک شرط پر بری کروا سکتا ہوں۔"

"میں آپ کی ہر شرط پوری کرنے کے لیے تیار ہوں۔" سرور جان نے کہا۔ "آپ مجھے سزا سے بچا لیں۔"

"ٹھیک ہے۔" عباسی نے کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ محسن علی سے تمھارا کیا سلسلہ ہے؟"

سرور جان نے شرماتے ہوئے کہا۔ "میں محسن سے محبت کرتی ہوں، اُس کی خاطر جان بھی دے سکتی ہوں۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔"

عباسی نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "تم اُس اچھے آدمی کے لیے جان دے سکتی ہو، کیا وہ بھی تمھاری خاطر جان دے سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں، ہم نے ایک دوسرے کی خاطر جینے مرنے کا عہد کر رکھا ہے۔"

"پھر وہ بھاگ کیوں گیا؟ اُس نے اپنی گرفتاری کیوں نہیں پیش کی؟"

"اُس نے کہا تھا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر ہم دونوں پکڑے جاتے تو دونوں کو سزا ہو جاتی۔ اُس کے پکڑے جانے سے میری سزا کم نہیں ہو گی۔ اس طرح کم از کم ایک تو بچ جائے گا۔"

"بہت بھولی ہو تم۔ وہ 'ایک' تم کیوں نہیں؟ محسن علی مرد ہے، اُسے خود آگے آنا چاہیے تھا۔"

"جی اصل مسئلہ تو میرا تھا۔ میں اپنے شوہر سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ محسن نے تو صرف میری مدد کی تھی۔"

"سنو میری بات۔" عباسی نے قدرے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "اس قسم کے عشق میں مت پھنسو، ورنہ زندگی بھر جیل میں سڑتی رہو گی۔ تمھارا حسن و شباب جیل میں رہ جائے گا۔ پندرہ بیس سال کے بعد جب تم جیل سے باہر آؤ گی تو خود بھی اپنی شکل نہیں پہچان سکو گی اور یاد رکھو کوئی محسن علی تمھارا انتظار نہیں کرے گا۔ اُس وقت اس کے بچے بھی جوان ہو چکے ہوں گے۔ اس لیے اس مصیبت سے بچنے کے لیے محسن علی کو آگے کر دو۔ باقی معاملہ میں سنبھال لوں گا۔ پولیس کو اپنی کارروائی مکمل کرنے کے لیے ایک قاتل کی ضرورت ہے۔"

"یہ تو آپ نے بڑی سخت شرط بتائی ہے۔" سرور جان سوچ میں پڑ گئی۔

"سرور جان! یہ شرط نہیں، تمھارے بچنے کی ترکیب ہے۔ شرط ابھی میں نے کہاں بتائی ہے!"

اتنے میں سرور جان کی ماں گل مرجان بھی کمرے میں پہنچ گئی۔ عباسی نے اُسے دوبارہ ساری بات بتائی، پھر کہا۔ "میری شرط یہ ہے کہ سرور جان کو میرے ساتھ شادی کرنا ہو گی۔"

گل مرجان نے عباسی سے اُس کی حیثیت کے بارے میں چند سوالات کیے، پھر سرور جان سے مشورہ کرنے کے بعد ہاں کر دی۔ "عباسی صاحب! اگرچہ آپ کا اور میری بیٹی کا کوئی جوڑ نہیں ہے، تاہم میں اس رشتے پر تیار ہوں۔"

سرور جان جو ہنوز مطمئن نہیں تھی، بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا، میں محسن علی کو کیا منہ دکھاؤں گی؟"

"تم فکر مت کرو۔" عباسی نے کہا۔ "محسن علی اپنے پیروں پر چل کر جیل سے باہر نہیں آئے گا۔ میں سب انتظام کر لوں گا۔ میں پیسہ بھی خرچ کر سکتا ہوں اور سفارش بھی لگا سکتا ہوں۔"

سرور جان ایک بار حوالات کا مزہ چکھ چکی تھی اور اس خوفناک تجربے کو دُہرانا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا اُس نے عباسی کی ہر شرط تسلیم کر لی اور اُس سے شادی پر رضامند ہو گئی۔

عباسی نے محسن علی کو گرفتار کروا دیا اور اپنے رسوخ سے کام لیتے ہوئے سرور جان کو گواہ بنوا دیا۔ اس کام کے لیے اُس نے یقیناً دولت بھی خرچ کی ہو گی۔ اس دوران اُس نے سرور جان کے ساتھ نکاح پڑھوا لیا اور اُس سے عدالت میں محسن علی کے خلاف بیان دلوایا۔ یہ وہی سرور جان تھی جو کہتی تھی کہ وہ اپنے محبوب محسن علی کی خاطر جان بھی قربان کر دے گی۔ بالآخر اُس نے اُسی جان سے زیادہ پیارے محبوب کے خلاف عدالت میں کھڑے ہو کر بیان دیا اور اُسے پھانسی کے تختے پر پہنچا دیا۔

اُن دنوں جو بیوی عباسی کے گھر میں تھی، وہ شگفتہ کی ماں نور بی بی تھی۔ وہ بھی کم خوب صورت نہیں تھی۔ اُس کے اُن دنوں دو بچے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ اُن کی عمریں دو تین سال سے زیادہ نہیں تھیں۔

عباسی نے سرور جان کو الگ مکان میں رکھا تھا اور نور بی بی کو اُس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

جب تک قتل کا کیس چلتا رہا تب تک سرور جان بہت دب کر رہی اور دل و جان سے عباسی کی خدمت کرتی رہی۔ لیکن جب کیس کا فیصلہ ہو گیا اور محسن علی کو موت کی سزا ہو گئی تو اُس نے پر پُرزے نکالنا شروع کر دیے۔ اُسے اس بات کا یقیناً رنج تھا کہ عباسی نے اُس کے محبوب کو پھانسی پر چڑھوا دیا تھا اور اُسے اپنی ازدواجی قید میں جکڑ لیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس نے عباسی سے یہ مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ یا تو وہ دونوں بیویوں کے ساتھ مساوی سلوک کرے یا دو میں سے ایک کو طلاق دے دے۔

عباسی کے لیے طلاق دینا کوئی مشکل نہیں تھا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اُسے نور بی بی کے بچوں سے بہت پیار تھا، خصوصاً ننھی شگفتہ سے۔ اس لیے وہ نور بی بی کو طلاق دینے سے گریز کر رہا تھا۔ اُدھر سرور جان کا شباب بھی اپنے جوبن پر تھا اور عباسی اُس کو بھی چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

جہاں تک سرور جان کا تعلق تھا، اُس کو دونوں صورتیں منظور تھیں، یعنی خواہ اُس کو طلاق ہو جائے اور خواہ اُس کی سوکن کو لیکن عباسی سرِ دست کسی کو بھی طلاق نہیں دینا چاہتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد سرور جان نے اپنی پالیسی تبدیل کر دی اور یہ مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ وہ اپنی سوکن کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ جواز یہ پیش کیا کہ وہ امید سے ہے اور اُسے کسی عورت کی مدد کی ضرورت ہے لیکن درحقیقت وہ بیچ میں رہ کر اپنی سوکن کو بھاگنے پر مجبور کرنا چاہتی تھی۔ عباسی نے اُس کا یہ مطالبہ منظور کر لیا اور اُسے نور بی بی کے گھر لے گیا۔ گھر بڑا تھا، دولت کی فراوانی تھی اور کام کاج کے لیے نوکر چاکر

موجود تھے۔ اس لیے دونوں عورتوں کے باہم ٹکراؤ کے امکانات بہت کم تھے۔

سرور جان نے اپنی خوش اخلاقی سے چند روز کے اندر سیدھی سادی نوری بی بی کا دل جیت لیا لیکن اندر ہی اندر شوہر کو اس کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ عباسی کے دل میں اُس کے متعلق شکوک پیدا کرنے شروع کر دیے۔ اُس کا تو مقصد ہی یہی تھا۔ یوں بھی وہ جوڑ توڑ میں خاصی ماہر تھی۔

نتیجہ اُس کی مرضی کے عین مطابق نکلا۔ چند سال بعد وہ نوری بی بی کو طلاق دلوانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس دوران نوری بی بی کے ہاں ایک اور لڑکا پیدا ہو چکا تھا۔ عباسی نے شگفتہ کو اپنے پاس رکھ لیا اور نوری بی بی کو دونوں بیٹوں سمیت طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔

اب سرور جان نہ صرف عباسی کے دل و جان کی بلکہ مال و جان کی بھی مالک تھی۔ وہ عباسی کی گالیاں سنتی رہی، سختیاں برداشت کرتی رہی، لیکن ساتھ ساتھ اُس کے معاملات پر گرفت بھی مضبوط کرتی رہی۔ اُس مکڑی کی طرح جو اپنے جالے میں پھنس جانے والے کیڑے کے گرد کمزور ترین تاروں کا جال بنتی چلی جاتی ہے، ایک کے بعد دوسرا تار اُس کے گرد لپیٹتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ کیڑا بالکل بے بس ہو جاتا ہے۔

اُسے معلوم تھا کہ عباسی کا ہر دن اُسے کمزوری اور ضعیفی کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس لیے کسی عجلت کی ضرورت نہیں تھی۔ چند سال بعد عباسی ریٹائر ہو گیا۔ اگرچہ اُس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن وہ اختیار چھن گیا تھا جس پر وہ بہت ناز کرتا تھا۔

اب سرور جان نے ایک اور حکمت عملی اختیار کی۔ عباسی کا حلقۂ احباب اگرچہ اتنا وسیع نہیں تھا، تاہم سرور جان نے اُس کے ملنے جلنے والوں کو مختلف طریقوں سے بھگانا شروع کر دیا۔ کسی پر دست درازی کا الزام لگا دیا، کسی پر بُری نظر کا طعنہ دھرا، کسی کے ساتھ بداخلاقی کا مظاہرہ کیا، کسی کو کھلے لفظوں میں منع کر دیا۔ دوسری چالاکی اُس نے یہ اختیار کی کہ عباسی کو حد سے زیادہ آرام طلب بنا دیا۔ ہر چیز اشارے پر حاضر... بس دن بھر اِدھر اُدھر پڑے رہو۔

بوڑھا آدمی اگر اپنے جسم کو حرکت میں نہ رکھے اور غذائیں مرغن کھائے تو اس کے جوڑوں میں درد اور چربی میں اضافہ شروع ہو جاتا ہے۔ عباسی کے ساتھ یہی ہوا۔ اُس کا وزن بڑھ گیا، نظر کمزور ہو گئی اور جوڑوں میں درد رہنے لگا لیکن ان بیماریوں اور کمزوریوں کے باوجود اُس کی عمر طویل ہوتی چلی گئی۔

یہ بات سرور جان کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ وہ بوڑھے عباسی کی خدمت کرتے کرتے تنگ آ چکی تھی اور وہ تھا کہ مرنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ لہٰذا اُس نے اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کر دی۔

یہ تھی مختصر سی بیک گراؤنڈ، جس کا ذکر کہانی کی تکمیل کے لیے ضروری تھا۔

اور جس اہم بات کا ذکر میں نے چھوڑ دیا تھا، وہ یہ تھی کہ عباسی کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ یہ واقعہ اُس رپٹ کے تقریباً ایک سال بعد پیش آیا تھا جس میں عباسی نے کہا تھا کہ اُسے اپنے رشتے داروں سے جان کا خطرہ ہے۔

قتل کی اطلاع ملتے ہی میں اپنے چند آدمیوں کے ہمراہ حویلی پہنچ گیا۔

حویلی کا ماحول خاصا کشیدہ نظر آتا تھا۔ عباسی کی مختلف بیویوں کی اولادیں... بلکہ اولادوں کی اولادیں بھی وہاں پہنچ چکی تھیں اور جائیداد پر قبضے کی فکر میں تھیں۔

انور عباسی میرے پاس آیا اور دھیمی آواز میں بولا "ملک صاحب! قتل کی تفتیش تو آپ کریں گے ہی۔ ساتھ ہی ایک نیک کام بھی کریں۔ حویلی سیل کر دیں۔ ورنہ آپ کے جانے کے بعد یہاں خون خرابا ہو جائے گا۔"

اُس کی تجویز معقول تھی۔ میں نے کہا "تم ایسا کرو کہ اپنے اور اپنے چند سوتیلے بہن بھائیوں کے دستخطوں سے ایک درخواست اس مضمون کی لکھ کر مجھے دو کہ جائیداد کے بے شمار دعوے داروں کی وجہ سے حویلی میں نقصِ امن کا اندیشہ ہے، اس لیے فی الوقت حویلی کو سیل کر دیا جائے۔ ایسی درخواست ملنے کے بعد میں تمھاری تجویز پر غور کرتا ہوں۔"

میں نے حویلی کے مکینوں کو ایک کمرے میں بٹھا دیا، باہر سے آنے والوں کو باہر بھیج دیا اور اے ایس آئی کے ہمراہ اندر جا کر لاش کا معائنہ کیا۔ لاش خواب گاہ میں بستر پر پڑی تھی اور ارد گرد خون پھیلا ہوا تھا۔ جسم پر تین گولیوں کے نشانات تھے۔ دو نشان سینے پر تھے اور ایک بائیں آنکھ کے قریب۔ واضح طور پر کسی نے اُس پر نیند کی حالت میں گولیاں چلائی تھیں اور اُسے کروٹ بدلنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ اس بات کا اندازہ خون کے نشانات سے ہوتا تھا۔ وہ کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا اور تینوں زخموں سے خون بہنے کا نشان نیچے کی طرف جاتا تھا۔ اُس کا رُخ اُس کھڑکی کی طرف تھا جو حویلی کے پہلو کی سمت کھلتی تھی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور باہر پھولوں کے پودے نظر آ رہے تھے۔ سائڈ ٹیبل پر کھانے کے گندے برتن اور دواؤں کی چند شیشیاں رکھی تھیں۔

دیواری الماری کھلی تھی اور اُس میں وہ فائلیں نظر آ رہی تھیں جو میں نے پچھلی مرتبہ دیکھی تھیں۔

پلنگ کے نیچے مجھے ایک تہ شدہ کاغذ اور ایک قلم پڑا دکھائی دیا۔ میں نے کاغذ اٹھایا اور اُسے کھولنے لگا۔

"ملک صاحب! یہ دروازہ دیکھا آپ نے؟" اے ایس آئی نے چونک کر کہا۔ "اس کو توڑ کر کھولا گیا ہے۔ یہ دیکھیں، یہاں سے کھپچیاں نکلی ہوئی ہیں۔ یہ بولٹ بھی اُکھڑا ہوا ہے۔ کسی نے باہر سے ٹکر مار کر اس کو توڑا ہے۔"

میں ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کو بھول گیا اور دروازے کا جائزہ لینے لگا۔ اے ایس آئی کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ دروازے کو واقعی ٹکر مار کر توڑا گیا تھا۔ لکڑی کی کھپچیاں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ کمرے میں دو دروازے اور ایک کھڑکی تھی۔ دوسرے دروازے پر اندر سے بولٹ لگا ہوا تھا۔ کھڑکی کھلی تھی مگر اُس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں، یعنی کوئی شخص کھڑکی کے راستے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے سرور جان کو بلا کر پوچھا کہ دروازہ کس نے توڑا تھا؟

اُس نے سبز رنگ کا ریشمی لباس پہن رکھا تھا اور گہرا میک اپ کیا ہوا تھا۔ وہ اُس عمر میں بھی خاصی پُرکشش لگ رہی تھی۔ پہلی ملاقات پر میں نے اُسے بغیر میک اپ کے دیکھا تھا۔ اب وہ میک اپ میں تھی۔

"یہ دروازہ ہم نے توڑا ہے۔" اُس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "تھوڑی دیر پہلے جب ہم شادی سے واپس آئے تو دونوں دروازے بند تھے اور بار بار کھٹکھٹانے کے باوجود کھل نہیں رہے تھے۔ لہٰذا ہم نے گھبرا کر دروازہ توڑ دیا۔ اندر یہ خون میں لت پت..." اچانک وہ چپ ہو گئی اور میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کو گھورنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں اچانک خوف سا اُتر آیا تھا۔ پھر سرعت سے اُس نے میرے ہاتھ سے وہ کاغذ چھیننے کی کوشش کی۔ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

پھر جو میں نے کاغذ پر نظر ڈالی تو میرے چہرے پر بھی حیرت اُتر آئی۔ کاغذ پر لکھا تھا۔

میں مر رہا ہوں۔ مجھے سرور جان، اشتیاق علی
اور گل رحمٰن نے قتل کیا ہے۔ انھوں نے مجھے زہر کھلا
دیا ہے۔ میں آہستہ آہستہ مر رہا ہوں۔
اورنگ زیب عباسی

میں نے یہ تحریر سرور جان کی نظروں سے بچا کر پڑھی تھی اور میرا اندازہ تھا کہ اُس نے رقعے کی صرف پہلی لائن پڑھی تھی، دوسری لائن وہ نہیں پڑھ سکی تھی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ رقعہ پڑھ کر میں خود بھی اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ عباسی نے لکھا تھا کہ اُسے زہر دیا گیا ہے جب کہ واضح طور پر اُس کی موت گولیوں سے واقع ہوئی تھی۔ میں نے رقعہ تہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور سرور جان کو گھورنے لگا۔

وہ اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے بولی "کیا بات ہے ملک صاحب! آپ مجھے ایسے کیوں گھور رہے ہیں؟"

"تم نے یہ کاغذ چھیننے کی کوشش کیوں کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ... مم... میں سمجھی تھی کہ... وہ میرا کوئی خط ہے۔ اس... اس کاغذ میں کیا لکھا ہے؟"

"فکر نہیں کرو۔ ابھی سب پتا چل جائے گا۔ فی الحال تم واپس جا کر انتظار کرو۔" اُس کے جانے کے بعد میں نے اے ایس آئی سے کہا۔ "ایک پڑھے لکھے سپاہی کو ان کی نگرانی پر مقرر کر دو اور اُس سے کہو کہ تمام افراد کی فہرست تیار کر لے۔"

قتل کی واردات بند کمرے میں کی گئی تھی۔ واضح طور پر قاتل نے کھڑکی سے گولیاں چلائی تھیں۔ اور وہ رقعہ عباسی نے سونے سے قبل لکھا تھا لیکن اگر اُسے زہر کے بارے میں پتا چل گیا تھا تو اُس نے جان بچانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ کسی شخص کو زہر دے دیا گیا ہو اور وہ رقعہ لکھنے کے بعد آرام سے سو گیا ہو۔ مجھے خیال آیا کہ شاید عباسی نے محض شک کی بنا پر وہ رقعہ لکھ دیا تھا یا وہ عادتاً اس قسم کے رقعے لکھتا رہتا تھا۔ یہ بات تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی معلوم ہو سکتی تھی کہ اُسے زہر دیا گیا تھا یا نہیں۔

اے ایس آئی واپس آ گیا اور لاش کا نقشہ تیار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے مجھے مقتول کی بائیں پنڈلی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا "ملک صاحب! یہ نشان کیسا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ عباسی نے اس پیر میں کوئی زنجیر یا کڑا وغیرہ ڈال رکھا تھا۔"

اُس کا خیال ٹھیک تھا۔ ٹخنے کے قریب ایک نمایاں نشان نظر آ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک دہشت ناک خیال اُبھرا۔ کیا عباسی کو اُس کے گھر والوں نے زنجیر ڈال رکھی تھی؟

جائے واردات کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی اور اہلِ خانہ کے بیانات لینے کے لیے نشست گاہ میں بیٹھ گیا۔ سپاہی نے مجھے جو فہرست دی، اُس میں صرف چار نام لکھے ہوئے تھے، حالاں کہ میں نے چھ سات افراد کو دیکھا تھا۔ فہرست میں سرور جان، عالمگیر، میمونہ اور شگفتہ کے نام شامل تھے۔ میں نے دو آدمیوں کو حویلی کی تلاشی پر مامور کر دیا اور سرور جان کو کمرے میں بلا لیا۔ وہ کچھ فکر مند نظر آتی تھی، تاہم اُس کے چہرے پر غم کی کوئی علامت نہیں تھی۔

اُس نے میرے سوالات کے جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ گھر کے دیگر افراد کے ہمراہ شام کے پانچ بجے ایک شادی پر گئی تھی اور آٹھ ساڑھے آٹھ بجے واپس آئی تھی۔ جانے سے پہلے وہ اپنے شوہر کے لیے کھانا نکال کر رکھ گئی تھی۔ گھر میں عباسی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ملازمہ بھی شام کے وقت چھٹی کر گئی تھی۔ عباسی کی ہدایت پر انھوں نے جاتے وقت باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ وہ تمام وقت شادی کے گھر میں موجود رہے تھے اور درمیان میں ایک منٹ کے لیے بھی باہر نہیں گئے تھے۔ جب وہ واپس آئے تو انھیں گھر میں کوئی غیر معمولی بات نہیں نظر آئی تھی، سوائے اس کے کہ اُس کے شوہر کی خواب گاہ کے دونوں دروازے اندر سے بند تھے اور

انھوں نے اندر سے جواب نہ ملنے پر گھبرا کر دروازہ توڑ دیا تھا۔

"سرور جان! تمھیں اپنے شوہر کی موت کا کوئی دُکھ نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"دُکھ کیوں نہیں ہوا" اُس نے جواب دیا۔ "دُکھ تو گھر کا کتا بھی مر جائے تو ہوتا ہے۔ عباسی تو میرے سر تاج تھے۔"

"تمھیں یہ بات ضرور معلوم ہوگی کہ تمھارے سر تاج کو تم سے جان کا خطرہ تھا۔ اُس نے تمھارے خلاف ایک سال پہلے رپٹ لکھوائی تھی۔ میں اس رپٹ کی بنیاد پر تم لوگوں کو حراست میں لے سکتا ہوں۔"

"میں آپ کا ہاتھ تو نہیں روک سکتی، لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ ہم نے عباسی صاحب کو قتل نہیں کیا۔ جس وقت یہ واردات یہاں ہوئی ہم اُس وقت ہم شادی کے گھر میں تھے۔ یہ حرکت یا تو اجمل کی ہے اور یا انور کی۔ یہ دونوں بہت عرصے سے موقع کی تلاش میں تھے اور اکثر حویلی کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ اجمل کے بارے میں تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ وہ عادی مجرم ہے۔ چوری ڈکیتی اُس کا پیشہ ہے۔"

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سرور جان! میں سب کچھ جانتا ہوں۔ میرے پاس تمھارا ریکارڈ بھی موجود ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمھارے پہلے شوہر کبیر احمد کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟"

اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا، بولی۔ "یہ... یہ تو بہت پرانی بات ہے۔ تیس چوبیس سال پرانی۔"

"بات نئی ہو یا پرانی حساب کتاب ضرور ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اُس زمانے میں عباسی تمھارا آلۂ کار بن گیا تھا۔ اُس نے اپنے اثر رسوخ اور دولت کے ذریعے تمھیں بچا لیا تھا۔ لیکن اُسے یہ خیال نہ آیا کہ جو عورت ایک شوہر کو قتل کروا سکتی ہے وہ دوسرے کو بھی کروا سکتی ہے۔ سرور جان! پولیس کے ریکارڈ سے بڑے پرانے قصے نکل آتے ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ کبیر احمد کو قتل کرنے کے لیے تم نے محسن علی کو اپنا آلۂ کار بنایا تھا، اور جب تمھارا کام نکل گیا تو تم نے اُسی محسن کو قربانی کا بکرا بنا کر اپنی جان بچا لی۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس دفعہ تم نے کس کو آلۂ کار بنایا ہے؟"

میری باتیں سن کر اُس کا رنگ دم بہ دم بدل رہا تھا۔ بولی۔ "میں سچ کہتی ہوں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اشتیاق علی سے تمھاری کیا رشتے داری ہے؟"

یہ وہ شخص تھا جو مجھے پہلی دفعہ حویلی میں نظر آیا تھا اور عباسی نے اپنے قاتلوں میں اس کا نام بھی لکھا تھا۔

"جی! اشتیاق علی؟ اُس سے ہماری کوئی خاص رشتے داری نہیں ہے۔ عباسی صاحب اُس سے منشی جاپی کروایا کرتے تھے۔"

"ہوں... خاص رشتے داری نہیں ہے اور... اس گل رحمٰن سے تمھاری کتنی خاص رشتے داری ہے؟"

اُس نے گھبرا کر آنکھیں پھیلائیں۔ "گل رحمٰن... ! گل رحمٰن کا نام آپ نے کہاں سے سنا ہے؟"

"وقت ضائع نہیں کرو سرور جان! میرے سوال کا جواب دو۔ کون ہے یہ گل رحمٰن؟"

"ہم... میں کسی گل رحمٰن کو نہیں جانتی۔" اُس نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ "بالکل نہیں جانتی۔"

"یہ جواب دے کر تم نے اپنی پوزیشن خراب کر لی ہے۔ تم چوبیس سال پہلے بھی یہ بات کہہ چکی ہو۔ تم نے تہیہ کر رکھا تھا کہ تم جان دے دو گی مگر اپنے آشنا کا نام زبان پر نہیں لاؤ گی۔ آج بھی تم وہی بات کہہ رہی ہو۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ نتائج بھی وہی ہوں۔ اب تمھیں عدالت میں دیکھ کر کسی دل پھینک بوڑھے کی دھڑکنیں بے ترتیب نہیں ہوں گی۔ سرور جان! تمھارا حسن قصۂ ماضی بن چکا ہے۔ اور میں بکنے والا تھانیدار نہیں ہوں۔ تمھیں قاتلہ سے گواہ نہیں بناؤں گا۔ بہتر ہے کہ تم اقرار جرم کر لو۔ ہم چوبیس گھنٹے کے اندر اندر گل رحمٰن کو ڈھونڈ نکالیں گے اور یہ بھی معلوم کر لیں گے کہ تمھارا اُس سے کیا رشتہ ہے۔ اُس کے بعد تمھاری جو پوزیشن ہوگی اُس کا تم بہ خوبی اندازہ لگا سکتی ہو۔"

"ملک صاحب! میں بڑے صبر سے آپ کی... یہ باتیں سن رہی ہوں۔" اُس نے برہمی سے کہا۔ "اگر آپ کے بس میں ہے تو بے شک مجھے پھانسی پر لٹکا دیں لیکن اب میں آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گی اور اگر آپ نے میرے ساتھ کوئی زیادتی کی تو یاد رکھیں میں خاموش نہیں بیٹھوں گی۔ حکام بالا کے پاس ضرور فریاد لے کر جاؤں گی۔"

میں نے اُسے الگ کمرے میں بٹھا دیا اور اُس کے بیٹے عالمگیر کو بلا لیا۔ وہ اپنی ماں کی نسبت زیادہ پریشان نظر آتا تھا۔ اُس نے بھی وہی بیان دیا جو اُس کی ماں نے دیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "عالمگیر! تم لوگوں نے اپنے ابا کے کمرے کا دروازہ کیوں توڑا؟ پولیس کے آنے کا انتظار کیوں نہ کیا؟"

"ہمیں یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ابا کو کسی نے قتل کر دیا ہے ورنہ ہم دروازہ توڑنے سے پہلے آپ کو اطلاع کرتے۔"

"دیکھو برخوردار! مجھے چکر دینے کی کوشش نہیں کرو۔" میں نے اُسے آنکھیں دکھائیں۔ "تم اس حویلی میں پلے بڑھے ہو، تمھیں یہ بات یقیناً معلوم تھی کہ تمھارے باپ کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوتی ہے۔ کوئی بھی عقلمند شخص دروازہ توڑنے سے پہلے کھڑکی سے اندر ضرور دیکھتا، خواہ اُسے کھڑکی کھلی ہونے کا علم ہوتا یا نہ ہوتا۔ کھڑکی کھلی تھی لیکن تم لوگ اُس طرف نہیں گئے۔ کیا میں اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"نہیں... گھبراہٹ میں کھڑکی کی طرف جانے کا خیال نہیں آیا۔" اُس نے جواب دیا۔

"ہوں... گھبراہٹ میں۔ بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ اب یہ بھی بتا دو کہ اس گھبراہٹ کا سبب کیا تھا؟"

"جی... ہمیں اسی بات کی گھبراہٹ تھی کہ نجانے ابا جی کو کیا ہو گیا ہے؟ دروازہ جو نہیں کھل رہا تھا۔"

"تم کچے مجرم ہو عالمگیر! تمھیں کسی اور چیز کی گھبراہٹ تھی۔ وہ فائلیں کہاں ہیں جو تم نے اپنے ابا کی الماری سے نکالی ہیں؟"

"فائلیں!" اُس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ "کک... کون سی فائلوں کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"میرا خیال ہے کہ تمھاری زبان تھانے جا کر ہی کھلے گی۔ یہ بتاؤ، گل رحمٰن سے تمھاری کیا رشتے داری ہے؟"

"گل رحمٰن!" اُس نے آنکھیں پھیلائیں۔ "اس نام کا کوئی شخص ہمارا رشتے دار نہیں ہے۔"

"اچھا... پھر یہ شخص حویلی میں کیا کرنے آتا تھا؟ کیا یہ تمھاری امی سے ملنے آتا تھا؟"

"ہم... میں اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے نہیں پتا کہ یہ کون ہے۔"

"اور اشتیاق علی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تم نے اس کو بھی کبھی نہیں دیکھا؟"

"اس کو تو دیکھا ہے... بلکہ جانتا ہوں۔ یہ... یہ رشتے میں ہمارا ماموں ہے۔ میری امی کا خالہ زاد بھائی ہے۔"

"اچھا... اب یہ تمھارا ماموں بھی بن گیا۔ پہلے تم لوگوں نے اسے اپنا ملازم بتایا تھا۔"

"ویسے یہ ہمارا ملازم بھی ہے، ہم اسے تنخواہ دیتے ہیں۔ اسے... ابا نے ملازم رکھا تھا۔"

"عالمگیر! تم جوان آدمی ہو۔ جیل تمھیں گھن کی طرح چاٹ جائے گی۔ میں تمھیں سچ بولنے کا موقع دیتا ہوں۔ سچ بول کر اپنی جان بچانے کی کوشش کرو۔ اور جھوٹ بولو گے تو نہیں بچ سکو گے۔ جاؤ، اور بیٹھ کر سوچو۔"

میں نے اُسے باہر بھیج دیا اور شگفتہ کو اندر بلایا۔

جب وہ اندر آئی تو اُس کی حالت دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ وہ اپنے باپ کی موت کے غم میں بے حال ہو رہی تھی۔ اگر اُس کی بھابی نے اُسے سہارا نہ دے رکھا ہوتا تو وہ چار قدم بھی نہ چل پاتی۔ حویلی میں وہ واحد فرد تھی جسے عباسی کی موت کا دُکھ ہوا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ رہا تھا۔ وہ کسی سوال جواب کے قابل نہیں تھی۔ میں نے اُسے ایک طرف بٹھا دیا اور میمونہ کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ گورے رنگ کی دراز قد اور خوب صورت لڑکی تھی۔ کچھ خود سر اور تنک مزاج بھی تھی۔

اُس نے ہر سوال کے جواب میں لاعلمی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ دروازہ کس نے توڑا تھا؟ پتا نہیں۔ سب سے پہلے عباسی کی خواب گاہ میں کون داخل ہوا تھا؟ پتا نہیں۔ الماری سے فائلیں کس نے نکالی تھیں؟ پتا نہیں۔ عباسی کو کھانا کس نے دیا تھا؟ پتا نہیں۔ اشتیاق علی اور گل رحمٰن کون تھے؟ پتا نہیں۔

میں نے سوالات کی روانی میں اچانک پوچھا۔ "تمھارا نام کیا ہے؟"

"پتا نہیں۔" اُس نے حسب معمول جواب دیا، پھر جلدی سے سنبھل کر بولی۔ "نن... نام تو آپ کو پتا ہی ہے۔"

"میمونہ بیگم! مجھے اور بھی بہت کچھ پتا ہے۔" میں نے سخت نظروں سے اُسے گھورا۔ "تم نے کبھی حوالات کی ہوا نہیں کھائی۔ دو چار راتیں حوالات میں گزارو گی تو سب کچھ یاد آ جائے گا۔"

"کیوں؟" اُس نے تیوری چڑھائی۔ "مجھے آپ کس جرم میں حوالات میں بند کریں گے؟"

"اچھا... تمھیں بھلا جرم کا کیوں پتا ہونے لگا۔" میں نے جیب سے عباسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا پرچہ نکال کر اُسے اُس کی جھلک دکھائی۔ "یہ تمھارے سسر کے ہاتھ کا لکھا ہوا پرچہ ہے۔ یہ پرچہ اُس نے اپنی موت سے تھوڑی دیر پہلے لکھا تھا۔ تم لوگوں کی بدقسمتی کہ یہ پرچہ تمھارے ہاتھ نہیں لگا۔ میں صرف اس پرچے کی بنیاد پر تم سب کو گرفتار کر سکتا ہوں اور کروں گا۔ اس کے علاوہ عباسی نے ایک سال پہلے یہ رپٹ درج کرائی تھی کہ اُسے تم لوگوں سے جان کا خطرہ ہے۔ اگر تم سچ بول دو گی تو میں تمھیں بچانے کی کوشش کروں گا، ورنہ تم بھی قتل کے جرم میں شریک سمجھی جاؤ گی۔ اچھی طرح سوچ لو۔"

"آ... آپ ہمیں گرفتار نہیں کر سکتے۔ واردات کے وقت ہم لوگ شادی والے گھر میں تھے۔"

میں چونکا۔ یہ بات میں تیسری دفعہ سن رہا تھا اور تینوں نے اس بات پر خاصا زور دیا تھا۔ پھر ایک عجیب بات میرے ذہن میں آئی۔ وہ خاصا مارٹا ہوا بیان لگتا تھا اور وہ لوگ اس عذر غیر حاضری کو اپنی برئیت کا موثر ذریعہ سمجھتے تھے۔

"میمونہ بیگم! ذرا سوچ کر میری بات کا جواب دینا۔" میں نے کہا۔ "شادی والا گھر یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟"

"زیادہ دور نہیں ہوگا۔" اُس نے جواب دیا۔ "یہی کوئی دس پندرہ منٹ کا راستہ ہوگا۔"

"یعنی آنے جانے میں تقریباً بیس پچیس منٹ لگے ہوں گے۔" میں نے حساب جوڑا، پھر کہا۔ "میمونہ بیگم! بقول تمھارے عباسی صاحب کو اُس وقت قتل کیا گیا جب تم لوگ شادی والے گھر میں تھے۔ یہ بات صرف اُسی

شخص بتا سکتا ہے جو جرم میں شریک ہو جس کو پتا ہو کہ قتل کس وقت کیا جائے گا۔"

وہ گڑبڑا گئی، بولی: "پ... پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"میمونہ بیگم! آپ کو یہاں پہنچنے میں تین منٹ بھی نہیں لگتے۔ یہ واردات اُس وقت بھی ہو سکتی تھی جب تم لوگ راستے میں تھے لیکن تمہارا وثوق کے ساتھ یہ کہنا کہ واردات اُس وقت ہوئی تھی جب تم لوگ شادی والے گھر میں تھے، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ عباسی صاحب کا قتل طے شدہ پروگرام کے مطابق کیا گیا ہے۔ تم لوگوں نے قاتل کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ تمہارے جانے کے اتنی دیر بعد کارروائی کرے۔"

"م... میرا یہ مطلب نہیں تھا... میں تو صرف یہ کہنے کی کوشش کر رہی تھی کہ..."

میں نے ایس آئی سے کہا: "یہ لوگ اصل بات چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھیں تھانے لے چلو۔ ان کے ساتھ کل تفتیش سے بات کریں گے اور حویلی میں دو سپاہیوں کا پہرا لگا دو۔"

قتل میں عباسی کے کسی ایسے بیٹے کا ہاتھ بھی ہو سکتا تھا جو حویلی سے باہر رہتا تھا لیکن زیادہ شک مجھے سرور جان پر تھا۔ بہرحال وہ کسی چور وغیرہ کی کارروائی نہیں تھی۔ کیوں کہ کوئی چیز چوری نہیں ہوئی تھی۔ عباسی کے رقعے کے بارے میں میں نے یہ اندازہ لگایا کہ سرور جان نے شادی میں جانے سے قبل عباسی کو کوئی خواب آور دوا کھلا دی تھی تاکہ قاتل کا کام آسان ہو جائے۔ عباسی پر جب غنودگی طاری ہونا شروع ہوئی ہوگی تو وہ یہی سمجھا ہوگا کہ اُسے زہر دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا اُس نے فوراً رقعہ لکھ دیا۔ بہرحال یہ ایک قیاس آرائی تھی جس کی تصدیق حقیقت کھلنے کے بعد ہی ہو سکتی تھی۔

جب ہم جانے کی تیاری کر رہے تھے تو اچانک شگفتہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ وہ بھی بیان دینا چاہتی ہے۔ اُس کے بال کھلے ہوئے تھے اور چہرے پر جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ اپنے حواس میں نظر نہیں آتی تھی۔ میرا اُس کو حراست میں لینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا بلکہ میں نے میمونہ کو بھی اُس کے کم سن بچے کی وجہ سے چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"تمہارا بیان ہم کل لیں گے۔" میں نے نرمی سے کہا: "اس وقت ہمیں اور کام بھی کرنے ہیں۔"

"نہیں....." اُس نے چیخ کر کہا: "میں ابھی بیان دینا چاہتی ہوں۔ میرا بیان ابھی قلم بند کریں۔"

یا تو وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ ہم اُسے بھی تھانے لے جا رہے ہیں یا کوئی اور بات تھی۔ جب وہ بیان دینے پر اصرار کر رہی تھی تو سرور جان کمرے میں داخل ہوئی اور اُسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

"میری جان، فکر نہیں کرو۔" اُس نے کہا: "گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا بیان بھی ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تمہارے ہوش ٹھکانے پر نہیں ہیں۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ دیکھو تھانیدار صاحب نے بھی تمہیں اجازت دے دی ہے۔ جب تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تو ہم خود تمہارا بیان دلوا دیں گے۔ یہ بہت اچھے آدمی ہیں۔"

وہ اُسے کھینچتی ہوئی دوسرے کمرے کی طرف لے چلی۔

شگفتہ نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا اور تیزی سے میری طرف آئی۔ "میں... میں یہاں نہیں رہوں گی۔ م... مجھے ان قصائیوں سے ڈر لگتا ہے۔ یہ... یہ مجھے بھی قتل کر دیں گے۔ میں اسی وقت بیان دینا چاہتی ہوں۔"

عالمگیر نے مضبوطی سے شگفتہ کا بازو پکڑ لیا اور اُسے کھینچتے ہوئے بولا: "میری اچھی بہن! ضد نہیں کرو۔ تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اپنا آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

معاملہ کچھ اور ہی نظر آ رہا تھا۔ لڑکی بیان دینے کے لیے مچل رہی تھی اور ماں بیٹا اُسے روکنا چاہتے تھے۔

"لڑکی کو چھوڑ دو۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا: "اور پیچھے ہٹ جاؤ۔ لڑکی کا بیان ابھی ہوگا۔"

"ملک صاحب! لڑکی پر ظلم نہ کریں۔" سرور جان نے کہا: "باپ کی موت نے اسے بے حال کر رکھا ہے۔ آپ اس کی باتوں پر نہ جائیں۔ بے چاری صدمے کی وجہ سے حواس کھو بیٹھی ہے۔"

ماں نے مجھے باتوں میں لگا لیا تھا اور بیٹا شگفتہ کو بدستور کھینچے لیے جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اے ایس آئی نے اُس کی گُدی پر ایک زوردار ہاتھ جمایا اور لڑکی کا بازو چھڑا کر اُسے ایک طرف کر دیا۔

"ان تینوں کو الگ کمرے میں لے جا کر بٹھا دو۔" میں نے اے ایس آئی سے کہا: "اور دو سپاہی ان کی نگرانی پر مقرر کر دو۔ میں اس لڑکی کا بیان ابھی سنوں گا۔"

تینوں نے بہت احتجاج کیا، بہت شور مچایا، بڑی منتیں کیں۔ میمونہ تو میرے ساتھ تقریباً لپٹ ہی گئی تھی۔ اُس کا بچہ، جس کی عمر دو ڈھائی برس کے قریب تھی، بُری طرح روئے جا رہا تھا۔ اُن لوگوں کی انتہائی کوشش تھی کہ میں سردست شگفتہ کا بیان نہ لوں لیکن اُن کا یہ احتجاج مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ خصوصاً شگفتہ کا یہ کہنا کہ اُسے اُن قصائیوں سے جان کا خطرہ ہے، خاصا غور طلب تھا۔ واضح طور پر وہ بہت سی اندرونی باتیں بتانا چاہتی تھی۔

اُن تینوں کو دوسرے کمرے میں بھیجنے کے بعد میں نے شگفتہ کو اپنے پاس بٹھایا۔ اُسے تسلی دی اور تحفظ کا یقین دلانے کے بعد کہا کہ وہ اطمینان سے ساری بات بتائے۔ اُس کے حواس پوری طرح ٹھکانے پر تھے اور وہ باپ کی موت کے صدمے کے باوجود بیان دینے

کے قابل تھی۔

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ شگفتہ کی ماں نوری بی کو سرور جان نے جوڑ توڑ کر کے طلاق دلوائی تھی۔ لیکن شگفتہ کو عباسی نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ کیوں کہ وہ اسے بہت چاہتا تھا۔ شگفتہ خاموش طبیعت اور صبر کرنے والی لڑکی تھی۔ چوں کہ اُس کی ماں نے دوسری شادی کر لی تھی اس لیے وہ باپ کا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس کی ماں نے جس شخص سے شادی کی تھی وہ ایک غریب آدمی تھا۔ جب کہ عباسی کے گھر میں ہر شے کی فراوانی تھی۔ شگفتہ ایک خادمہ کی حیثیت سے باپ کے گھر میں رہی، وہ اپنی سوتیلی ماں اور بھائی کی خاموشی سے خدمت کرتی رہی اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائی۔ اُسے معلوم تھا کہ اگر اُس نے ایسا کیا تو اُسے بھی اپنی ماں کی طرح اُس گھر سے نکلنا پڑے گا۔

اُس نے مجھے بتایا کہ گھر میں سرور جان کا حکم چلتا تھا۔ اُس نے اُس کے ابا کو پوری طرح اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ اُس کی بہو میمونہ بھی اُس کے خاندان کی فرد ہے۔ وہ اُس کی بہن کی بیٹی ہے۔ بیٹا پہلے ہی اُس کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ شگفتہ کو وہ ذرا بھی اہمیت نہیں دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ شگفتہ اُن کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور تھی اور اُن کے منصوبوں میں پوری طرح اُن کا ساتھ دیتی تھی، لیکن آخری منصوبے میں وہ دھوکا کھا گئے تھے۔

اس مختصر تعارف کے بعد میں شگفتہ کا بیان اپنے الفاظ میں اور اپنی ترتیب کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کہانی کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے واقعات کی ترتیب بدلنا پڑتی ہے۔

شگفتہ نے مجھے بتایا کہ سرور جان اُس کے باپ کی طویل العمری سے تنگ آتی جا رہی تھی۔ اُس کا یہ خیال تھا بلکہ اسے پورا پورا یقین تھا کہ عباسی زیادہ سے زیادہ ستر سال تک جیے گا، اور اُس وقت اُس کی اپنی عمر چھتیس سینتیس سال کے لگ بھگ ہوگی یعنی ابھی وہ بڑھاپے سے کافی دور ہوگی اور بہ آسانی کسی معقول شخص سے دوسری شادی کر سکے گی لیکن جب عباسی پچھتر سال کی عمر کو پہنچا اور پھر اُس کی عمر اسّی کو چھونے لگی تو سرور جان کی پریشانی فزوں تر ہو گئی۔ اس پر مستزاد یہ کہ عباسی اعلیٰ درجے کے کشتے استعمال کرتا تھا اور سنچری پوری کرنے کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ لہٰذا سرور جان نے اُسے ختم کرنے کی تدبیریں سوچنا شروع کر دیں۔

سب سے پہلے تو اُس نے عباسی کے عزیزوں اور دوستوں کی حویلی میں آمد و رفت بند کر دی۔ عباسی نے کئی بار اُسے حویلی سے نکالا لیکن وہ اپنے بیٹے اور بہو سے ساز باز کر کے دوبارہ واپس آ جاتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عباسی بوڑھا، کمزور اور محتاج ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنی آتشیں طبیعت اور بعض مخصوص عادات کی وجہ سے اپنے عزیزوں کی ہمدردی سے پہلے ہی محروم تھا۔ بالآخر اُس کی بینائی اتنی کمزور ہو گئی کہ وہ قریب کی چیز کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ یہ اُس کے آخری دنوں کی باتیں ہیں۔

ان دنوں حویلی میں سرور جان کے رشتے داروں کی آمد و رفت خاصی بڑھ گئی تھی۔ ان میں دو افراد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو اشتیاق علی اور دوسرا گل رحمٰن۔ اشتیاق کا ذکر آپ سن چکے ہیں۔ گل رحمٰن کے بارے میں شگفتہ نے بتایا کہ وہ پچپن چھپن سال کا ایک قوی الجثہ شخص تھا۔ اگرچہ سرور جان اُسے اپنا رشتے دار بتاتی تھی لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ اُس کا رشتے دار نہیں، صرف آشنا تھا۔ سرور جان اُس کی مدد سے اپنے شوہر کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ اور گل رحمٰن، سرور جان سے شادی کر کے وسیع حویلی پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ٹرک ڈرائیور تھا۔

ان دونوں افراد نے حویلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا کام عباسی کی نگرانی کرنا تھا، دیکھ بھال نہیں ــــ دونوں باری باری ڈیوٹی دیتے تھے۔ مقصد اس ڈیوٹی کا یہ تھا کہ عباسی حویلی سے باہر نکلنے نہ پائے۔ شروع میں انھوں نے اپنا رویّہ نرم رکھا۔ سرور جان نے عباسی سے یہی کہا تھا کہ وہ دونوں ملازم ہیں اور انھیں اُس کی خدمت کے لیے

رکھا گیا ہے لیکن جلد ہی عباسی کو یہ احساس ہو گیا کہ اُسے اُس کی اپنی حویلی میں قید کر دیا گیا ہے۔ اس بات کا اُسے اُس وقت پتا چلا جب ایک روز گل رحمٰن نے اُسے گیٹ سے باہر جانے سے روک دیا۔

کئی ہفتوں سے عباسی کا کوئی ملنے والا نہیں آیا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کے ذریعے کئی لوگوں کو بلوانا چاہا لیکن بیٹا ماں کے زیرِ اثر تھا۔ اور باپ کا پیغام آگے نہیں پہنچاتا تھا اور اگر کوئی بھولا بھٹکا آ جاتا تھا تو اُسے یہ کہہ کر گیٹ سے لوٹا دیا جاتا تھا کہ عباسی صاحب آرام کر رہے ہیں یا اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

اُس روز عباسی اپنے پڑوسی سے ملنے اور اُسے اپنی نظر بندی کا احوال بتانے کے ارادے سے باہر نکلا تھا۔

لیکن گیٹ پر گل رحمٰن نے اُس کا راستہ روک لیا اور بولا۔ "عباسی صاحب! کہاں جا رہے ہیں آپ؟ اگر کوئی کام ہے تو مجھے حکم کریں۔ آپ اس بڑھاپے میں کہاں دھکے کھاتے پھریں گے۔"

عباسی صاحب اپنی چھڑی لہراتے ہوئے بولے۔ "کون ہو تم؟ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ گیٹ کھولو۔"

"میں آپ کا نوکر گل رحمٰن ہوں جی۔ آپ کو بیگم صاحبہ نے اندر بلایا ہے۔ آپ جا کر اُن کی بات سُن لیں۔"

"بیگم صاحبہ سے بھی مل لوں گا۔ میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔ تم میرے راستے سے ہٹتے ہو یا نہیں؟"

اُس کی نظر کمزور تھی اور چال میں خاصی نقاہت تھی۔ اُس نے جب دیکھا کہ گل رحمٰن راستے سے نہیں ہٹ رہا تو اُس نے چھڑی سے اُسے مارنا چاہا، لیکن گل رحمٰن نے اُٹھتی ہوئی چھڑی کا سرا پکڑ لیا۔ اتنے میں سرور جان بھی اُن کے پاس پہنچی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" اُس نے غصے [illegible] نوکر کا سر پھاڑنے کا ارادہ ہے؟"

"یہ... یہ نوکر ہے یا میرا باپ ہے؟" عباسی نے چیخ کر کہا۔ "دیکھتی نہیں ہو، میرا راستہ روکے کھڑا ہے۔"

"آپ نوکروں کے منہ نہ لگا کریں۔" سرور جان نے بوڑھے شوہر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "چلیے میرے ساتھ اندر۔ آپ کو کچھ دکھائی تو دیتا نہیں اور منہ اُٹھائے باہر [illegible] جا رہے ہیں۔ مجھے بتائیں کیا کام ہے؟ میں کس لیے ہوں!"

"میں [illegible] بھائی کرم الٰہی سے ملنے جا رہا ہوں۔ اس نوکر کو کہو مجھے اُن کے گھر چھوڑ آئے۔"

"آپ [illegible]" سرور جان نے [illegible] لہجے میں کہا۔ "میں [illegible] صاحب کو [illegible] بلا لیتی ہوں۔"

"نہیں [illegible] میں [illegible] چلا جاتا ہوں۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔" عباسی نے کہا اور بیوی سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں لڑکھڑا گئے۔ اگر گل رحمٰن اُنھیں بروقت سہارا نہ دیتا تو وہ گر پڑتے۔ "میں قیدی نہیں ہوں۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"آپ کہیں نہیں جائیں گے۔" سرور جان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "گیٹ نہیں کھلے گا۔ آرام سے گھر میں بیٹھیں۔"

عباسی نے غصے میں بیوی کو چھڑی مارنے کی کوشش کی، مگر گل رحمٰن نے اُس کے ہاتھ سے چھڑی چھین لی۔

"چاچا جی! زیادہ غصہ اچھا نہیں ہوتا۔" اُس نے کہا۔ "اب آپ کا نکلنے کی عمر نہیں رہی۔"

عباسی طیش میں آ گیا اور اول فول بکنے لگا۔ اس اثنا میں اشتیاق بھی گیٹ پر پہنچ چکا تھا۔

سرور جان نے اشتیاق اور گل رحمٰن سے کہا۔ "اس بڈھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اسے اُٹھا کر اندر لے چلو۔"

عباسی چیختا رہا، گل رحمٰن اور اشتیاق اُسے گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے۔

عباسی اپنی بے بسی پر بچوں کی طرح رونے لگا۔ یہ وہی عباسی تھا جس کے ساتھ کوئی آنکھیں ملا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ آج اُس کی وہ خوف ناک آنکھیں صرف آنسو بہانے کے لیے رہ گئی تھیں، اُن آنکھوں میں اتنا بھی نور نہیں رہا تھا کہ وہ قریب کھڑے ہوئے شخص کو شناخت کر سکتیں۔

اس احساس کے بعد کہ اُس کی حسین بیوی نے دو مشٹنڈوں کی مدد سے اُسے گھر میں قید کر دیا ہے، اُس نے چند روز تک بہت شور مچایا اور کئی بار گھر سے نکلنے کی کوشش کی۔

شگفتہ نے زار و قطار روتے ہوئے مجھے بتایا کہ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے سرور جان نے ایک سات آٹھ فٹ لمبی زنجیر منگوائی، اس کا ایک سرا پلنگ کی پٹی میں اور دوسرا سرا اُس کے باپ کے پیر میں ڈال دیا، دونوں طرف تالا لگا دیا۔ اُس کے کمرے سے انھوں نے تمام ایسی چیزیں ہٹا دیں جو ہتھیار کے طور پر استعمال ہو سکتی تھیں۔ اشتیاق علی اور گل رحمٰن میں سے ایک شخص ہر وقت اُس کے کمرے میں موجود رہتا تھا۔

شگفتہ کو بوڑھے باپ کی یہ حالت دیکھ کر بہت دُکھ ہوا۔ اُس نے عالمگیر سے کہا۔ "عالمگیر بھائی! ابا لاکھ بُرے سہی، ہمیں اُن کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ تم امی کو سمجھاؤ کہ وہ اُن کی زنجیر کھلوا دیں۔ اب تو وہ ویسے بھی کہیں جانے کے قابل نہیں رہے۔ نہ اُن سے چلا جاتا ہے اور نہ انھیں دکھائی دیتا ہے۔"

"یہ امی اور ابا کا معاملہ ہے۔" عالمگیر نے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ابا میری ماں پر کتنا ظلم کرتے رہے ہیں۔ اور تمھاری ماں پر بھی انھوں نے کم ظلم نہیں کیا۔ انھوں نے بیویوں کو مارنے کے لیے ہنٹر رکھا ہوا تھا۔ جب ہم اپنی ماؤں کو باپ کے ظلم سے نہیں بچا سکے تو آج باپ کو ماں

کے ظلم سے کیوں بچائیں۔ اور ابا تو آج بھی ظلم کرنے سے باز نہیں آتے۔ پہلے اُن کا ہاتھ چلتا تھا، آج زبان چلتی ہے۔"

جب سرور جان کو شگفتہ کے احتجاج کا علم ہوا تو اُس نے اُسے الگ بلا کر کہا۔ "دیکھو شگفتہ! یہ ہمارے گھر کا مسئلہ ہے۔ اس کا ذکر باہر نہیں جانا چاہیے۔ اگر یہ بات باہر نکلی تو تمھاری خیر نہیں۔ تمھارا باپ انسان نہیں، وحشی ہے اور وحشیوں کو زنجیروں میں ہی جکڑ کر رکھا جاتا ہے۔ میں پچیس چھبیس سال سے اس شخص کی قید میں تھی۔ بتاؤ تو سہی کہ کون سا ظلم ہے جو اس نے مجھ پر نہیں کیا۔ اب اللہ نے اسے بوڑھا اور کمزور کر کے میرے بس میں کر دیا ہے۔ میں ضرور اس سے اپنا بدلہ لوں گی۔ اپنا بدلہ، تمھاری ماں کا بدلہ اور اُن تمام عورتوں کا بدلہ جو تمھارے باپ کے ظلم کا نشانہ بنی تھیں۔"

شگفتہ اُن ساری باتوں کو مانتی تھی مگر پھر بھی اُس سے اپنے باپ کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اشتیاق علی اور گل رحمٰن اب عباسی کا کھلم کھلا مذاق اُڑاتے تھے۔ سرور جان بھی اُن کے ساتھ شامل ہو جاتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ان باتوں سے کسی طرح بوڑھے عباسی کا ہارٹ فیل ہو جائے، مگر قدرت اُسے زندہ رکھنا چاہتی تھی، طبعی موت اُس کی قسمت میں نہیں تھی۔

شگفتہ نے مجھے بتایا کہ اُس کے باپ کو وقت پر کھانا نہیں دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات اُسے بھوکا ہی سونا پڑتا تھا۔

ایک رات شگفتہ نے دیکھا کہ سرور جان اور گل رحمٰن اُس کے باپ کے کمرے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ عباسی کو بھوک لگی تھی اور وہ کئی بار کھانا مانگ چکا تھا، لیکن سرور جان اُسے ہر بار جھڑک دیتی اور کہتی۔ "دیکھتے نہیں، ہم کھانا کھا رہے ہیں۔"

شگفتہ پریشانی کے عالم میں ساتھ والے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ وہ سوتیلی ماں کی اجازت کے بغیر باپ کو کھانا نہیں دے سکتی تھی۔

"چاچا عباسی!" اُس نے گل رحمٰن کو کہتے سُنا۔ "تم آخر کب تک اس عورت پر بوجھ بنے رہو گے؟"

"کمینے کتے.......!" عباسی نے چیخ کر کہا۔ "میرے گھر میں بیٹھ کر میری روٹیاں کھا رہے ہو اور مجھی پر بھونک رہے ہو، تم [illegible] سے بھی بدتر ہو۔ کتا بھی جس کا کھاتا ہے اُس کے سامنے دُم ہلاتا ہے۔"

گل رحمٰن نے قہقہہ لگایا، بولا۔ "چاچا! میں نے سُنا ہے تم نے یہ ساری جائداد رشوت کے مال سے بنائی ہے۔"

"سرور جان! اس کتے کو باہر نکال دے۔" عباسی نے اپنی بیوی سے اپیل کی۔ "میرے مرنے کے بعد بے شک اس سے نکاح پڑھوا لینا لیکن میرے سامنے ایسی حرکتیں نہ کر۔ خدا کو کیا منہ دکھائے گی؟"

"زیادہ بک بک نہ کر۔" سرور جان نے اُسے جھڑک دیا۔ "تیرے پاس تو بڑا اچھا منہ ہے نا خدا کو دکھانے کے لیے، ساری زندگی میں تو نے کوئی ایک بھی اچھا کام کیا ہے؟ اب تیری ہڈیاں کڑکڑانے لگی ہیں تو تجھے خدا یاد آنے لگا ہے۔ کہاں گئی وہ تیری اکڑ اور تیری پکڑ؟ ذرا دیکھ، خدا نے تجھے کیسا میرے قابو میں کیا ہے۔ تیرے ہنٹروں کے نشانات آج بھی میرے بدن پر موجود ہیں۔ میں نے وہ ہنٹر بھی سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ تیرے جیسے فرعونوں کی یہی سزا ہے۔ میرے بس میں ہو تو میں تیرے گلے میں زنجیر ڈال کر تجھے گلی گلی پھراؤں۔"

"سرور جان! اللہ بھی معاف کر دیتا ہے تو بھی معاف کر دے۔ مجھے بہت سزا مل چکی ہے۔"

"اورنگ زیب عباسی! اللہ نے شدادوں کو کبھی معاف نہیں کیا۔" سرور جان اپنے دل کا غبار نکالنے پر تلی ہوئی تھی۔ "اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ تو کس فطرت کا انسان ہے تو میں پھانسی پر چڑھ جانا قبول

کرلیتی، مگر تیرے ساتھ شادی نہ کرتی، مگر نہیں، اللہ نے مجھے اُن مظلوم عورتوں کا انتقام لینے کے لیے چُنا تھا جنھیں تو نے پیروں تلے کچلا تھا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تیری ساری بیویوں کو یہاں بلاؤں اور انھیں تیری حالت دکھاؤں اور وہی ہنٹر نکال کر اُن کے ہاتھ میں دے دوں جس سے تو اُن کو مارا کرتا تھا۔ میں نے تیرے ساتھ جو چوبیس سال گزارے ہیں وہ قید بامشقت سے بھی سخت تھے۔ اب میں تجھے کتے کی موت ماروں گی۔ ترسا ترسا کر۔"

"سرور جان! یہ بہت سخت جان بڈھا ہے۔" گل رحمٰن نے کہا۔ "یہ اتنی آسانی سے نہیں مرنے والا۔"

عباسی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور ہاتھ اُٹھا کر موت کی دُعا مانگنے لگا۔

شگفتہ نے بتایا کہ اُس کے ابا کو جب بھی اُس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملتا تھا وہ اُس سے کہتے: "شگفتہ بیٹی! کہیں سے تھوڑا سا زہر لا دو۔ مجھ سے اب یہ اذیت برداشت نہیں ہوتی۔"

چند روز پہلے اُس نے بیٹی کے پیر پکڑ لیے اور رو رو کر زہر کے لیے منتیں کرنے لگا۔ شگفتہ کو معلوم تھا کہ سرور جان خواب آور گولیاں استعمال کرتی ہے۔ اُس نے موقع پا کر خواب آور گولیوں کی شیشی باپ کو دے دی۔ اس کے دوسرے ہی دن اُس نے اپنی سوتیلی ماں کو گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ خفیہ میٹنگ کرتے دیکھا۔ وہ لوگ عباسی کے قتل کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اس میٹنگ میں اشتیاق علی اور گل رحمٰن کے علاوہ میمونہ اور عالمگیر بھی شامل تھے۔ شگفتہ چھپ کر اُن کی باتیں سنتی رہی۔ وہ قتل کرنے کے مختلف طریقوں پر بحث کر رہے تھے۔

اچانک سرور جان نے ساتھ والے کمرے میں شگفتہ کی موجودگی کو محسوس کر لیا۔ وہ تیزی سے اُٹھی اور شگفتہ کو کمرے سے نکلتے ہوئے جا لیا۔

"شگفتہ بیٹی! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اُس نے بظاہر بڑی نرمی سے پوچھا۔

"جج... جی کچھ نہیں۔" شگفتہ نے گھبرا کر جواب دیا۔ "میں... میں بستر رکھنے آئی تھی۔"

موقع شناس اور مکار سرور جان چند لمحوں تک سوچتی رہی۔ وہ یہ بات سمجھ چکی تھی کہ شگفتہ نے اُن کی باتیں سن لی ہیں۔ لہٰذا اُس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو اپنے منصوبے سے دستبردار ہو جائے اور یا شگفتہ کو بھی اپنے منصوبے میں شامل کر لے۔ وہ شگفتہ پر بھروسا کر سکتی تھی کیوں کہ اس لڑکی نے کبھی اُن کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔ اُس نے اندر جا کر دوسروں سے مشورہ کیا اور شگفتہ کو بھی منصوبے میں شامل کر لیا۔

منصوبوں اور تجویزوں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ شگفتہ نے محسوس کیا کہ وہ لوگ اُس کی باتوں میں زیادہ دلچسپی ظاہر کر رہے تھے، یا بالفاظِ دیگر اُس کی باتوں کا گہرا تجزیہ کر رہے تھے۔ غالباً وہ چاہتے تھے کہ وہ دل سے اُن کے ساتھ تھی یا خوف کی وجہ سے اُن کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ اس احساس کے بعد شگفتہ مجبوراً باپ سے زیادہ "دلچسپی" لینے لگی۔ اُسے ڈر تھا کہ اگر وہ پیچھے ہٹی تو یہ لوگ اُسے بھی قتل نہ کر دیں۔ منصوبہ طے ہو گیا تو سرور جان اندر سے قرآن اُٹھا لائی اور سب نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ حلف اُٹھایا کہ ایک دوسرے کے ساتھ دھوکا نہیں کریں گے۔

جب انسان کی آنکھوں پر شیطان پردہ ڈالتا ہے تو وہ ایسی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ کام خدا کے حکم کے خلاف کیا جا رہا ہے اور خدا کی کتاب کو بنایا جا رہا ہے۔ اس سے بڑی جہالت اور کیا ہو سکتی ہے۔ شگفتہ نے بتایا کہ اس تقریبِ حلف برداری کے بعد گل رحمٰن نے ریوالور نکال لیا اور بظاہر سب کو مخاطب کر کے بولا: "میں آدمی بہت کھرا ہوں۔ نہ دھوکا کرتا ہوں اور نہ دھوکا کھاتا ہوں۔ اگر کسی نے ساتھ دھوکا کرنے کی کوشش کی تو میں اُسے قتل کر دوں گا۔ جب ایک قتل کر لیتا ہے تو دوسرا قتل اُس کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ ایک قتل سے کوئی فرق پڑتا ہے، پھانسی تو ایک ہی دفعہ ہو گی۔"

شگفتہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ بات صرف اُس کو سنانے کے لیے کی گئی تھی۔

یہ منصوبہ بنانے کے بعد سرور جان اور اُس کی بہو میمونہ کی طرح شگفتہ کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ وہ نہ تو باہر جا سکتی تھی اور نہ ہی باپ کے کمرے میں۔ شاید وہ یہ بھی دیکھنا چاہتی تھیں کہ شگفتہ دھوکا تو نہیں دے جائے گی۔ اس کے چند روز بعد سرور جان کے رشتے داروں کی طرف سے ایک شادی کا بلاوا آ گیا اور اُن کی عدم موجودگی میں گل رحمٰن نے منصوبے کے مطابق عباسی کو قتل کر دیا۔

لیکن عباسی نے جو رقعہ لکھا تھا وہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا۔ بہت سے قارئین اس رقعے کی حقیقت سمجھ گئے ہوں گے۔ میں کچھ اور باتیں آپ کو بتا لوں، اُس کے بعد رقعے کی حقیقت بتاؤں گا۔

شگفتہ کا بیان مکمل ہونے کے بعد میں نے سرور جان کو اُس کے بیٹے اور بہو سمیت کمرے میں بلا لیا اور کہا: "سرور جان! مجھے گل رحمٰن اور اشتیاق علی کا پتا چاہیے۔ آسان طریقے سے بتاؤ گی یا مشکل طریقے سے؟"

اُن تینوں کے چہرے دہشت سے سفید پڑ چکے تھے اور میمونہ کے گھٹنے کانپ رہے تھے۔

سرور جان نے ایک بار پھر گول مول بات کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا: "اس عورت کی خواب گاہ میں جاؤ اور وہاں سے وہ زنجیر تلاش کر لاؤ جس سے اس نے اپنے شوہر کو باندھ رکھا تھا۔ آج میں اُسی زنجیر سے اس عورت کو چھت پر الٹا لٹکا دوں گا۔" شگفتہ نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ مذکورہ زنجیر شادی سے

اُس کے بعد اُس کے باپ کے پیر سے نکال لی گئی تھی اور سرور جان نے اپنی خواب گاہ میں چھپا دیا تھا۔ اے ایس آئی زنجیر لینے چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی میمونہ میرے پیروں میں گر پڑی اور سرور جان مجھے بڑی بڑی رقموں کا لالچ دینے لگی۔

"سرور جان! تیرے حُسن کا جادو ختم ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب تجھے تیسرے شوہر کو قتل کرنے کی مہلت نہیں ملے گی۔ مجھے سارا معاملہ معلوم ہو چکا ہے۔ اب تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ قانون کی مدد کر کے اپنی سزا میں کمی کرانے کی کوشش کرو۔ تم ہمارے کام میں رکاوٹ ڈالو گی تو اپنے ہی گلے میں پھندا سخت کرو گی۔"

اس اثنا میں اے ایس آئی زنجیر تلاش کر کے لے آیا۔ وہ آٹھ فٹ لمبی زنجیر تھی جس کے دونوں سروں پر دو مضبوط کڑے لگے ہوئے تھے۔ میں نے زنجیر کا معائنہ کیا تو ایک کڑے کے ساتھ چند بال چپکے ہوئے نظر آئے۔ یہ واضح طور پر وہ عباسی کی ٹانگ کے بال تھے۔

تھوڑی سی محنت کے بعد ہم سرور جان سے گل رحمٰن اور اشتیاق علی کا ٹھکانہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے اُسی وقت چار چار اہل کاروں پر مشتمل دو پارٹیاں ان کی گرفتاری کے لیے روانہ کر دیں۔

رات خاصی گزر چکی تھی لیکن میں کام مکمل کیے بغیر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ایک بڑا مسئلہ شگفتہ کی حفاظت کا تھا۔ میں اُسے حویلی میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کسی کا اُس کے پاس موجود رہنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ میمونہ کے بچے کا مسئلہ بھی تھا۔ میں نے شگفتہ سے پوچھا کہ انور عباسی کیسا آدمی ہے؟

"انور بھائی شریف آدمی ہیں۔" اُس نے جواب دیا۔ "انھوں نے کبھی ہمیں پریشان نہیں کیا۔"

"اگر میں اُن کی فیملی کو حویلی میں آنے کی اجازت دے دوں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہ ہو گا؟"

اُس نے جواب دیا کہ اُسے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ میں نے انور عباسی کو بلوایا اور اُس سے کہا کہ وہ فوراً اپنی فیملی کو لے کر حویلی پہنچ جائے۔ یہ بات سن کر اُس کے چہرے پر ایسی حیرت اُتر آئی کہ الاماں... اور اُس کی حیرت بجا بھی تھی۔ اُس کی ساری زندگی تنگی و عسرت میں گزری تھی۔ جس حویلی کا دروازہ کھٹکھٹانے کی اجازت نہیں تھی آج اُسے اُس حویلی میں رہنے کے لیے کہا جا رہا تھا۔

"انور عباسی! میں سرور جان کو اُس کے بیٹے اور بہو سمیت تمھارے باپ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔ اس وجہ سے شگفتہ یہاں تنہا ہو جائے گی۔ اس کی حفاظت کرنا بھی تمھارا فرض ہو گا۔"

"میں دل و جان سے اس کی حفاظت کروں گا۔" اُس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یہ میری بہن ہے۔ میں اس کی حفاظت نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔ ملک صاحب! اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی ماں کو بھی یہاں لے آؤں؟"

"لے آؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن حویلی کا سامان اِدھر اُدھر نہیں ہونا چاہیے۔"

سرور جان کو جب پتا چلا کہ میں نے انور عباسی اور اُس کی فیملی کو حویلی میں رہنے کی اجازت دے دی ہے تو اُس نے شور مچا دیا اور دھمکیاں دینے لگی۔

"سرور جان! قاتلوں کو جائداد میں سے حصہ نہیں ملا کرتا۔" میں نے کہا۔ "تم اب اس حویلی کو بھول جاؤ۔ تمھارا جرم بہت سنگین ہے۔ تمھارے اعمال نامے میں یہ دوسرا قتل ہے۔ عدالت تمھیں معاف نہیں کرے گی۔"

انور عباسی تقریباً ایک گھنٹے کے اندر اپنی فیملی کے ہمراہ حویلی پہنچ گیا۔ اُس کی بوڑھی ماں بھی ساتھ تھی۔ اُس کی عمر پچھتر سال کے قریب تھی۔ انور عباسی کی تین لڑکیاں اور تین ہی لڑکے تھے۔ اُن کی عمریں تیرہ اور تیئیس سال کے درمیان تھیں۔ وہ سب روتے ہوئے حویلی میں داخل ہوئے تھے۔ اُن کی آمد کے بعد ہی یہ محسوس ہوا کہ حویلی میں کسی کی میت ہو گئی ہے۔ عجیب منظر تھا۔ بچے اُس دادا کے غم میں رو رہے تھے جس نے کبھی اُن کے سروں پر دستِ شفقت نہیں رکھا تھا۔

انور عباسی کی بوڑھی ماں نے شگفتہ کو بیٹی کہہ کر گلے سے لگا لیا اور دونوں رونے لگیں۔

اس اثنا میں سرور جان کو اُس کے بیٹے اور بہو سمیت تھانے بھجوا چکا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میمونہ اپنے بچے کو حویلی میں چھوڑ جائے مگر وہ اُسے ساتھ رکھنے پر مصر تھی۔

صبح ہونے سے پہلے پہلے ہم نے گل رحمٰن اور اشتیاق علی کو آلۂ قتل سمیت گرفتار کر لیا۔ آلۂ قتل یعنی ریوالور گل رحمٰن کا تھا، مگر گولیاں اشتیاق علی نے چلائی تھیں۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق موت گولیوں سے واقع ہوئی تھی۔ کیمیکل اگزامنر کی رپورٹ سے پتا چلا کہ عباسی کے معدے میں زہر کی خاصی بڑی مقدار تھی۔ اگر قاتل دس پندرہ منٹ لیٹ ہو جاتا تو عباسی کی موت زہر سے واقع ہو جاتی اور ایسی صورت میں قتل کا مقدمہ بنانا مشکل ہو جاتا کیوں کہ یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ عباسی نے خودکشی کے ارادے سے زہر کھایا تھا۔ وہ خودکشی کر کے اپنے دشمنوں کو قتل کے الزام میں پھنسوانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زہر کھانے کے بعد وہ آرام سے بستر پر لیٹ گیا تھا۔ جب اُس پر گولیاں چلائی گئی تھیں اُس وقت اُس پر بے ہوشی طاری تھی، اور میرا خیال ہے کہ اُسے گولیوں سے اتنی تکلیف بھی نہیں ہوئی تھی جتنی کانٹا چبھنے سے ہوتی ہے۔



وعدہ معاف

ایک ایسا قصہ جو ایک لفظ ردِ کیے میں الجھ گیا تھا

جرائم کی دُنیا بڑی بھیانک دُنیا ہے، لیکن اس کے قصے پڑھنے والوں کو بہت دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ تو آیئے ایک بار پھر جرائم کی دُنیا میں چلتے ہیں۔ پرانے قصے اور پرانی یادیں۔

وہ موسمِ بہار کے ابتدائی دن تھے۔ رات کے گیارہ بجے تھانے سے پیغام ملا کہ قتل کی ایک واردات ہو گئی ہے اور گشت کرنے والی پولیس پارٹی نے قاتل کو گرفتار کر لیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں بستر پر لیٹ چکا تھا اور... "نیند سے پہلے" والی خوشگوار کیفیت سے دوچار تھا۔ اس خبر سے جی بہت بُرا ہوا لیکن فرض کی آواز پر کان بند نہیں کیے جا سکتے تھے۔ مجرموں کو تھانیدار کی صحت اور آرام کی کیا پروا۔ بہرحال اُٹھ کر وردی پہنی، بیوی سے جلد آنے کا وعدہ کیا اور تھانے پہنچ گیا۔

جس حوالدار نے ملزم کو گرفتار کیا تھا، وہ بہت خوش تھا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ معمول کے مطابق گشت پر تھا۔ اُس کے ساتھ ایک سپاہی بھی تھا۔ گلی سنسان تھی اور زیادہ تر گھروں کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک مکان کے اندر سے دوڑو... پکڑو... کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ساتھ ہی دوڑنے کی آواز بھی سنائی دی۔ حوالدار، سپاہی کے ہمراہ مکان کے دروازے پر پہنچا اور سیٹی بجاتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کے ہاتھ مارنے سے دروازہ کھل گیا۔ ایک آدمی جو دوڑتا ہوا دروازے کی طرف آ رہا تھا، پولیس کو دیکھ کر رُکا اور تیزی سے اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔ حوالدار اس کے پیچھے دوڑا اور اسے رُکنے کا حکم دیا۔ صحن میں درخت اُگے ہوئے تھے۔ دوڑنے والا درختوں کی تاریکی میں غائب ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے دیوار پر چڑھ کر گلی میں کود گیا۔ حوالدار بھاری جسم کا آدمی تھا۔ اس کے لیے دیوار پھلانگنا مشکل تھا۔ وہ واپس دروازے کی طرف دوڑا اور گلی میں پہنچ کر دوڑنے والے کو پہلے وارننگ دی، پھر فائر کر دیا۔ فائر کا محرک اس شخص کا شور تھا، جو ملزم کا پہلے سے تعاقب کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ یہ قاتل ہے اسے پکڑو... اس نے قتل کر دیا ہے، یہ جانے نہ پائے۔ گولی ملزم کی ران میں لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ شور اور فائر کی آواز سن کر پورا محلہ جاگ گیا۔ پتا یہ چلا کہ ملزم نے ایک نوجوان جوڑے کو جن کی کچھ دن قبل شادی ہوئی تھی، قتل کر دیا تھا اور دونوں کی لاشیں باورچی خانے میں پڑی تھیں۔

مرد کا نام منور حسین اور اس کی بیوی کا نام ممتاز بیگم معلوم ہوا۔ ان کا بچہ کوئی نہیں تھا۔

میں نے حوالدار سے پوچھا۔ "ملزم کہاں ہے؟"

"اسے میں نے مرہم پٹی کے لیے اسپتال بھجوا دیا ہے۔" حوالدار نے جواب دیا۔ "اُس کی حالت خطرے سے باہر ہے محلے والوں نے اس کے زخم پر پٹی باندھ دی تھی۔"

اُن لوگوں نے انسانی ہمدردی کا صحیح مظاہرہ کیا تھا۔ مجرم کو سزا عدالت کا کام ہے اور اگر مجرم زخمی ہو تو مرہم پٹی اس کا حق ہے۔ آج کل ایسے مناظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ کہیں ایکسیڈنٹ ہو جائے تو لوگ ڈرائیور کو پکڑ کر مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ مار مار کر ادھ موا کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ قصور اس بچے کا ہو، جو اچانک گاڑی کے سامنے آ گیا ہو۔

بہرحال، حوالدار کی زبانی ساری بات سننے کے بعد میں نے اسے ساتھ لیا اور موقعہ پر پہنچ گیا۔ وہاں ایک اے ایس آئی اور چند سپاہی پہلے سے موجود تھے۔ مکان کے باہر خاصی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ گھر کے اندر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اے ایس آئی نے مجھے بتایا کہ اس نے کافی حد تک ضابطے کی کارروائی مکمل کر لی تھی، تاہم ابھی تک لاشوں کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹایا تھا۔

مکان کا صحن خاصا کشادہ تھا اور باورچی خانہ رہائشی کمروں سے ہٹ کر بنا ہوا تھا۔ اُس کا سائز ایک درمیانے کمرے کے برابر تھا۔ اس میں دو دروازے اور ایک کھڑکی تھی۔ ایک چھوٹی سی کھڑکی والے مکان کی طرف کھلتی تھی۔ واضح طور پر اہلِ خانہ کے پڑوسیوں سے خاصے خوشگوار تعلقات تھے۔ اس وقت وہ کھڑکی بند تھی۔

لاشیں مع آلاتِ قتل کے باورچی خانے کے وسط میں پڑی تھیں۔ آلاتِ قتل میں نے اس لیے کہا ہے کہ قتل کے لیے دو چیزیں استعمال کی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک تو گوشت کاٹنے کی خنجر نما چھری تھی اور دوسری جلانے کی ایک لکڑی تھی۔ وہ دو فٹ لمبی خاصی بھاری لکڑی تھی۔ یہ بات حیرت میں ڈالنے والی تھی۔ اگر قاتل ایک تھا تو اس نے قتل کے لیے دو چیزیں کیوں استعمال کی تھیں؟

اس مختصر تفصیل کے بعد اب میں آپ کو لاشوں کی کیفیت بتاتا ہوں۔ عورت کی لاش مرد کی لاش کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ پوری طرح نہیں صرف جزوی طور پر۔ عورت چت پڑی تھی اور مرد کا سر اس کے پیٹ کے اوپر تھا۔ عورت کے جسم پر چھری کے پانچ زخم آئے تھے اور اُس کے آس پاس کثیر مقدار میں خون پھیلا ہوا تھا۔ خون آلود چھری مرد کے سر کے قریب پڑی تھی۔

مرد کے سر پر لکڑی سے دو چوٹیں لگائی گئی تھیں۔ (یہ تفصیل طبی

... بتائی گئی تھی) اور یہ لکڑی مرد کی ٹانگوں کے پاس پڑی تھی۔ ... عورت کی لاش نیچے تھی، اس لیے واضح طور پر پہلے اسے قتل کیا گیا تھا۔

اے ایس آئی، جو اس صورتِ حال پر کافی غور کر چکا تھا، بولا۔ "... صاحب! معلوم ہوتا ہے کہ عورت باورچی خانے میں اکیلی تھی... قاتل نے پہلے اسے قتل کیا اور جب چیخیں سن کر اس کا شوہر یہاں پہنچا تو قاتل نے اسے بھی قتل کر دیا۔"

"ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ چھری اور لکڑی والا معاملہ سمجھ میں نہیں آیا۔"



"میں نے اس پر بھی غور کیا کہ قاتل عورت کو قتل کرنے کے بعد گھات لگا کے کھڑا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے بتی بجھا دی ہو گی اور اس دروازے کے پیچھے کھڑا ہو گیا ہو گا۔ اندھیرے میں چھری کے بجائے لکڑی زیادہ مہلک ہتھیار ثابت ہو سکتی ہے۔ سر کی پشت پر چوٹوں کے نشان بھی اس تھیوری کی تصدیق کرتے ہیں۔"

تھیوری اس کی معقول معلوم ہوتی تھی، لیکن ابھی بہت سی باتیں وضاحت طلب تھیں۔

میں نے پوچھا۔ "کیا کوئی چیز بھی چوری ہوئی ہے؟"

"ابھی تک کسی چیز کی چوری کا انکشاف نہیں ہوا۔ گھر والے کہتے ہیں کہ کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔"

عورت کے بارے میں چند باتیں اور آپ کو بتا دوں۔ اس کی عمر تئیس اور چوبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اگرچہ موت نے اس کا چہرہ بگاڑ دیا تھا، مگر اس کے نقوش بتا رہے تھے کہ وہ ایک حسین عورت تھی۔ بعد میں میں نے اس کی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ وہ واقعی بہت حسین اور پرکشش عورت تھی۔ اس نے طلائی چوڑیاں اور بُندے پہن رکھے تھے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ شاید قاتل اس کی چوڑیاں اتارنا چاہتا تھا۔ میں نے اس نقطۂ نظر کو ذہن میں رکھ کر مقتولہ کی کلائیوں اور کانوں کا معائنہ کیا، مگر یہ بات قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوئی۔ کانوں پر یا کلائیوں پر کوئی ایسا نشان نظر نہیں آیا جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ قاتل نے زیور اتارنے کی کوشش کی تھی۔ جو شخص قتل کا ارتکاب کر سکتا تھا، وہ کانوں کی پروا کیے بغیر بندے بھی نوچ سکتا تھا۔ چوڑیاں اتنی تنگ نہیں تھیں۔ انھیں تھوڑی سی کوشش سے اتارا جا سکتا تھا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ قتل کا محرک چوری نہیں تھا۔

مرد جس کا نام منور حسین تھا، ستائیس اٹھائیس برس کا صحت مند اور پڑھا لکھا شخص تھا۔ اس کی کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی تھی اور جیب میں کچھ نقدی تھی جس کی مالیت مجھے یاد نہیں رہی۔ اس بات کے بتانے کا مقصد یہ ہے کہ قاتل نے اس کی قیمتی چیزوں کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا، لہٰذا اس قتل کا محرک نئی یا پرانی دشمنی تھی۔

ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے آلاتِ قتل اپنی تحویل میں لے لیے اور لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیں۔

اگلی صبح ملزم کو اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ جب میں تھانے پہنچا تو وہ حوالدار کے کمرے میں فرش پر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ وہ تئیس چوبیس سال کا دُبلا پتلا سا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور وہ خاصا خوف زدہ دکھائی دیتا تھا۔ حوالدار نے مجھے بتایا کہ اس کی بڑی خاطر رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ گزشتہ رات میں نے واردات کا جو بھیانک نقشہ دیکھا تھا، وہ چہرہ اس واردات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

"اوئے، کیا دشمنی تھی تمھاری اُن سے؟" میں نے پوچھا۔ "قتل کر دیا تم نے اُن دونوں کو؟"

اُس نے میرے پیر پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "جناب! میں بالکل بے گناہ ہوں۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

"ملک صاحب! یہ دیکھنے میں مسکین لگتا ہے، مگر اندر سے پکا ہے۔ اس کے اوپر کافی محنت کرنا پڑے گی۔"

"میرا نام منظور احمد ہے جی۔ میں جی بالکل بے گناہ ہوں۔"

"کدھر کے رہنے والے ہو؟"

اس نے ایک قریبی علاقے کا نام لیا، جو مجھے یاد نہیں۔ اس نے مزید کہا کہ وہ ریلوے اسٹیشن جا رہا تھا۔

"یہ جھوٹ بولتا ہے جی۔" حوالدار نے کہا۔ "آخری ٹرین سوا دس بجے نکل جاتی ہے۔ اسے ہم نے دس بجے کے بعد پکڑا تھا۔"

"سارا واقعہ سچ سچ بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "تم منور حسین کے مکان میں کیا کرنے گئے تھے؟"

"سچ... جناب! میں گلی سے گزر رہا تھا۔" اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "اچانک پکڑو پکڑو... کا شور اٹھا۔ پھر ایک آدمی دوڑتا ہوا میرے قریب سے گزر گیا۔ اتنے میں رائفل چلنے کی آواز آئی اور مجھے لگا جیسے جلتا ہوا انگارا میری ران میں گھس گیا ہو۔ میں زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ شور سن کر لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ایک بھلے آدمی نے میرے زخم پر کپڑا باندھ دیا۔ پھر آپ کے سپاہی مجھے اسپتال لے گئے۔ جناب! میں بالکل بے گناہ ہوں۔"

آدمی وہ خاصا ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اس نے جو قصہ بیان کیا، قابلِ یقین معلوم ہوتا تھا، لیکن اس کا لہجہ اور چہرے کے تاثرات ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

میں نے پوچھا۔ "کیا وہ آدمی سامنے سے دوڑتا چلا آ رہا تھا؟"

"جی ہاں، سامنے سے ہی آیا تھا۔"

"تم نے اسے روکنے کی کوشش کیوں نہ کی؟"

"جی! مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ کیا معاملہ ہے۔ اُدھر وہ میرے پاس سے گزرا، اِدھر مجھے گولی لگ گئی۔"

"تم اِدھر کیا کرنے آئے تھے؟"

"نوکری تلاش کرنے آیا تھا جی!"

میرے استفسار پر حوالدار نے بتایا کہ اس کی جیب سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں نکلی تھی۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھا۔

"تم واپس کیسے جاتے؟ تمھارے پاس تو کرائے کے پیسے بھی نہیں۔"

"جناب! میری جیب کٹ گئی تھی، اس لیے میں بس پر سفر نہیں کر سکتا تھا۔ اسٹیشن پہنچا تو ٹرین نکل چکی تھی۔"

"اوئے، ابھی تو تم نے کہا ہے کہ تم اسٹیشن جا رہے تھے اور اب کہتے ہو کہ ٹرین نکل چکی تھی۔"

"دونوں باتیں صحیح ہیں جی! میں اسٹیشن سے شہر گیا تھا اور شہر سے واپس اسٹیشن جا رہا تھا۔"

"اسٹیشن سے شہر کیوں گئے تھے اور شہر سے واپس اسٹیشن کیوں جا رہے تھے؟"

"روٹی ٹکر کی تلاش میں شہر گیا تھا اور رات گزارنے کے لیے واپس اسٹیشن جا رہا تھا۔ بکنگ کلرک نے بتایا تھا کہ ٹرین صبح چار بجے جاتی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ پلیٹ فارم پر تھوڑی سی نیند کر لوں گا اور صبح کی ٹرین سے واپس چلا جاؤں گا، مگر یہ آزمائش بھی قسمت میں لکھی تھی۔"

باتیں وہ بڑی سمجھداری کی کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "مگر... ٹرین پر تم کس طرح سفر کرتے؟ جیب تو تمھاری خالی ہے۔"

"حضور! ٹرین پر تو آدمی بغیر ٹکٹ بھی سفر کر سکتا ہے۔ پکڑا بھی جائے تو ٹی ٹی بابو کی منت کر لیتا ہے۔"

"جیب تمھاری کیسے کٹ گئی تھی؟"

"میں اُدھر سینما کی لائن میں لگا ہوا تھا۔ ٹکٹ کے پیسے میرے ہاتھ میں تھے، باقی پیسے جیب میں تھے۔ رش بہت تھا۔ بندے پر بندہ چڑھا ہوا تھا۔ میں ٹکٹ لے کر اندر چلا گیا۔ ہاف ٹائم میں میں نے کچھ کھانے کا ارادہ کیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی شیطان کا بندہ جیب خالی کر گیا تھا۔ فلم ختم ہوئی تو میں نے اسٹیشن کی طرف دوڑ لگائی، لیکن ابھی میں اسٹیشن سے دور ہی تھا کہ ٹرین روانہ ہو گئی۔ آپ کو تو پتا ہی ہو گا کہ اس اسٹیشن پر ٹرین ایک منٹ بھی نہیں ٹھہرتی۔"

ان دنوں وہاں ایک سفری سینما کمپنی آئی ہوئی تھی، جو شامیانے میں فلمیں دکھاتی تھی۔ میں نے منظور احمد کے بیان کو چیک کرنے کے لیے اس سے پوچھا کہ فلم کون سی لگی ہوئی تھی۔

"...ستی..." اس نے جواب دیا اور جواب صحیح تھا۔

اس کے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر وہ قاتل تھا تو اس کا محرک کیا تھا؟ نہ تو اس نے کوئی چیز چوری کی تھی، نہ اس کے پاس سے کچھ برآمد ہوا تھا۔

"رات کو تم نے کھانا کہاں سے کھایا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہسپتال سے کھایا تھا جی!" اس نے جواب دیا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کھانا اتنی تکلیف کے بعد ملے گا تو میں بھوکا ہی سو جاتا۔ اس کے نام لکھا تھا سو لگ گئی۔"

"مطلب، اتنی تکلیف سے کھانا ملے گا؟"

"جناب! میں تو بھوکا ہی واپس جا رہا تھا۔ گولی نہ لگتی تو رات بھوکا ہی رہنا پڑتا۔"

میرے دل میں خیال آیا، ہو سکتا ہے کہ وہ کھانے کی تلاش میں باورچی خانے میں گھسا ہو اور اتفاق سے مقتولہ ممتاز بیگم نے اسے دیکھ لیا ہو اور شور مچانے کی کوشش کی ہو اور اس نے گھبرا کر اسے قتل کر دیا ہو، لیکن بات دل کو لگتی نہیں تھی۔ وہ اتنی معمولی بات پر دو قتل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے فرار کا راستہ کھلا تھا۔ وہ ممتاز بیگم کو دیکھ کر بھاگ سکتا تھا یا اسے اپنی مجبوری بتا سکتا تھا۔ اُدھر حوالدار کو پورا یقین تھا کہ اس نے جس شخص کو بھاگتے دیکھا تھا، وہ منظور ہی تھا۔ اگرچہ اس نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی، مگر حلیہ اور قد کاٹھ ہو بہو ایسا ہی تھا۔

اگر حوالدار کا قیاس صحیح تھا تو پھر ملزم منظور احمد نہایت زیرک اور ہوشیار شخص تھا۔ اس نے بڑے غور و فکر کے بعد قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ فلم دیکھنا، جیب کٹ جانے کا بہانہ، ٹرین نکل جانے کا بہانہ اور کھانے کی تلاش کا بہانہ.... سب کچھ اس کے منصوبے کا حصہ ہو سکتا تھا۔ بظاہر وہ کمزور لگتا تھا، تاہم دُبلے آدمی کی طاقت کا اندازہ عموماً غلط نکلتا ہے۔ اس کے کمزور نظر آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ زخمی ہونے کی وجہ سے اس کا کافی خون بہہ گیا تھا۔

میں نے بہ نظرِ غائر اس کے لباس اور جسم کا جائزہ لیا۔ اس کی آستینوں پر اور لباس کے اوپری حصے پر خون کے دھبے موجود نہیں تھے۔ شلوار پر اور قمیص کے دامن پر جو خون کے دھبے موجود تھے، وہ اس کے اپنے خون کے دھبے معلوم ہوتے تھے۔ اس کی داہنی ہتھیلی پر مجھے رگڑ کا نشان دکھائی دیا۔

میرے استفسار پر اس نے جواب دیا۔ "جناب! یہ رگڑ گرنے کی وجہ سے آئی تھی۔"

لیکن وہ رگڑ چھری یا کھردری لکڑی کے استعمال کی وجہ سے بھی آ سکتی تھی۔ اس پر محنت کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ وہ کون تھا اور اس کا مقتولین سے کوئی پرانا تعلق تھا یا نہیں۔ نیز ابھی قتل کے محرک کا اندازہ بھی نہیں ہو سکا تھا۔ اچانک مجھے ایک بات یاد آئی۔

میں نے حوالدار سے پوچھا۔ "رات کو جو شخص پکڑو.... پکڑو کا شور مچا رہا تھا اور اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا، وہ کہاں ہے؟"

حوالدار میری بات سن کر چونکا، بولا۔ "اُس آدمی کا تو کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ بالکل غائب ہی ہو گیا۔"

"ممکن ہے کہ گواہی دینے سے گھبرا گیا ہو۔" میں نے کہا۔

"لیکن ملک صاحب! وہ تو گھر کا آدمی تھا۔ اُس مکان کے اندر تھا۔ دوبارہ اس کی آواز ہی نہیں سنی۔ اسے دوڑتے ہوئے دیکھا بھی تھا، لیکن پھر میں اس کے پیچھے لگ گیا اور اس کا خیال میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ وہاں بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ بھی اُن میں

شامل ہوگا۔ لیکن وہ آگے نہیں آیا۔ آپ کا خیال ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ وہ گواہی دینے سے گھبراتا ہوگا۔"

"اس شخص کو تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس واردات کا واحد عینی گواہ ہے۔"

منظور احمد جو بڑے غور سے ہماری گفتگو سن رہا تھا، اچانک بول پڑا۔ "اصل قاتل وہی ہوگا جناب!"

"وہی کون؟" حوالدار نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "تمھیں کیا پتا کہ ہم کس آدمی کی بات کر رہے ہیں؟"

"معافی چاہتا ہوں جی!" اس نے جلدی سے کہا۔ "میں نے تو یونہی ایک اندازہ لگایا تھا۔"

اس کی بات میں معقولیت تھی۔ گھر کا ایک آدمی "پکڑو... پکڑو" کا شور مچاتا ہے لیکن پھر گواہی کے لیے آگے نہیں آتا۔ کیوں؟ کیا وہ خود ہی قاتل تھا اور اس نے اس نوجوان کو قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی تھی؟

میں نے فوراً تانگا منگوایا اور ملزم منظور احمد کو ساتھ لے کر مقتول منور حسین کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں بڑی تعداد میں مرد و زن تعزیت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میری آمد کی خبر سن کر مقتول کا بوڑھا باپ اکبر حسین باہر آیا اور مجھے ایک الگ کمرے میں لے گیا۔ ملزم کو میں نے اے ایس آئی کی تحویل میں دے دیا تھا اور انھیں تانگے میں انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔

"تھانیدار صاحب! اس وقت ہمارا گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔" اکبر حسین نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "ہمارے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں۔ اگر آپ تفتیش کرنے آئے ہیں تو دو چار روز کے بعد آجائیں۔ اس وقت ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ آہ... جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔"

"آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جوان بیٹے کا صدمہ واقعی بہت بھاری ہوتا ہے۔ اللہ آپ کو صبر عطا کرے۔ میں تفتیش وغیرہ کرنے نہیں آیا۔ یہ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ رات ہم نے ایک آدمی کو، جو آپ کے مکان سے نکل کر بھاگ رہا تھا، گرفتار کیا تھا۔ وہ اپنا نام منظور احمد بتاتا ہے اور صحتِ جرم سے انکاری ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ گلی سے گزر رہا تھا کہ اس کو گولی لگ گئی اور سپاہی اسے گرفتار کر کے لے گئے۔ میں اسے شناخت کے لیے یہاں لایا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ گھر کے کسی فرد نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا ہو۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے اندر بلا لوں۔ وہ باہر تانگے میں بیٹھا ہوا ہے۔"

اس نے گہرا سانس لیا، بولا۔ "بلا لیں... ویسے امید نہیں کہ گھر کا کوئی فرد اسے پہچان سکے۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس وقت ہم لوگ سو رہے تھے۔"

میں نے دروازے میں جا کر اے ایس آئی کو آواز دی اور کہا کہ ملزم کو اندر لے آئے۔ پھر اکبر حسین سے کہا۔ "جس حوالدار نے ملزم پر گولی چلائی تھی، اس کا کہنا ہے کہ گھر کا کوئی آدمی ملزم کے پیچھے دوڑ رہا تھا 'پکڑو... پکڑو' کا شور مچا رہا تھا۔ ہمیں اس آدمی کی گواہی چاہیے"

وہ بھنویں سکیڑ کر سوچنے لگا، پھر بولا۔ "شور تو میں نے بھی سنا مگر میں یہ سمجھا تھا کہ شور مچانے والا آپ کا آدمی تھا۔ اب آپ کے کہنے سے یاد آ رہا ہے کہ شور صحن کے اندر سے ہی سنائی دیا تھا۔ مگر وہ آدمی کون ہو سکتا ہے؟"

"گزشتہ رات گھر میں کتنے افراد تھے؟"

اس نے گلوگیر لہجے میں جواب دیا۔ "جو دو اللہ کو پیارے ہو گئے، ان کے علاوہ کل چار افراد تھے۔ میں، میری گھر والی، میری بیٹی اور چھوٹا بیٹا تنویر۔"

"آپ ان افراد کو یہاں بلا لیں تاکہ یہ بھی ملزم کو دیکھ لیں۔ اس سے زیادہ میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔"

منظور احمد اے ایس آئی کی نگرانی میں کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ زخمی ہونے کی وجہ سے سہارے کے بغیر نہیں چل سکتا تھا۔ اکبر حسین نے اپنے بیوی بچوں کو بلا لیا۔

رضیہ کی عمر انیس بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ تنویر اُس سے چھوٹا تھا۔ اُس کی عمر تیرہ یا چودہ سال کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ اُن سب نے اجنبی نظروں سے منظور احمد کو دیکھا۔ اکبر حسین کی معمر بیوی، جس کی نظر کمزور تھی، دیر تک منظور احمد کو گھورتی رہی۔

"پتا نہیں، یہ تھا یا کوئی اور تھا۔" اس نے کہا۔ "کل گیارہ بارہ بجے ایک آدمی ممتاز سے ملنے تو آیا تھا۔ اس وقت میرے اور دلہن کے سوا گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ سب اپنے اپنے کاموں پر گئے ہوئے تھے۔"

میں نے دیکھا، منظور احمد فرش پر بیٹھ گیا تھا اور اس نے سر نیچے کر لیا تھا۔

"کیا دلہن نے بتایا نہیں کہ ملنے والا کون تھا؟"

"اُس نے کہا تھا کہ وہ منور کا کوئی دوست تھا۔"

باقی افراد نے بھی منظور احمد کو نہیں پہچانا۔

میں نے اُن سب کو مخاطب کر کے کہا۔ "کل رات واردات کے فوراً بعد کسی آدمی نے 'پکڑو... پکڑو' کا شور مچایا تھا۔ اس آدمی کا پتا نہیں چل رہا کہ وہ کون تھا۔ آپ میں سے تو کسی نے اس آدمی کو نہیں دیکھا؟"

میں نے محسوس کیا کہ تنویر کچھ کہنا چاہ رہا تھا، لیکن جھجک محسوس کر رہا تھا۔

"ہاں بیٹے!" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "تم شاید کچھ

کہنا چاہتے ہو۔"

"میں نے ایک آدمی کو ساتھ والے گھر میں کودتے دیکھا تھا۔" تنویر نے کہا۔ "شاید وہ گولی چلنے کی آواز سن کر گھبرا گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کون تھا۔"

کچھ عورتیں دروازے میں کھڑی اندر دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نظروں کا مرکز ملزم منظور احمد تھا۔ اچانک ایک عورت کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہائے میں مر جاؤں...!" اس نے کہا۔ "یہ تو اپنا منظور ہے۔" وہ اندر آئی اور ملزم کو گھورنے لگی۔ "وے منظورے! یہ تیرے ہاتھ میں ہتھکڑی! تو ادھر کیسے؟"

وہ ادھیڑ عمر کی ایک خوش حال عورت نظر آتی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "بی بی! کیا آپ اس کو جانتی ہیں؟"

"لو جانتی کیسے نہیں۔ یہ تو ہمارے ہاتھوں میں کھیلا پلا ہے۔"

میرے سوالات کے جواب میں اُس نے بتایا کہ وہ مقتولہ ممتاز کی ماں تھی اور اس کا نام زہرہ بی بی تھا۔ ملزم منظور ان کے قصبے کا رہنے والا تھا اور ممتاز کا پڑوسی تھا۔

"خالہ! میں بے گناہ ہوں۔" منظور نے زہرہ بی بی کے پیر پکڑ لیے۔ "مجھے بچا لو۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ تمھیں تو پتا ہی ہے کہ میں ممتاز کو اپنی بہنوں کی طرح سمجھتا تھا... اس کی عزت کرتا تھا... میں نے اُسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

میں نے اسے اے ایس آئی کے ہمراہ باہر بھیج دیا اور تنویر سے پوچھا۔ "بیٹا! اس آدمی کو تم نے ساتھ والے مکان میں کودتے دیکھا تھا، اس کا قد کاٹھ کیا تھا؟"

اس بچے کے لیے اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "کوئی بڑا سا آدمی تھا۔ وہ بڑے آرام سے دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف غائب ہو گیا۔"

اس کے باپ نے کہا۔ "تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

لڑکا کچھ نہیں بولا۔

میں نے اکبر حسین سے پوچھا کہ جس مکان میں آدمی کودا تھا، اس میں کون رہتا ہے؟"

"اس میں کوئی نئے لوگ آئے ہیں۔ پتا نہیں کرائے دار ہیں یا انھوں نے مکان خرید لیا ہے۔ مرد کا نام شبیر علی ہے۔ بڑا چھوٹا سا کنبہ ہے۔ گھر میں صرف دو عورتیں ہیں۔ ایک شبیر علی کی ماں ہے اور دوسری شاید اس کی بیوی ہے۔"

"بیوی نہیں، بہن ہے۔" رضیہ نے کہا۔ "پہلے ہم بھی اسے اس کی بیوی سمجھتے تھے۔ شبیر علی کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔"

"یہ شبیر علی آدمی کیسا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارا اس سے ابھی کوئی خاص واسطہ نہیں پڑا۔ دیکھنے میں تو اچھا ہی لگتا ہے۔ ہمارے ساتھ اس کی کبھی کوئی اونچ نیچ نہیں ہوئی۔ اندر کا حال اللہ بہتر جانے۔"

"اور کام کیا کرتا ہے؟"

"مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہے؟"

"اکبر صاحب! ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کی یا آپ کے بیٹے کی کسی سے دشمنی تو نہیں تھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا، بولا۔ "ہماری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے، نہ ہی ہمیں کسی پر شبہ ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ آپ کی بہو کوئی دشمنی ساتھ لائی ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"ہمیں اپنی بہو سے کوئی شکایت نہیں تھی۔" اکبر حسین کی بیوی نے کہا۔ "بڑی سگھڑ اور شریف لڑکی تھی۔ اُس نے کبھی کسی دشمنی کی بات نہیں کی تھی۔"

میں نے اس وقت زیادہ سوالات کرنا مناسب نہیں سمجھے اور واپس آ گیا۔ اس کے بعد میں مقتول منور حسین کے چند دوستوں سے ملا۔ منور حسین ایک سرکاری محکمے میں کام کرتا تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس سال کے قریب تھی۔ اس کے دوستوں نے بتایا کہ منور دلیر اور غیرت مند آدمی تھا۔ اس نے کبھی کسی کے ساتھ برائی نہیں کی تھی۔ تاہم وہ اپنی عزت کے معاملے میں بہت حساس تھا۔ بے عزتی یا گالی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اس دوران میں نے منور حسین کے چند پڑوسیوں سے بھی بات کی۔ سب نے وہی باتیں بتائیں، جو میں پہلے سن چکا تھا۔ لیکن جب میں نے شبیر علی کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے کوئی مرد باہر نہیں آیا۔ دستک کے جواب میں ایک صحت مند اور خوش شکل عورت نے دروازہ کھولا۔ اس کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان تھی۔ اُس کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ اس کا نام بعد میں فاطمہ معلوم ہوا۔

اس نے میرے استفسار پر کہا۔ "شبیر گھر پر نہیں ہے جی۔ آپ دو چار دن میں آ کر پتا کریں۔"

"کیا وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے؟"

"شہر سے باہر نہ گیا ہوتا تو میں آپ کو دو چار دن کے بعد آنے کو کیوں کہتی۔"

میں نے پوچھا۔ "اسے گئے ہوئے کتنے دن ہوئے ہیں؟"

"وہ جی، پرسوں گیا تھا۔"

"بی بی! تمھارے پڑوسیوں نے بتایا ہے کہ کل رات ایک آدمی درمیانی دیوار پھاند کر تمھارے گھر میں گھسا تھا۔ تم نے کسی کو دیکھا تو نہیں؟"

"ہم نے کسی کو نہیں دیکھا جی۔ ہمارے گھر میں کسی کو گھسنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم ایسے چکّروں میں نہیں پڑتے۔"

"تمہارا بھائی کام کیا کرتا ہے؟"

"غلّے کا کاروبار کرتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "مگر آپ اتنی لمبی چوڑی باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"تمہارے پڑوس میں ایک میاں بیوی قتل ہو گئے ہیں۔ میں اُن کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔"

"تو پھر ہم کیا کریں؟ ہم نے اُن کو قتل کیا ہے؟"

"نہیں! پوچھنا تو پڑتا ہے — میں نے سنا ہے کہ تم لوگ یہاں نئے آئے ہو۔ اس سے پہلے کہاں رہتے تھے؟"

"او جاؤ جی! اپنا کام کرو۔ میرے پاس اور بھی بہت سارے کام ہیں۔" وہ بگڑ کر بولی۔ "آپ کسی اور کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ اکیلی عورت دیکھ کر پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہے۔۔۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے آس پاس کے لوگوں سے شبیر علی کے بارے میں پوچھ گچھ کی مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ وہ شخص وہاں نیا آیا تھا اور بہت کم گھر سے باہر نکلتا تھا۔ محلے میں کسی سے اس کا میل جول نہیں تھا۔ چند لوگوں نے کہا کہ وہ شکل و صورت سے اچھا آدمی نہیں لگتا۔

میں نے ایک اے ایس آئی کو اس شخص کی چھان بین پر مامور کر دیا اور ایک حوالدار کو منظور احمد کے قصبے روانہ کر دیا۔ یہ بات جاننے کے بعد کہ منظور احمد مقتولہ ممتاز کا پڑوسی تھا، میرے ذہن میں اس کی پوزیشن خاصی مشکوک ہو گئی تھی۔ واضح طور پر وہ بہت کچھ چھپا رہا تھا۔

شام کے وقت منظور کا باپ دو رشتے داروں کے ہمراہ تھانے پہنچ گیا۔ وہ بوڑھا آدمی تھا اور اس کا نام چراغ دین تھا۔

"ملک صاحب! میں اپنے بیٹے کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ کارروائی اس نے نہیں کی۔ ہمارا پورا محلّہ اس کی شرافت کی گواہی دے سکتا ہے۔ میں ضمانتی ساتھ لے کر آیا ہوں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی، میرے بیٹے کو رہا کر دیں۔ اس کی ماں اور بہنوں کی حالت بہت خراب ہے۔ جب سے اس کے زخمی ہونے کی خبر ملی ہے، تب سے اس کی ماں نے کچھ نہیں کھایا۔"

"چراغ دین! تمہارا بیٹا موقع سے فرار ہوتے ہوئے گرفتار کیا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "دوسری بات یہ ہے کہ اس نے بہت ہی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ جب تک ہماری تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ ہر باپ اپنے بیٹے کو شریف اور بے گناہ سمجھتا ہے۔"

"جناب! آپ اس سے میرے سامنے پوچھ گچھ کریں۔ میرے سامنے وہ کوئی بات نہیں چھپا سکتا۔"

مجھے خیال آیا۔ ہو سکتا ہے کہ منظور اکیلا نہ ہو۔ کوئی عجب نہ کہ جس شخص کو تنویر نے دیوار پھاندتے دیکھا تھا وہ منظور کا ساتھی اور اصل کام اُسی نے کیا ہو۔

"چراغ دین! تمہارے بیٹے سے تو میں بعد میں سوال جواب کروں گا، پہلے تم یہ بتاؤ کہ منظور کے ساتھ جو شخص یہاں آیا تھا، اس کا کیا نام ہے؟"

اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا، پھر بولا۔ "سچ پوچھیں تو مجھے اس کی کوئی زیادہ علم نہیں ہے۔ یہ آج کل نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ مجھے نہیں پتا، یہ اکیلا ادھر آیا تھا یا اس کے کوئی ساتھ بھی تھا۔ اگر اس کے ساتھ کوئی تھا تو اس کا پتا چل جائے گا۔ یہ بات چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔"

میں نے ایک اور اندازہ لگایا اور اس سے پوچھا۔ "میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں نے منظور کے لیے ممتاز کا رشتہ مانگا تھا؟"

اس نے قدرے تامل کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے سچ سنا۔ رشتہ ہم نے ضرور مانگا تھا، مگر کوئی ہیرا پھیری والا معاملہ نہیں تھا۔ گھر والی کو لڑکی پسند تھی۔ وہی ایک دفعہ رشتہ مانگنے گئی تھی۔ لڑکی کے گھر والوں نے کہا کہ وہ لوگ کسی کو زبان دے چکے ہیں، اس لیے ہم دوبارہ نہیں گئے۔ ویسے ہمارے ان لوگوں سے بڑے اچھے تعلقات ہیں، کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔"

میں نے اسے باہر بھیج دیا اور منظور کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ سپاہی کے سہارے چلتا ہوا کمرے میں آیا اور کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا، زخم کی وجہ سے اس کا پیر سوج گیا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"جناب! اگر اجازت ہو تو نیچے بیٹھ جاؤں۔" اس نے کہا۔ "کھڑے ہونے سے ٹانگ میں تکلیف ہوتی ہے۔"

دیکھنے میں وہ بہت سیدھا نظر آتا تھا۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ وہ جھجکتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

"منظور احمد! تمہارا باپ باہر آیا بیٹھا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کی زبانی مجھے ساری باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔ سب سے پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھی کا کیا نام ہے اور اُس کا ٹھکانا کہاں ہے؟"

"جناب۔۔۔ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی تھا۔"

"مجھے ایک واقف کار نے بتایا ہے کہ تم ممتاز سے محبت کرتے تھے اور اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔"

اس نے عاجزی سے کہا۔ "حضور! محبت تو نہیں تھی، صرف پسند کرتا تھا۔ میری ماں رشتہ مانگنے گئی تھی، پر بات نہیں بنی۔"

"تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟" میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"حضور! ڈر کی وجہ سے نہیں بتائی۔"

"حوالدار نے ٹھیک ہی کہا تھا، تم آرام سے منہ نہیں کھولو گے۔ تم پر کافی محنت کرنا پڑے گی۔"

"حضور! اب جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ جو پوچھیں گے، اس کا سچ سچ جواب دوں گا۔۔۔ میں بہت کمزور آدمی ہوں۔ اگر آپ نے مارا تو میرا دم نکل جائے گا۔ میں بالکل بے گناہ ہوں حضور!"

"ہم لوگ ایسی باتیں سننے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہر مجرم یہی کہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم دوپہر کے وقت بھی اور رات کو بھی ممتاز سے ملنے گئے تھے۔ میں تفصیل سے ساری بات جاننا چاہتا ہوں۔ اور یاد رکھو، میں جھوٹ بولنے والوں سے نرمی نہیں کیا کرتا۔"

اس نے اقرار کیا کہ وہ واقعی ممتاز سے ملنے گیا تھا، لیکن ساتھ ہی یہ کہا کہ وہ صرف سلام کرنے گیا تھا۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اُس وقت گھر میں کوئی مرد نہیں ہو گا۔ دستک کے جواب میں ممتاز نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر تھوڑی سی حیران ہوئی۔

"باجی! میں اپنے کام سے ادھر آیا تھا۔" منظور نے کہا۔ "سوچا آپ کو سلام کرتا چلوں۔ آپ خیریت سے تو ہیں نا؟"

"ہاں، اللہ کا شکر ہے۔ میں بالکل خیریت سے ہوں۔ منور تو اس وقت دفتر گئے ہوئے ہیں۔ میرے سسر بھی گھر میں نہیں ہیں، ورنہ میں آپ کو ضرور اندر بٹھاتی۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ میں صرف سلام کرنے آیا تھا۔ اگر آپ نے اپنے گھر کوئی پیغام دینا ہو یا کوئی چیز بھجوانا ہو تو مجھے دے دیں، میں رات کو واپس چلا جاؤں گا۔"

منظور نے کہا کہ یہ بات سن کر ممتاز سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی۔ "میں کچھ چیزیں گھر بھجوانا چاہتی ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ ایک دو گھنٹے بعد آ جائیں۔ میں گٹھڑی تیار کر رکھوں گی، مگر کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

"آپ گٹھڑی بنا کر رکھ چھوڑیں۔ میں رات کو لے جاؤں گا۔ میرا دوبارہ آنا تو ہے نہیں، سارا دن کہاں گٹھڑی اٹھائے پھروں گا۔"

منظور نے کہا کہ ممتاز ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی۔ قدرے تامل کے بعد اس نے کہا۔ "دراصل میں اپنے سسرال والوں کو ان چیزوں کے بارے میں نہیں بتانا چاہتی۔ اگر آپ رات کو آئیں تو دس بجے کے بعد آئیں اور پچھلے دروازے سے آئیں۔ میں باورچی خانے میں آپ کا انتظار کروں گی۔ نو بجے سب لوگ سو جاتے ہیں۔ آپ زور سے دروازہ کھٹکھٹائیں، میں خاموشی سے گٹھڑی آپ کے حوالے کر دوں گی۔"

منظور نے بتایا کہ جب اس کی جیب کٹ گئی تو اس کے دل میں ممتاز سے کچھ پیسے اُدھار لینے کا خیال آیا، لیکن پھر اس کی غیرت نے یہ بات گوارا نہ کی اور وہ فلم دیکھ کر سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں ٹرین نکل چکی تھی۔ وہ کچھ دیر پلیٹ فارم پر پریشان پھرتا رہا۔ اس دوران میں اسے خیال آیا کہ ممتاز اس کا انتظار کر رہی ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ پیسے گھر بھیجنا چاہتی ہو۔ اس نے سوچا کہ وہ اُنہی پیسوں ہی سے بس کا ٹکٹ خرید لے گا اور گھر پہنچ کر رقم پوری کر دے گا۔

اس خیال کے تحت وہ ممتاز کی گلی میں پہنچا اور پچھلے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب تو نہ ملا، مگر دستک دینے سے دروازہ کھل گیا۔ باورچی خانہ بالکل سامنے تھا۔ اسے دروازے کے سامنے ایک ہیولا سا دکھائی دیا۔ وہ یہ سوچ کر اندر چلا گیا کہ غالباً وہ ممتاز ہے، جو تاریکی میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے، لیکن وہ ہیولا غائب ہو گیا۔

منظور باورچی خانے کے دروازے میں رُک کر تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے ممتاز کو ہلکی سی آواز دی اور دو قدم اندر چلا گیا۔ تب ہی اس کا پیر کسی نرم چیز سے ٹکرایا۔ اس نے جھک کر اس چیز کو چھوا تو وہ کسی انسان کی ٹانگیں تھیں۔ پھر اسے فرش پر دراز دو ہیولے بھی نظر آئے۔ یہ دیکھ کر وہ گھبرایا اور تیزی سے باہر نکلا۔ تب ہی کسی نے پکڑو۔۔۔ پکڑو کا شور مچا دیا۔ شور مچانے والا عقبی دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ لہٰذا منظور کو سامنے والے دروازے کی طرف دوڑنا پڑا۔ باورچی خانے سے ذرا آگے رہائشی حصّے کے بائیں جانب ایک گلی سی بنی ہوئی تھی جو اگلے اور پچھلے صحن کو آپس میں ملاتی تھی۔

ابھی وہ دروازے سے کچھ دور ہی تھا کہ اس نے حوالدار کو اندر داخل ہوتے دیکھا، اس سے وہ اور زیادہ بدحواس ہو گیا اور دیوار پھاند کر گلی میں کود گیا۔ اس کے فوراً بعد فائر ہوا، گولی اس کی ران میں لگی اور وہ زمین پر گر گیا۔

"حضور! یہ کل واقعہ ہے۔" اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔ میری ممتاز یا منور حسین سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

مجھے خیال آیا کہ اگر منظور کا بیان صحیح ہے تو ممتاز نے اپنے گھر بھجوانے کے لیے ضرور کوئی گٹھڑی تیار کی ہو گی۔ بہت ممکن ہے کہ وہ گٹھڑی باورچی خانے میں ہی موجود ہو۔

ایک بات بتا دوں کہ لاشیں اٹھوانے کے بعد میں نے باورچی خانہ سیل کروا دیا تھا اور ایک سپاہی ہر وقت وہاں پہرے کے لیے موجود رہتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے منظور کو حوالات میں بھجوا دیا۔ اور اے ایس آئی کے ہمراہ منور حسین کے گھر پہنچ گیا۔ اے ایس آئی نے باورچی خانے کا تالا کھولا اور ہم اندر داخل ہو کر

ادھر اُدھر دیکھنے لگے فرش پر پھیلا ہوا خون خشک ہوگیا تھا اور کمرے میں عجیب سی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں وہ خاصا کشادہ باورچی خانہ تھا۔ اس میں برتن اور باورچی خانے کی ضرورت کے سامان کے علاوہ اناج کی چند بوریاں، تین چار کنستر اور پانی کا ڈرم بھی رکھا تھا۔ ڈرم کے پاس کھرا بنا ہوا تھا۔ جس میں گندے برتن پڑے ہوئے تھے۔

سرسری معائنے کے بعد میں نے باریکی سے تلاشی لینا شروع کی۔ چند منٹ کے بعد دروازے کے قریب رکھے ہوئے ایک خالی کنستر سے چھوٹی سی گٹھڑی برآمد ہوگئی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اُس میں چند میلے اور پھٹے کپڑے تھے، جن کے درمیان زیورات کے تین ڈبے رکھے تھے۔ سب سے اوپر والے ڈبے میں زیور کے علاوہ ایک رقعہ بھی تھا جس کا مضمون یہ تھا۔

پیاری امی! السلام علیکم...

آج کل میں بہت پریشان ہوں۔ اس شخص نے مزید آگے بڑھنا شروع کردیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اُس سے روزانہ ملتی رہوں۔ میرے لیے یہ بات بہت مشکل ہے۔ آخر میں کب تک اپنے شوہر کو دھوکا دیتی رہوں گی۔ میں نہیں جاتی تو وہ بڑی دلیری سے گھر میں گھس آتا ہے۔ اس وقت یا تو گھر میں کوئی نہیں ہوتا، یا سب سو رہے ہوتے ہیں۔ یہ مصیبت ٹلتی نظر نہیں آتی۔ منور کو جس دن اس بات کا پتا چلا، اسی دن قیامت آجائے گی۔ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔ منظور کے ہاتھ اپنا زیور اور پانچ سو روپے بھجوا رہی ہوں۔ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو یہ زیور شہناز کے کام آجائے گا۔ کسی کو اس بات کا پتا نہ چلے۔

آپ کی غم زدہ بیٹی، ممتاز۔

میں نے خط جیب میں رکھ لیا اور گٹھڑی کو جوں کا توں باندھ کر باہر آگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ گھر میں ممتاز کے ماں باپ اور رشتے دار بھی آئے ہوئے تھے۔ باہر نکل کر میں نے مقتول منور کے باپ اکبر حسین سے کہا کہ میں ممتاز کی ماں سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ اُس نے میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گٹھڑی کے بارے میں جاننا چاہا۔ میں نے جواب دیا کہ میں گٹھڑی کے بارے میں ہی ممتاز کی ماں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

اُس نے مجھے بیٹھک میں بٹھایا اور ممتاز کی ماں کو میرے پاس چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ اس کا نام ولایت بیگم تھا اور وہ بیالیس چھیالیس سال کی خوش شکل عورت تھی۔ مزاج کی تیز معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر سوگواری پائی جاتی تھی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور گٹھڑی اُس کے سامنے رکھ دی۔

"اس گٹھڑی میں کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "کھول کر دیکھ لیں اور پہچاننے کی کوشش کریں کہ یہ چیزیں کس کی ہیں؟"

اس نے گٹھڑی کھولی اور جلدی جلدی ایک ایک چیز... چیزیں دیکھ کر اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی، بولی۔ "یہ تو میری ممتاز کی چیزیں ہیں۔ یہ زیور بھی اسی کا ہے۔ یہ گٹھڑی آپ کو کہاں سے ملی ہے؟"

"اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ کی بیٹی گھر سے ... تیاری کررہی تھی تو کیا آپ میری بات مان لیں گی؟"

"ہرگز نہیں۔" اس نے تیزی سے کہا۔ "میری ممتاز ... نہیں تھی۔"

"یہ بتائیں کہ کیا ممتاز کو کسی شخص سے کسی قسم کا خطرہ ..."

"تھانیدار صاحب! میری ممتاز بہت نیک اور سیدھی تھی۔ اس نے کبھی کسی کے ساتھ برائی نہیں کی تھی۔ اس کا ... دشمن تھا اور نہ ہی اسے کسی سے خطرہ تھا اور دوسری بات مجھے ایسے سوالات بالکل پسند نہیں ہیں۔ آپ ہم لوگوں کو پریشان کرنے کے بجائے قاتل کا کھوج لگائیں، اصل قاتل کو تلاش کریں۔"

وہ ایک ماں کے خیالات تھے۔ ہر ماں یہی چاہتی ہے کہ ... کے بعد اس کی اولاد کی نیک نامی ہو اور اُس کی برائیوں پر پردہ پڑا رہے۔ میں نے ممتاز کا خط نکال کر ولایت بیگم کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ آپ کی بیٹی کا خط ہے۔ یہ اس نے مرنے سے کچھ ... لکھا تھا۔"

اس نے خط میرے ہاتھ سے لیا اور اسے پوری توجہ سے پڑھنے لگی۔

خط کے مضمون سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ ممتاز ... بہت اعتماد کرتی تھی۔ اُسے اس کی ایمانداری کے بارے میں ... نہیں تھا۔ لیکن جو بات مجھے شک میں ڈالتی تھی، وہ یہ تھی کہ ممتاز نے جن پانچ سو روپوں کا ذکر کیا تھا، اُن کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ ... زمانے میں پانچ سو روپے ایک بڑی رقم تھی۔ اُن دنوں سونا ... پچاس روپے تولہ تھا۔ پانچ سو روپے میں دس تولے سونا خریدا جا سکتا تھا۔ آج کل دس تولے سونے کی قیمت تیس ... بنتی ہے۔ کیا منظور نے پانچ سو روپے کی خاطر میاں بیوی کو ... دیا تھا؟ لیکن یہاں بھی وہی مسئلہ تھا۔ رقم منظور کے پاس سے برآمد نہیں ہوئی تھی۔ غالباً اُس نے روٹھتے وقت رقم کہیں ... دی تھی۔

"یہ... یہ خط آپ کو کہاں سے ملا ہے؟" ولایت بیگم ...

"یہ خط اس گٹھڑی میں تھا اور یہ گٹھڑی باورچی خانے ..."

... کنستر سے برآمد ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس خط سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ آپ کی بیٹی کسی خطرے میں گھری ہوئی تھی۔ اور اسی خطرے کی وجہ سے اپنے شوہر سے دھوکا کررہی تھی۔ آپ مجھے اس شخص کا نام بتائیں جس کا اس خط میں ذکر کیا گیا ہے؟"

"مجھے ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہے۔"

"ولایت بیگم! اگر آپ میرے ساتھ تعاون نہیں کریں گی تو میں آپ کی بیٹی کے قاتل کو قانون کے حوالے نہیں کرسکوں گا۔"

"تھانیدار صاحب! قاتل گرفتار ہو یا نہ ہو، میں نہیں چاہتی کہ موت کے بعد میری بیٹی کی نیک نامی پر کوئی حرف آئے۔"

اس نے خط تہ کرکے اپنے پاس رکھ لیا۔

"اور اس وجہ سے آپ مجھے اس شخص کا نام بتانے پر تیار نہیں جس کا آپ کی بیٹی نے اس خط میں ذکر کیا ہے؟"

"اس دنیا میں شیطانوں کی کوئی کمی نہیں ہے، لیکن میں آپ سے صاف کہتی ہوں کہ مجھے اس شخص کا نام معلوم نہیں ہے۔ میں آپ سے ایک گزارش یہ کرنا چاہتی ہوں کہ آپ اس خط کا کہیں ذکر نہ کریں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "منظور کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے سنا ہے کہ اس کی ماں نے اس کے لیے ممتاز کا رشتہ مانگا تھا۔"

"میں نے منظور میں آج تک کوئی بُرائی نہیں دیکھی۔ ہمارے ساتھ اس کا رویہ ہمیشہ اچھا رہا ہے۔ رشتے تو کئی لڑکوں کے آئے تھے۔ منظور کا رشتہ بھی آیا تھا لیکن ہمارے انکار سے کسی کے دل میں کوئی رنجش نہیں تھی۔ پھر انسان، انسان ہی ہوتا ہے۔ اُس کے دل میں کسی وقت بھی بُرائی آسکتی ہے۔ اگر منظور نے کوئی بُرائی کی ہے تو اس کا پتا چلانا آپ کا کام ہے۔"

وہ عورت کوئی تعاون کرنے پر تیار نہیں تھی۔ میں اس کے ساتھ سخت رویہ اختیار نہیں کرسکتا تھا۔ لہٰذا میں نے گٹھڑی اس سے واپس لی اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔

اس حوالدار کو میں نے منظور کے بارے میں چھان بین کرنے بھیجا تھا، وہ دو روز بعد واپس آیا۔ اور ایک دلچسپ کہانی بھی لایا۔ یہ کہانی اُسے منظور اور ممتاز کے ڈیڑھ دو درجن محلے والوں کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ اس کہانی کو میں اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یہ اپنی جگہ پر ایک الگ اور مکمل کہانی ہے، یہاں یہ کہانی دُہرے قتل کی تفتیش کے درمیان میں پھنس گئی ہے ورنہ یہ کبھی منظرِ عام پر نہ آتی۔

حوالدار نے بتایا کہ کچھ عرصہ قبل ممتاز کے قصبے میں رفیق عرف فیکا موچی کا نام بہت مشہور ہوا تھا۔ اس نے مذکورہ قصبے میں ڈکیتی کی کئی پے در پے وارداتوں سے زبردست خوف و ہراس پھیلایا ہوا تھا۔ اس کے گروہ میں کل تین یا چار آدمی تھے۔ اصل منصوبہ بندی فیکا موچی کرتا تھا۔ یہ شخص اتنی ذہانت اور چابکدستی سے واردات کرتا تھا کہ سارے حفاظتی انتظامات دھرے رہ جاتے تھے۔ یہ صرف دولت مندوں کو لوٹتا تھا اور اس کی وارداتوں کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ اس نے نہ تو کبھی کسی آدمی کو قتل کیا تھا اور نہ ہی کسی کو زخمی کیا تھا۔ واردات یہ ہمیشہ اسلحے کے ساتھ کرتا تھا، مگر منصوبہ بندی ایسی زبردست کرتا تھا کہ گولی چلانے کی نوبت نہیں آتی تھی۔

پولیس ایک بار بھی اس پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ واردات کے بعد یہ ایسے غائب ہوجاتا تھا کہ جیسے دُھواں ہوا میں تحلیل ہوجاتا ہے۔ پولیس کے پاس نہ تو کوئی اس کا ریکارڈ تھا اور نہ ہی انھیں اس کا حلیہ معلوم تھا۔ واردات کے دوران یہ نقلی داڑھی مونچھیں استعمال کرتا تھا۔ اور انھیں ایسے بے ڈھنگے پن سے لگاتا تھا کہ ان کا نقلی ہونا دور سے نظر آجاتا تھا۔ اکثر لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ نقلی داڑھی مونچھیں بطور نقاب کے استعمال کرتا تھا اور دوسرا مقصد اس کا غالباً اپنی دہشت پھیلانا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ غالباً اس کی شکل اتنی خوف ناک نہیں تھی، جتنی ایک ڈاکو کی ہونا چاہیے۔

ایک رات فیکا موچی اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ ممتاز کے گھر میں ڈکیتی کی نیت سے گھس آیا۔ اس وقت تقریباً گھر میں سات افراد تھے، جن میں چار عورتیں، ایک بچہ اور دو مرد تھے۔ فیکے نے ان سب افراد کو ایک کمرے میں اکٹھا کرلیا اور خود ان کی نگرانی کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور ہولسٹر میں ریوالور لگا ہوا تھا۔ اس کے دو ساتھی اطمینان کے ساتھ قیمتی سامان اکٹھا کرنے لگے۔

ممتاز کے باپ بہادر علی نے بعد میں پولیس کو بتایا کہ فیکے موچی کے چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ یا عجلت نہیں پائی جاتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے گھر میں ہو۔

"ہم آپ لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے۔" اس نے شستہ لہجے میں کہا۔ "صرف تھوڑا سا مال لینے آئے ہیں اور مال لے کر واپس چلے جائیں گے۔ کسی کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم بھی آپ جیسے انسان ہیں۔ جن کو نیند آرہی ہو، وہ بے شک لیٹ جائیں۔ ہم بندوں کے ساتھ صرف اسی وقت چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں جب وہ ہمارے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

عورتوں نے سروں پر چادریں ڈال رکھی تھیں اور اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ڈاکو نرم لب و لہجے میں بات کررہا ہے تو انھوں نے پردے میں رہتے ہوئے

اس کی طرف دیکھنا شروع کیا۔

فیکے موچی نے قدرے توقف کے بعد کہا "چک ہرلی میں ہیں صرف اس وجہ سے ایک پورے خاندان کو قتل کرنا پڑا تھا کہ انھیں اپنی جان سے زیادہ مال پیارا تھا۔"

ممتاز نے بعد میں اپنی ایک سہیلی کو بتایا کہ اُسے فیکے ڈاکو کی یہ بات جھوٹ معلوم ہوئی۔ (اور یہ بات حقیقتاً جھوٹی ہی تھی) اس نے اندازہ لگایا کہ فیکے نے انھیں خوف زدہ کرنے کے لیے وہ جھوٹ بولا تھا۔ اس بات سے اس کے دل میں خوف پیدا ہونے کے بجائے حوصلہ پیدا ہوا۔

"بعض لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں۔" فیکا موچی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ نہیں سوچتے کہ جان زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ جس کی جان گئی اُس کا مال بھی گیا۔ لیکن آپ لوگ مجھے سمجھدار معلوم ہوتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔"

ممتاز نے بعد میں بتایا کہ فیکے کی باتیں سن کر اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے کہا: "آپ کی یہ نصیحتیں صرف دوسروں کے لیے ہیں یا اپنے لیے بھی ہیں۔"

"کیوں نہیں۔" فیکے نے جواب دیا۔ "اپنے لیے بھی ہیں۔"

"تو پھر آپ اپنی جان کیوں ہتھیلی پر لیے پھر رہے ہیں؟" ممتاز نے بات کرتے ہوئے اپنی ہتھیلی کو دائیں بائیں حرکت دی۔ ایسا کرنے سے اس کی چادر سر سے ڈھلک گئی اور سر چہرے سمیت ظاہر ہو گیا۔ لیکن جوش کی وجہ سے اسے چادر ٹھیک کرنے کا خیال نہیں آیا۔ "آپ کیوں مال کی خاطر اپنی جان کو تباہی میں ڈالنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

فیکا ڈاکو اس کی بات سُن کر تھوڑا سا متاثر ہوا۔ بولا: "میں اپنی جان کی حفاظت سے کبھی غافل نہیں رہا۔ یہ رائفل میں اسی لیے ساتھ رکھتا ہوں۔"

ممتاز نے بعد میں کہا کہ اس کے دل میں فیکے کے لیے ہمدردی پیدا ہوئی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ اس ہمدردی کا سبب کیا تھا اور ہمدردی کے اس جذبے کی وجہ سے اُسے وہ خوف ناک ڈاکو بہت حقیر معلوم ہوا۔ اس نے غصے سے کہا: "رفیق احمد! تم جھوٹ بولتے ہو۔ لوگوں سے نہیں اپنے آپ سے جھوٹ بولتے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایسا کام کرنے والوں کا انجام بُرا ہوتا ہے۔ تمھیں کیا پتا کہ کب کسی بندوق سے نکلی ہوئی گولی تمھارا سینہ چھلنی کر ڈالے گی۔ ڈاکوؤں پر لوگ پھول نچھاور نہیں کیا کرتے۔ گولیاں چلایا کرتے ہیں۔ ہر واردات کے بعد تمھاری جان زیادہ سے زیادہ خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ بندوقوں کا

رُخ تمھاری طرف ہو جاتا ہے۔"

فیکے ڈاکو نے گہرا سانس لیا۔ اور عجیب نظروں سے ممتاز کو [illegible] لگا۔ الفاظ سے زیادہ ممتاز کی ہمدردی نے اسے متاثر کیا تھا۔ ا[illegible] خصوصاً اس بات نے کہ ممتاز نے اسے فیکا موچی کہنے کے بجائے رفیق احمد کہا تھا۔ تاہم وہ ڈاکو تھا اور اتنی آسانی سے جھک نہیں سکتا تھا۔

"گولیوں سے کھیلنا ہمارا پیشہ ہے۔" اس نے بظاہر بے نیازی سے کہا: "ہم گولیوں کو روکنا بھی جانتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ تمھارے اندر یہ کمال موجود ہو۔" ممتاز نے [illegible] "لیکن ایک گولی ایسی ہے جسے دنیا کی کوئی ڈھال نہیں روک سکتی اور یہ وہ گولی ہے، جو کسی مظلوم کے سینے سے نکلتی ہے اور آسمانی بجلی بن کر ظالم پر ٹوٹ پڑتی ہے۔"

فیکا ڈاکو چُپ سا ہو گیا۔

"رفیق احمد! تم خوش شکل اور پڑھے لکھے نوجوان ہو۔ اس نقلی داڑھی کے پیچھے تمھارا اصلی چہرہ دیکھ سکتی ہوں۔ تم اتنے [illegible] آدمی نہیں ہو، جتنا خود کو ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ ہو [illegible] ہے کہ کسی دولت مند یا جاگیردار نے تم پر ظلم کیا ہو، لیکن اس [illegible] انتقام کا یہ طریقہ انتہائی بُزدلانہ ہے۔ اگر تمھارے دماغ میں عقل ا[illegible] بازوؤں میں دم ہے تو محنت کر کے دولت کماؤ۔ اگر ان دونوں [illegible] سے محروم ہو تو بھیک مانگ کر گزارا کر لو۔"

فیکا موچی واردات کے دوران مصنوعی داڑھی مونچھوں [illegible] علاوہ چہرے پر تھوڑی سی کالک بھی مَل لیتا تھا۔ جس کی وجہ [illegible] اس کا رنگ کالا اور چہرہ ناقابلِ شناخت ہو جاتا تھا۔ ممتاز نے [illegible] خوش شکل کہہ کر اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔ یہ بات ن[ے] فیکے پر نفسیاتی اثر ڈالنے کے لیے کہی تھی اور وہ اس میں [illegible] طرح کامیاب رہی تھی۔

فیکے نے اپنے ساتھیوں کو بُلا لیا۔ اور بغیر کچھ چوری کیے [illegible] سے نکل گیا۔ اس کے بعد اس کی وارداتوں کا سلسلہ رُک گیا۔ [illegible] نے یہی اندازہ لگایا کہ فیکا وہ علاقہ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا گ[یا] لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔

ممتاز کی ایک رازدار سہیلی تھی جس کا نام شہلا تھا۔ ممتاز [illegible] ایک ایک بات شہلا کو بتا دیتی تھی۔ شہلا نے یہ ساری باتیں شوہر نجیب کو بتائیں۔ نجیب کے ذریعے یہ باتیں حوالدار کو معلوم ہوئ[یں] حوالدار نے مجھے بتائیں اور اب چھتیس سال کے بعد میں یہ با[تیں] آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

فیکے موچی کی پُراسرار روپوشی کے چند ہفتے بعد ممتاز کو ایک [illegible] ملا۔ رقعہ لانے والی ایک سات آٹھ سالہ بچی تھی۔ جس کا نام [illegible]

[illegible] کر لیتے ہیں۔ وہ ممتاز کے پڑوس میں رہتی تھی اور اکثر و بیشتر ان [illegible] آ جاتی تھی۔ رقعہ وہ ایک کتاب میں رکھ کر لائی تھی اور بڑی رازداری سے ممتاز کو دیا تھا۔

ممتاز نے وہ رقعہ پڑھا تو اس کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ اس میں لکھا تھا۔

> آپ نہایت حسین، نہایت ذہین اور اعلیٰ کردار کی مالک ایک قابلِ پرستش خاتون ہیں۔ میں نے جب سے آپ کو دیکھا ہے، میرا دل میرے اختیار میں نہیں رہا۔ ہر وقت آپ کا تصور مجھے بے چین رکھتا ہے۔ میری ایک چھوٹی سی خواہش پوری کر دیں۔ آپ کے گھر کی جو کھڑکی مغرب کی طرف کھلتی ہے، آج دوپہر کو ٹھیک دو بجے چند منٹ کے لیے اس میں کھڑی ہو جائیں۔ آپ کو دیکھ کر آپ کے اس خاموش پرستار کو کچھ چین آ جائے گا۔ اگر آپ نہ آئیں تو مجھے بہت دُکھ ہو گا۔

رقعے کا مضمون ظاہر کرتا تھا کہ لکھنے والا کوئی معقول اور مہذب [illegible] تھا۔ رقعہ پڑھ کر ممتاز کو غصہ بھی آیا اور اچھا بھی لگا۔

اس نے روبی سے پوچھا کہ وہ رقعہ اسے کس نے دیا تھا؟

"محسن چچا نے دیا ہے۔" روبی نے سادگی سے جواب دیا۔ "انھوں نے کہا تھا کہ ممتاز باجی کے علاوہ کسی کو نہیں بتانا۔"

"اچھا... تو یہ تمھارے چچا کی کارستانی ہے؟" ممتاز نے کہا۔ "ان حضرت کا نام محسن ہے۔ کیا یہ تمھارے گھر میں رہتے ہیں؟"

"یہ میرے اصلی چچا تھوڑے ہی ہیں۔" روبی نے کہا۔ "[illegible] گھر کے پاس رہتے ہیں۔ انھوں نے خود ہی اپنا نام محسن [illegible] بتایا تھا۔ ہمارے گھر کبھی نہیں آئے۔"

ممتاز نے بوجہ تجسس پوچھا: "یہ تمھارے محسن چچا کیسے آدمی ہیں؟ [illegible] شکل و صورت کیسی ہے؟"

"[بہت] پیارے ہیں... مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

ممتاز کرید کرید کر محسن کے بارے میں پوچھنے لگی۔

[رو]بی کے جوابات سے جو نقشہ سامنے آیا، وہ یہ تھا کہ محسن [illegible] اور خوبرو نوجوان ہے۔ اچھے کپڑے پہنتا ہے، اچھی [illegible] ہے۔ اس کے خوبصورت بال ہر وقت پیشانی پر بکھرے [رہتے ہ]یں اور وہ بہت ہی ہنس مکھ اور زندہ دل آدمی ہے۔ یہ [illegible] آئیڈیل محبوب کا نقشہ تھا۔ اُس نے رقعے کو کئی بار پڑھا [illegible] ہوئے بھی ٹھیک دو بجے مغرب کی سمت کھلنے والی [کھڑکی] میں پہنچ گئی۔ اس کی متلاشی نظریں چاروں طرف طواف کرتی [رہیں]، مگر کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو روبی کے بتلائے ہوئے

حلیے پر پورا اترتا۔ ممتاز کو اس بات سے مایوسی بھی ہوئی اور اُس کے دل میں تجسس بھی پیدا ہوا۔

اگلے روز اُسے روبی کے ذریعے ایک اور رقعہ ملا۔ محسن نے والہانہ انداز میں اُس کے کھڑکی میں آنے کا شکریہ ادا کیا تھا اور ان لمحات کو اپنی زندگی کے یادگار لمحات قرار دیا تھا۔ نیز دوبارہ کھڑکی میں آنے کی درخواست بھی کی تھی۔

چند روز تک یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ ممتاز محسن کے رقعے، جو رفتہ رفتہ طویل ہوتے جا رہے تھے، وصول کرتی رہی اور کھڑکی میں جاتی رہی، لیکن محسن کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ غالباً وہ چھُپ کر اسے دیکھتا تھا۔ ممتاز کے دل میں اپنے پُراسرار پرستار کو دیکھنے کی خواہش شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ وہ خود اُسے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن بالآخر وہ مجبور ہو گئی۔ اُس نے پہلی دفعہ محسن کے نام رقعہ لکھا اور پوچھا۔ کیا آپ مجھ ہی کو دیکھتے رہیں گے یا خود بھی کبھی سامنے آئیں گے؟

اس سوال کا جواب یہ ملا۔ ڈرتا ہوں کہ آپ مجھے دیکھ کر مجھ سے نفرت نہ کرنے لگیں۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلی دفعہ آپ مجھے قریب سے دیکھیں، تاکہ اگر آپ کو مجھ میں کوئی خامی نظر آئے تو میں اس کی وضاحت کر سکوں۔

اس بات نے ممتاز کو کشمکش و پیچ میں مبتلا کر دیا۔ اس نے روبی سے کرید کرید کر پوچھا، مگر وہ محسن کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ بتا سکی جسے خامی کہا جا سکتا۔

ایک رقعے کے بعد ممتاز نے محسن کے خطوں کے جواب دینے شروع کر دیے۔ اس نے محسن سے تصویر مانگی، مگر جواب انکار میں ملا۔ محسن رُو برو پیش ہونا چاہتا تھا۔

خط و کتابت نے دونوں کو خاصا قریب کر دیا تھا۔ ممتاز اپنے آئیڈیل سے ملنے کی خود بھی خواہش مند تھی۔ لہٰذا خطوں کے ذریعے دونوں نے ملاقات کے لیے وقت اور جگہ کا تعین کر لیا۔ یہ جگہ محسن کے ایک دوست کا گھر تھی۔ گھر میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ تاہم ممتاز، روبی کو ساتھ لے کر گئی تھی۔ جب اس نے محسن کو دیکھا تو دم بخود رہ گئی۔ وہ اس کے تصور سے زیادہ خوش شکل، ایک بانکا سجیلا نوجوان تھا۔ اس نے بوسکی کا کُرتا پہن رکھا تھا۔ اس کا رنگ گورا چٹا، پیشانی کشادہ اور بال بھورے تھے۔ اس نے جھکی ہوئی نظروں سے ممتاز کو سلام کیا اور سر جھکا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

صورتِ حال ممتاز کے اندازے سے بالکل اُلٹ تھی۔ وہ گھر سے روانہ ہوتے وقت خاصی نروس تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہ کس طرح ایک غیر مرد کی نظروں کا مقابلہ کرے گی اور کس طرح اس سے باتیں کرے گی، مگر وہ مرد تو اس کے تصور سے بھی زیادہ شرمیلا تھا۔

وہ دونوں ہاتھ گھٹنوں میں دبائے اور آنکھیں نیچی کیے یوں اس کے سامنے بیٹھا تھا، جیسے کوئی پجاری دیوی کی مورتی کے سامنے بیٹھا ہو۔

ممتاز کچھ دیر تک اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی، پھر بولی "کیا ہم یونہی چپ بیٹھے رہیں گے؟"

"نہیں۔" محسن کے منہ سے باریک سی آواز نکلی۔

"تو پھر کوئی بات کریں۔"

"آپ بات کریں، میں سنتا ہوں۔" محسن نے کہا۔

آواز اتنی مدھم تھی کہ ممتاز کو آگے جھکنا پڑا۔

"آپ تو لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہیں۔"

"جی۔" محسن کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "میں آپ کا مجرم ہوں۔"

ممتاز کو اس کی آواز کچھ مانوس سی معلوم ہوئی۔

"مجرم تو آپ واقعی ہیں۔ آپ کے اس شرمیلے پن نے مجھے گھر سے نکلنے پہ مجبور کر دیا ہے۔ کیا سزا دی جائے آپ کو؟"

محسن نے دونوں ہاتھ آگے کر دیے اور بولا۔ "مجھے ہمیشہ کے لیے قید کر لیں، یہی میری سزا ہے۔"

تب ہی ممتاز نے اس کی آواز پہچان لی اور اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

وہ شخص جو آنکھیں نیچی کیے اس کے سامنے بیٹھا تھا، وہ درحقیقت فیکا موچی تھا۔ وہ مشہور ڈاکو جس کی دہشت سے پورا قصبہ کانپتا تھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا لڑکیوں کی طرح شرما رہا تھا۔

ممتاز حیرت سے گنگ ہو گئی۔ کئی لمحوں تک اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی۔

محسن عرف فیکا موچی سمجھ گیا کہ ممتاز نے اسے پہچان لیا ہے۔

"میں جانتا تھا کہ آپ مجھے پہچان لیں گی۔" اس نے کہا۔ وہ اسی طرح آنکھیں نیچی کیے بیٹھا تھا۔ "اسی لیے میں آپ کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ مجھے معاف کر دیں۔۔۔"

"تمھاری یہ تبدیلی میری سمجھ سے باہر ہے۔" ممتاز نے ایک طویل توقف کے بعد کہا۔ "کہیں تم نے مجھے دھوکا دینے کے لیے تو یہ بہروپ نہیں بھرا؟ تم فیکے موچی ہو نا؟"

"ہاں، یہ میرا ہی نام تھا۔ میں نے وقتی ضرورت کے تحت یہ نام اختیار کیا تھا۔ میرا اصل نام محسن رفیق ہے۔"

"لیکن کیوں؟" ممتاز نے جاننا چاہا۔ "تم یہ سب کچھ کیوں کرتے رہے؟ تم دیکھنے میں تو شریف آدمی لگتے ہو۔"

"میں نے جو کیا، وہ میری جہالت تھی، لیکن میں اپنی مظلومیت کی کہانی آپ کے سامنے بیان نہیں کروں گا۔ کیونکہ اس ظلم کی وجہ سے جو راستہ میں نے اختیار کیا، وہ بُرا تھا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔"

اس کے چہرے پر عاجزی اور شرمیلے پن کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس بات نے ممتاز کو بہت متاثر کیا کہ پورے قصبے میں دہشت والا ڈاکو نہ صرف یہ کہ اس کی پرستش کرتا تھا بلکہ اس کے سامنے نظر اٹھا کر بات نہیں کر رہا تھا۔ پھر وہ شکل و صورت اور قد و قامت کے لحاظ سے ایک مثالی نوجوان تھا۔ اس کا رکھ رکھاؤ اور رویہ بھی مہذب لوگوں جیسا تھا۔ اس نے ممتاز کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بغیر کسی حجاب کے اس بات کا اعتراف کیا کہ ایک پشت پہلے ان کے خاندان کے بعض لوگ جوتے گانٹھ کر گزر بسر کرتے تھے۔ اس نسبت سے اس نے خود ہی اپنے نام کے ساتھ لفظ موچی لگا دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ پولیس کو اپنے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔

اس کی یہ چال خاصی کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ پولیس نے اس کی تلاش میں آس پاس کے علاقوں میں رہنے والے موچی خاندانوں کو کھنگال مارا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ ممتاز کو بھی اس سے محبت ہو گئی۔ کچھ عرصے دونوں میں چوری چھپے خط و کتابت چلتی رہی۔ محسن نے ممتاز کو کئی تحائف بھی دیے۔ یہ بات چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی تھی۔ ممتاز کی ماں ولایت بیگم کو بیٹی کی پُراسرار سرگرمیوں کی وجہ سے شبہ ہوا۔ اس نے سختی سے باز پُرس کی۔ ممتاز نے محسن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

ولایت بیگم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کی بیٹی ایک ڈاکو کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اگر دنیا کو یہ بات معلوم ہو گئی تو کیا ہو گا!

ممتاز نے ماں کی منت کی کہ وہ صرف ایک بار محسن سے مل لے، پھر اس کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے۔

"تم پاگل ہو گئی ہو۔" ولایت بیگم نے غصے سے کہا۔ "تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں اس کالے چور کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ اس جنگلی کو دیکھ کر میں ضرور بے ہوش ہو جاؤں گی۔ اللہ ایسے خونخوار شخص سے خدا بچائے۔"

لیکن ممتاز نے محسن کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے اور ماں کو اس سے ملنے پر مجبور کر دیا۔ ولایت بیگم نے کہا کہ وہ پردے میں رہ کر اس ڈاکو سے بات کرے گی اور پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں دے گی۔

محسن عرف فیکے موچی کو صبح کے دس بجے گھر بلایا گیا۔ اس وقت گھر کے مرد اپنے کاموں پر گئے ہوئے تھے۔

ولایت بیگم نے جب ایک خونخوار کالے چور کے بجائے ایک خوبرو اور بانکے سجیلے نوجوان کو بیٹھک میں داخل ہوتے دیکھا

تو دنگ رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ یہ وہی ڈاکو ہے جس کی رنگت سیاہ، چہرے پر جھاڑ جھنکار داڑھی اور ہاتھ میں رائفل تھی۔

بیٹھک میں داخل ہونے والا تو ایک مہذب اور شرمیلا نوجوان تھا۔ وہ کسی پہلو سے فیکا ڈاکو نہیں لگتا تھا۔

ولایت بیگم پردے میں رہنے کی شرط بھول کر سامنے آ گئی۔ محسن نے اپنی باتوں سے ماں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس نے اسے یقین دلایا کہ وہ چوری ڈکیتی سے توبہ کر چکا ہے اور آئندہ باعزت زندگی گزارنے کا عزم رکھتا ہے۔

ان ساری باتوں کے باوجود ولایت بیگم ایک سابق ڈاکو کو اپنا داماد بنانے پر تیار نہیں تھی۔ یہ بات ہمیشہ چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ کچھ دن وہ اس بات کو چھپاتی رہی اور از خود یہ کوشش کرتی رہی کہ ممتاز، محسن کا خیال دل سے نکال دے۔ لیکن ممتاز کا کہنا تھا کہ جس شخص نے اس کی خاطر ڈکیتی ترک کی تھی، اسے سہارا دینا اس کا فرض تھا۔

ولایت بیگم نے مجبور ہو کر یہ بات اپنے شوہر کو بتائی۔ اس کے شوہر بہادر علی کو پہلے تو اپنی بیوی کی بات پر یقین ہی نہیں آیا۔

"کیا تم نے یہ کہا ہے کہ فیکا ڈاکو ہمارے گھر میں آتا رہا ہے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "اس ہمارے گھر میں؟"

"ہاں، میں نے یہی کہا ہے۔" ولایت بیگم نے جواب دیا۔ "تم اسے دیکھو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ وہ اچھی شکل و صورت کا مالک ہے اور خاندانی آدمی لگتا ہے۔ ڈاکو تو وہ بالکل نہیں لگتا۔ پتا نہیں اس نے میری بیٹی پر کیا جادو کر دیا ہے۔ صبح و شام اسی کے نام کی مالا جپتی ہے۔"

"ولایت بیگم! تم فیکے موچی کی تعریفیں کر رہی ہو، تمھارا دماغ تو ٹھکانے پر ہے؟"

"خدانخواستہ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اسے بیٹی کا رشتہ دے دیں۔" ولایت بیگم نے کہا۔ "لیکن سچی بات یہ ہے کہ وہ لڑکا ہے بڑا تعریف کے قابل۔ قسم لے لو جو اس نے ایک دفعہ بھی آنکھیں اٹھا کر میرے ساتھ بات کی ہو۔ ہمیشہ نیچی نظروں سے بات کرتا ہے۔ مجھے تو اس پر ترس آتا ہے۔ اس کے ماں باپ مر چکے ہیں اور اس کا بھائی بہن بھی نہیں ہے۔"

"جہنم میں جائے۔۔۔ ہماری بلا سے۔ آج کے بعد اگر اس نے ہمارے گھر میں قدم رکھا یا ممتاز نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا اور دوسری بات یہ ہے کہ ممتاز کی شادی کی تیاری شروع کر دو۔ اکبر حسین اشارتاً اپنے بیٹے منور کا ذکر کر چکا ہے۔ لڑکا شریف ہے اور سرکاری ملازم ہے۔ یعنی پکی نوکری ہے۔ ہمیں اور کیا چاہیے؟"

ولایت بیگم نے ممتاز کو باپ کے فیصلے سے آگاہ کر دیا اور محسن سے کہہ دیا کہ وہ دوبارہ ان کے گھر کا رُخ نہ کرے، لیکن وہ اتنی آسانی سے پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔ چند روز بعد اس نے بہادر علی کو بازار میں روک لیا اور سلام کرنے کے بعد کہا۔ "چاچا بہادر علی! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔"

بہادر علی نے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا اور فیصلہ کیا کہ وہ کوئی شریف آدمی ہے۔ اس نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"کیا نام ہے تمھارا اور کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"بات پردے کی ہے۔" محسن نے کہا۔ "آئیں، ادھر ہوٹل میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ کچھ لسی پانی بھی ہو جائے گا۔"

بہادر علی قدرے تامل کے بعد محسن کے ہمراہ ایک قریبی ہوٹل میں جا بیٹھا۔ اس اثنا میں اسے کچھ شک سا ہو گیا تھا۔

محسن نے کھانے پینے کی چیزوں کا آرڈر دیا اور بیرے کے جانے کے بعد بولا۔ "چاچا! میرا نام محسن رفیق ہے۔ اس سے پہلے میں فیکے موچی کے نام سے مشہور تھا لیکن اب میں نے یہ نام اپنی زندگی کی تختی سے مٹا دیا ہے۔ میں شریف آدمی بن گیا ہوں اور عزت کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ میری اس تبدیلی میں آپ کی بہادر بیٹی کا ہاتھ ہے۔ آپ کو وہ رات یقیناً یاد ہو گی جس رات آپ کی بیٹی نے مجھ سے غیرت دلائی تھی۔ اس رات کے بعد میں نے کوئی واردات نہیں کی۔"

بہادر علی نے خاموشی سے اس کی بات سنی، پھر بولا۔ "تم نے بہت اچھا کیا کہ اس بُرے کام سے توبہ کر لی۔ اب میں تمھیں یہ مشورہ دوں گا کہ یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں دور چلے جاؤ۔ جہاں تمھیں جاننے پہچاننے والا کوئی نہ ہو۔"

"میرا یہی ارادہ ہے لیکن اس سے پہلے میری آپ سے ایک درخواست ہے۔۔۔"

بہادر علی نے اس کی بات کاٹی، بولا۔ "دیکھو محسن! میری بیٹی نے تم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس کی وجہ سے تم نے ایک بہت بڑی بُرائی چھوڑ دی ہے۔ کیا تم اس کے احسان کے بدلے اُسے ہم سے چھین لینا چاہتے ہو؟"

"چاچا بہادر علی! وہ بھی یہی چاہتی ہے۔"

"بس۔" بہادر علی نے تیزی سے کہا۔ "میں اس سے آگے کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔ لڑکیاں اس معاملے میں نادان ہوتی ہیں۔ اسی لیے خدا نے انھیں از خود اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ یہ ہماری شرافت ہے کہ ہم نے تمھیں پولیس کے حوالے نہیں کیا۔"

محسن مسکرایا اور سرد نظروں سے بہادر علی کو گھورنے لگا۔ یہ نظریں ان نظروں سے بہت مختلف تھیں، جنھیں ممتاز اور اس کی ماں جانتی تھی۔ بہادر علی کو وہ نظریں بہت خوفناک معلوم ہوئیں۔

محسن نے بہادر علی کی کلائی پکڑلی اور بظاہر نرم لہجے میں بولا "چاچا! فیکے موچی پر پولیس ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ اگر یقین نہ آئے تو آؤ، ابھی تھانے چلتے ہیں۔ میں کچھ نہیں بولوں گا۔ آپ پولیس کو جو چاہیں کہانی سنائیں لیکن یہ بات میں ابھی آپ کو بتا دیتا ہوں کہ ان ہاتھوں کے لیے ابھی کوئی ہتھکڑی نہیں بنی۔"

بہادر علی نے محسوس کیا کہ اس نرم گفتار نوجوان کی گرفت لوہے کی طرح مضبوط ہے اور اس کی آنکھیں کسی شیر کی آنکھوں کی طرح سرد اور خوفناک ہیں۔ وہ گھبراہٹ محسوس کرنے لگا۔

"دیکھو برخوردار! رشتے اس طرح طے نہیں ہوا کرتے۔"

"اس معاملے میں میں واقعی اناڑی ہوں۔" محسن نے کہا۔ "آپ میرے بزرگ ہیں، آپ ہی طریقہ بتا دیں۔"

"دراصل بات یہ ہے کہ میں زبان دے چکا ہوں۔"

"کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنی بیٹی سے ضرور پوچھ لیں۔ وہ میرے حق میں فیصلہ کر چکی ہے۔"

بہادر علی نے دل میں کہا "میں ایک موچی اور ڈاکو سے بیٹی بیاہنے کے بجائے اسے قتل کر دینا زیادہ بہتر سمجھوں گا۔"

"میں اپنی بیٹی کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "اس نے آج تک میری نافرمانی نہیں کی، وہ اس شخص کو قبول کرے گی جسے میں پسند کروں گا۔"

بات ختم کرتے ہی وہ رخصت ہو گیا۔

اس کے چند ہفتے بعد اس نے ممتاز کو بیاہ کر رخصت کر دیا۔ محسن نے اس اعتبار سے شرافت کا ثبوت دیا کہ شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔

حوالدار کی زبانی یہ کہانی سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس دوہرے قتل میں محسن رفیق عرف فیکے موچی کا ہاتھ ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شبیر علی کے گھر کود کر جانے والا شخص محسن ہی تھا اور اغلب خیال یہ تھا کہ وہ شبیر علی کے گھر میں مقیم تھا۔ اور وہیں سے منور حسین کے گھر میں گھس جاتا تھا۔

میں نے چند آدمی ساتھ لیے اور شبیر علی کے گھر جا پہنچا۔ دستک کے جواب میں اس دفعہ بھی شبیر علی کی بہن فاطمہ نے دروازہ کھولا۔

"لو جی حد ہو گئی..." اس نے مجھ پر نظر پڑتے ہی کہا۔ "آپ نے ایک ہی دروازہ دیکھ لیا ہے۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ دو چار دن کے بعد آنا۔"

"ہم تمہارے گھر کی تلاشی لینے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس گھر میں ڈاکو چھپے ہوئے ہیں۔ تم اپنی ماں کو لے کے ایک طرف ہو جاؤ۔"

اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ بولی "کسی نے آپ کو وہم ڈال دیا ہے۔ ہمارے گھر میں ڈاکوؤں کا کیا کام؟"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر ڈاکو نہ ملے تو ہم واپس چلے جائیں گے۔ دو چار منٹ کی تو ساری بات ہے۔"

اس نے ہمیں رکنے کے لیے کہا اور دروازہ بھیڑ کر واپس چلی گئی۔ میں نے دو آدمی پچھلی گلی میں اور ایک آدمی منور حسین کے گھر میں متعین کر دیا تھا۔ فاطمہ کے جانے کے دو منٹ بعد میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ سامنے چھوٹا سا کچا صحن تھا۔ آگے تین چار کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں حوالدار کے ہمراہ کمرے کے دروازے کے قریب جا پہنچا۔ اندر سے کسی مرد کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

"فیکے موچی! باہر آ جاؤ۔" حوالدار نے زور سے آواز لگائی۔ "ہم مکان کو گھیرے میں لے چکے ہیں۔ خالی ہاتھ باہر آ جاؤ۔"

لمحہ بھر کے بعد دروازہ کھلا اور ایک تیس بتیس سالہ شخص باہر آیا۔ اس نے دھوتی کے اوپر بنیان پہن رکھی تھی اور خاصے مضبوط جسم کا مالک تھا۔

"کیا بات ہے جناب؟" اس نے برہمی سے کہا۔ "آپ کون سے قانون کے تحت گھر کے اندر گھسے ہیں؟"

"نہلے بھی..." حوالدار نے کہا۔ "بڑی قانون کی باتیں جانتے ہو۔ یہ قانون تمہیں پتا کہ دروازے پر کسی مرد کو جانا چاہیے۔ ہر دفعہ عورت کو دروازے پر بھیج دیتے ہو۔"

میں نے دیکھا اس کا ہاتھ دھوتی کی ڈب کی طرف سرک رہا تھا۔

"یہ ہمارا گھر ہے۔" اس نے کہا۔ "ہماری جائیداد ہے۔ آپ لوگ مہربانی کر کے دروازے سے باہر چلیں۔"

اس کی ڈب خاصی ابھری ہوئی تھی۔ غالباً اس نے وہاں کوئی ہتھیار چھپا رکھا تھا۔ لیکن میں نے اسے ہتھیار نکالنے کا موقع نہیں دیا۔ اور تیزی سے اپنا ریوالور نکال کر اسے نشانے پر رکھ لیا۔ ریوالور دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر شاطرانہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

"مسئلہ کیا ہے جناب عالی؟" اس نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ "یہاں آپ کس کی تلاش میں آئے ہیں؟"

میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "اندر جتنے آدمی ہیں، ان سب کو باہر بلاؤ اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام شبیر علی ہے۔ اندر میری ماں اور بہن کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ ہم شریف لوگ ہیں، یہاں ریوالور کی ضرورت نہیں ہے۔"

"چلو ہمارے ساتھ، ہم تمہارے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ یہاں فیکا موچی نامی ڈاکو رہتا ہے۔"

فیکے موچی کا نام سن کر اس کے چہرے پر لہر سی آ کر چلی گئی۔

ذرا سے توقف کے بعد بولا۔ "میں اس شخص کو نہیں جانتا۔"

ہم نے اسے ساتھ لیا اور پورا مکان دیکھ ڈالا۔ اندر اس کی ماں اور بہن کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ جب تک ہم مکان دیکھتے رہے، دونوں عورتیں ہمیں صلواتیں سناتی رہیں۔ پچھلی طرف متعین سپاہی نے بتایا کہ انھوں نے کسی شخص کو مکان سے نکلتے نہیں دیکھا ہے۔

میں نے شبیر علی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اور اس کی بہن فاطمہ سے کہا۔ "ہم تمہارے بھائی کو اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک محسن رفیق عرف فیکا موچی ہمارے ہاتھ نہیں آ جاتا۔ ہمیں اس بات کی پکی شہادت ملی ہے کہ وہ اسی گھر میں رہتا ہے۔ اس سے کہنا کہ اگر اسے اپنے دوست کی عزت پیاری ہے تو خود ہی حاضر ہو جائے۔"

عورتیں شور مچاتی رہیں۔ مگر ہم شبیر علی کو لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

تھانے پہنچ کر میں نے شبیر علی سے کہا۔ "دیکھو شبیر علی! ہمیں تمہارے دوست فیکے موچی کا پتا چاہیے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم تمہیں باعزت طور پر یہاں سے رخصت کر دیں تو ہمیں فیکے کا اتا پتا بتا دو۔ ورنہ ہم اس دُہرے قتل کے مقدمے میں تمہارا نام بھی لکھ دیں گے۔ تین گواہوں نے قاتل کو دیوار پھاند کر تمہارے گھر میں گھستے دیکھا تھا۔"

"تھانیدار صاحب! واردات والے روز میں گھر میں موجود نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کون ہمارے گھر میں گھسا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ایک طرف سے گھسا ہو اور دوسری طرف سے باہر نکل گیا ہو اور فیکے موچی کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تم کام کیا کرتے ہو؟"

"م... میں ٹھیکیداری کرتا ہوں۔"

"اچھا... تمہاری بہن نے تو کہا تھا کہ تم غلے کا کام کرتے ہو۔"

"غلے کا کام بھی کبھی کبھی کر لیتا ہوں۔"

"غلے کے دو آڑھتیوں کے نام بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "ایسے دو آڑھتیوں کے نام جو تمھیں جانتے ہوں۔"

وہ کوئی نام نہ بتا سکا۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ وہ فیکے موچی کے گروہ کا آدمی ہے اور غالباً اس نے فیکے کے ایما پر ہی وہ مکان خریدا تھا۔ فیکا ممتاز کے قریب رہنا چاہتا تھا۔

شبیر علی خاصا سخت آدمی تھا۔ وہ کوئی بات بتلانے پر تیار نہیں تھا۔ میں نے اس کے بارے میں تفتیش کی تو پتا چلا کہ وہ سزا یافتہ تھا۔ میں نے اسے ایک اے ایس آئی کے حوالے کر دیا اور کہا کہ اس سے فیکے موچی کے بارے میں اور گزشتہ وارداتوں کے بارے میں اگلوانے کی کوشش کرے۔ اے ایس آئی تین چار دن تک محنت کرتا رہا مگر کوئی بات معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

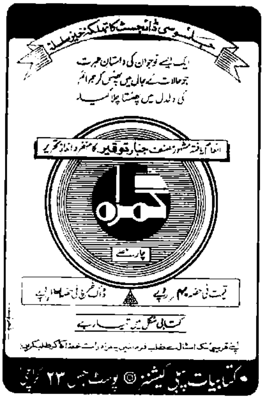
چوتھے یا پانچویں روز دو آدمی اس کی ضمانت کرانے کے لیے تھانے آئے۔ وہ کھاتے پیتے کاروباری آدمی تھے۔ انھوں نے قانونی ذرائع استعمال کرنے کے علاوہ ایک معقول رقم بطور رشوت بھی پیش کی۔ میں نے انھیں شبیر علی کی تھوڑی سی جھلک دکھائی۔ چار دن میں اس کا حلیہ خاصا بگڑ چکا تھا۔ پھر کہا۔ "اگر آپ کو اس شخص سے کوئی ہمدردی ہے تو فیکے موچی کا ٹھکانا مجھے بتا دیں۔ یا اس سے کہیں کہ وہ خود تھانے حاضر ہو جائے۔ میں اسے چھوڑ دوں گا ورنہ اس کے خلاف پرچہ کاٹ دوں گا۔ گواہ ہمارے پاس موجود ہیں۔"

دونوں مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

اس کے تین یا چار روز بعد دو خوش پوش افراد تھانے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک تو وکیل تھا۔ اس نے وکیلوں والا سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا اور بال اس کے جزوی طور پر سفید تھے۔ میں اس کے بارے میں تھوڑا سا جانتا تھا۔ وہ خاصا تجربہ کار کرمنل وکیل تھا۔ اس کا ساتھی ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ اس نے شارک اسکن کا سوٹ اور فلیٹ ہیٹ پہن رکھا تھا۔ دونوں ہیڈ کلرک کی رہنمائی میں میرے کمرے میں داخل ہوئے۔

وکیل نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔ "ملک صاحب! آپ نے شبیر علی نامی ایک بے گناہ شخص کو حوالات میں بند کر رکھا ہے۔ میں اس کا وکیل ہوں اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وکیل صاحب! جس شخص کو آپ بے گناہ قرار دے رہے



کیا وہ سزا یافتہ اور عادی مجرم ہے۔ ہم نے اس کا پچھلا اعمال نامہ منگوا لیا ہے۔ اسے ہم نے عینی گواہوں کے بیانات کی روشنی میں گرفتار کیا ہے۔"

"پولیس کے لیے عینی گواہوں کا حصول کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کیا مجھے اس سے ملنے کی اجازت ہے؟"

میں نے ہیڈ کلرک سے کہا کہ وکیل صاحب کی شبیر علی سے ملاقات کرا دے۔ وکیل نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔

"آپ شبیر علی سے مل آئیں۔" نوجوان نے کہا۔ "میں ملک صاحب سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ہاں، وہ کاغذ مجھے دے دیں۔"

وکیل نے ایک کاغذ نکال کر خوش پوش نوجوان کو دے دیا اور اٹھ کر ہیڈ کلرک کے ہمراہ کمرے سے نکل گیا۔

خوش پوش نوجوان نے دونوں بازو میز پر ٹکا لے اور خفیف سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "خادم کو محسن رفیق کہتے ہیں۔ مجھے پتا چلا تھا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس لیے حاضر ہو گیا ہوں۔"

اس کے چہرے پر بے خوفی پائی جاتی تھی۔

میں نے اس کے رکھ رکھاؤ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "تو ں ں ں... تو تم ہو فیکے ڈاکو؟"

"نو سر... محسن رفیق۔" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے تصحیح کی۔ "میرے میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں یہی نام لکھا تھا۔ میں فیکے ڈاکو کو نہیں جانتا۔"

میں نے گھنٹی بجا کر حوالدار کو اندر بلایا اور کہا۔ "یہ فیکا ڈاکو ہے۔ اسے مہمان خانے میں لے جاؤ۔ ایک رات کی مہمانی کے بعد اس کو اپنا اصل نام یاد آ جائے گا۔"

حوالدار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے سوٹ اور فلیٹ ہیٹ سے خاصا مرعوب ہو گیا تھا۔

"یہ... فیکا ڈاکو ہے جی؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

محسن نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا اور بولا۔ "یہ ضمانت قبل از گرفتاری کا کاغذ ہے۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ غلط فہمی ہو سکتی ہے۔"

وہ پورا بندوبست کر کے تھانے آیا تھا۔ میں نے کہا۔ "برخوردار! ضمانت منسوخ بھی ہو سکتی ہے۔ میرے پاس آدھی درجن سے اوپر گواہ ایسے موجود ہیں جو تمھیں فیکے ڈاکو کی حیثیت سے شناخت کر سکتے ہیں۔"

اس کی خود اعتمادی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ چند لمحوں تک متبسم نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔ "ملک صاحب! فیکا ڈاکو مر چکا ہے۔ محسن رفیق زندہ ہے۔ کیا آپ... محسن رفیق کو مار کر فیکے ڈاکو کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں؟"

وہ بڑی گہری بات کہہ گیا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ "میں فیکے ڈاکو کو زندہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس بدبخت کو گرفتار کرنا چاہتا ہوں جس نے محبت کے نام پر اپنی محسنہ کو قتل کر دیا۔"

"نہیں، وہ قاتل زندہ نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "اسے اس کے جرم کی سزا مل چکی ہے۔"

"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"پہلے میری ایک بات کا جواب دیں۔" اس نے کہا۔ "فرض کریں، ایک شخص ایک مہلک ہتھیار سے، آپ کی نظروں کے سامنے ایک کمزور عورت پر قاتلانہ حملہ کرتا ہے۔ آپ اس عورت کو بچانے کے لیے حملہ آور پر وار کرتے ہیں۔ وہ وار مہلک ثابت ہوتا ہے اور حملہ آور دم توڑ دیتا ہے۔ کیا قانونی نقطۂ نظر سے آپ کا فعل جرم کہلائے گا؟"

"ایسی صورت میں یہ فعل جرم نہیں کہلائے گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس مثال سے تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

"میں آپ کو فیکے ڈاکو کی چھوٹی سی کہانی سنانا چاہتا ہوں، بشرطیکہ آپ مجھے فیکا ڈاکو بنانے کی کوشش نہ کریں۔"

"دھمکی دے رہے ہو؟"

اس نے عاجزانہ انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "آپ کا کالا جناب! دھمکی کیسے دے سکتا ہوں۔ آپ نے فیکے ڈاکو کا نام سنا ہے۔ کبھی اس کو دیکھا نہیں، نہ ہی کبھی وہ پکڑا گیا ہے۔ وہ دوبارہ نہیں پکڑا جائے گا۔ چھ سات سال تو نکال ہی جائے گا۔ ذرا سوچیں! ان چھ سات سالوں میں اس کے ہاتھ سے کتنا نقصان ہو چکا ہوگا۔ اس لیے اسے قبر میں ہی پڑا رہنے دیں۔"

"اور اس نے جو جرم کیے ہیں؟"

"ملک صاحب! اس نے آج تک کسی انسان کو جسمانی نقصان نہیں پہنچایا۔ البتہ لوگوں سے 'ٹیکس' ضرور وصول کیا ہے۔ اور ٹیکس تو آپ بھی وصول کرتے ہیں۔ کئی اور محکموں کے لوگ بھی ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ البتہ وصولی کا طریقہ ہر ایک کا مختلف ہے۔"

"میں تمھاری اپیل پر غور کروں گا۔" میں نے کہا۔ "کہانی سنا۔"

اس نے مختصر الفاظ میں فیکے ڈاکو کی محبت کی کہانی سنائی۔ اس کہانی کی کچھ تفصیل آپ سن چکے ہیں۔ اس نے بتایا کہ وارداتوں کے دوران فیکے کا کئی بار خوبصورت لڑکیوں سے واسطہ پڑ چکا تھا، لیکن ممتاز جیسی ذہین اور دلیر لڑکی اس کی نظر سے کوئی نہیں گزری تھی۔

اس نے ممتاز کی خاطر ڈکیتی ترک کر دی اور اپنے دل میں یہ تہیہ کیا کہ وہ اس لڑکی کو پانے کی خاطر تمام برائیاں ترک کر دے گا۔ اور اس نے ایسا ہی کیا۔

وہ ممتاز کا دل جیتنے میں کامیاب ہو گیا، مگر اس کے باپ کو راضی نہ کر سکا۔ اس نے بتایا کہ وہ دو تین دفعہ ممتاز کے باپ

بہادر علی سے ملا۔ آخری ملاقات میں اس نے بہادر علی کے پیر پکڑ کر اس کی منت سماجت کی، لیکن بہادر علی نے اسے دھتکار دیا۔ اور کہا کہ وہ ایک موچی سے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کر سکتا۔

"چاچا بہادر علی! موچی ذات نہیں، پیشہ ہے۔ انسان صرف اس وقت تک موچی کہلا سکتا ہے، جب وہ موچی کا کام کرتا ہو۔" محسن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں موچی نہیں ہوں۔ ہمارے دادا، پردادا میں سے کوئی موچیوں کا کام کرتا تھا۔ میں پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ عزت سے روزی کما سکتا ہوں۔"

بہادر علی پر اس کی منت سماجت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ فیکا اگر چاہتا تو ڈاکو بن کر بہادر علی کو جھکنے پر مجبور کر سکتا تھا لیکن اس نے ممتاز کی وجہ سے کوئی سخت رویہ اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ محبت سے اسے اپنانا چاہتا تھا۔

ممتاز نے بھی اپنے طور پر بہت کوشش کی، لیکن جب وہ کامیاب نہ ہو سکی تو اس نے محسن سے کہا۔ "محسن! میرا جسم کہیں بھی رہے، میرا دل اور میری روح تمھارے ساتھ رہے گی۔ اس لیے تم میری خاطر خاموشی سے پیچھے ہٹ جاؤ۔"

محسن نے ایسا ہی کیا، لیکن وہ ممتاز کا خیال اپنے دل سے نہ نکال سکا۔ بالآخر اس نے منور حسین کے ساتھ والا گھر خرید لیا۔ اور وہاں اپنے دوست شبیر علی کو آباد کر دیا۔ شروع میں اسے صرف ممتاز کے قرب کی خواہش تھی۔ وہ گاہے بگاہے اس کی ایک جھلک دیکھ لینا چاہتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ اس نے باورچی خانے والی کھڑکی کو ممتاز سے رابطے کا ذریعہ بنا لیا۔ جب ممتاز باورچی خانے میں تنہا ہوتی تو وہ کھڑکی میں پہنچ جاتا اور اس سے باتیں شروع کر دیتا۔ ممتاز نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ وہ موقع پا کر گھر میں گھس آتا تھا، مگر محسن نے اس بات کا اقرار نہیں کیا۔ نہ جانے دونوں میں سے کون جھوٹا تھا؟

وقوعہ والے روز ممتاز باورچی خانے میں ٹھہر کر منظور کا انتظار کر رہی تھی۔ اس موقع پر بیک وقت تین باتیں ہوئیں۔

پہلی بات یہ ہوئی کہ منظور کی جیب کٹ گئی اور اسے وہاں پہنچنے میں تاخیر ہو گئی۔ محسن نے دیوار کے اوپر سے ممتاز کو تاریک باورچی خانے کے دروازے میں کھڑے دیکھ لیا۔ وہ سمجھا کہ ممتاز اس سے ملنے کے لیے وہاں کھڑی ہے۔ یہ دوسری بات تھی۔ اس نے درمیانی کھڑکی پر مخصوص سگنل دیا۔ ممتاز تاریک باورچی خانے میں چلی گئی اور کھڑکی کھول کر محسن سے باتیں کرنے لگی۔ تیسری بات یہ ہوئی کہ اتفاق سے منور حسین کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے جب دیکھا کہ اس کی بیوی بستر پر موجود نہیں ہے تو وہ فکرمند ہوا۔ اور اس کی تلاش میں باہر نکلا۔

جب اس نے باورچی خانے سے اپنی بیوی کو کسی مرد کے ساتھ باتیں کرتے سنا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے اندر سے

چھری نکالی سبے پاؤں باورچی خانے میں پہنچا اور ممتاز پر پے در پے وار کرنا شروع کر دیے۔ محسن تیزی سے دیوار پھاند کر ان کے گھر میں داخل ہوا۔ دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی لکڑیوں میں سے ایک لکڑی اٹھائی اور عقب سے جا کر منور حسین کے سر پر دو وار کیے۔

ممتاز پہلے ہی فرش پر گر چکی تھی، منور حسین اس کے اوپر گر گیا۔ دونوں نے وہیں دم توڑ دیا۔

یہ سب کچھ بہت تیزی سے ہو گیا۔ ممتاز اپنے شوہر کے حملے سے ایسی خوف زدہ ہوئی کہ اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ یہی صورت منور حسین کے ساتھ پیش آئی۔ اُس کے منہ سے بھی کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔

اسی لمحے عقبی دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔ یہ دستک منظور نے دی تھی۔ دستک کی آواز سن کر محسن باورچی خانے کے تاریک گوشے میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد منظور اندر آیا اور لاشوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ محسن نے اچانک خیال کے تحت پکڑو... پکڑو کا شور مچا دیا۔ منظور بدحواس ہو گیا اور سامنے والے دروازے کی طرف بھاگا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ آپ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں۔

محسن نے بات ختم کرنے کے بعد کہا: "ملک صاحب! میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ میں مقتولہ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ جوش کی وجہ سے میں چوٹ کی شدت کا اندازہ نہیں لگا سکا۔ جو کچھ ہوا اُس پر مجھے افسوس ہے۔"

میں نے اسی وقت منظور اور شبیر علی کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا: "تم دونوں آزاد ہو۔ اگر تم لوگوں کی گواہی کی ضرورت پڑی تو بعد میں بلا لیں گے۔"

منظور نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ اچانک مجھے ایک بات یاد آئی۔ میں نے حوالدار کو اس کے پیچھے دوڑایا اور کہا کہ اسے واپس بلائے۔

دو منٹ کے بعد حوالدار اسے بازو سے پکڑ کر کمرے میں لے آیا۔ وہ بے چارہ ایک بار پھر حواس باختہ نظر آنے لگا۔

میں نے محسن سے کہا: "اپنا بٹوا نکالو اور اس نوجوان کو پچاس روپے دے دو۔ اس نے تمہاری وجہ سے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔"

محسن نے بلا تامل پچاس روپے نکال کر منظور کی طرف بڑھائے۔ منظور متذبذب نظر آنے لگا۔

"رکھ لو۔" میں نے کہا: "بغیر ٹکٹ سفر کرو گے تو پکڑے جاؤ گے۔"

اس نے پیسے لے لیے اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

"ہمیں بھی اجازت دیں۔" محسن کے وکیل نے کہا: "اب ہمارا یہاں کیا کام...؟"

محسن نے کہا: "میرا خیال ہے کہ قتل کیس کے سلسلے میں ملک صاحب کو ہماری گواہی کی ضرورت ہو گی۔"

میرے اختیار میں دونوں باتیں تھیں۔ میں اسے ملزم بھی بنا سکتا تھا اور گواہ بھی۔ لیکن اغلب یہی تھا کہ اس کا بیان درست تھا۔ کم از کم اس حد تک ضرور درست تھا کہ اس نے ممتاز کو قتل نہیں کیا تھا۔ لاشوں کی پوزیشن بھی یہی ظاہر کرتی تھی کہ ممتاز کو اس کے شوہر نے قتل کیا تھا، لیکن محسن کا یہ بیان کردہ کھڑکی کی دوسری جانب سے ممتاز کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، مشکوک معلوم ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ باورچی خانے کے اندر موجود رہا ہو اور منور حسین کی آہٹ پا کر دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا ہو۔ اس کی یہ بات بھی درست معلوم ہوتی تھی کہ اس نے ممتاز کو بچانے کے لیے منور حسین پر وار کیے تھے۔ ان شواہد کی روشنی میں اس پر قتل کا کیس نہیں بنتا تھا۔

"تو تم اس کیس میں گواہ بننا چاہتے ہو؟" میں نے طویل توقف کے بعد کہا: "ملزم نہیں بنو گے۔"

"اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے۔" اس نے کہا: "میں نے تو فقط مشورہ دیا ہے۔ گواہی کی صورت میں میں اپنے اور ممتاز کے گزشتہ تعلقات کا ذکر کرنا پسند نہیں کروں گا۔ میرا بیان صرف یہ ہو گا کہ میں ایک عورت کی چیخیں سن کر گھر میں گھسا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک مردِ خنجر سے عورت پر وار کر رہا ہے۔ میں اس شخص کو اس فعل سے روکنا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے قریب پڑی ہوئی لکڑی اٹھا کر اس کے سر پر وار کر دیا۔"

"اور حقیقت بھی یہی ہے۔" وکیل نے کہا: "میرے مؤکل نے ارادۂ قتل سے نہیں، ایک مظلوم عورت کی مدد کی نیت سے لکڑی گھمائی تھی۔ آپ جیسا چاہیں کیس بنا لیں۔ عدالت بہرحال میرے مؤکل کو بری کر دے گی۔"

مجھے یاد آیا کہ ممتاز نے اپنے خط میں محسن کا اچھے لفظوں میں ذکر نہیں کیا تھا۔ حالانکہ محسن کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ برضا و رغبت اس سے ملتی تھی۔ واضح طور پر وہ اس سے ملتی بھی تھی اور اپنے شوہر سے ڈرتی بھی تھی۔ غالباً منور حسین کو ان کی ملاقاتوں کے بارے میں شک ہو گیا تھا اور اس نے ممتاز کو سخت الفاظ میں وارننگ بھی دی تھی۔ ورنہ زیور اور نقدی میکے بھجوانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

میں چاہتا تو محسن رفیق عرف فیکے ڈاکو کو قتل کے ملزم کی حیثیت سے عدالت میں پیش کر سکتا تھا، لیکن چونکہ وہ اپنے جرائم سے تائب ہو چکا تھا اور باعزت زندگی گزارنا چاہتا تھا، اس لیے میں نے اسے گواہ بنانا ہی مناسب سمجھا۔

انتقام

اُس مردِ متکبر کی کہانی جسے یتیموں کی آہوں نے جلا کر راکھ کر ڈالا

ایک صبح ایک اے ایس آئی کا دس گیارہ سالہ لڑکا کسی کام سے تھانے آیا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے باپ نے ایک نوجوان کو الٹا لٹکا رکھا ہے اور اس پر مختلف طریقوں سے تشدد کر رہا ہے۔ لڑکے نے کھڑکی سے یہ منظر دیکھا۔ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا، پھر خاموشی سے واپس چلا گیا۔ باپ کو اس کے آنے کا پتا چلا نہ جانے کا۔

شام کے وقت اے ایس آئی نے مجھے بتایا کہ اُس کا بیٹا گھر سے بھاگ گیا ہے اور وہ اُس کی تلاش میں سرگودھا جا رہا ہے۔ سرگودھا میں لڑکے کا ننھیال تھا اور اے ایس آئی کو پتا چلا تھا کہ وہ وہیں گیا تھا۔

میرے استفسار پر اے ایس آئی نے بتایا کہ صبح اُس کا بیٹا پرویز تھانے آیا تھا اور اُس سے ملے بغیر واپس چلا گیا تھا۔ گھر پہنچ کر اُس نے ماں سے کہا: "ماں، میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔"

ماں نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا اور پوچھا: "کیا بات ہے؟ تو اس گھر میں کیوں نہیں رہے گا؟ تیرے ابا نے تجھے



معاملہ ہے؟"

پرویز نے نفی میں سر ہلایا، بولا: "مجھے تو نہیں معلوم، پر ابا اچھا آدمی نہیں ہے۔ میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔"

ماں فکرمند ہوئی، پوچھا: "کچھ پتا تو چلے کہ ہوا کیا ہے؟"

"ابا بہت ظالم ہے۔" پرویز نے کہا: "اور ایسا ظالم میرا باپ نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک آدمی کو الٹا لٹکا کر مار رہا تھا۔" اس نے رونا شروع کر دیا۔ "بہت بری طرح مار رہا تھا۔ وہ آدمی چیخیں مار رہا تھا، پر ابا کو ذرا رحم نہیں آیا۔ میں نانا کے گھر جا رہا ہوں۔"

ماں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا: "اُس آدمی نے ضرور کوئی بہت بڑا جرم کیا ہوگا۔ اپنے ابا کو گھر آ لینے دو، میں اُن سے ضرور یہ بات پوچھوں گی۔ اگر اُس آدمی کا قصور ثابت نہ ہوا تو میں بھی اُن سے بات نہیں کروں گی۔" اس نے بیٹے کے آنسو پونچھے، منہ دھویا اور کچھ دیر بعد سودا لینے بازار بھیج دیا۔ اس کے بعد لڑکا واپس نہیں آیا۔

اے ایس آئی بہت غصے میں تھا، کہنے لگا.......

"ایک دفعہ تو میں اسے سیدھا کر دوں گا۔ اس عمر میں اُسے اتنی بڑی بڑی باتیں آ گئی ہیں، بڑا ہو کر کیا کرے گا؟"

"لڑکا حساس معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا: "اُسے غلط فہمی ہو گئی ہے۔ تم اپنے سسر کے نام پرچی لکھ دو، میں کسی آدمی کو بھیج کر لڑکے کو بلوا لیتا ہوں۔"

اے ایس آئی خود ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اُسے سختی سے روک دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جاتے ہی بیچارے لڑکے کی پٹائی کرے گا، پھر کوئی دوسری بات کرے گا۔

میں نے ایک حوالدار کو سرگودھا بھیج دیا۔ جاتے ہی صبح لڑکے کو لے کر واپس پہنچ گیا۔

ایک بات بتا دوں کہ پرویز نے اپنے باپ کو جس شخص پر تشدد کرتے دیکھا تھا اُس کا نام یونس تھا۔ اُس نے ایک چھ سالہ لڑکی کے کانوں سے بالیاں اُتار کر اُسے قتل کر دیا تھا بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اُس نے بالیاں نوچ لی تھیں۔ لڑکی کے دونوں کان پھٹے ہوئے تھے اور اُن پر خون جما ہوا تھا۔ یہ بات بعد میں معلوم ہوئی تھی۔ ملزم بالیاں بیچتا ہوا پکڑا گیا تھا۔ سنار نے جب بالیوں کا باریکی سے معائنہ کیا تو اُسے ایک بالی پر معمولی سا خون لگا ہوا دکھائی دیا۔ اس بات سے اُسے شک ہوا۔ اُس نے ملزم کو باتوں میں لگائے رکھا اور ایک آدمی کو ہمارے پاس بھیج دیا۔

اس سے چار دن قبل ایک چھ سالہ بچی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی گئی تھی۔ ہم نے ملزم کو شک کی بنا پر گرفتار کر لیا اور لڑکی کے گھر والوں کو بالیاں دکھائیں۔ انھوں نے فوراً بالیاں پہچان لیں۔ وہ انھی کی بچی کی بالیاں تھیں۔ ملزم بالیوں کے بارے میں کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ وہ بار بار بیان بدلتا تھا ہر بار اُس کا بیان جھوٹا ثابت ہوتا تھا۔ اُس کے بیانات سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اُس نے لڑکی کو قتل کر کے لاش کہیں گاڑ دی تھی۔ جب مجھے اُس کے مجرم ہونے کا پورا یقین ہو گیا تو میں نے اُسے اے ایس آئی کے سپرد کر دیا۔ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اُس نے لڑکی کی لاش کہاں دفن کی تھی۔

میں نے اے ایس آئی کے بیٹے پرویز کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ وہ گھر سے کیوں بھاگا تھا؟

"میرا ابا بہت ظالم ہے۔" اُس نے جواب دیا: "میں اُس کے پاس نہیں رہوں گا۔"

میں نے پوچھا: "تمھاری کوئی چھوٹی بہن ہے؟"

"دو ہیں۔" اُس نے جواب دیا، پھر ہاتھ سے اشارہ کر کے اُن کے قد بتائے: "ایک اتنی سی ہے اور ایک اتنی ہے۔"

اے ایس آئی نے بتایا کہ ایک دو سال کی اور دوسری پانچ سال کی ہے۔

پرویز نے میرے سوال کے جواب میں کہا کہ اُس کی پانچ سالہ بہن کے کان میں سونے کی بالیاں ہیں۔

"بیٹے، ایک بات تو بتاؤ۔" میں نے کہا: "اگر کوئی بدمعاش تمھاری بہن کی بالیاں نوچ لے، جس سے اُس کے کان زخمی ہو جائیں تو تم کیا کرو گے؟"

اُس نے بڑے جوش سے جواب دیا: "میں اُس کو مار کر سور بنا دوں گا۔"

"اور اگر وہ بدمعاش تمھاری بہن کا گلا گھونٹ کر اُس کی لاش جنگل میں پھینک دے تو پھر تم کیا کرو گے؟"

"میں تو اُس کا خون پی جاؤں گا۔ اُس کو جان سے مار دوں گا۔"

میں نے کہا: "بیٹے، کل تمھارا ابا جس بدمعاش کو مار رہا تھا، اُس نے ایک چھ سالہ لڑکی کے کانوں سے بالیاں نوچ کر اُسے قتل کر دیا ہے اور اب یہ نہیں بتا رہا ہے کہ لڑکی کی لاش اُس نے کہاں چھپائی ہے۔ ہم اُس سے یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

یہ سن کر لڑکے کا غصہ جاتا رہا اور اُس نے اپنے باپ سے معافی مانگ لی۔

چند روز کے بعد یونس نے اقبالِ جرم کر لیا اور ہم نے اس کی نشاندہی پر لڑکی کی لاش برآمد کر لی۔

جب قاتل کو پھانسی دی جاتی ہے تو وہ نہایت بے بس اور مظلوم نظر آتا ہے۔ اُس وقت اچھے بھلے آدمی کو اُس پر ترس آ جاتا ہے، کیوں کہ اُس وقت صرف تصویر کا ایک رُخ نظر آتا ہے۔ اُس کے جرائم نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔

یہ تو قانون کی سزا کا ذکر تھا۔ قدرت کی سزا اس سے بھی سخت ہوتی ہے۔ ان سزاؤں کو دیکھ کر بعض لوگ ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں اور بعض کے ہارٹ فیل ہو جاتے ہیں۔

انھی دنوں کی بات ہے کہ ایک حویلی میں آگ لگ گئی۔ وہ گرمیوں کا موسم اور دوپہر کا وقت تھا۔ اُس وقت اہلِ خانہ آرام کر رہے تھے۔ حویلی کی تعمیر میں لکڑی زیادہ استعمال کی گئی تھی۔ چھت کی کڑیاں، دیواری الماریاں، کھڑکیاں، دروازے اور دو چھجے وغیرہ سب لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ چارپائیاں، بستر اور فرنیچر سمیت بے شمار چیزیں ایسی تھیں جو آگ پکڑنے والی تھیں۔

جس وقت آگ لگی اُس وقت حویلی کے اندر درجن بھر کے قریب افراد تھے۔ اُن میں صاحبِ خانہ چودھری غلام قادر، اُس کی بیوی کلثوم بیگم، اُن کے دو بیٹے، جمال اور فرید اور ایک بیٹی رضیہ شامل تھی۔ ان کے علاوہ دو تین ملازم بھی تھے۔

چودھری غلام قادر ایک دولت مند اور بااثر شخص تھا۔ ایسے لوگوں کے کئی دشمن بھی ہوتے ہیں۔

آگ کا احوال بیان کرنے سے پہلے میں چودھری کا پس منظر آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

آگ کے واقعے سے دو مہینے قبل ایک صبح ایک بوڑھی عورت تھانے میں آئی۔ اُس نے روایتی انداز میں مجھے دعائیں دیں اور کہا۔ "تھانیدار جی، میں ایک چھوٹی سی عرض لے کر تمھارے پاس آئی ہوں۔"

اُس کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے سادہ مگر صاف ستھرا لباس پہن رکھا تھا۔ چہرے مہرے سے وہ سمجھدار اور جہاندیدہ عورت نظر آتی تھی۔ اُس کی گفتگو میں بھی شائستگی جھلکتی تھی۔

میں نے اُسے کرسی پر بٹھایا اور کام پوچھا۔

اس نے اپنا نام سارج بی بی اور اپنے مرحوم شوہر کا نام چودھری فضل حسین بتایا۔

"میرے شوہر کو فوت ہوئے اٹھارہ سال ہو چکے ہیں۔" اس نے مزید کہا: "وفات سے پہلے اُس پر چودھری غلام قادر کی کچھ رقم واجب الادا تھی۔ اس قرض کے عوض ہم نے اپنی تین مربعے زمین چودھری کے پاس رہن رکھی تھی۔ فضل حسین کی وفات کے بعد ہمارے مالی حالات ٹھیک نہیں رہے لیکن میں نے قرضے کی قسطیں ادا کرنے میں سستی نہیں کی۔ پورے اٹھارہ سال سے قسطیں ادا کر رہی ہوں لیکن چودھری نے وہ ساری رقم سود کے حساب میں لگا لی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اصل رقم میں سے ابھی تک ایک دھیلہ بھی ادا نہیں ہوا۔ میں انصاف کی تلاش میں تمھارے پاس آئی ہوں۔ میں قرضہ ادا کرتے کرتے بوڑھی ہو گئی ہوں۔ میری زمین مجھے واپس دلاؤ، میں ساری عمر تمھیں دعائیں دوں گی۔"

وہ کچھ کاغذات وغیرہ بھی ساتھ لائی تھی۔ میں نے سرسری انداز میں اُن کا معائنہ کیا۔ یہ بات بالکل صحیح تھی کہ وہ اٹھارہ سال سے قسطیں ادا کر رہی تھی لیکن اُن کاغذات سے یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ اصل رقم کتنی تھی اور اس کا کیا حساب تھا۔

"بی بی، ان کاغذات سے تو کچھ پتا نہیں چلتا۔" میں نے کہا: "قرضے کے کاغذات کس کے پاس ہیں؟"

"یہی تو سارا مسئلہ ہے۔ قرضے کے کاغذات چودھری کے پاس ہیں۔ ہمیں نہیں دکھاتا۔ دس ہزار روپے اور مانگتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ رقم ادا کر دو تو زمین واپس مل جائے گی۔ اٹھارہ سال پہلے اس نے مجھے چھ ہزار روپے قرضہ بتایا تھا۔ اتنا کچھ دینے کے بعد اب بھی دس ہزار اور مانگتا ہے۔ اگر یہ بات مجھے پہلے معلوم ہوتی تو میں اپنی زمین ہی چھوڑ دیتی۔"

"بی بی، تم یہ مانتی ہو کہ تمھارے شوہر نے چودھری سے قرضہ لیا تھا، یہ بھی مانتی ہو کہ یہ قرضہ سود پر لیا تھا۔ اب سود کا حساب یہ ہے کہ اگر صرف سود ادا کیا جائے اور اصل رقم میں سے کچھ بھی ادا نہ کیا جائے تو سود کا حساب ساری عمر ختم نہیں ہو سکتا اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ دیوانی کیس ہے، ہم اس میں ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔"



"میں چودھری پر مقدمہ نہیں کرنا چاہتی۔" سراج بی بی نے کہا۔ "میں تو صرف اس لیے تمھارے پاس آئی ہوں کہ تم چودھری کو سمجھا بجھا کر ہماری زمین واپس دلا دو۔ میں نے ایک پڑھے لکھے آدمی سے ان رسیدوں کا حساب لگوایا تھا۔ میں بیس ہزار سے اوپر رقم ادا کر چکی ہوں۔ کُل رقم چھ ہزار تھی۔ چودھری سے کہو کہ خدا سے ڈرے اور یتیموں کا مال واپس کر دے۔ خدا کے کلام میں لکھا ہے کہ یتیموں کا مال کھانے والا اپنے پیٹ میں آگ ڈالتا ہے۔ میرے دو بچے میرے شوہر کی وفات کے وقت دونوں بہت چھوٹے سے تھے۔ میں نے بڑی مشقت سے انھیں پالا ہے۔ اگر چودھری ان کا حق نہیں دے گا تو یہ آگ اُسے جلا ڈالے گی۔"

"تمھاری زمین کے کاغذات کس کے پاس ہیں؟"

"وہ بھی چودھری کے پاس ہیں۔"

"تمھارے پاس تو پھر کچھ بھی نہ ہوا۔" میں نے کہا۔ "بہرحال تم اطمینان رکھو میں چودھری سے بات کروں گا۔ تم دو چار دن کے بعد آنا۔ دیکھیں چودھری کیا کہتا ہے۔"

وہ دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

چودھری غلام قادر کے بارے میں جو رپورٹ مجھے ملی تھی وہ اچھی نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا جاگیردار سمجھتا تھا اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ چوں کہ معاملہ ایک بیوہ عورت اور یتیم بچوں کا تھا، اس لیے میں اُس سے ملنے چلا گیا۔ میں نے سوچا، شاید وہ میرے کہنے پر بیوہ کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے پر تیار ہو جائے۔

ایک ملازم نے مجھے کشادہ بیٹھک میں بٹھایا اور اندر خبر کرنے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد چودھری جھومتا جھامتا بیٹھک میں داخل ہوا۔ اُس نے سفید قمیص اور سفید ہی دھوتی باندھ رکھی تھی، جس کے دونوں طرف نکلے ہوئے لڑ نمایاں نظر آ رہے تھے۔ اُس نے کندھے پر رنگین پٹکا ڈال رکھا تھا۔ مونچھیں خاصی گھنی تھیں۔ قد چھ فٹ سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ اور عمر ستر سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔

اُس نے پُرجوش انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور گہری نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا: "ملک صاحب، آج ہماری حویلی کا راستہ کیسے بھول گئے؟"

"میں اِدھر سے گزر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ آپ کو سلام کرتا چلوں۔"

"بڑی نوازش ہے آپ کی۔ کیا پئیں گے؟"

"تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

اُس نے بھی زیادہ زور نہیں دیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر میں نے کہا: "چودھری صاحب، چند روز پہلے ایک بیوہ عورت میرے پاس آئی تھی۔"

"کون سی بیوہ عورت؟" اُس نے آنکھیں پھیلائیں۔ "اس بستی میں بیوہ عورتیں بہت ہو گئی ہیں۔"

"اُس نے اپنے شوہر کا نام چودھری فضل حسین بتایا۔"

اتنے میں ایک پینتیس چھتیس سالہ شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے بھی گھنی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں اور خاصا قوی الجثہ شخص تھا۔ چودھری نے اُسے مخاطب کر کے کہا: "پتر جمال، ملک صاحب کی بات سنی تم نے؟ یہ کہتے ہیں فضل حسین بھی چودھری تھا... اوہی... وہی سراج بی بی کا بندہ۔"

نووارد اُس کا بیٹا جمال قادر تھا۔ اُس نے مجھے سلام کیا، صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا: "فضل حسین زندگی میں تو چودھری نہیں تھا۔ مرنے کے بعد چودھری بن گیا ہو تو پتا نہیں۔ اُس کی بیوہ لوگوں کے برتن مانجھ کر گزارہ کرتی ہے۔"

میں نے اُن کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا: "چودھری صاحب... میں نے سنا ہے کہ سراج بی بی کی زمین آپ کے پاس گروی رکھی ہوئی ہے؟"

جمال قادر نے پوچھا: "کیا اُس نے ہمارے خلاف کوئی پرچہ کٹوا دیا ہے؟"

"پرچہ وغیرہ تو نہیں کٹوایا، ویسے ہی میرے پاس آئی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ وہ اٹھارہ سال سے قسطیں ادا کر رہی ہے۔"

"ملک صاحب، آدمی اُدھار لیتا ہے تو قسطیں بھی پڑتی ہیں۔" چودھری نے کہا۔ "یہ ہماری شرافت ہے کہ ہم نے اپنا پیسہ وصول کرنے کے لیے کبھی سختی سے کام نہیں لیا۔"

"آپ نے زمین کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"پتا نہیں آپ کس زمین کی بات کر رہے ہیں۔ زمین کا کتاب تو پٹواری کے پاس ہوتا ہے۔"

میں جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ "آپ سچ کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے پٹواری کے پاس جانا چاہیے تھا۔ آپ کو خواہ مخواہ تکلیف دی۔"

اُسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ پٹواری کا ذکر کر کے اُس نے مجھے راستہ دکھا دیا تھا۔

"ملک صاحب، آپ تو ناراض ہو گئے۔" اُس نے اُٹھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آپ بیٹھیں تو سہی۔"

"چودھری صاحب، بات یہ ہے کہ میری سراج بی بی سے کوئی رشتے داری نہیں ہے۔ وہ میرے پاس ایک مسئلے کو لے کر آئی

تھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اُس کی بات میں جھوٹ کتنا ہے اور سچ کتنا ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔"

"ملک صاحب، آپ وردی میں ہمارے گھر آئے ہیں۔" جمال قادر نے کہا۔ "اس لیے ہم یہی سمجھے کہ آپ تھانیدار کی حیثیت سے ہمارے پاس آئے ہیں۔ اگر آپ کہتے ہیں کہ آپ ذاتی حیثیت میں یہاں آئے ہیں تو ہم آپ کی بات مان لیتے ہیں۔ اور جس مسئلے کے سلسلے میں آپ آئے ہیں اُس کے بارے میں اتنا ہی بتانا کافی ہے کہ وہ قابلِ دست اندازیٔ پولیس نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ سراج بی بی نے ہم سے سود پر قرضہ لیا تھا۔ جواب اُسے بھاری معلوم ہو رہا ہے لیکن قرضہ تو قرضہ ہی ہوتا ہے۔ وہ تو اُسے ادا کرنا ہی پڑے گا۔ اگر اُسے اس معاملے میں کوئی سہولت چاہیے تو بڑی خوشی سے ہمارے پاس آ جائے۔ ہم ہمدردی سے اُس کی بات سنیں گے اور جو کچھ ہم سے ہو سکے گا وہ ضرور کریں گے۔"

بڑے چودھری نے قدرے سوچتے ہوئے کہا: "میں تو اس عورت کا پردہ رکھتا رہا ہوں، مگر معلوم ہوتا ہے اُسے اپنا پردہ منظور نہیں ہے۔ قصہ یہ ہے کہ اس کا آدمی جسے یہ اب چودھری کہتی ہے، بہت بڑا جعل ساز تھا۔ اس نے ایک بیوہ عورت کی جو اس کی رشتے دار تھی، چھ مربعے زمین جعلی کاغذات کے ذریعے ہمارے پاس فروخت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن [illegible] ہمیں اس کی جعلسازی کا علم ہو گیا اور ہم نے زمین خریدنے سے انکار کر دیا۔

بعد میں معاملہ پولیس تک پہنچ گیا۔ پولیس نے فضل حسین اور اس کے دو ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ ہم بیعانہ دے چکے تھے۔ فضل حسین نے اپنی بیوی کو میرے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ فی الحال وہ ہمارا بیعانہ واپس نہیں کر سکتا۔ سراج بی بی نے میرے پیر پکڑ لیے۔ کہنے لگی: "چودھری صاحب، آپ کے پیسے میں واپس کر دوں گی۔ آپ مجھ سے پکا کاغذ لکھوا لیں، مگر میرے آدمی کے خلاف عدالت [illegible] بہت افسوس ہے۔ مجھے [illegible] عزت کا خیال کرتے ہوئے [illegible] کے خلاف گواہی نہیں دی لیکن پھر بھی اُسے سات [illegible] ہو گئی۔ جو رقم اُس نے بطور بیعانہ مجھ سے لی تھی وہ تھانے [illegible] بلکہ سراج بی بی نے ہم سے کچھ اور قرضہ بھی لیا [illegible] فضل حسین کا جیل میں انتقال ہو گیا۔ اس کا ایک [illegible] جمیل حسین اُس کا نام تھا، اُس کا بھی آوارہ لوگوں میں [illegible] تھا۔ فضل حسین کی موت کے ایک سال بعد وہ اپنے کسی ساتھی کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اب یہ بیوہ عورت رہ گئی ہے، ہماری اس کے ساتھ ر[illegible]

کچھ بھی دیں تو فضل حسین کے علاوہ ہمارا کوئی کھانے والا [illegible]

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر بات پکی ہونی چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ [illegible] کے بعد فضل حسین رقم دینے سے انکار کر دے۔"

یاد رکھیں مجھ سے کاغذ لکھوا لیں۔"

[illegible] لکھوانے سے کیا ہوتا ہے۔ کاغذ کے ساتھ ایک بار بھی نہیں کیا تھا [illegible] بات پر زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا اور واپس آ گیا۔

تین چار روز بعد سراج بی بی میرے پاس آئی تو میں نے اُسے چودھری غلام قادر کے ساتھ ہونے والی بات چیت کے بارے میں بتایا۔ وہ یہ بات سن کر تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئی۔ پھر اُس نے اپنے شوہر کی جعل سازی اور چودھری کے [illegible] کے بارے میں ایک نئی کہانی سنائی۔

"تھانیدار جی، میری بات میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔" اُس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "اس بستی میں ابھی بھی اس واقعے کے کئی گواہ موجود ہیں۔ سب سے بڑا گواہ محمد حسین پٹواری ہے۔ اس کے علاوہ ماسٹر محمد طفیل جنجوعہ اور رحمت علی صراف بھی ابھی زندہ ہیں۔ تم ان لوگوں سے بے شک پوچھ لو۔ اگر میری بات غلط ہو تو جو چاہے سزا دینا۔"

محمد حسین پٹواری ریٹائر ہو چکا تھا اور کبھی کبھار مجھ سے ملتا رہتا تھا۔ وہ خاصا بوڑھا آدمی تھا اور دل میں خوفِ خدا رکھتا تھا۔ ایک روز میں نے اُس سے سراج بی بی اور چودھری غلام قادر کے تنازعے کا ذکر کیا۔ چوں کہ وہ اُن دنوں پٹواری تھا اس لیے اُس نے تفصیل سے ساری بات بتائی۔ اُس کے بیان سے سراج بی بی کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی۔

اس کے علاوہ میں نے چند اور بوڑھے لوگوں سے بھی بات چیت کی۔ ان سب لوگوں کے بیانات سے جو کہانی سامنے آئی وہ میں اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

اس کہانی کی ابتدا دوسری جنگِ عظیم سے پہلے ہوئی تھی۔ وہ انیس سو چھتیس اور سینتیس کا زمانہ تھا۔

[illegible] کی دو پارٹیوں میں لڑائی کے نتیجے میں فریقین [illegible] مارے گئے۔ ایک فریق کے تین آدمی کام آئے۔ ان [illegible] کے بعد خاندان میں ایک بھی مرد باقی نہیں [illegible] خاندان کی بوڑھی بیوی زندہ بچی۔ اُس کے دو [illegible] ہنگامے میں ہلاک ہو گئے۔ اس عورت کا نام [illegible]

"تمہیں چوہدری پر مقدمہ نہیں کرنا۔ لل ہوگئی اُسے ڈر تھا کہا: "میں تو صرف اس لیے تمھارے پاس آئی ہوں کو سمجھا بُجھا کر ہماری زمین واپس دلا دو۔ میں نے ایک پڑھے آدمی سے ان رسیدوں کا حساب لگوایا تھا۔ میں بیس ہزار سے اوپر رقم ادا کر چکی ہوں۔ کُل رقم چھ ہزار تھی۔ چوہدری سے کہو کہ خدا سے ڈرے جو مُسکین اور یتیموں کا مال واپس کر دے۔ خدا کے کلام میں ہے کہ یتیم کا مال کھانے والا اپنے پیٹ میں آگ ڈالتا ہے۔"

شوہر کی وفات کے وقت بے سہارا دیکھ کر چوہدری غلام قادر نے اُس سے تعلقات بڑھانا شروع کر دیے لیکن درحقیقت اس کی نظر حرمت بیگم کی زمینوں پر تھی۔ ایک آدھ سال میں اُس نے اُس کی زمینوں کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں کر لیا۔ وفادار ملازموں کی چھٹی کر دی اور اُن کی جگہ پر اپنے مطلب کے آدمی رکھ لیے۔

سراج بی بی کا شوہر فضل حسین ایک ہوشیار آدمی تھا اور محکمۂ مال میں ملازم تھا۔ اُس نے ملازمت کے دوران چند مربعے زمین بھی خرید لی تھی۔ اس کا چوہدری غلام قادر کے ساتھ خاصا میل ملاپ تھا۔

ایک روز چوہدری غلام قادر نے اُسے کھانے پر بلایا اور کھانے کے بعد کہا: "فضل حسین، ہمارا ایک چھوٹا سا کام اٹکا ہوا ہے۔ آپ کوشش کریں تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" فضل حسین نے کہا: "آپ کا کام ہو اور اٹک جائے۔ حکم کریں، کیا کام ہے؟"

"زمین کے انتقال کا معاملہ ہے۔" چوہدری نے تامل کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے زمین تو ہمارے ہی قبضے میں ہے میں چاہتا ہوں کہ کاغذات بھی ہمارے نام ہو جائیں۔"

فضل حسین ہولے ہولے سر ہلانے لگا، بولا: "غالباً آپ حرمت بیگم کی زمین کی بات کر رہے ہیں۔"

"آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔ ہمیں اُسی زمین کے کاغذات کی نقول چاہئیں۔"

"جعلی خریداری؟"

چوہدری نے اثبات میں سر ہلایا، بولا: "یہی بات ہے ویسے ہم حرمت بی بی کو کچھ نہ کچھ دیتے رہیں گے۔ آٹھ دس سال تک اُس کا اس جعلسازی کی طرف دھیان نہیں جائے گا۔ وہ بوڑھی عورت ہے جلد ہی اللہ کو پیاری ہو جائے گی۔"

"آپ کا کام ہو جائے گا۔" فضل حسین سوچتے ہوئے بولا۔ "تھوڑا سا کام ہے ہو جائے گا۔ زمین کتنی ہے؟"

"زیادہ نہیں ہے۔ پانچ چھ مربعے ہو گی۔" چوہدری نے کہا۔ "کام زیادہ نہیں ہے۔ آپ کو ایک ہزار روپے مل جائیں گے لیکن یہ بات راز میں رہنی چاہیے۔"

"چوہدری صاحب، کاغذات تو میں کل ہی آپ کو بھیج سکتا ہوں لیکن صرف کاغذات سے آپ کا کام نہیں بنے گا۔ آپ کو دس جگہ جانا پڑے گا اور ہر جگہ پیسے خرچ کرنا پڑیں گے۔ میں آپ کا سارا کام کروا دیتا ہوں۔ انتقال کے مکمل کاغذات آپ کو بغیر کسی محنت کے مل جائیں گے۔"

"یہ ہو جائے تو پھر کیا ہی بات ہے۔ کُل کتنی رقم خرچ ہو جائے گی؟"

"میں آپ سے دو ہزار روپے فی مربع لوں گا۔"

وہ نہری زمین تھی اور خاصی زرخیز تھی۔ چوہدری نے فضل حسین کو دس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا اور نصف رقم پیشگی ادا کر دی۔

فضل حسین نے چند روز کے اندر کاغذات تیار کروا لیے جعلی دستخط ہو گئے، مُہریں لگ گئیں، ضروری اندراجات ہو گئے لیکن آخری موقع پر اس جعلسازی کا پول کھل گیا۔

پولیس نے فضل حسین اور اُس کے دو ساتھیوں کو گرفتار کر لیا نیز جعلی کاغذات اپنے قبضے میں کر لیے۔

چوہدری فوراً تھانے پہنچا اور فضل حسین سے علیحدگی میں کہا: "فضل حسین، گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ میں آپ کو بڑے آرام سے بری کروا لوں گا لیکن اس کیس میں میرا ذکر نہیں آنا چاہیے۔"

"آپ کا ذکر تو ضرور آئے گا۔" فضل حسین نے کہا: "کیونکہ کاغذات آپ ہی کے نام بنائے گئے تھے۔"

"میرا یہ مطلب ہے کہ جعلسازی کے ضمن میں میرا ذکر نہیں آنا چاہیے۔ آپ کے بیان میں یہ اقرار ہونا چاہیے کہ میں جعلسازی میں شامل نہیں تھا۔ آپ پر جعلسازی کا الزام تو آ ہی چکا ہے میرے اس الزام میں شامل ہونے سے کیس کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں اس الزام سے باہر رہ کر آپ کی زیادہ مدد کر سکتا ہوں۔"

"لیکن آپ اپنے آپ کو اس الزام سے کیسے بری ثابت کریں گے؟ مجھے تو کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔"

"میں وکیل سے مل کر کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوں گا۔"

"میں ایک شرط پر سارا الزام اپنے سر لے سکتا ہوں۔" فضل حسین نے کہا: "اگر کیس میرے خلاف ہو گیا تو آپ اُس رقم کا مطالبہ نہیں کریں گے جو میں آپ سے پیشگی وصول کر چکا ہوں۔"

"رقم کی فکر مت کرو۔ دولت آنی جانی شے ہے۔"

فضل حسین چوہدری کی باتوں میں آ گیا اور اُس کی مرضی کے مطابق بیان دے دیا۔

اس بیان سے چوہدری نہ صرف قانون کی گرفت سے بچ گیا بلکہ اس سے اُسے حرمت بیگم کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کا جواز بھی مل گیا۔

اُس نے حرمت بیگم کے سامنے اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہا: "مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ شخص آستین کا سانپ ثابت ہو گا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ آپ کی زمینوں کا انتظام میرے ہاتھ میں ہے تو اس نے اپنی سرکاری حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کی زمین کے کاغذات نکلوائے اور میرے نام خریداری کے جعلی کاغذات تیار کروا کے میرے پاس پہنچ گیا۔ کہنے لگا دس ہزار روپے دے دیں اور زمین کے مالک بن جائیں۔ اگر میں اس شخص کو لعن طعن کر کے بھگا دیتا تو پھر یہ کسی اور سے سودے بازی کرنے کی کوشش کرتا۔ لہٰذا میں بظاہر خریدار بن گیا اور ثبوت ہاتھ میں آنے کے بعد اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔"

بوڑھی حرمت بیگم نے کہا: "چوہدری صاحب، اللہ آپ کو اس نیک کام کا اجر دے گا۔ شوہر اور جوان بیٹوں کی موت کے بعد میں زمین کے جھگڑوں سے دور ہی رہنا چاہتی ہوں۔ اگر ہماری آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ ہوتا تو میں یہ زمین فوراً فروخت کر دیتی۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔" چوہدری نے کہا: "ہمارے ہوتے ہوئے کوئی شخص آپ کی زمین پر بُری نظر نہیں ڈال سکتا۔"

حرمت بی بی کو مطمئن کرنے کے بعد وہ فضل حسین کی بیوی سراج بی بی کے پاس پہنچا اور اُسے پانچ ہزار روپے کی وہ رسید دکھائی جو اُس نے فضل حسین سے حاصل کی تھی۔

سراج بی بی کو یہ بات معلوم تھی کہ اُس کا شوہر رشوت بھی لیتا تھا اور کبھی کبھار جعلسازی بھی کر لیتا تھا۔

چوہدری نے کیس کی تفصیل بتانے کے بعد کہا: "پولیس یہ چاہتی ہے کہ میں تمھارے شوہر کے خلاف بیان دوں، لیکن ابھی تک میں نے کوئی بیان نہیں دیا۔ یہ رسید تمھارے شوہر کے جرم کا پکا ثبوت ہے۔ اگر میں نے یہ رسید عدالت میں پیش کر دی اور اس کے خلاف بیان دے دیا تو وہ سزا سے نہیں بچ سکے گا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ بری ہو جائے۔"

"چوہدری صاحب، آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔" سراج بی بی نے کہا: "آپ کسی طرح اُسے سزا سے بچا لیں۔"

"میں تو یہی چاہتا ہوں۔" چوہدری نے چالاکی سے کہا: "لیکن فضل حسین میری بات نہیں مانتا۔ وہ میرے خلاف بیان دینے پر تُلا ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ میں یہ پانچ ہزار روپے اُسے معاف کر دوں ورنہ وہ مجھے بھی اپنے جرم میں شامل کر لے گا۔ میں اسی مسئلے کے سلسلے میں تمھارے پاس آیا ہوں۔"

سراج بی بی کا بیان چوہدری کی توقع کے عین مطابق تھا۔ اُس نے کہا: "چوہدری صاحب، آپ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ آپ کا قرضہ میں ادا کروں گی۔ فضل حسین کے علاوہ ہمارا کوئی کمانے والا نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر بات پکی ہونی چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ بری ہونے کے بعد فضل حسین رقم دینے سے انکار کر دے۔"

"آپ مجھ سے کاغذ لکھوا لیں۔"

"خالی کاغذ لکھوانے سے کیا ہوتا ہے۔ کاغذ کے ساتھ کوئی ضمانت بھی ہونی چاہیے۔"

سراج بی بی نے پریشانی سے پوچھا: "کیسی ضمانت؟"

چوہدری نے سوچنے کی اداکاری کی حالانکہ ساری بات اُس نے پہلے ہی سوچ رکھی تھی، بولا: "میں نے سُنا ہے کہ فضل حسین کے پاس تین مربعے بنجر زمین پڑی ہے۔ میں تمھاری وہ زمین پانچ ہزار روپے کے عوض رہن رکھ سکتا ہوں۔ اگر تم اس پر راضی ہو تو میں پکا کاغذ تیار کروا لیتا ہوں۔ لیکن یہ کام آج ہی ہو جانا چاہیے۔"

سراج بی بی سخت پریشان تھی۔ وہ زمین رہن رکھنے پر تیار ہو گئی۔

شام کے وقت چوہدری پکا کاغذ لے کر سراج بی بی کے پاس پہنچ گیا۔ اُس کے ساتھ اُس کا وکیل اور دو گواہ بھی تھے ایک گواہ فضل حسین کا چھوٹا بھائی تجمل حسین تھا۔

اُس نے چالاکی یہ کی کہ فضل حسین کے چھوٹے بھائی کو بھی ہمدردی کا فریب دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ پٹواری نے بتایا کہ تجمل حسین لالچی آدمی تھا۔ چوہدری نے اُسے کچھ پیسے بھی دیے تھے۔ اسٹامپ پیپر پر دستخط ہو گئے۔ اور سراج بی بی نے زمین کے کاغذات چوہدری کے حوالے کر دیے تو اُس کے وکیل نے قرضے کی شرائط پڑھ کر سنائیں۔ اُن شرائط میں سے ایک شرط سود کی تھی اور رقم چھ ہزار روپے لکھی گئی تھی۔

سراج بی بی نے اس پر اعتراض کیا: "چوہدری صاحب، آپ نے سود کا ذکر تو نہیں کیا تھا۔ اور رقم بھی آپ نے زیادہ لکھی ہے۔"

"رقم کی بات یہ ہے کہ مجھے تمھارے شوہر کی رہائی کے لیے بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی۔ وکیل... پولیس... کچہری... ان سب جگہوں پر پیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور جہاں تک سود کا تعلق ہے تو یہ کاروباری بات ہے۔ اگر میں یہی رقم کسی کاروبار میں لگاؤں گا تو مجھے اس معمولی سود سے زیادہ فائدہ ہو گا۔ ویسے میں تمھیں چھ مہینے کی چھوٹ دے سکتا ہوں۔ اگر تم چھ مہینے تک قرض ادا کر دو تو میں کوئی سود نہیں لوں گا۔ آگے جو تمھاری مرضی، چاہو تو اپنے کاغذات واپس لے لو۔"

سراج بی بی نے اپنے دیور تجمل حسین سے مشورہ کیا۔ وہ

تو چودھری سے پیسے کھائے بیٹھا تھا۔ اُس نے بھاوج کو وہی مشورہ دیا جو چودھری کے مفاد میں جاتا تھا۔

سراج بی بی کو مجبوراً ساری شرائط ماننا پڑیں۔

رخصت ہونے سے پہلے چودھری نے سراج بی بی اور تجمل حسین سے علیحدگی میں کہا: "اس لکھت پڑھت کا کسی اور کو نہیں پتا چلنا چاہیے۔ اگر فضل حسین تک یہ بات پہنچ گئی تو وہ غصے میں اپنا کیس خراب کر لے گا۔"

دونوں نے رازداری کا وعدہ کیا اور چودھری اپنی کامیابی پر خوش خوش وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں نے اکثر یہ دیکھا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے دنیا کی فراخی عطا کی ہے اُن میں سے بعض غریبوں پر ظلم کر کے ایک خاص لذت محسوس کرتے ہیں اور اس بات کی بالکل پروا نہیں کرتے کہ اس کائنات کا محتسبِ اعلیٰ ایک دن اُن کے عملوں پر انھیں پکڑنے والا ہے۔

اپنے قرضے کی وصولی کا پکا انتظام کرنے کے بعد چودھری غلام قادر نے عدالت میں جو بیان دیا وہ سراسر فضل حسین کے خلاف تھا۔ اُس نے عدالت کو بتایا کہ فضل حسین حرمت بی بی کے نمائندے کی حیثیت سے اُس کے پاس آیا تھا۔ اُسے اُس کی جعلسازی کا بعد میں علم ہوا تھا۔

جیسا کہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں، فضل حسین کو جعلسازی کے جرم میں سات سال کی سزا ہو گئی اور سزا کے پانچ سال بعد اُس کا جیل میں انتقال ہو گیا۔

اُس کی وفات کے بعد اُس کے چھوٹے بھائی تجمل حسین نے چودھری سے بھائی کی زمین کی واپسی کا مطالبہ شروع کر دیا لیکن چودھری کی نیت خراب تھی۔ وہ زمین واپس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تجمل حسین کے بارے میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ خاصا سخت مزاج آدمی تھا اور کچھ جرائم پیشہ لوگوں سے اُس کے تعلقات بھی تھے۔ اُس نے چودھری سے کہا کہ وہ اُس کے قرضے کی آدھی رقم پہلے ادا کرے گا اور آدھی زمین کا قبضہ ملنے کے بعد۔

غالباً وہ زمین فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس ضمن میں اُس نے اپنی بھابی کو بھی راضی کر لیا تھا لیکن نیت اُس کی بھی اچھی نہیں تھی۔ اُس نے ادھر اُدھر سے دباؤ ڈال کر چودھری کو زمین واپس کرنے پر راضی کر لیا تھا۔ مگر چند ہفتوں کے بعد کسی نے اُسے بے خبری میں وار کر کے ہلاک کر دیا۔

دیور کی موت کے بعد سراج بی بی نے خود کو بالکل بے سہارا محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اُس وقت اُس کے صرف دو بچے تھے، ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ جب فضل حسین کو سزا ہوئی تو اُن کی عمر علی الترتیب تیرہ اور نو سال تھی۔ لڑکا چھوٹا تھا۔

❀❀

یہ تھا وہ پس منظر جو میں آپ کو بتلانا چاہتا تھا۔ جب غلام قادر نے سراج بی بی کی زمین کے بارے میں بات کرنے سے انکار کر دیا تو میں نے سراج بی بی کو مشورہ دیا کہ وہ تحصیل دار دفتر سے اپنی زمین کے بارے میں پتا کرے اور کوشش کرے زمین کے کاغذات کی نقول حاصل کر لے۔ ایسا نہ ہو کہ چودھری کاغذات کے ذریعے زمین اپنے نام کروا لے۔

اس کے چند روز بعد سراج بی بی میرے پاس آئی اور کہ چودھری کا اُس کے پاس آیا تھا۔

"وہ چاہتا ہے کہ میں زمین اُس کے ہاتھ فروخت کر دوں" اُس نے مزید کہا۔ "اُس کا کہنا ہے کہ اُس نے محنت کر کے کو قابلِ کاشت بنایا ہے اس لیے وہ زمین واپس نہیں کرے گا۔ پندرہ بیس سال پہلے وہ زمین بنجر پڑی تھی۔ لیکن ان دنوں نئی نہر کی کھدائی سے وہ زمین زرخیز ہو گئی تھی اور اُس کی قیمت میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔

میرے استفسار پر سراج بی بی نے بتایا کہ چودھری نے اُسے دس ہزار روپے کی پیش کش کی ہے، یعنی قرضہ ختم ہو جائے گا اور دس ہزار نقد مل جائیں گے۔

لیکن سراج بی بی زمین چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ وہ اور اُس کی اولاد سترہ اٹھارہ سال سے زمین کی واگزاری کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ انھیں توقع تھی کہ زمین حاصل ہونے کے بعد اُن کے بھی دن پھر جائیں گے۔

سراج بی بی نے مجھے پُرنم آنکھوں سے بتایا کہ اُس کا تیرہ چودہ سال کی عمر سے کام کر رہا تھا۔ اُس کی بیٹی سلائی کڑھائی کا کام کرتی تھی۔ وہ خود بھی اٹھارہ سال سے محنت مشقت کر رہی تھی اور ان کی آمدنی میں سے آدھا حصہ زمیندار کی جیب میں چلا جاتا تھا، صرف اس امید پر کہ ایک دن اُن کی زمین واپس مل جائے گی اور اُن کے گھر میں بھی خوش حالی آ جائے گی لیکن چودھری زمین واپس کرنے پر تیار نہیں تھا۔

اس قسم کے حالات دیکھ کر بڑا دُکھ ہوتا ہے۔ وہ کیسا انسان تھا جو اٹھارہ سال سے ایک بیوہ اور دو یتیموں کی نصف آمدنی کھا رہا تھا اور اب اُن کی زمین واپس کرنے پر نہیں تھا۔

میں بحیثیت تھانیدار کچھ نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ وہ دیوانی کیس تھا۔ اگر معاملہ عدالت میں جاتا تو اُس میں یقیناً برسوں لگ جاتے اور حاصل پھر بھی کچھ نہ ہوتا۔

میں نے علاقے کے دو معتبر آدمیوں سے کہا کہ وہ اس بیوہ کی مدد کریں اور اُس کی زمین واپس دلانے کی کوشش کریں۔ اگر چودھری وہ زمین خریدنا چاہتا ہے تو اُسے چاہیے کہ وہ موجودہ قیمت لگائے۔

وہ دونوں معتبرین ناکام واپس آ گئے۔ چودھری نے نہ صرف زمین کے معاملے میں تعاون کرنے سے انکار کر دیا، بلکہ میرے بارے میں دھمکی آمیز کلمات بھی کہے۔ اُس نے کہا: "ملک صفدر حیات سے کہہ دینا کہ ہمارے معاملے میں دخل اندازی نہ کرے ورنہ میں اسے لائن حاضر کروا دوں گا۔ آئی جی تک پہنچ ہے میری۔"

اس کے دو تین روز بعد وہ تھانے پہنچا اور بغیر کسی تمہید کے بولا: "ملک صاحب! میں ایک شخص کے خلاف پرچہ کٹوانا چاہتا ہوں۔ اُس نے مجھے قتل کی دھمکی دی ہے۔"

میں نے پوچھا: "اُس شخص کا نام پتا کیا ہے؟ میں اُسے ابھی تھانے بلوا لیتا ہوں۔"

اُس کا خیال تھا کہ میں اُس کی بات سن کر رپورٹ لکھنے میں پس و پیش کروں گا۔ میرے جواب سے اُس کے چہرے کی سختی جاتی رہی۔ وہ میری میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا، اور بولا: "اُس کا نام اشرف ہے۔"

میں نے فوراً حوالدار کو اپنے کمرے میں بلایا، چودھری غلام قادر سے اشرف کا پتا پوچھ کر اُسے نوٹ کرایا اور کہا: "ایک آدمی اپنے ساتھ لے جاؤ اور اس شخص کو پکڑ کر تھانے لے آؤ۔"

حوالدار کے جانے کے بعد میں نے چودھری کے لیے بوتل منگوائی اور ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ سراج بی بی کی زمین کا ذکر نہ اُس نے کیا نہ میں نے۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد حوالدار ایک دُبلے پتلے نوجوان کو ساتھ لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ نوجوان کی عمر بیس ستائیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ وہ اُن مسکین لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جن کی ساری زندگی... چودھریوں کی چاکری میں گزر جاتی ہے، اور وہ اپنے رویے کی وجہ سے پیدائشی خدمت گار معلوم ہوتے ہیں۔

وہ کچھ خوف زدہ سا کمرے میں داخل ہوا۔ جب اُس کی نظر چودھری پر پڑی تو وہ قدرے جھکا، کندھے تھوڑے سے اونچے کیے اور عاجزانہ انداز میں دونوں ہاتھ سلام کے لیے بڑھائے لیکن چودھری نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

"اِدھر بات کرو۔" اُس نے میری طرف اشارہ کیا: "تمھیں تھانیدار صاحب نے بلایا ہے۔"

نوجوان نے مجھے جھک کر سلام کیا اور ادب سے میرے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ میرا تجربہ کہہ رہا تھا کہ وہ نوجوان کوشش کر کے بھی کسی کو دھمکی نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے پوچھا: "کیا نام ہے تمھارا؟"

"جی، میرا نام اشرف حسین ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"کیا کام کرتے ہو؟"

"جی خراد کا کام کرتا ہوں، لاہور کے ایک کارخانے میں۔"

"ان کو، چودھری صاحب کو جانتے ہو؟"

"جی، بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان سے ہمارے بڑے پرانے تعلقات ہیں۔ میں چھوٹا سا تھا جب یہ پہلی دفعہ ہمارے گھر آئے تھے، پر آج انھوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا۔"

"اوئے، زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" چودھری نے اُسے ڈانٹا: "ملک صاحب جو سوال کرتے ہیں اُتنا ہی جواب دو۔"

"بہت اچھا چودھری صاحب۔" اُس نے پہلی دفعہ سپاٹ لہجے میں کہا: "مجھے آپ کیا ڈانٹتے ہیں، میں تو ویسے ہی آپ کا نوکر ہوں، حکم کا بندہ ہوں۔"

"اشرف حسین، کیا تم نے چودھری صاحب کو قتل کی دھمکی دی ہے؟"

"میں نے... قتل کی دھمکی!" اُس نے حیرانی سے کہا۔ "نہیں جناب، ہرگز نہیں... ایسا کیسے ہو سکتا ہے، چودھری صاحب میرے بزرگ ہیں، میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔"

میں نے چودھری سے پوچھا: "یہ کون ہے؟ کیا اس سے آپ کا کوئی تنازعہ چل رہا ہے؟"

"ملک صاحب، یہ اُسی بڑھیا کا بیٹا ہے، جو روز آپ کے پاس آنسو بہانے آ جاتی ہے، وہی سراج بی بی..."

"اچھا، اچھا، یہ بات ہے۔" میں نے کہا: "ان لوگوں نے اپنی زمین آپ کے پاس گروی رکھی ہوئی ہے۔"

"وہ ایک الگ مسئلہ ہے۔"

"یہ دھمکی اس نے کس سلسلے میں دی ہے؟"

"جناب، میں نے کوئی دھمکی نہیں دی۔"

"تم ذرا صبر کرو۔" میں نے چودھری کو سنانے کے لیے سخت لہجے میں کہا: "میں چودھری صاحب سے بات کر رہا ہوں۔"

چودھری ذرا خوش ہوا، وہ سمجھا کہ میں اُس سے دب کر بات کر رہا ہوں، بولا: "ملک صاحب، یہ اَن پڑھ اور جاہل آدمی ہے۔ اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ میں اس کے باپ کے لیے کیا کچھ کر چکا ہوں۔ اس نے مجھے کیوں دھمکی دی ہے، اس کی وجہ تو یہی جانتے لیکن میرے پاس گواہ موجود ہیں۔ آپ اس کے خلاف

پرچہ کاٹیں اور ضروری کارروائی کریں۔ دھمکی کی وجہ خود بخود سامنے آجائے گی۔"

اشرف حسین پریشانی کے عالم میں کبھی میری طرف دیکھتا تھا اور کبھی چودھری کی طرف۔

میں نے ہیڈ کلرک کو بلایا اور کہا کہ وہ چودھری صاحب کی رپورٹ روزنامچے میں درج کر لے۔ میں نے چودھری کے ساتھ ہمدردانہ رویّہ برقرار رکھا اور رپورٹ میں رہن شدہ زمین اور قرضے کا ذکر بھی کر دیا۔ میں یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتا تھا کہ سراج بی بی نے اپنی تین مربعے زمین چھ ہزار روپے میں چودھری غلام قادر کے پاس رہن رکھی تھی اور اٹھارہ سال گزرنے کے باوجود قرضہ ادا نہیں کر پائی تھی، اُس کے بیٹے اشرف حسین کے دل میں اس وجہ سے رنجش پائی جاتی تھی اور اُس نے چودھری کو قتل کی دھمکی دی تھی۔

رپورٹ درج ہو گئی اور چودھری نے اُس پر دستخط بھی کر دیے۔ اگلے روز میں نے چودھری کے بتائے ہوئے گواہوں کے بیانات بھی لے لیے اور اُن سے بھی یہ بات کہلوائی کہ سارا جھگڑا مرہونہ زمین کی وجہ سے تھا۔

اشرف حسین کو میں نے کچھ دیر تھانے میں بٹھائے رکھا اور پھر یہ سمجھا کر گھر بھیج دیا کہ وہ ایک دو روز گھر سے باہر نہ نکلے۔

تیسرے روز میں نے سراج بی بی کو تھانے بلایا اور اُس کی طرف سے چودھری غلام قادر کے خلاف خیانتِ مجرمانہ کا پرچہ کٹوا دیا۔ اُس رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا۔

چودھری غلام قادر نے اٹھارہ سال قبل چھ ہزار روپے کے عوض سراج بی بی کی تین مربعے زمین رہن رکھی تھی۔ مُدعا علیہ یعنی چودھری نے مُدعیہ کے ناخواندہ ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رسید میں سود کی شرط بھی شامل کر دی تھی۔ مُدعیہ اصل رقم سے کہیں زیادہ رقم ادا کر چکی تھی۔ رہن اور قرضے کے معاہدے کے مطابق چودھری کو زمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن چودھری معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مُدعیہ کی زمین کو گزشتہ اٹھارہ سال سے استعمال کر رہا تھا۔ مُدعیہ نے درخواست کی تھی کہ مُدعا علیہ سے نہ صرف اُس کی زمین واپس دلائی جائے بلکہ اٹھارہ سال کی پیداوار کا کم از کم نصف حصّہ بھی دلایا جائے۔

یہ رپورٹ درج کرنے کے بعد میں نے ایک تُند مزاج.... اے ایس آئی کو تفتیش کے لیے بھیج دیا اور اُس کو سمجھا دیا کہ وہ چودھری کے ساتھ ہرگز کوئی نرمی نہ کرے۔

چند گھنٹوں کے بعد اے ایس آئی واپس آ گیا اور بتایا کہ چودھری نے اُسے لمبی چوڑی رشوت کی پیشکش کی تھی۔

میں نے پوچھا "تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے رشوت لینے سے صاف انکار کر دیا۔" اُس نے مجھے بتایا "یہ سُن کر اُس نے مجھے دھمکیاں دینے کی کوشش کی۔ اس پر میں نے بھی سختی سے بات کی اور کہا کہ یہ معاملہ ہمارے ہاتھ میں نہیں رہا۔ ہمیں اوپر سے ہدایت ملی ہے کہ بیوہ کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ چودھری آپ سے بات کرنے آئے گا۔"

اُس کا خیال صحیح نکلا۔ شام کے وقت چودھری چند آدمیوں کے ہمراہ تھانے پہنچ گیا۔ میں نے اُسے کچھ دیر باہر بٹھائے رکھا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ میرے ماتحتوں کے ساتھ الجھنے لگا تب میں نے اُسے اندر بلا لیا۔ اُس کے ساتھیوں کو باہر ہی بٹھائے رکھا۔

"ملک صاحب! یہ کیا اندھیر نگری مچی ہوئی ہے۔" اُس نے آتے ہی کہا "آپ کے نیچے والے تو آپ سے بھی دو ہاتھ آگے جا رہے ہیں۔ میں ایک گھنٹے سے باہر بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ اتنا انتظار تو مجھے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں بھی نہیں کرنا پڑتا۔"

"میں ذرا مصروف تھا۔" میں نے خشک لہجے میں کہا "اس وقت گورنر بھی آتا تو اُسے انتظار کرنا پڑتا۔ حکم کریں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"صبح آپ کا ایک اے ایس آئی ہمارے پاس آیا تھا، بڑا شور مچا رہا تھا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ اُس مائی نے ہمارے خلاف کوئی پرچہ کٹوایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ وہ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو؟"

"چودھری صاحب، یہ تھانہ ہے۔" میں نے کہا "ہم ہر شخص کی فریاد سننے کے پابند ہیں۔ ہمیں بھی جواب دینا پڑتا ہے۔"

"آپ کا اے ایس آئی کہہ رہا تھا کہ اس معاملے میں آپ کو اوپر سے حکم ملا ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

"ہم آپ کو اندر کی باتیں نہیں بتا سکتے، نہ ہی ہم کسی کو اوپر جانے سے روک سکتے ہیں۔ آپ اپنا جواب داخل کر دیں۔ ہم اپنی تفتیش مکمل کر کے کیس عدالت میں پیش کر دیں گے۔"

اُس نے کچھ دیر سوچا پھر بولا "ایک کام کریں۔ میں نے اشرف کے خلاف جو رپورٹ درج کرائی ہے اُسے ختم کر دیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "وہ رپورٹ ختم نہیں ہو سکتی کیونکہ اُس کی نقل ایس پی کے دفتر میں جا چکی ہے۔"

"چھوڑیں ملک صاحب، آپ چاہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے اور خرچے ورچے کی فکر نہ کریں۔ ہم نے پیسہ خرچ کرنے میں کبھی

...ں سے کام نہیں لیا۔ حکم کریں، کیا چاہیے آپ کو؟"

"نہیں، اس کیس میں سودے بازی نہیں ہو سکتی۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ اوپر والوں سے ڈرتے ہیں۔ اچھا ...ک کام اور کریں۔ مائی کو یہاں بلا لیں اور ہمارا راضی نامہ کرا دیں۔"

"یہ بات آپ کی معقول ہے۔" میں نے کہا "صلح صفائی بہت ...چھی چیز ہے۔ میں آدمی بھیج کر سراج بی بی کو بلوا لیتا ہوں۔"

میں نے ایک حوالدار کو بلایا اور کہا "سراج بی بی اور اُس کے ...اشرف کو بلا لاؤ۔ انھیں ساتھ ہی لے آنا۔"

حوالدار کے جانے کے بعد چودھری نے کہا "ملک صاحب ...اصل تفصیل تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ اگر آپ تھوڑی سی کوشش ...کریں گے تو یہ معاملہ جلدی حل ہو جائے گا۔"

"میں کوشش کرنے کے لیے ہی اس کرسی پر بیٹھا ہوں۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔" چودھری نے کہا "اصل ...جھگڑا زمین کا ہے۔ میں یہ زمین کسی صورت میں نہیں چھوڑنا چاہتا ...ہم نے اس زمین پر بڑی محنت کی ہے۔ اسے کاشت کے قابل بنایا ہے۔ ...ایک بات اور بھی ہے، ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ایک کمی خاندان ...ہمارے مقابلے پر کھڑا ہو جائے۔ زمیندار اور چودھری کہلوانے لگے۔ ...ملک صاحب، اس بات پر تو ہم لوگ سر کٹوا لیا کرتے ہیں... ...کاٹ لیتے ہیں۔"

"چودھری صاحب، راضی نامہ دو طرفہ ہوتا ہے۔" میں نے ...کہا "صرف ایک فریق کی شرطوں پر راضی نامہ نہیں ہوا کرتا۔ ویسے میں ...سراج بی بی کو سمجھاؤں گا کہ وہ زمین فروخت کرنے پر راضی ہو جائے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" اُس نے کہا "اگر وہ اس بات پر راضی نہیں ہوگی تو نقصان اٹھائے گی۔"

اُس کی ہر بات میں دھمکی کا پہلو غالب تھا۔

تھوڑی دیر بعد سراج بی بی حوالدار کے ہمراہ تھانے ...پہنچ گئی۔ اُس کے ساتھ اُس کے بیٹے اشرف کے علاوہ محمد حسین ...پٹواری بھی تھا۔ چودھری نے پٹواری کو دیکھ کر تیوری چڑھائی اور پوچھا ..."آپ کس سلسلے میں یہاں آئے ہیں؟"

"میں سراج بی بی کے کہنے پر آیا ہوں۔" بوڑھے پٹواری نے ...جس کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی "دو صلح کرنے والوں کے درمیان ...گواہ ہونا بہت ضروری ہے، چودھری صاحب! آپ کوئی فکر نہ کریں ...میں کوئی ناانصافی کی بات نہیں کروں گا۔"

"محمد حسین، یہاں انصاف یا ناانصافی کا نہیں خاندانی ...عزت کا مسئلہ ہے۔ خیر آپ آ ہی گئے ہیں تو بیٹھیں لیکن ایک بات ...خیال رکھیں، میں اپنے معاملے میں کسی کی بے جا دخل اندازی پسند ...نہیں کرتا۔" پھر وہ سراج بی بی کی طرف متوجہ ہوا "ہاں تو مائی، میں نے ملک صاحب کے ساتھ ساری بات کر لی ہے۔ تم بولو، کیا چاہتی ہو؟"

چودھری کے طرزِ تخاطب سے اشرف کا چہرہ سُرخ ہو گیا، بولا "چودھری صاحب، ہم لوگ غریب ضرور ہیں، لیکن رذیل نہیں ہیں۔ میری ماں آپ سے عمر میں بہت چھوٹی ہیں، آپ انھیں مائی کہہ کر مخاطب نہ کریں۔"

"اوئے تم کون سے لاٹ صاحب کے پتر ہو۔" چودھری نے غصّے سے کہا "تم سے تو ہمارے نوکر چاکر ہی زیادہ اچھے ہیں۔ ہم اپنے مقابلے پر کھڑے ہونے والوں کے سر اُتار دیا کرتے ہیں، تم ہو کیا چیز! تجھے یاد نہیں رہا کہ تیرا باپ ایک عادی مجرم تھا۔ رشوت خور اور جعلساز، جس کی موت جیل کے اندر واقع ہوئی تھی۔ کہتا ہے کہ ہم رذیل نہیں ہیں! ہونہہ..."

اشرف نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اُس کی ماں نے اُسے روک دیا، بولی "کوئی بات نہیں بیٹا، ہر بات کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا۔ ہم چودھری کے مقابلے پر نہیں کھڑے ہو سکتے۔ چودھری صاحب، مجھے صرف اپنا حق چاہیے، اور کچھ نہیں چاہیے۔"

چودھری نے حقارت سے کہا "اگر حق کی بات ہے تو پھر تمھارا کچھ بھی نہیں ہے۔ تمھاری زمین اٹھارہ سال پہلے ہماری ہو گئی تھی۔ تم نے چھ مہینے کے وعدے پر قرضہ لیا تھا۔ اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اگر مقررہ مدت کے اندر قرضہ واپس نہ کیا جائے تو رہن شدہ چیز ضبط ہو جاتی ہے۔ لیکن میں تمھارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میں تمھیں بالمقطع دس ہزار روپے دینے پر تیار ہوں۔ اگر ملک صاحب کہیں گے تو تھوڑا بہت اضافہ کر دوں گا۔ اس سے زیادہ مجھ سے کوئی امید نہ رکھو۔"

اُس زمانے میں زیرِ بحث زمین کی قیمت بیس سے پچیس ہزار روپے فی مربع تھی یعنی تین مربع کی قیمت ساٹھ ستّر ہزار کے لگ بھگ تھی۔

"چودھری صاحب، میں اس طرح زمین فروخت نہیں کروں گی۔ پہلے مجھے زمین کا قبضہ ملنا چاہیے۔ اُس کے بعد فروخت کی بات ہوگی۔ اور خریداری کا پہلا حق آپ کا ہوگا۔"

"زمین کو بھول جاؤ سراج بی بی۔"

"میں نے پوچھا "چودھری صاحب، قرضے کی اصل رقم کتنی ہے؟"

"چھوڑیں جی، اصل رقم کا اب کیا ذکر۔" چودھری نے ٹالنے والے انداز میں کہا "وہ تو بات ہی ختم ہو چکی ہے۔"

"وہ بات کیسے ختم ہو چکی ہے؟" اشرف نے کہا۔

"اگر وہ بات ختم ہو گئی تھی تو اب تک آپ ہم سے قسطیں

کیوں وصول کرتے رہے ہیں؟"

"او کاکا، توں اپنی بوتھی بند رکھ۔"

"کیوں جی، میں کیوں اپنی بوتھی بند رکھوں۔ میں اپنی بارہ تیرہ سال کی محنت کی کمائی آپ کی جھولی میں ڈالتا رہا ہوں۔ آپ مجھے بولنے سے نہیں روک سکتے۔ میں نے کوئی ناجائز بات نہیں کی۔"

محمد حسین پٹواری نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "چودھری صاحب، ٹھنڈے دل سے بات چیت کر کے کوئی سمجھوتا کر لیں۔ غصے سے بات نہیں بنا کرتی۔"

میں نے کہا: "چودھری صاحب، پہلے یہ بات ہو جانی چاہیے کہ تنازعے کی بنیاد کیا ہے۔ اُس کے بعد ہی بات آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔ اس لیے پہلے آپ قرضے کی رقم بتائیں، پھر یہ بتائیں کہ کل کتنی رقم باقی ہے؟"

"قرضے کی کل رقم پانچ ہزار تھی۔" سراج بی بی نے کہا۔

"پانچ نہیں چھ ہزار۔" چودھری نے فوراً کہا۔

"کاغذ میں تو چھ ہزار ہی لکھی ہے۔" سراج بی بی نے کہا۔ "مگر اصل رقم پانچ ہزار تھی۔ آپ نے ایک ہزار روپے میرے آدمی کے مقدمے پر خرچ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اُلٹا اُس کے خلاف بیان دے کر اُسے سزا کروا دی۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا، سزا کروا دی؟" چودھری نے جاننا چاہا۔ "سزا دینا عدالت کا کام ہے۔ میں نے وہی بیان دیا تھا جو مجھے دینا چاہیے تھا۔ اور جعلسازی کرنے والوں کو عدالت سزا ہی دیا کرتی ہے۔"

"اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اُسی رقم کو تسلیم کریں گے جو رسید میں لکھی ہوئی ہے۔ کیوں جی چودھری صاحب، ٹھیک ہے؟"

"جی ہاں، بالکل ٹھیک ہے۔"

"سراج بی بی، اب تم یہ بتاؤ کہ تم کتنی رقم ادا کر چکی ہو؟"

"اللہ آپ کا بھلا کرے، بیس ہزار سے زیادہ دے چکی ہوں۔" سراج بی بی نے جواب دیا۔ "میرے پاس چودھری صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی رسیدیں موجود ہیں۔"

"بیس ہزار روپے!" پٹواری نے حیرانی سے کہا۔ "اور ابھی تک قرضہ ادا نہیں ہوا؟"

"محمد حسین، اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔" چودھری نے کہا۔ "قرضہ سود پر لیا گیا تھا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "چودھری صاحب، آپ یہ بتائیں کہ اس وقت کتنا قرضہ باقی ہے؟"

"ملک صاحب، میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مسئلہ قرضے کا نہیں زمین کا ہے۔ ہم نے اس زمین پر بہت محنت کی ہے۔"

"میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" میں ... "اُس طرف آنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ ایک واضح ... ہمارے سامنے آ جائے۔"

چودھری تامل کرتے ہوئے بولا: "میرے حساب سے تو ... دس ہزار روپے اور نکلتے ہیں۔"

اشرف نے کہا: "یہ تو سخت زیادتی ہے۔"

"تم ذرا خاموش رہو۔" میں نے اشرف سے کہا پھر چ... کی طرف متوجہ ہوا۔ "چودھری صاحب، بات آگے بڑھانے سے پہلے میں قرضے کی رسید دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"رسید دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟" اُس نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ ہر چیز ریکارڈ میں آ جائے۔ آپ ... کریں کہ کل کسی وقت یہاں تشریف لے آئیں۔"

"ملک صاحب، اس جھگڑے کو آج ہی ختم کریں۔ میں آدمی بھیج کر ابھی رسید منگوا لیتا ہوں۔"

وہ اُٹھ کر باہر گیا اور اپنے کسی آدمی کو رسید لانے کے لیے حویلی بھیج دیا۔ وہ شخص پندرہ بیس منٹ میں واپس آ گیا۔

اُس تحریر کے مطابق سراج بی بی نے چودھری غلام قا... سے چھ ہزار روپے بطور قرضہ، بیس فی صد سالانہ سود پر لیا تھا۔ اپنی تین مربعے زمین اس قرضے کے عوض رہن رکھی تھی۔

تحریر میں رقم کی واپسی کی کوئی مدت مقرر نہیں کی گئی تھی۔ ... کے بارے میں یہ وضاحت نہیں تھی کہ وہ سود در سود تھا۔ لہٰذا ... کی رُو سے وہ سادہ سود تھا۔ ایسی بھی کوئی شرط نہیں تھی کہ چود... زمین کو استعمال کر سکتا تھا اور اُس کی ساری آمدنی خود رکھ سکتا تھا۔

میں نے محمد حسین پٹواری سے سود کا حساب نکالنے کے لیے کہا۔ اُس نے ایک منٹ میں حساب سامنے رکھ دیا۔

"بیس فی صد سالانہ کے حساب سے چھ ہزار روپے پر اٹھا... سال کا سود اکیس ہزار چھ سو روپے بنتا ہے۔ اس میں اصل ر... بھی ملا لی جائے تو کل رقم ستائیس ہزار چھ سو روپے بنتی ہے۔"

"ملک صاحب، آپ اس چکر کو چھوڑیں۔ اصل بات..."

میں نے چودھری کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "اس حسا... سے سراج بی بی کے ذمے تقریباً ساڑھے سات ہزار روپے نکلتے ہیں۔ کیوں کہ بیس ہزار روپے ادا کیے جا چکے ہیں۔"

"نہیں، اصل رقم اس سے بہت کم ہو گی۔" محمد حسین نے ... "جو رقم ادا ہو جائے گی اُس پر سود نہیں لگایا جا سکتا۔"

چودھری اپنے جوش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہو... بولا: "اس حساب کتاب کو گولی مار دو جی۔ میں ان لوگوں کو بارہ ... روپے دے دوں گا۔"

میں نے پٹواری سے پوچھا: "اس زمین کی موجودہ قیمت کیا ہو گی؟"

"اس وقت اس زمین کی قیمت بیس اکیس ہزار روپے مربع سے کم نہیں ہو گی۔" بوڑھے پٹواری نے جواب دیا۔ "اچھا گاہک مل جائے تو زیادہ قیمت بھی مل سکتی ہے۔"

"اس حساب سے تین مربع زمین کے ساٹھ پینسٹھ ہزار روپے بنتے ہیں۔" میں نے چودھری سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اگر آپ یہ زمین خریدنا ہی چاہتے ہیں تو اس کی صحیح قیمت لگائیں اور بات ختم کریں۔"

"اور وہ جو ہم زمین پر محنت کرتے رہے ہیں، اُس کا کیا حساب ہو گا؟"

"ہم نے زمین گروی رکھی تھی، ٹھیکے پر نہیں دی تھی۔" سراج بی بی نے کہا۔ "آپ زمین کو استعمال نہیں کر سکتے تھے۔"

"تم نے میرا پیسہ استعمال کیا یا نہیں کیا؟" چودھری نے غضبناک نظروں سے سراج بی بی کو گھورا۔ "میں نے زمین کو استعمال کر لیا تو کون سی قیامت آ گئی۔"

اشرف نے کہا: "ہم نے پیسہ استعمال کرنے کا سود دیا، آپ نے ہمیں زمین کی پیداوار میں سے کیا دیا؟"

"بہت کچھ دیا ہے تیرے باپ کو۔ اور اُسی نے مجھے زمین استعمال کرنے کا اختیار بھی دیا تھا۔"

"چودھری صاحب، اس تحریر میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا: "میں آپ کی خاطر ان لوگوں کو زمین فروخت کرنے پر مجبور کر سکتا ہوں لیکن قیمت آپ کو مارکیٹ کے حساب سے لگانی ہو گی۔ اور انصاف کا تقاضہ بھی یہی ہے۔"

"ملک صاحب، یہ نہیں ہو سکتا۔"

پٹواری محمد حسین اور سراج بی بی ایک طرف جا کر کچھ بات چیت کرنے لگے۔ پھر دونوں واپس آ گئے اور سراج بی بی نے کہا: "چودھری صاحب، آپ میرے ساتھ پیسوں کا حساب کر لیں، آپ کی بقایا رقم کل تک ادا کر دوں گی۔"

چودھری، پٹواری کو گھورنے لگا: "محمد حسین، تیرے جیسے پٹواری میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ میں تمھاری چالوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ اس زمین پر قبضہ کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ یہ زمین میری ہے اور میرے ہی پاس رہے گی۔"

"چودھری، خدا سوچ سمجھ کر بات کرو۔" بوڑھے پٹواری نے غصے سے کہا۔ "میں بھی چھوٹا زمیندار نہیں ہوں۔ میری زمینیں تجھ سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہوں گی۔ یاد رکھو، یتیموں کا مال ہضم نہیں ہو گا۔"

چودھری غصے سے کھڑا ہو گیا۔ بولا: "ملک صاحب، میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ سب ملی بھگت ہے۔ اس قسم کے ڈرامے ہم نے بہت سے کیے ہیں۔ اس طرح بات نہیں بنے گی۔"

"چودھری صاحب، میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس طرح بات نہیں بنے گی۔ اگر آپ تعاون نہیں کریں گے تو مجھے اپنے قانونی اختیارات استعمال کرنے پڑیں گے۔"

"بڑے شوق سے استعمال کریں اپنے قانونی اختیارات۔" اُس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا: "آپ مجھے گرفتار کر لیں، حوالات میں بند کر دیں، ان کا مقدمہ عدالت میں پہنچا دیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کے حق میں ڈگری ہو جائے گی۔ اور کیا ہو گا؟ زمین تو کہیں نہیں چلی جائے گی۔ اس میں کاشتکاری کون کرے گا؟"

وہ کھلی دھمکی تھی۔ اُس کا مطلب یہ تھا کہ نہ تو اُسے قانون کی پروا تھی اور نہ ہی کسی عدالتی فیصلے کی۔ وہ زمین کا قبضہ چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ جب ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو پھر بڑے زمیندار سے ٹکر لینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ لوگ خونریزی سے بھی باز نہیں آتے۔ فریقِ مخالف اگر کمزور ہو اور اُس میں جوانوں کی کمی ہو تو وہ کچھ نہیں کر سکتا۔

سراج بی بی نے ہمت کر کے کہا: "میرا پُتر اور جوائی کاشتکاری کرے گا۔ ہم سب مل کر کام کریں گے۔"

چودھری طنزیہ انداز میں ہنسا۔ بولا: "سراج بی بی، زمینوں کو گھبرو جوان سنبھالا کرتے ہیں۔ تیرا پُتر تو اپنا وجود نہیں سنبھال سکتا، یہ زمین کیا سنبھالے گا۔ ہونہہ... وہ کیا کہتے ہیں، ذات دی کوڑھ کرلی تے شیراں نال جپھے۔"

"چودھری، یتیموں کا مال نہ کھاؤ۔" بوڑھے پٹواری نے کہا۔ "اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے، 'جو لوگ ظلم سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں یقیناً آگ بھرتے ہیں اور وہ یقیناً شعلہ زن آگ میں داخل ہوں گے۔'"

چودھری نے استہزائیہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ بولا: "کدھر ہے آگ۔ مجھے تو کہیں آگ نظر نہیں آتی۔"

"چودھری، ایک بات اچھی طرح سن لو۔" محمد حسین نے کہا۔ "جس دن آگ نظر آئے گی اُس دن تمھیں بچنے کا راستہ نظر نہیں آئے گا۔ اس لیے خدا سے ڈرو۔"

چودھری دروازے کی طرف مڑا، پھر رُک کر بولا: "ملک صاحب! میں زیرِ حراست تو نہیں ہوں؟"

"فی الحال آپ آزاد ہیں۔"

"شکریہ۔" اُس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "جاتے جاتے ایک بات ضرور کہوں گا۔ چودھری غلام قادر کا خاندان جدی پشتی اس علاقے میں آباد ہے، اور آئندہ بھی

آباد رہے گا۔ گھر تھا نیدار آتے جاتے رہتے ہیں۔"
بات ختم کرتے ہی وہ کمرے سے نکل گیا۔

❀❀

قارئین کرام، شروع میں میں نے حویلی کی آگ کا ذکر کیا تھا اور یہ حویلی چودھری غلام قادر کی تھی۔

وہ گرمیوں کے دن تھے اور دوپہر کا وقت تھا۔ اُس وقت میں ایک تفتیش کے سلسلے میں قریب ہی موجود تھا۔ شور سُن کر میں اپنے ساتھیوں سمیت موقع پر پہنچ گیا۔

حویلی چاروں طرف سے آگ کی لپیٹ میں تھی۔ لوگ پانی کی بالٹیاں اُٹھائے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے لیکن آگے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ دوپہر کا وقت، گرمیوں کا موسم اور بھڑکتی ہوئی آگ کی تپش۔ پندرہ بیس گز کے فاصلے تک آگ کی تپش محسوس ہو رہی تھی۔

صرف پانچ روز پہلے چودھری غلام قادر نے استہزائیہ انداز میں کہا تھا: "کدھر ہے آگ؟ مجھے تو کہیں آگ نظر نہیں آتی۔"

اور محمد حسین پٹواری نے کہا تھا: "جس دن آگ نظر آئے گی اس دن تمھیں بچنے کا راستہ نظر نہیں آئے گا۔"

یہ ساری باتیں لفظ بہ لفظ پوری ہو رہی تھیں۔ لوگ چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ چودھری کا پورا خاندان آگ میں گھرا ہوا ہے۔ اُن کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ عورتیں آہ و بکا کر رہی تھیں۔

لوگ پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر لا رہے تھے، آگ کی طرف پھینک رہے تھے، مگر پانی آگ تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ اچانک صحن کی طرف سے زیادہ شور سنائی دیا۔ لوگوں کا ہجوم اُس طرف بھاگا۔ میں بھی صحن میں پہنچ گیا۔ اُس طرف خواب گاہ کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے راستے دھوئیں کے بادل باہر آ رہے تھے لیکن کھڑکی ابھی آگ کی لپیٹ میں نہیں آئی تھی۔ اُس کھڑکی کے پاس ایک چیختا ہوا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ چلاتے ہوئے مدد کے لیے پکار رہا تھا لیکن وہ باہر نہیں آ سکتا تھا کیوں کہ کھڑکی پر مضبوط سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور دروازہ آگ کی لپیٹ میں تھا۔

کسی نے چیخ کر کہا: "یہ بڑے چودھری صاحب ہیں۔ یہ بڑے چودھری صاحب ہیں۔ خدا کے لیے کوئی ان کی مدد کرے۔"

مسئلہ یہ تھا کہ کھڑکی برآمدے میں تھی اور برآمدہ بھی آگ کی لپیٹ میں تھا۔ لوگ مدد کے لیے آگے بڑھتے تھے اور آگ کی تپش محسوس کر کے پیچھے ہٹ جاتے تھے۔

چند آدمی لمبا سا شہتیر اٹھا لائے اور اُس سے جلتے ہوئے دروازے کو ٹھوکریں مارنے لگے۔ تب ہی میں نے دیکھا کہ در… کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں فوراً تخریب کا… کا خیال آیا کہ کسی نے خوابگاہ کا دروازہ باہر سے بند کر کے… آگ لگا دی تھی؟

شہتیر کی مسلسل چوٹوں سے دروازے کے دونوں پٹ… پر ڈھیر ہو گئے۔ وہ نصف سے زیادہ جل چکے تھے اور اُن میں… آگ بھڑک رہی تھی۔

دروازہ گرنے کے ساتھ ہی ایک ہیولا تیزی سے… میں نمودار ہوا لیکن جیسے ہی اُس نے برآمدے میں قدم… ایک جلتا ہوا شہتیر اُس کے سر پر گرا اور وہ شہتیر کے سا… فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ باہر کھڑے ہوئے لوگوں کی بے ساختہ… نکل گئیں۔

چند لوگوں نے چادریں گیلی کر کے اپنے گرد لپیٹیں اور خ… خطرے میں ڈال کر جلتے ہوئے شخص کو پیروں سے پکڑ کر باہر گھسی… لائے۔ وہ چودھری غلام قادر تھا۔ اُس کا پورا لباس، بلکہ جسم تک… چکا تھا۔ اُس کی طرف دیکھ کر بدن پر ہیبت طاری ہوتی تھی… نے اُس کے جسم کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ جب اُس کا معا… گیا تو پتا چلا کہ اُس کے اندر زندگی کی کوئی رمق نہیں رہی تھی… وہ مر چکا تھا۔

لوگ رونے لگے، عورتیں بین کرنے لگیں۔

میں ایک طرف ہو گیا۔ مجھے اے ایس آئی کا گیارہ س… بیٹا یاد آ گیا، جو باپ کو ظالم سمجھ کر گھر سے بھاگ گیا تھا۔ اُ… وقت میری آنکھوں کے سامنے ویسا ہی منظر تھا۔ وہاں کئی لو… قدرت کو ظالم سمجھ رہے تھے۔ چودھری کو مظلوم سمجھ رہے… اُس کی ہولناک موت پر آنسو بہا رہے تھے کیوں کہ اُس وقت… کے سامنے تصویر کا صرف ایک رُخ تھا۔ اُن کو چودھری کے ظلم… نہیں آ رہے تھے۔ اُس وقت یہ بات سوچنے والا شاید کوئی نہیں… کہ چودھری غلام قادر نے یتیموں، بیواؤں اور مجبور لوگوں پر کتنے… کیے تھے۔ وہ یتیموں کی آہوں کی آگ تھی جس نے اُسے جب… کر راکھ کر دیا تھا۔

آگ میں نو افراد جل کر ہلاک ہو گئے تھے۔ چودھری ک… خاندان میں سے بس ایک شخص زندہ بچا تھا۔ وہ چودھری کا چہیتا… ستائیس سالہ بیٹا تھا۔ اُس کا نام فرید قادر تھا اور وہ پیدائش… پاگل تھا۔

اگلے روز جب ایک ہی وقت میں نو جنازے اُٹھے تو شہر… سوگوار اور پُر نم تھا لیکن فرید اچھل اچھل کر تالیاں بجا رہا تھا اور خو…

…تھا۔ اُس کے خیال میں وہ کوئی تفریحی میلہ تھا۔

…چوں کہ مجھے اُس حادثے کے بارے میں تخریبی یا انتقامی …روائی کا شبہ ہوا تھا، اِس لیے میں نے حویلی کے گرد پہرہ بٹھا …دیا۔ آگ اگرچہ بجھ گئی تھی، مگر رات بھر دبی ہوئی آگ سے دھواں …نکلتا رہا۔ حویلی کھنڈر بن چکی تھی۔ کئی کمروں کی چھتیں بیٹھ گئی تھیں۔

…اگلی صبح پانچ آدمی تھانے آئے۔ ان میں سے ایک شخص چودھری …جمال قادر کا دور کا رشتے دار تھا۔ اُس نے اپنا نام رجب علی بتایا اور …کہا کہ وہ چودھری غلام قادر اور اُس کے خاندان کے قتل کی رپورٹ درج …کرانا چاہتا ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کا پڑھا لکھا شخص نظر آ رہا تھا۔ باقی چار …چودھری غلام قادر کے ملنے جلنے والے اور پڑوسی تھے۔

…میں اُس وقت تفتیش کے لیے حویلی جانے کا ارادہ کر …رہا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو یہ بات بتائی اور کہا کہ رپورٹ …کارروائی چھان بین کے بعد لکھی جائے گی۔ "ابھی یہ فیصلہ نہیں ہوا …کہ آگ دانستہ لگائی گئی تھی یا وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔"

"آگ دانستہ لگائی گئی تھی۔" رجب علی نے کہا۔ "ہم اِسی لیے …آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔"

"کیا آپ کسی ثبوت کے ساتھ آئے ہیں؟"

"جی ہاں، ثبوت کے ساتھ ہی آئے ہیں۔ یہ بات آپ کے …علم میں ہو گی کہ چودھری صاحب کا اشرف حسین نامی ایک شخص …سے زمین کا تنازعہ چل رہا تھا۔ اس شخص نے چند روز پہلے چودھری …صاحب کو دھمکی دی تھی کہ وہ اُن کی حویلی کو آگ لگا دے گا۔ یہ بات …خود چودھری صاحب نے دو روز پہلے ہمیں بتائی تھی۔ یہ سب لوگ …وہاں موجود تھے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ آگ لگنے سے پہلے …چند لوگوں نے اشرف حسین کو حویلی کے آس پاس منڈلاتے دیکھا …تھا۔ اس سازش میں محمد حسین پٹواری بھی شامل ہے۔ اُس کا نام بھی درج …کر لیں۔"

"چودھری صاحب نے بتایا تھا کہ محمد حسین پٹواری، اشرف حسین …کو …دینا چاہتا تھا۔" رجب علی کے ایک ساتھی نے کہا۔ "…اسے چودھری صاحب کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔"

"اشرف حسین کے خلاف ہم پہلے ہی پرچہ کاٹ چکے ہیں۔" میں …نے بتایا۔ "چودھری صاحب نے چند روز پہلے اس کے …خلاف رپورٹ درج کروائی تھی۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے تھانے …بلا کر اچھی طرح پوچھ گچھ کرتا ہوں۔ اگر مجھے اس کے خلاف کوئی شہادت …ملی تو اُس کے ساتھ کوئی نرمی نہیں کروں گا۔"

اشرف کے بارے میں مجھے یقین نہیں تھا کہ حویلی میں اُس …نے آگ لگائی تھی۔ وہ اس ٹائپ کا نوجوان نہیں تھا لیکن اگر محرک …مضبوط ہو تو بعض اوقات ایک کمزور آدمی بھی بہت بڑی حرکت کر گزرتا ہے۔ اور محرک یہ تھا کہ وہ لوگ اٹھارہ سال سے اپنی زمین کی واگزاری کی امید لگائے بیٹھے تھے، لیکن آخری ملاقات میں چودھری نے اُن کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں کوئی بھی شخص بڑے سے بڑا قدم اٹھا سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اشرف کو بلانے کے لیے ایک آدمی بھیج دیا اور خود حویلی پہنچ گیا۔ سب سے پہلے میں یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ آگ کس طرح لگی تھی۔

حویلی کے بیشتر کمرے جل کر خاک ہو چکے تھے۔ بعض کی چھتیں گری ہوئی تھیں۔ میں نے چھتوں کا ملبہ ہٹانے کے لیے چند مزدور لگا دیے اور ایک اے ایس آئی کو ان کی نگرانی پر مقرر کر دیا۔ میں نے اسے اس بات کی تاکید کر دی کہ کمروں کی جلی ہوئی چیزوں کو نہ چھیڑا جائے، صرف اوپر سے گرنے والا ملبہ احتیاط سے ہٹا دیا جائے۔

یہ انتظام کرنے کے بعد میں واپس تھانے پہنچا تو اشرف اور اُس کی ماں سراج بی بی وہاں موجود تھے۔

میں نے اشرف سے کہا: "مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم نے چودھری غلام قادر کی حویلی کو آگ لگانے کی دھمکی دی تھی۔"

"جناب، میں نے کسی کو دھمکی نہیں دی۔" اُس نے جواب دیا۔ "ہماری تو اللہ نے عزت رکھ لی ورنہ چودھری نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔"

سراج بی بی نے کہا: "جس روز یہاں تھانے میں ہماری چودھری سے بات ہوئی تھی اُس کے اگلے روز چودھری جمال قادر کچھ غنڈے لے کر ہمارے گھر پہنچ گیا تھا۔"

"غنڈے لے کر پہنچ گیا تھا! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"بات یہ ہے بیٹا کہ ہم ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے تو بس اوپر والے کی عدالت میں اپنا مسئلہ پیش کر دیا تھا۔ اُس کی مہربانی سے ہماری عزت بچ گئی۔"

دونوں نے جو طویل تفصیل بتائی اُس کا خلاصہ میں اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

گزشتہ منگل کے روز رات کے نو بجے سراج بی بی نے دستک کی آواز پر دروازہ کھولا تو چار آدمی اُسے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ اُس روز سراج بی بی کی شادی شدہ بیٹی بھی اُس کے گھر آئی ہوئی تھی۔ اُس کے ہمراہ اُس کی دو بیٹیاں بھی تھیں جن کی عمریں بارہ اور چودہ سال تھیں۔

گھر میں داخل ہونے والے چار آدمیوں میں سے ایک چودھری جمال قادر تھا۔ باقی افراد سراج بی بی کے لیے اجنبی تھے۔ ان کی شکلیں خوف ناک تھیں۔ وہ سب مسلح تھے۔ ایک کے ہاتھ میں مٹی کے تیل

کا کنستر تھا۔

جمال قادر نے اندر گھستے ہی اشرف کو گریبان سے پکڑا اور اُس کے منہ پر تھپڑ مارے۔ یہ دیکھ کر لڑکیاں چیخنے لگیں تو جمال قادر کے ساتھیوں نے انھیں بالوں سے پکڑ لیا اور اُن کے منہ بند کر دیے۔

"اوئے، بڑے چودھری صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ تم تھانے میں بہت اچھل اچھل کر باتیں کر رہے تھے۔" جمال قادر نے اشرف سے کہا: "انھوں نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے ان کے ساتھ بڑی سخت بدکلامی کی تھی۔"

اشرف نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا: "نہیں جناب، میں نے تو بڑے ادب سے بات کی تھی۔ بڑے چودھری صاحب میرے ابا کے دوست تھے، میں ان کے ساتھ کیسے بدکلامی کر سکتا ہوں۔"

"تیرا مطلب ہے کہ ابا جی نے جھوٹ بولا ہے؟"

"جی، میں نے یہ تو نہیں کہا۔ آپ بے شک ملک صاحب سے پوچھ لیں، میں نے تو کوئی غلط بات نہیں کی۔"

جمال قادر اُس کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے بولا: "فکر نہ کر، ملک صاحب کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ ایسے کئی ملک آئے اور کئی گئے۔ اور سنا ہے تم لوگوں کو حساب کتاب کرنا بھی آگیا ہے۔ زمین کے پیسے مانگتے ہو۔"

سراج بی بی نے منت کرتے ہوئے کہا: "بیٹا، تم جس طرح کہو گے ویسے ہی کریں گے۔"

جمال قادر نے اُسے پرے دھکا دیا، بولا: "پرے ہٹ مائی، آئندہ مجھے بیٹا مت کہنا۔ تم نے ہمارے خلاف دھوکا دہی کی رپٹ درج کرائی ہے۔"

"ہمیں معاف کر دو چودھری۔ ہماری رپٹ لکھانے کی مرضی نہیں تھی۔ یہ رپٹ تھانیدار صاحب نے خود ہی لکھ لی تھی۔"

"خود ہی لکھ لی تھی!" جمال قادر نے منہ بگاڑ کر کہا: "انگوٹھا بھی خود ہی لگا لیا تھا۔"

سراج بی بی کی بیٹی اور نواسیاں بدمعاشوں کی گرفت میں بُری طرح کانپ رہی تھیں۔ سراج بی بی نے جمال قادر کے پیر پکڑ لیے، بولی: "چودھری صاحب، ہمیں کچھ نہیں چاہیے، نہ زمین چاہیے اور نہ ہی پیسہ۔"

"آج ہم جھگڑا ہی ختم کرنے آئے ہیں۔" غلام قادر نے کہا۔ پھر اپنے ساتھی سے بولا: "رب نواز، چلو اپنا کام شروع کرو۔ دونوں کمروں میں اچھی طرح مٹی کا تیل چھڑک دو۔ ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچنا چاہیے۔"

یہ کوئی نئی یا عجوبہ بات نہیں تھی۔ چنگیز اور فرعون اس قسم کی انسانیت سوز حرکتیں اکثر کرتے رہتے ہیں۔ پہلے بھی تھے اور آج بھی کرتے ہیں۔ جب مظلوم اور بے بس افراد جل رہے ہوتے ہیں تو یہ شیطان باہر کھڑے ہو کر قہقہے ... ہیں۔ یہ لوگ نہ بوڑھوں کی پروا کرتے ہیں نہ عورتوں کی ... جلتے ہوئے بچوں پر ترس آتا ہے۔

جب رب نواز نامی بدمعاش نے تیل کا کنستر ... سراج بی بی اور اُس کا پورا کنبہ جمال قادر کے قدموں میں ... آہ و بکا کرنے لگا۔

سراج بی بی نے کہا: "چودھری صاحب، ہمیں ... چاہیے۔ آپ ہماری زمین بھی رکھ لیں۔ ہم یہ بستی چھوڑ کر ... گے۔ دوبارہ کبھی ادھر کا رُخ نہیں کریں گے۔ جیسا کاغذ چاہو لکھوا لو، پر ہمارے اوپر یہ ظلم نہ کرو۔ میں تمھیں اللہ اور رسول ... دیتی ہوں کہ ہمیں زندہ نہ جلاؤ۔ ہم خاموشی سے یہ بستی چھوڑ ... جائیں گے۔ کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔"

"رب نواز، ذرا ٹھہرو۔" جمال قادر نے کہا: "اس ... کچھ سمجھ میں آتی ہے۔"

رب نواز رُک گیا، بولا: "ہم نے تو سوچا تھا کہ ... دیکھیں گے، پر جیسے آپ کی مرضی۔"

جمال قادر نے کچھ سادہ کاغذ اور اسٹامپ پیپر ... ان پر سراج بی بی سے انگوٹھے لگوائے اور اشرف سے دستخط ... پھر بولا: "میں تم لوگوں کو بستی چھوڑنے کے لیے صرف تین ... مہلت دیتا ہوں۔ اگر تم لوگ تین دن کے بعد یہاں نظر ... میں کوئی سوال جواب نہیں کروں گا۔ تم لوگوں کو اندر بند کر ... لگا دوں گا۔ تمھارا یہ مکان رب نواز نے خرید لیا ہے ... روپے میں۔ کوئی پوچھے تو بتا دینا۔ زمین بھی ہم نے خرید ... اب تمھاری اس علاقے میں کوئی جائداد نہیں ہے، سمجھ ...؟"

"تین دن تو بڑے تھوڑے ہیں۔" سراج بی بی ... کرتے ہوئے بولی: "اتنی جلدی ہم کہاں انتظام کریں ... پندرہ دن کی مہلت دے دیں۔"

"پندرہ دن کی مہلت نہیں مل سکتی۔ زیادہ سے ... ہفتے کی مہلت دیتا ہوں۔ اور ہاں، اگر وہ تھانیدار تیرے ... آئے تو اُسے کہہ دینا کہ تیرا ہمارے ساتھ راضی نامہ ہو ... دینا کہ تجھے زمین کے بیس ہزار مل گئے ہیں۔"

جانے سے پہلے اُن بدمعاشوں نے لڑکیوں کی ... بھی کی۔ سراج بی بی نے مجھے بتایا کہ چودھری کے جا... بعد وہ ساری رات رو رو کر خدا کو پکارتی رہی۔ اُس کے بچوں اور نواسیوں کو بھی ساری رات نیند نہیں آئی۔

پانچ روز کے بعد جب اُس نے چودھری کے پورے کنبے ... کی خبر سنی تو وہ سجدے میں گر گئی اور اُس نے شکرانے ... دو نفل پڑھے۔

"تھانیدار صاحب، یہ سب کچھ اللہ نے کیا ہے۔" سراج بی بی ... بات ختم کرتے ہوئے کہا: "جس وقت حویلی میں آگ لگی، ... اُس وقت اشرف لاہور گیا ہوا تھا۔ مکان کا بندوبست کرنے ... ساتھ اس کا دوست ساجد علی بھی تھا۔ دونوں کل شام کو واپس ... آئے ہیں۔"

اشرف نے لاہور میں اپنی مصروفیات کی پوری تفصیل ... دونوں کے بیانات میں کوئی خامی نظر نہیں آئی تھی، لہٰذا میں ... انھیں جانے کی اجازت دے دی۔ تاہم جانے سے پہلے ... دیا کہ وہ پٹواری محمد حسین کی مدد سے اپنی زمین کے کاغذات کی نقول نکلوا لے۔ مجھے یقین تھا کہ چودھری کے پاس جو کاغذات ... وہ سب جل چکے ہوں گے۔

قارئین کرام، آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کہانی ختم ہو چکی ... اب کوئی کہنے سننے والی بات باقی نہیں رہی۔

تو عرض ہے کہ ابھی کہانی ختم نہیں ہوئی۔ ہنوز ایک عجیب ... بات باقی ہے اور شاید یہی وہ بات ہے جس کی وجہ سے یہ واقعہ ... میں نے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔

تھانے کے کاموں سے فارغ ہو کر میں چار پانچ بجے کے ... قریب حویلی پہنچا۔ اے ایس آئی بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔

"ملک صاحب، ایک بڑی عجیب چیز میں نے دیکھی ہے، ابھی ... اس کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

وہ مجھے جلی ہوئی خواب گاہ میں لے گیا۔ وہاں ہر شے ... راکھ ہو چکی تھی۔ اے ایس آئی نے ایک جلی ہوئی چارپائی ... کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے خاکستر فریم اور راکھ کے درمیان ... چوہے کے ڈھانچے کو دیکھا، جو جل کر خاک ہو چکا تھا۔

"اس میں کیا عجیب بات ہے؟" میں نے کہا: "حویلی میں ... چوہے کی موجودگی کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔"

"اب اس تار کو بھی دیکھیں۔"

لوہے کا ایک پتلا سا تار چوہے کی دُم کے قریب پڑا تھا۔ ... اُس کے ایک سرے کو موڑ کر آنکھ سی بنا دی گئی تھی۔

"یہ تار چوہے کی دُم کے ساتھ منسلک تھا۔" اے ایس آئی ... بولا: "جلنے کی وجہ سے الگ ہو گیا ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"میرے پاس اس کا ثبوت بھی ہے۔ آئیں میرے ساتھ۔" اس نے مجھے ویسا ہی ایک اور مُردہ چوہا دکھایا۔ یہ چوہا خواب گاہ سے ملحقہ اسٹور میں مرا پڑا تھا۔ اس چوہے کی دُم کے ساتھ بھی تار کا ویسا ہی ٹکڑا منسلک تھا۔ اسٹور میں رضائیاں اور گدے بھرے ہوئے تھے جو سب جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ مُردہ چوہا گدوں کی راکھ کے قریب پڑا تھا۔ اُس کی دُم سے منسلک تار کے دوسرے سرے پر جلے ہوئے کپڑے کی راکھ پڑی تھی۔ غالباً وہ کپڑا تار کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ ویسا ہی ایک تیسرا چوہا برآمدے میں پڑا ہوا تھا۔ وہ جلے ہوئے فرنیچر کے نیچے پڑا تھا۔ اُس کی دُم کے ساتھ بھی تار منسلک تھا۔ بات بڑی واضح معلوم ہوتی تھی۔ کسی نے چوہوں کی دُم کے ساتھ کپڑے کے ٹکڑے باندھ کر انھیں آگ لگائی اور چوہوں کو حویلی میں چھوڑ دیا تھا۔

بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ ساری کارروائی بڑی منصوبہ بندی سے کی گئی تھی۔ چوہوں کو اس طریقے سے چھوڑا گیا تھا کہ آگ بھڑک اٹھنے کے بعد باہر نکلنے کے راستے مسدود ہو گئے تھے۔ چوہے آگ کی تپش کے باعث دوڑتے رہے تھے اور جگہ جگہ آگ

لگاتے چلے گئے تھے۔

برآمدے میں ایک مٹی کے تیل کا کنستر بھی پڑا ہوا تھا۔ وہ پہلو کے بل پڑا تھا اور خالی تھا۔ تاہم اس میں مٹی کے تیل کی بُو موجود تھی۔

"میرا خیال ہے کہ یہ کسی گھر کے بھیدی کا کام ہے۔" ایس آئی نے کہا۔ "اور یہ سارا کام برآمدے میں کیا گیا تھا۔ چوہوں کی دُموں کے ساتھ جو کپڑے باندھے گئے تھے انھیں تیل میں بھگویا گیا تھا اور اس طرف کے یہ تینوں دروازے باہر سے بند تھے۔"

"یہ چوہوں والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ "اگر کسی نے اس برآمدے سے یہ سارا ڈراما کیا ہے تو اُسے چوہوں کا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بڑے آرام سے مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا سکتا تھا۔ پہلے چوہے چھوڑنا پھر مٹی کے تیل کا کنستر اوندھا کرنا، یہ کچھ عجیب سی بات لگتی ہے۔"

اے ایس آئی نے کہا: "ملک صاحب، سارے مجرم عقل مند نہیں ہوتے، یہ کسی احمق مجرم کا کام معلوم ہوتا ہے۔"

سراج بی بی نے رب نواز نامی ایک شخص کا ذکر کیا تھا۔ میں نے آس پاس کے لوگوں سے اُس کے بارے میں پوچھ گچھ کی، اور دو سپاہی بھیج کر اُسے حویلی بلا لیا۔ وہ اُن چھوٹے بدمعاشوں میں سے تھا جو جاگیرداروں کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں، اور اُن کے اشاروں پر اپنے ہی طبقے کے افراد پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ وہ خاصا پلا ہوا شخص تھا۔ میں نے کہا: "رب نواز، تیرے اِن دانتوں کو مرگئے؟"

وہ پیلے دانت نکال کر بولا: "کوئی بات نہیں سرکار، کوئی اور حویلی دیکھ لیں گے۔"

میں نے بڑے زور سے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ وہ اس اچانک تھپڑ کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ بُری طرح بوکھلا گیا۔

"حویلی نہیں، حوالات۔۔۔ کُتّے کے بچّے۔۔۔"

"تھانیدار صاحب، یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

اُس وقت ہم حویلی کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ میں نے ایک سپاہی سے کہا: "جاؤ، پرچون کی دکان سے مٹی کے تیل کی ایک بوتل لے آؤ۔" سپاہی کے جانے کے بعد میں نے اے ایس آئی سے کہا: "اس کے ہاتھ پیر باندھ دو۔ میں اس کے اوپر مٹی کا تیل چھڑک کر اسے آگ لگاؤں گا۔"

اُس کے چہرے پر خوف اُتر آیا۔ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا: "تھانیدار صاحب، میرا کوئی قصور بھی پتا چلے۔"

میں نے ایک تگڑے سے سپاہی سے کہا کہ اُسے پیچھے سے قابو کر کے کھڑا ہو جائے۔ سپاہی نے اُسے شکنجے میں کس ل

"سُن اوئے رب نواز، مجھے تیری بدمعاشی کا سارا معلوم ہو چکا ہے لیکن اب یہ قصہ میں تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ اگر تیرے منہ سے ایک بھی غلط لفظ نک یہاں سے تیری لاش ہی جائے گی۔ پہلے تو اس کنستر کو دیکھ تو اس کو پہچانتا ہے؟"

میں نے تھانیدار والا بالکل تیار پکڑا ہوا تھا۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا: "یہ مٹی کے تیل کا کنستر

میں نے رول سے اُس کے کندھے پر ضرب لگائی او

"میں نے پہچاننے کی بات کی ہے۔ کیا یہ وہی کنستر ہے جسے جمال تھاور کے ہمراہ سراج بی بی کے گھر لے کر گئے تھے؟"

اُس نے لمحہ بھر توقف کیا پھر پیلا ہاتھ بلند ہوتے د کر بولا: "جج... جی، یہی ہے۔"

"کُتّے، تم اُس بیوہ عورت کو، اُس کی بیٹی، بیٹے اور نواسیا کو گھر کے اندر جلا کر تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔"

وہ کراہ کر بولا: "جج... جناب اس میں میرا کوئی قصور نہ ہے۔ اس کا حکم بڑے چودھری صاحب نے دیا تھا۔"

"اوئے، کچھ عبرت پکڑ۔ دیکھتا نہیں تیرا بڑا چودھری اپنے 'انولے' سمیت کُتّے کی موت مر گیا۔ یاد رکھ، بیواؤں او یتیموں پر ظلم کرنے والوں کو خدا آگ میں جھونک دیا کرتا ہے۔ اُس کے لیے یہاں بھی آگ ہے اور وہاں بھی آگ ہے۔ تیر دوسرے دو ساتھیوں کا کیا نام ہے؟"

"ایک کا نام جیجا تیلی اور دوسرے کا نام چودھری رجب ہے۔"

یہ رجب علی وہی تھا جو صبح چار آدمیوں کے ہمراہ اشر کے خلاف پرچہ کٹوانے آیا تھا۔ میں نے ایک حوالدار سے کہا وہ دو تین آدمی ساتھ لے جائے اور رجب علی اور جیجے تیلی کو پکڑ کر تھانے لے جائے۔

"رب نواز، اس حویلی میں کس نے آگ لگائی ہے؟"

وہ قسمیں کھانے لگا کہ اُسے اُس آگ کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ اُس کا بیان سچا معلوم ہوتا تھا۔

قدرت کا عجیب فیصلہ تھا۔ چودھری نے جس تیل سے ایک بیوہ اور اُس کے کنبے کو ہلاک کرنا چاہا تھا، وہی تیل اُس کی اپنی ہلاکت کا باعث بن گیا تھا۔

لیکن چوہوں والا معما ہنوز حل نہیں ہوا تھا۔

اگلے روز میں نے آس پاس رہنے والوں سے پوچھ گچ

شروع کی۔ کسی اجنبی کو حویلی میں داخل ہوتے یا نکلتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ زندہ بچنے والا واحد فرد چودھری کا پاگل بیٹا فرید تھاور تھا۔ وہ نہ کوئی بات سمجھتا تھا اور نہ کچھ بتا سکتا تھا۔

اے ایس آئی کافی دیر تک اُس کے ساتھ مغز ماری کرتا رہا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ فرید اُس ساری گفتگو کو تفریح سمجھتا تھا۔ وہ کبھی ہنسنے لگ جاتا، کبھی تالیاں بجاتا اور کبھی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگ جاتا۔

میں نے اُس سے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا: "فرید۔۔۔ جب آگ لگی تم کہاں تھے؟"

"آگ۔۔۔" اُس نے دونوں ہاتھ پھیلائے: "تماشا۔۔۔ بہت سارے لوگ۔۔۔ تماشا۔۔۔ ہو ہو ہو۔۔۔"

"تمھارے ساتھ کون تھا؟"

"آگ۔۔۔ بہت ساری۔۔۔ تماشا۔۔۔ ہو ہو ہو۔۔۔"

کافی دیر تک ایسے ہی سوال و جواب کے بعد مجھے اچانک ایک خیال آیا۔ میں نے پوچھا: "فرید۔۔۔ چوہا۔۔۔ تم نے چوہا دیکھا؟"

اُس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ بولا: "چوہا۔۔۔۔۔ تماشا۔۔۔ آگ۔۔۔"

غالباً کوئی بات اُس کے ذہن میں آ رہی تھی۔ میں نے اُس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا: "ہاں ہاں۔۔۔ شاباش، تم نے چوہا کہاں دیکھا؟ چوہا۔۔۔"

اُس نے سینے پر ہاتھ مارا، بولا: "چوہا۔۔۔ میں۔۔۔ جیرا۔۔۔ تماشا۔۔۔ ہو ہو ہو۔۔۔"

پہلی دفعہ ایک نام اُس کی زبان پر آیا تھا۔

"جیرا کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے پھر سینے پر ہاتھ مارا، بولا: "جیرا۔۔۔ میں۔۔۔ چوہا۔"

"یہ جیرا کوئی ملازم معلوم ہوتا ہے۔" میں نے اے ایس آئی سے کہا: "تم آس پاس سے پتا کرو، اور اس نام کے جتنے لوگ ہیں انہیں ساتھ لے آؤ۔"

کوئی آدھے پونے گھنٹے بعد اے ایس آئی ایک نو دس سال کے لڑکے کو ساتھ لیے حویلی میں پہنچ گیا۔ لڑکے کے ساتھ اُس کا باپ بھی تھا۔ دونوں کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ لڑکا کچھ زیادہ ہی خوف زدہ نظر آتا تھا۔ اُس کا نام نذیر عرف جیرا تھا۔

فرید نے جیرے کو دیکھا تو خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔ "جیرا آ گیا۔۔۔ آہا جیرا آ گیا۔"

میں نے جیرے کی گھبراہٹ دور کرنے کے لیے دو چار سوالات کیے، پھر پوچھا: "جیرے، یہ چوہوں کا کیا قصہ ہے؟"

یہ سوال سنتے ہی اُس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ بولا: "سرکار، سب دی، میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ اِس نے فرید نے مجھ کو کہا تھا کہ آؤ چوہوں کا تماشا کرتے ہیں۔"

"گھبراؤ نہیں پُتّر، ہم نے کب کہا ہے کہ تمھارا قصور ہے۔ ویسے ہوا کیا تھا، چوہے کون لایا تھا؟"

"چوہے تو جی پنجرے میں پھنسے ہوئے تھے، چار پانچ تھے۔ چاچی نے مجھے پنجرہ دیا اور کہا کہ چوہوں کو چھپڑ میں ڈبو کر مار دو۔ میں جانے لگا تو فرید نے مجھے روک لیا۔ کہنے لگا آؤ چوہوں کا تماشا کرتے ہیں۔"

"کون سی چاچی نے پنجرہ دیا تھا؟"

"فرید کی اماں نے۔"

"اچھا، پھر کیا ہوا؟"

"جی پہلے تو ہم چوہوں کو ایسے ہی چھیڑتے رہے۔ پھر یہ فرید کہنے لگا کہ چوہوں کی دُم میں کپڑا باندھ کر آگ لگاتے ہیں۔ میں نے اس کو منع بھی کیا، لیکن یہ نہیں مانا۔"

"تم لوگوں نے چوہوں کی دُم کے ساتھ کپڑا کیسے باندھا؟"

"یہ جی، ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر چوہا پکڑتا تھا۔ میں تار کے ساتھ کپڑا باندھ کر تار کو چوہے کی دُم پر لپیٹ دیتا تھا۔"

"کپڑے پر مٹی کا تیل بھی ڈالا تھا؟"

"ہاں جی، اس نے کپڑے کو کنستر میں ڈبویا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ماچس لے آیا اور ایک چوہے کے کپڑے کو آگ لگا کر چھوڑتا گیا۔ دو تین چوہے کمروں میں گھس گئے۔ میں نے فرید سے کہا کہ اب تمھارے ابا جی تمھیں بہت ماریں گے۔ اس نے ڈر کے مارے سارے دروازے بند کر دیے۔ تھوڑی دیر بعد اندر شور مچ گیا۔ ادھر بھی آگ لگ گئی۔ ہم ڈر کے مارے باہر بھاگے تو فرید کی کنستر سے ٹکر ہو گئی اور وہ کنستر اُلٹ گیا۔"

بات ختم کرتے ہی اُس نے رونا شروع کر دیا۔ وہ بار بار یہی کہتا تھا: "ایمان سے میں نے کچھ نہیں کیا، میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

میں نے اُسے اُس کے باپ کے ہمراہ رخصت کر دیا۔ اُس کا واقعی کوئی قصور نہیں تھا۔ قصور اُس پاگل فرید کا بھی نہیں تھا۔ اُس ساری کارروائی میں درحقیقت قدرت کا دستِ انتقام کام کر رہا تھا۔



اس حسین دوشیزہ کی داستانِ الم جو آشیانۂ غربت میں جنم لینے کی مجرم تھی

ترنم پارا

پت جھڑ

کا موسم تھا اور صبح سے خشک ہوا چل رہی تھی۔

شام کے وقت اسپتال سے اطلاع آئی کہ ایک نوجوان لڑکی جو خاصی زخمی ہے، علاج کے لیے وہاں لائی گئی ہے۔ میں نے ایک اے ایس آئی کو ساتھ لیا اور فوراً اسپتال پہنچ گیا۔

لڑکی کو اسپتال پہنچانے والا ایک بس ڈرائیور تھا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے جنھیں وہ گواہی کے لیے ساتھ لایا تھا۔ وہ تیس بتیس سال کا مضبوط آدمی تھا۔ سانولا رنگ، بھاری جسم اور بڑی بڑی مونچھیں۔ اُس نے کندھوں پر گیروے رنگ کی چادر ڈال رکھی تھی اور بڑی بے چینی کے ساتھ سگریٹ پھونک رہا تھا۔

ہمیں دیکھ کر اُس نے سگریٹ جُوتے کے نیچے مسل دیا اور سلام کرنے کے بعد بولا "جناب، ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارا بیان سُن لیں اور ہمیں اجازت دیں۔ اگر ہمیں دیر ہو گئی تو مالک ناراض ہو گا۔"

میرے استفسار پر اُس نے اپنا نام حفیظ خان بتایا اور کہا کہ وہ خوشاب کا رہنے والا ہے۔

میں نے پوچھا "یہ لڑکی کون ہے اور حادثہ کیسے پیش آیا ہے؟"

"لڑکی کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔" اُس نے جواب دیا۔ "ہم جھنگ سے آ رہے تھے۔ اُدھر سے ایک بارات ہماری بس میں بیٹھی تھی جو پچھلے گاؤں میں اُتر گئی۔ بس تقریباً خالی تھی۔ اڈے سے تین چار فرلانگ اُدھر یہ لڑکی سڑک کے کنارے کھڑی دکھائی دی۔

اُس وقت مویشیوں کا ایک ریوڑ سڑک کے کنارے چل ر[illegible]
لیے میں نے بس کی رفتار کم کر دی تھی۔ بعض اوقات کوئی [illegible]
کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگتا ہے جس سے حادثے کا خطرہ [illegible]
ہے۔ پھر یہ لڑکی مجھے نظر آئی۔ یہ بہت آگے ہو کر سڑک [illegible]
تھی اور ہماری بس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں یہی سم[illegible]
میں سوار ہونا چاہتی ہے۔ اِس لیے میں نے رفتار کم ہی رکھ[illegible]
کے اشارے کا انتظار کرنے لگا لیکن جیسے ہی بس قریب پہنچ[illegible]
دوڑ کر سامنے آ گئی۔ میں نے تیزی سے بس کو دائیں طرف کا[illegible]
کچے پر اُتر گئی اور وہاں اُگے ہوئے درخت سے ٹکراتے ٹکر[illegible]
لڑکی فینڈر سے رگڑ کھاتی ہوئی ایک طرف جا گری اور گر[illegible]
ہو گئی۔ ہم نے اسے بس میں ڈالا اور یہاں اسپتال لے آئے [illegible]
کوئی زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ اگر بس کی رفتار تیز ہوتی تو اِ[illegible]
محال تھا۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ لڑکی نے خودکشی کی کوشش [illegible]

"ہاں جی، لگتا تو یہی ہے۔" اُس نے جواب دیا۔ پھر [illegible] کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "میں اِن لوگوں کو گواہی [illegible] لایا ہوں۔ آپ اِن سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔"

اُن میں سے ایک باریش بوڑھا اور دوسرا نوجوان تھا۔

میں نے بوڑھے سے پوچھا "آپ کہاں سے بس میں [illegible]

"ہم لوگ یہیں کے رہنے والے ہیں۔" اُس نے جو[illegible] "ہم دونوں ایک فیکٹری میں کام کرتے ہیں اور چھٹی کے بعد [illegible] تھے۔ ہم نے شور کی آواز سُنی تو دوڑ کر اُدھر پہنچ گئے۔"

"وہاں آپ نے کیا دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھا کیا تھا جی! اُس نے جواب دیا۔ "ہم تو گھبرا ہی گئے تھے۔ سڑک پر بیل بی بے شعور پڑی تھی۔ میں سمجھا مر گئی ہے۔ بشیر نے اس کی نبض دیکھی تو کہنے لگا کہ یہ تو زندہ ہے۔" اُس کا اشارہ نوجوان کی طرف تھا۔ "کچھ اور لوگ بھی وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ سب نے شور مچایا کہ لڑکی کو اسپتال پہنچاؤ۔ ان کی بس ادھر کیچڑ میں پھنس گئی تھی۔ لوگوں نے دھکا لگا کر بس کو باہر نکالا۔ لڑکی کو اندر سیٹ پر لٹایا اور فوراً یہاں لے آئے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ حادثہ تم لوگوں کے سامنے نہیں ہوا تھا؟"

"ہم تھوڑے فاصلے پر تھے۔"

میں نے نوجوان سے پوچھا: "تم نے کیا دیکھا تھا؟"

"میں نے بھی یہی کچھ دیکھا تھا۔" اُس نے جواب دیا۔ "ہم اپنے دھیان میں جا رہے تھے۔ شور کی آواز سن کر میں نے اُدھر دیکھا تو یہ لڑکی گرتی دکھائی دی۔"

میں نے ڈرائیور سے پوچھا: "حادثے کے وقت بس میں کل کتنی سواریاں تھیں؟"

"جناب، چار یا پانچ سواریاں تھیں۔ ایک میں تھا اور کنڈکٹر تھا۔ کل چھ سات آدمی تھے۔"

"یہ سواریاں کہاں ہیں؟"

"دو سواریاں تو اسی علاقے کی تھیں اور تین آگے جانے والی تھیں۔ حادثے کی وجہ سے اُنھوں نے دوسری بس پکڑ لی۔ شور شرابے کی وجہ سے مجھے کچھ پتا نہیں چلا، ورنہ میں اُن کو جانے نہ دیتا۔"

"کنڈکٹر کہاں ہے؟"

"باہر بس میں بیٹھا ہے۔"

اسپتال میں داخل ہوتے وقت ہمیں دیوار کے ساتھ ایک بس کھڑی دکھائی دی تھی۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا کہ وہ باہر جا کر کنڈکٹر کو بلا لائے۔

ڈرائیور نے جو کچھ بتایا تھا اُس کی تصدیق کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ جن دو گواہوں کو وہ ساتھ لایا تھا، اُنھوں نے حادثہ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ جو مسافر عینی گواہ ہو سکتے تھے۔ وہ بقول اُس کے بس سے اتر کر چلے گئے تھے۔ اب پتا نہیں کہ بس میں کوئی مسافر تھا بھی یا نہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ لڑکی بس میں اکیلی رہ گئی ہو اور ڈرائیور اور کنڈکٹر نے اُس کے ساتھ دست درازی کی ہو یا وہ اُسے کہیں سے اغوا کر کے لا رہے ہوں اور اپنا جرم چھپانے کے لیے اُسے بس کے نیچے کچلنے کی کوشش کی ہو مگر اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکے اور لوگوں کے جمع ہو جانے کی وجہ سے لڑکی کو اسپتال پہنچانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بہر حال یہ سب امکانات تھے جو میرے ذہن میں پیدا ہوئے۔

چند منٹ کے بعد اے ایس آئی کنڈکٹر کو ساتھ لے آیا۔ نام اقبال معلوم ہوا۔ وہ تیکھے نقوش والا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ اُس نے میلی سی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اور سر پر میلا سا مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ اُس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا: "یہ حادثہ کس طرح ہوا تھا؟"

"حضور، میں تو پچھلی سیٹ پر بیٹھا کیش گن رہا تھا کہ بس کو جھٹکا لگا۔" اُس نے کنڈکٹروں والی مخصوص آواز میں کہا۔ "جھٹکا لگتے ہی میں یہ پڑا ہوں اور کیش وہ پڑا ہے۔ سارے پیسے اچھل گئے۔ یہ دیکھیں۔" اُس نے بازوؤں اور ٹانگوں پر چوٹوں کے نشانات دکھائے۔ "بس کیچڑ میں اُتر گئی۔ میں سمجھا کوئی ڈھور ڈنگر سامنے آ گیا ہے لیکن اتنے میں شور مچا دیا کہ عورت بس سے ٹکرا گئی ہے۔ میں نے کیش اُدھر ہی چھوڑا اور باہر بھاگا۔ یہ عورت سڑک پر بے سُدھ پڑی تھی۔"

"بس میں اُس وقت کتنے مسافر تھے؟"

"اُس وقت صرف پانچ مسافر تھے۔" اُس نے کہا۔ "ہم اِدھر لڑکی کو سنبھالنے میں لگ گئے اور مسافر پیچھے آنے والی ایک بس میں جا بیٹھے۔"

اُس کے اور ڈرائیور کے بیان میں کوئی فرق نہیں تھا۔

"جناب، ہمیں اجازت دیں۔" ڈرائیور نے کہا۔ "بہت دیر ہو گئی ہے۔ پراچہ صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"تم لوگ ابھی اِدھر ہی رکو۔" میں نے انھیں اے ایس آئی کی نگرانی میں چھوڑا اور زخمی لڑکی کی خبر لینے اندر پہنچ گیا۔ لڑکی کا معائنہ ایک اُدھیڑ عمر لیڈی ڈاکٹر نے کیا تھا۔ وہ خوش اخلاق اور اپنے کام میں ماہر خاتون تھی۔

اُس نے میرے استفسار کے جواب میں کہا: "ملک صاحب، یہ صرف ایکسیڈنٹ کیس نہیں ہے۔ لڑکی کے ساتھ انتہائی بُرا سلوک کیا گیا ہے۔ اس کے جسم پر جا بجا تشدد کے نشانات موجود ہیں۔ اُس پر مجرمانہ حملہ بھی کیا گیا ہے۔"

گویا میرے ذہن میں جو شک پیدا ہوا تھا، وہ غلط نہیں تھا۔ میں نے پوچھا: "کیا میں اُس کا بیان لے سکتا ہوں؟"

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ بولی: "وہ ابھی تک بے ہوش ہے اور فی الحال ہوش میں آنے کا امکان بھی نہیں۔ میں نے اُسے نیند کا انجکشن لگایا ہے۔ بیان کے لیے آپ کل آئیں۔ کچھ پتا چلا کہ یہ لڑکی کون ہے؟"

"ابھی تک تو کچھ پتا نہیں چلا۔ بس والے ایک چیز بھی یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ ہم نے ابھی تک اُسے کھول کر نہیں دیکھا۔" اُس نے نرس کو بلایا اور اُسے زخمی لڑکی کی گٹھری لانے کے لیے کہا: "ممکن ہے کہ اس گٹھری میں سے کوئی شناختی کاغذ نکل آئے۔"

نرس نے ایک چھوٹی سی گٹھری لا کر میز پر رکھ دی۔ ڈاکٹر نے میری درخواست پر اُسے کھولا اور اُس کی ایک ایک چیز چیک کرنے لگی۔ اُس میں دو سوتی جوڑے، چاندی کی جھانجروں کا ایک جوڑا، بارہ روپے، چند زنانہ استعمال کی چیزیں اور ایک رنگین سوتی چادر تھی۔ ایک آدھ اور بھی چیز تھی جو مجھے یاد نہیں رہی۔ اُن چیزوں سے لا تعین باتوں کا اندازہ ہوتا تھا مثلاً یہ کہ وہ لڑکی غالباً سفر کی نیت سے گھر سے نکلی تھی۔ غریب گھرانے کی فرد تھی اور کسی دوسرے علاقے سے آئی تھی . . . یا لائی گئی تھی۔

"لڑکی کی حالت کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایکسیڈنٹ سے اُسے خاصی چوٹیں آئی ہیں مگر اُس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ اُسے تقریباً ایک ہفتہ اسپتال میں رہنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے، میں کل صبح بیان لینے کے لیے آ جاؤں گا۔"

برآمدے میں ڈرائیور اور کنڈکٹر اے ایس آئی سے اُلجھ رہے تھے۔ انھیں واپس جانے کی بہت جلدی تھی۔ میں نے اُن کا نام و پتا نوٹ کر لیا اور انھیں جانے کی اجازت دے دی۔ جاتے وقت یہ ہدایت بھی کر دی کہ وہ علاقہ چھوڑ کر نہ جائیں اور اگلے روز تھانے میں پہنچ کر اپنا بیان نوٹ کرا جائیں۔

☐

کل صبح لڑکی ہوش میں آ چکی تھی۔ گزشتہ رات والی ڈاکٹر اسپتال میں موجود نہیں تھی۔ نرس مجھے لڑکی کے کمرے میں لے گئی۔ لڑکی نہایت [illegible] اور حسین تھی۔ اُس کی عمر اُنیس بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ [illegible] پر لیٹی خالی نظروں سے چھت کو گھور رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا، وہ سخت دہشت زدہ تھی۔

[illegible] بستر کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور نرس کو کمرے [illegible] دیا۔ تاکہ لڑکی کو حوصلہ رہے۔ وہ اپنے خیالات میں اتنی محو [illegible] ہماری آمد کا بالکل پتا نہیں چلا۔ جب میں نے اُس سے [illegible] وہ بڑی طرح چونک گئی اور خوفزدہ نظروں سے میری طرف [illegible] ساتھ ہی سمٹ کر پرے ہو گئی۔

"[illegible] نام ہے تمھارا؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

[illegible] وقت میں یونیفارم میں نہیں تھا۔

[illegible] نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا: "بی بی! یہ تھانیدار [illegible] رات کو بھی آئے تھے۔ اُس وقت تم بے ہوش تھیں۔ [illegible] جو کچھ بولنے وہ بے دھڑک بتا دو۔ ڈرو نہیں۔"

[illegible] نہیں بولی۔ بس خوفزدہ نظروں سے کبھی میری طرف اور کبھی نرس کی طرف دیکھتی رہی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں پر سے اُس کا اعتماد اُٹھ چکا تھا۔ میں نے اور نرس نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بتائے، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارے سوالات کے جواب میں کبھی وہ منہ چھپاتی، کبھی نفی میں سر ہلاتی، کبھی ہاتھ جوڑتی اور کبھی اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے۔ مجھے خیال پیدا ہوا کہ شاید وہ گونگی تھی۔

اتنے میں لیڈی ڈاکٹر بھی آ گئی۔ اُس نے لڑکی کا معائنہ کیا، نرس کو کچھ ہدایات دیں اور مجھے کمرے سے باہر بلا کر کہا: "گزشتہ رات دو آدمی سلطانہ کو لینے آئے تھے۔"

"سلطانہ؟"

"انھوں نے اِس کا نام سلطانہ ہی بتایا ہے۔ ایک آدمی کا نام چودھری رب نواز اور دوسرے کا رحمت علی تھا۔ رحمت علی نے خود کو سلطانہ کا شوہر ظاہر کیا تھا۔ میں نے اُن کو بتایا کہ لڑکی بے ہوش ہے اور کم از کم سات آٹھ دن اسپتال میں رہے گی۔ لیکن وہ اسے اسی وقت ساتھ لے جانے پر اصرار کر رہے تھے۔ کہنے لگے کہ وہ اس کا کسی پرائیویٹ اسپتال میں مناسب علاج کروائیں گے۔ میں نے انھیں بڑی مشکل سے ٹالا۔ میں ایک بے ہوش اور زخمی لڑکی کو کیسے اُن کے حوالے کر دیتی۔ میرا خیال ہے کہ وہ دوبارہ آئیں گے۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا۔" میں نے کہا۔ "میں دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔ اگر یہ لوگ دوبارہ آئیں تو انھیں میرے آدمیوں کے پاس بھیج دیں۔"

یہ کچھ عجیب بات معلوم ہوتی تھی۔ اگر وہ لڑکی کے ورثا تھے تو انھیں تھانے آنا چاہیے تھا۔ وہ کیسے وارث تھے جو بے ہوش اور زخمی لڑکی کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔

میں نے دو آدمیوں کی اسپتال میں ڈیوٹی لگا دی اور انھیں تاکید کر دی کہ اگر کوئی شخص لڑکی کو لینے آئے تو اُسے تھانے بھیج دیں۔

دو ڈھائی گھنٹے کے بعد دو آدمی تھانے میں وارد ہوئے۔ دونوں گھوڑوں پر آئے تھے۔ اُن کی عمریں تیس اور پینتیس سال کے درمیان تھیں۔ ایک نے کلف دار سفید لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر قراقلی ٹوپی تھی اور اُس کی طلّے دار جوتی ہر قدم پر چرچراہٹ پیدا کرتی تھی۔

اُس کی گردن تنی ہوئی اور گلے میں رنگین چادر تھی۔

اُس کے ساتھی کا لباس اگرچہ صاف تھا، مگر پرانا تھا اور اُس پر شکنیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ اُس نے سر پر صافہ باندھ رکھا تھا۔ وہ دور ہی سے مالک اور ملازم نظر آتے تھے۔ دونوں سیدھے میرے کمرے میں آئے۔

ٹوپی والے نے سلام کرنے کے بعد کہا: "میرا نام چودھری رب نواز ہے اور یہ میرا۔ ۔ ۔ دوست رحمت علی ہے۔"

"بیٹھیں۔" میں نے کہا: "کیسے آنا ہوا؟"

"اس کی بیوی سلطانہ کل ایک حادثے میں زخمی ہو گئی تھی۔" چودھری رب نواز نے کہا: "اس وقت اسپتال میں پڑی ہے۔ ہم اُسے لینے گئے تھے، مگر اُدھر سے پتا چلا ہے کہ وہاں آپ نے پہرے سنتری لگا دیے ہیں، معاملہ کیا ہے؟"

میں نے رحمت علی کو گھورا: "سلطانہ تمھاری بیوی ہے؟"

"ہاں جی، میری بیوی ہے۔" رحمت علی نے جواب دیا۔

"ہم لوگ سید پور سے آئے ہیں۔" چودھری نے کہا: "آپ نے چودھری حق نواز کا نام ضرور سنا ہوگا۔ میں اُن کا بیٹا ہوں۔"

میں چودھری حق نواز کو اچھی طرح جانتا تھا اور اُس کے ظلم و جبر کی کہانیاں بھی سن چکا تھا۔ میں نے اُس کی بات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اُس وقت میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ سلطانہ نامی لڑکی واقعی رحمت علی کی بیوی تھی یا کوئی اور بات تھی۔ اُس نے خودکشی کی کوشش کیوں کی تھی اور اس پر مجرمانہ حملہ کس نے کیا تھا؟ ان لوگوں نے اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔

"رحمت علی، تمھاری بیوی اس علاقے میں کیا کر رہی تھی؟"

"ادھر اُس کے رشتے دار رہتے ہیں۔" چودھری نے رحمت علی کو جواب دینے کا موقع ہی نہیں دیا۔ "اُن سے ملنے آئی ہوگی۔"

"کیا بات ہے چودھری، تم رحمت علی کو کیوں نہیں بولنے دیتے؟ یہ گونگا تو نہیں ہے؟"

"ملک صاحب، میں اس لیے ساتھ آیا ہوں۔" چودھری نے کہا: "اس کو ڈر تھا کہ بات اگر پولیس تک پہنچ گئی تو اس کی کوئی سننے کا نہیں۔ ایکسیڈنٹ میں اس غریب کا یا اس کی بیوی کا تو کوئی قصور نہیں۔ ادھر آپ نے لڑکی پر پہرے بٹھا دیے ہیں، ادھر اس غریب سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے بس ڈرائیور کو ایسے ہی چھوڑ دیا ہے۔"

"چودھری! میں ہوں تھانے دار ذرا دوسری قسم کا۔ جو کچھ تم نے کہہ دیا ہے، فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ اب تم جا کر باہر بیٹھو تاکہ میں اس سے دو چار باتیں کر لوں۔"

"چھوڑیں ملک صاحب، اس غریب کو تنگ کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ مجھ سے بات کریں۔ میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ آپ جیسے افسروں کا ہم ہمیشہ خیال رکھتے ہیں۔"

"میں اس سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے قدرے سختی سے کہا: "تم دو منٹ کے لیے باہر چلے جاؤ۔"

"یہ نہیں ہو سکتا جناب۔" اُس نے اٹھتے ہوئے کہا: "بات ہوگی تو سامنے ہوگی۔ اُٹھ اوئے رحمت علی، چلیں۔ معلوم ہوتا ہے ملک صاحب نے ہمیں پہچانا نہیں۔"

دونوں کمرے سے نکل گئے۔ میں نے اُنھیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دوبارہ آئیں گے۔

کچھ دیر بعد ہی ہیڈ کلرک میرے پاس آیا اور نوٹوں کی گڈی میز پر رکھتے ہوئے بولا: "جناب، یہ پیسے چودھری رب نواز نے دیے ہیں۔ بڑی منت کر رہا ہے، کہتا ہے کہ لڑکی اُن کی عزیزہ ہے۔ اس لیے وہ اُس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"معاملہ کچھ گڑبڑ معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا: "تم یہ پیسے پاس ہی رکھو اور کسی طرح رحمت علی کو الگ کرنے کی کوشش کرو۔ میں اس سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"جناب، حکم کریں تو چودھری کو تھوڑی دیر کے لیے اندر بند کر دوں؟"

"کسی گڑبڑ کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کام آرام سے ہو سکتا ہے، اُسے آرام سے ہی کرنا چاہیے۔"

ہیڈ کلرک واپس چلا گیا اور میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد وہ رحمت علی کو لیے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوا اور بولا: "جناب، یہ شریف آدمی اپنی بیوی کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ آپ اسے بیوی کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دیں۔"

میں سمجھ گیا۔ وہ چودھری کو فریب دے کر اُسے میرے پاس لے آیا تھا۔ میں نے رحمت علی کو بیٹھنے کے لیے کہا اور ہیڈ کلرک کو واپس بھیج دیا۔

"رحمت علی، معاملہ کیا ہے؟" میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ "تمھاری بیوی اکیلی کیوں گھر سے نکلی تھی؟"

وہ تھوڑا سا فکر مند نظر آنے لگا۔ بولا: "ایسی تو کوئی بات نہیں ہے جی۔ چودھری صاحب آپ کو بتا ہی چکے ہیں کہ سلطانہ ادھر اپنے رشتے داروں سے ملنے آئی تھی۔"

"ٹھیک، وہ تمھاری بیوی ہے۔ تم جب چاہو اُسے ساتھ لے جاؤ۔ یہ باتیں تو میں ایکسیڈنٹ کی رپورٹ مکمل کرنے کے لیے پوچھ رہا ہوں۔ وہ گھر سے کتنے بجے نکلی تھی؟"

اس نے سر کھجلاتے ہوئے کہا: "وقت تو مجھے یاد نہیں، میرا خیال ہے کہ دوپہر کے وقت روانہ ہوئی تھی۔"

گو وہ کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا لیکن آدمی خاصا مکار اور چال باز تھا۔

میں نے پوچھا: "یہاں وہ جن رشتے داروں سے ملنے آئی تھی، اُن کا اتا پتا کیا تھا؟"

اُس نے قدرے تامل کرتے ہوئے کہا: "اُس کا ایک دور پار کا ماموں اِدھر رہتا ہے۔ اُس سے کبھی کبھی ملنے آتی ہے۔ غلام محمد اُس کا نام ہے، لیکن مجھے اُس کا پتا یاد نہیں ہے۔"

وہ دوپہر کو گھر سے نکلی تھی اور شام کو اُس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اس دوران میں اُس پر مجرمانہ حملہ کیا گیا تھا۔ کیا اُسے اغوا کر لیا گیا تھا یا کوئی اور بات تھی؟ میں سوچ رہا تھا۔

میں نے رحمت علی کو چکر دینے کے لیے کہا: "رحمت علی، تمھاری بیوی کا کل شام کے وقت ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ غالباً وہ سڑک پار کر رہی تھی یا بس کو روکنا چاہتی تھی۔ بس ڈرائیور کا کہنا ہے کہ اُس وقت کچھ مویشی بھی سڑک کے کنارے چل رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی جانور بدک گیا ہو اور بس ڈرائیور کے قابو میں نہ رہی ہو۔ تمھارے گھر والوں نے سلطانہ کی روانگی کے بارے میں تمھیں کیا بتایا ہے؟"

"جی۔ ۔ ۔ کوئی خاص بات نہیں بتائی۔" اُس نے سوچتے ہوئے کہا: "اُدھر سے صرف اتنا ہی پتا چلا ہے کہ وہ شام کے وقت والوں سے رخصت ہو گئی تھی لیکن جب وہ گھر نہیں پہنچی تو مجھے یہاں پھیرو لوگوں کی زبانی پتا چلا کہ ایک اکیلی عورت حادثے میں زخمی ہوئی ہے۔ ہم نے اسپتال سے پتا کیا تو وہ سلطانہ ہی نکلی۔ جناب، آپ مہربانی کریں اور ہمیں اجازت دیں۔"

"ارے میاں، چلے جانا، جلدی کس بات کی ہے۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا: "ایک بات اور بتاؤ۔ سلطانہ جب اپنے ماموں کے گھر سے نکلی تو خیریت سے تھی نا؟ میرا مطلب ہے کہ وہاں اُس کا کسی سے جھگڑا تو نہیں ہوا تھا؟"

"جھگڑا کیوں ہونا تھا جی۔"

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ یعنی کوئی بات چھپا رہا تھا۔

میں نے پوچھا: "تمھارے ساتھ تو اُس کا معاملہ ٹھیک ٹھاک تھا؟ وہ گھر سے ناراض ہو کر تو نہیں نکلی تھی؟"

اُس نے میرے اس اشارے سے فوراً فائدہ اٹھایا، بولا: "او جی۔ ۔ ۔ بات یہ ہے کہ سلطانہ ذرا تیز طبیعت ہے۔ بڑی جلدی غصے میں آ جاتی ہے۔ آپ نے ٹھیک ہی اندازہ لگایا ہے، وہ ناراض ہو کر گھر سے نکل گئی تھی۔"

اتنے میں چودھری رب نواز تیز چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور رحمت علی سے بولا: "اوئے رحمت علی، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں نے تمھیں منع بھی کیا تھا۔" "ایک بھائی بن کر میری بات سنیں" اور رحمت علی کرسی سے [illegible] ہے کہ یہاں ایک شریف بھی میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ ملک صاحب [illegible] بڑے بہت آدمی ہیں۔ انھوں نے بڑی ہمدردی سے میری باتیں سنی ہیں۔ کہتے ہیں، جب چاہو سلطانہ کو لے جاؤ۔"

چودھری نے شک آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر بولا: "تو پھر ہمیں اجازت لینی چاہیے۔"

"تم لوگوں کو ایک دو روز انتظار کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "پہلی بات یہ ہے کہ لڑکی کی حالت سفر کے قابل نہیں ہے اور دوسری یہ کہ جب تک اُس کا بیان نہیں ہو جاتا، ہم اُسے جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔"

"اوئے ملک صاحب اتنے بھی اللہ لوگ نہیں ہیں۔" چودھری نے اُس کا بازو پکڑ کر کھینچا: "آؤ چلیں۔"

دونوں کمرے سے نکل گئے۔ چودھری نے "آؤ چلیں" خاصے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔ مجھے خیال بھی آیا کہ شاید اُس نے سلطانہ کو اسپتال سے نکالنے کی کوئی تدبیر سوچ لی تھی۔ لیکن یہ خیال جتنی تیزی سے ذہن میں آیا تھا، اتنی تیزی سے نکل گیا۔

دوپہر کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ سلطانہ روپوش ہو گئی ہے۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ چودھری نے اُسے اغوا کروا لیا ہوگا۔ میں فوراً اسپتال پہنچا۔ وہاں پر صورت حال مختلف نظر آئی۔ چودھری رب نواز لیڈی ڈاکٹر سے اُلجھ رہا تھا۔

مجھے دیکھا تو اُس نے کہا: "اچھا ہوا آپ آ گئے ہیں۔ میں ان لوگوں کے خلاف رپورٹ درج کرانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے جان بوجھ کر سلطانہ کو غائب کر دیا ہے۔"

"یہ جیل خانہ نہیں، اسپتال ہے۔" ڈاکٹر نے غصے سے کہا۔ "اگر کوئی مریض علاج نہیں کروانا چاہتا تو ہم اُسے زبردستی نہیں روک سکتے۔ آپ اسپتال میں شور نہیں مچائیں، نکلیں یہاں سے۔"

"لڑکی کیسے غائب ہو گئی؟" میں اپنے سپاہیوں کی طرف مڑا جو احمقوں کی طرح ایک طرف کھڑے تھے۔ "تم لوگ کہاں تھے؟"

"جناب، ہم ایک منٹ کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوئے۔" ایک سپاہی نے جواب دیا۔ "تھوڑی دیر پہلے لڑکی نرس کے ساتھ باتھ روم گئی تھی۔ زنانہ باتھ روم کی طرف مردوں کو جانے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے ہم باہر ہی کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر بعد نرس نے شور مچا دیا کہ لڑکی بھاگ گئی۔ ۔ ۔ لڑکی بھاگ گئی۔ ہم لڑکی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑے، مگر کچھ پتا نہیں چلا۔"

اُس کی گردن تنی ہوئی اور گلے میں رنگین جالندھر نرس کو بلوایا۔ وہ قدرے بھاری اُس کے ساتھی کا لباس اگرچہ صاف تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق وہ پندرہ سال پر شکنیں بھی پڑی ہوئی تھیں اور کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ اُس کا نام مسز زبیدہ تھا۔

میرے استفسار پر اُس نے جواب دیا "جناب! میں مریضہ کو لیبر روم میں چھوڑ کر پانچ منٹ کے لیے ایک مریض کے کمرے میں گئی، واپس آئی تو وہ غائب ہو چکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی عورت کی چادر سر پر ڈال کر یا کپڑے بدل کر ان کی آنکھوں میں دھول جھونک گئی تھی۔" اُس کا اشارہ سپاہیوں کی طرف تھا۔

میں نے لیڈیز باتھ روم کا جائزہ لیا تو اُس کا اندازہ کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوا، کیونکہ باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا، البتہ درمیان میں ایک تقریباً سات فٹ اونچی دیوار تھی جو مردانہ اور زنانہ حصے کو الگ کرتی تھی۔ لیکن ایک مجروح عورت اُس دیوار کو کسی مدد کے بغیر نہیں پھاند سکتی تھی۔

میں نے سپاہیوں کو امکانی جگہوں کی طرف دوڑایا اور چودھری سے پوچھا "یہ لڑکی فرار کیوں ہوئی ہے؟"

"میرا تو خیال ہے کہ اسے اسپتال والوں نے غائب کیا ہے" اُس نے جواب دیا "اُس وقت ہم تینوں یہیں موجود تھے۔ سلطانہ نرس کے ساتھ باتھ روم میں گئی اور پھر غائب ہو گئی۔ آپ ان لوگوں کے خلاف رپورٹ درج کریں۔"

"کیوں؟" میں نے قدرے سختی سے پوچھا "ان کو سلطانہ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"وہ ان کے سامنے روئی گائی ہو گی . . ." اُس نے بے خیالی میں کہا "انھوں نے ہمدردی میں آکر . . . خیر چھوڑیں اس بات کو۔" اُسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا "آپ ان کے خلاف اغوا کی رپورٹ درج کریں۔"

اُس کا یہ کہنا کہ سلطانہ روئی گائی ہو گی، اس بات کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ لڑکی مظلوم تھی۔ اُس پر ظلم ہوا تھا اور وہ ان لوگوں سے چھپتی پھرتی تھی۔ دوسرا اشارہ اُس کی باتوں سے یہ ملتا تھا کہ وہ شوہر سے زیادہ لڑکی میں دلچسپی رکھتا تھا۔

"یہ رونے گانے کا کیا چکر ہے؟" میں نے رحمت علی سے پوچھا "کیا تم اپنی بیوی کو خوش نہیں رکھتے؟"

"ملک صاحب، یہ بے چارہ کیا کرے" چودھری نے جواب دیا "لڑکی بہت تیز ہے۔ اس کے قابو نہیں آتی۔"

وہ شخص رحمت علی کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ لڑکی اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی" میں نے کہا۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ تم لوگوں کے ڈر سے بھاگی ہے۔ اُسے کسی نے اغوا نہیں کیا۔"

وہ اغوا کی رپورٹ پر اصرار کرتا رہا۔ میں نے اُسے آکر بات کرے۔

شام کے وقت ایک ادھیڑ عمر شخص تھانے آیا۔ اُس نے اپنا نام عظمت علی بتایا اور کہا کہ اُس کی بیوی مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔

"کیا تم اپنی بیوی کو ساتھ لائے ہو؟"

"نہیں جی" اُس نے "آپ کو گھر پر بلایا ہے۔ آپ بعد آئیں اور سادہ لباس میں آئیں۔"

"معاملہ کیا ہے؟"

"معاملہ وہی بتائے گی۔ اُس نے مجھے پریشان کر دیا۔ ہو سکتا ہے میرے ہی خلاف رپورٹ لکھوانا چاہتی ہو۔"

"پھر تو آپ بہت ہی سیدھے آدمی ہیں۔ آپ کو چاہیے تھا تھانے کا ایک چکر لگا کر واپس چلے جاتے اور اُسے کہتے کہ آپ نے تھانیدار کو پیغام پہنچا دیا ہے۔"

"یہ ایک دن کی بات نہیں ہے جی، زندگی بھر کا آپ شام کو ضرور تشریف لے آئیں، ورنہ وہ مجھے چین سے بیٹھنے دے گی۔"

میں نے اُس کے گھر کا پتا نوٹ کر لیا اور وعدہ کیا کہ ملنے آ جاؤں گا۔

جو پتا اُس نے نوٹ کروایا تھا، وہ سرکاری کوارٹروں اسپتال کا بیشتر عملہ انھی کوارٹروں میں رہتا تھا۔

ڈیوٹی سے فارغ ہو کر میں گھر گیا۔ وہاں کچھ دیر آرام کیا اور بعد عظمت علی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ مجھے سادہ سی بیٹھک میں بٹھایا اور رسمی بات چیت کے کو میرے بارے میں بتانے کے لیے اندر چلا گیا۔

چند لمحوں کے بعد ایک بھاری جسم کی عورت کمرے ہوئی۔ اُس نے سفید شلوار اور رنگین قمیص پہن رکھی تھی۔ اُس سلام کیا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ اُس کی شکل کچھ مانوس سی محسوس میں نے چند روز پہلے اُسے کہیں دیکھا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔" اُس یونیفارم سے بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ میں مسز زبیدہ ہوں

"اوہ . . . میں یہی سوچ رہا تھا کہ میں نے آپ کو ہے۔" میں نے کہا۔ یونیفارم میں وہ اپنی اصل عمر سے چھوٹی لگتی گھر کے کپڑوں میں اصل عمر سے بڑی لگتی تھی۔ میرے ذہن یہ بات آئی کہ وہ سلطانہ کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی تھی بار سلطانہ اُسی کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔

"سلطانہ کہاں ہے؟" میں نے اپنے اندازے کی روشنی میں سوال کیا۔

"میں نے اُسی کے بارے میں بات کرنے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے۔" اُس نے دھیمی آواز میں کہا اور اٹھ کر اندر کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کر دیا "لیکن بات کرنے سے پہلے میں آپ سے یہ وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ آپ اُس دکھی لڑکی کو چودھری کے حوالے نہیں کریں گے اور اُس کی پوری مدد کریں گے۔"

"میں نے اسی لیے دو سپاہیوں کی ڈیوٹی لگائی تھی۔" میں نے کہا "تم نے اُسے غائب کس طرح کیا تھا؟"

"بہت آسان طریقے سے۔" اُس نے جواب دیا "لیکن اس سے پہلے میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے اُسے کیوں غائب کیا ہے۔ حادثے کے دوسرے روز ایک نرس نے مجھے بتایا کہ وہ آدمی سپاہیوں کو رشوت دے کر سلطانہ کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ وہ دو آدمی چودھری رب نواز اور رحمت علی ہوں گے۔ مجھے خود بھی اُن دونوں پر شک تھا۔ میں نے سلطانہ سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ بُری طرح کانپنے لگی۔ اُس نے میرے پیر پکڑ لیے اور میری منت کی کہ میں اُسے اُن لوگوں کے چنگل سے محفوظ رکھوں۔ میں نے اُسے تسلی دی اور کہا کہ میں کوئی طریقہ سوچتی ہوں۔ مجھے ڈر بھی تھا، اگر چودھری رب نواز کو پتا چل گیا تو میں بھی مصیبت میں پھنس جاؤں گی۔ بہرحال میں سلطانہ کو باتھ روم میں لے گئی اور چند منٹ کے بعد شور مچا دیا کہ لڑکی بھاگ گئی ہے۔ حالانکہ سلطانہ اُس وقت باتھ روم میں ہی تھی۔ آپ کے سپاہیوں نے پہلے باتھ روم میں نظر ڈالی۔ میں نے ایک خالی باتھ روم کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ سلطانہ اس کے اندر تھی۔ میں نے انھیں باہر جا کر دیکھنے کا مشورہ دیا۔ وہ باہر کی طرف بھاگے۔ اُن کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے سلطانہ کو پہلے ایک اسپیشل وارڈ میں چھپایا اور پھر اپنے گھر لے آئی۔ میرے شوہر کو بھی حقیقت معلوم نہیں ہے۔ اُسے میں نے یہی بتایا ہے کہ سلطانہ میری ایک سہیلی کی بیٹی ہے اور ایک حادثے میں زخمی ہو گئی ہے۔ میں اُسے اسپتال میں رکھنے کے بجائے گھر لے آئی ہوں۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ تم اسے کب تک اپنے پاس رکھو گی؟ پھر سلطانہ خود کیا کہتی ہے؟"

"اُس کی کہانی بہت لمبی ہے۔ یہ لوگ اُسے قتل کرنا چاہتے ہیں۔"

"قتل کرنا چاہتے ہیں؟ کیوں؟ وجہ کیا ہے؟"

"ملک صاحب! آپ اِس وقت سادہ لباس میں ہیں اور ڈیوٹی پر بھی نہیں ہیں۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ تھانیدار بن کر نہیں، ایک بھائی بن کر میری بات سنیں اور سوچ سمجھ کر جواب دیں۔ سلطانہ کا خیال یہ ہے کہ یہاں ایک غریب اور بے سہارا کو انصاف نہیں مل سکتا۔ پولیس کے معاملے میں اُسے بہت تلخ تجربہ ہوا ہے۔ اُسے پولیس سے انصاف کی کوئی توقع نہیں ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پولیس میں یقیناً خدا ترس افسر بھی ہوں گے۔ آپ مجھے صرف اتنا بتائیں کہ آپ ایک یتیم اور بے سہارا لڑکی کی خاطر ایک جاگیردار سے ٹکر لے سکتے ہیں؟"

"میں پوری بات سنے بغیر کیا کہہ سکتا ہوں؟" میں نے کہا "بلاوجہ کوئی شخص کسی سے ٹکر نہیں لیتا۔ ہم لوگ قانون اور اپنے اختیارات کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی سائل کی مدد کر سکتے ہیں۔ اگر یہ لڑکی واقعی مظلوم ہے تو میں اس کی مدد کرنے کی مزید کوشش کروں گا۔ لیکن میں تفصیل سنے بغیر وعدہ نہیں کر سکتا۔"

وہ کچھ مایوس نظر آنے لگی۔ بولی "پھر تو آپ سے بات کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ سلطانہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔"

"آپ مجھے پورا واقعہ تو سنائیں۔" میں نے کہا "اور مجھ پر بھروسا رکھیں۔ میں نے ظالموں کا کبھی ساتھ نہیں دیا۔"

میرے اصرار پر وہ پوری بات سنانے پر راضی ہو گئی۔ بات شروع کرنے سے پہلے اُس نے سلطانہ کو بھی کمرے میں بلا لیا تاکہ اگر زبیدہ کوئی بات بھول جائے تو وہ بتا دے۔

سلطانہ کے چہرے پر غایت درجہ دہشت طاری تھی۔ وہ زبیدہ بیگم کے قریب سکڑ کر بیٹھ گئی اور خالی نظروں سے فرش کو گھورنے لگی۔ اُس کی آنکھوں سے ویرانی جھانک رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا سے بالکل مایوس ہو چکی ہے۔ حالات نے اُس کی خوشیاں اور مسکراہٹیں اُس سے چھین لی تھیں۔

زبیدہ بیگم نے اُس کی موجودگی میں جو واقعات مجھے بتائے وہ میں اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

سلطانہ سید پور کی رہنے والی تھی اور غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، تاہم اپنی خوب صورتی کی وجہ سے پورے گاؤں میں مشہور تھی۔ اس کی خوب صورتی کا چرچا رب نواز نے بھی سنا۔ اُس نے موقع پا کر سلطانہ کو دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ ایک روز وہ اُن کے گھر پہنچ گیا۔

سلطانہ کے باپ کریم بخش نے اپنی حیثیت کے مطابق اُس کی خاطر تواضع کی اور اُس کی آمد کا مقصد پوچھا۔

"چاچا، میں ایک غرض لے کر تمھارے پاس آیا ہوں۔" چودھری رب نواز نے کہا "اُمید ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔"

بوڑھا کریم بخش یہ بات سُن کر فکر مند ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ جاگیر دار کا خود سر بیٹا اُس کے پاس کیا عرض لے کر آیا تھا۔ اُس کی اکلوتی بیٹی سلطانہ حسین اور پڑھی لکھی تھی۔ رب نواز یقیناً اُس کے پاس اِسی سلسلے میں آیا تھا۔

"چودھری صاحب، میں ایک معمولی سا غریب آدمی ہوں۔" اُس نے عاجزی سے کہا۔ "میں تو اپنی اُمیدیں پوری نہیں کر سکتا۔ بھلا کسی اور کی اُمیدیں کیسے پوری کر سکتا ہوں؟"

"کریم بخش، تم میری اُمید پوری کر سکتے ہو۔ میں تمھاری بیٹی سلطانہ کا رشتہ مانگنے آیا ہوں۔"

کریم بخش کو معلوم تھا کہ رب نواز کی شادی تین سال قبل ہو چکی تھی اور اُس کا ایک بچہ بھی تھا۔

"چودھری صاحب، آپ یقیناً اپنے کسی دوست یا عزیز کے لیے رشتہ مانگنے آئے ہیں۔" کریم بخش نے کہا۔ "کیونکہ آپ تو ماشاء اللہ شادی شدہ ہیں اور آپ کی شادی کو ابھی زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا۔"

"کریم بخش، مجھے اپنے لیے رشتہ چاہیے۔" رب نواز نے صاف لفظوں میں کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے۔"

"مگ . . . کیا بڑے چودھری صاحب اِس بات کی اجازت دے دیں گے؟" کریم بخش نے فرار کی راہ نکالی۔

"فی الحال یہ کام بڑے چودھری صاحب کے علم کے بغیر ہوگا۔" رب نواز نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں سلطانہ کو الگ مکان میں رکھوں گا اور مناسب موقع دیکھ کر بڑے چودھری صاحب کو بتا دوں گا۔"

کریم بخش نے ایک اور فرار کی راہ نکالی۔ بولا۔ "چودھری صاحب، آپ سے اچھا رشتہ اور کون سا ہوگا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں زبان دے چکا ہوں۔ میری بیوی کے بھانجے سے سلطانہ کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔"

"اچھا! نام کیا ہے آپ کے ہونے والے داماد کا؟"

"اُس کا نام . . . رفیق ہے۔ رفیق حسین۔"

کریم بخش کی بیوی نے ایک دو مرتبہ یہ کہا تھا کہ اُس کی بہن اپنے بیٹے رفیق حسین کے لیے سلطانہ کے رشتے کی خواہش مند ہے۔ لیکن کریم بخش نے انکار کر دیا تھا کیونکہ لڑکا کوئی مستقل کام نہیں کرتا تھا۔ اب اُس نے رب نواز سے جان چھڑانے کے لیے رفیق حسین کا نام لے دیا تھا۔

رب نواز سمجھ گیا کہ کریم بخش اُسے ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں کریم بخش، منگنیاں ٹوٹ بھی جایا کرتی ہیں۔ ایک آخری عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اگر رفیق حسین نے شادی سے انکار کر دیا تو پھر میری باری ہوگی۔"

رب نواز تو رخصت ہو گیا لیکن کریم بخش سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اُسے معلوم تھا کہ رب نواز آسانی سے ٹلنے والا نہیں تھا۔ اُس کی سکینہ اندر کمرے میں ساری گفتگو سُن رہی تھی۔ رب نواز کے جانے کے بعد وہ کمرے میں آ گئی اور اپنے شوہر کو مشورہ دیا کہ لڑکی کی فوراً [illegible] کر دینی چاہیے۔

"کس کے ساتھ؟" کریم بخش نے بیزاری سے پوچھا۔ "تمھارے بھانجے کے ساتھ؟" اُس کی طبیعت بہت چڑچڑی ہو رہی تھی۔

"ہاں، اب میرے اوپر نکالو سارا غصّہ!" سکینہ نے کہا۔ "میرا بھانجا تمھیں اتنا ہی بُرا لگتا ہے تو اُس کا نام لینے کی کیا ضرورت [illegible]"

"اُس شیطان سے جان نہ چھڑواتا تو اور کیا کرتا؟"

"وہ شیطان تمھارے جیسا بدھو نہیں ہے۔" سکینہ [illegible] "مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور رفیق سے ملے گا۔"

کریم بخش چونک کر بولا۔ "یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔ اگر [illegible] کہہ دیا کہ اُس کی کوئی منگنی وَنگنی نہیں ہوئی تو بات بگڑ جائے [illegible] رفیق سے مل کر آتا ہوں۔"

"لیکن اُس سے بات کیا کرو گے؟"

کریم بخش نے جلدی سے جوتے پہنے، ٹوپی سر پر [illegible] سکینہ کی بات کا جواب دیے بغیر گھر سے نکل گیا۔

(۱)

رفیق حسین مٹھائی والے کی دکان کے سامنے رکھی [illegible] بینچ پر بیٹھا ایک دوست کے ساتھ گپیں ہانک رہا تھا۔ اُس [illegible] چوبیس پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ قد چھ فٹ سے او[illegible] چکا تھا اور حلیہ ایسا ہی تھا جیسا آوارہ گردوں کا ہونا چاہیے [illegible] نے اپنے خالو کو فکر اور تفکری کے عالم میں آتے دیکھا تو اپنے دو[ست] سے بولا۔ "لے پیارے، آج کوئی لمبا ہی چکر معلوم ہوتا ہے۔ خا[لو] ہمیشہ سے اُکھڑے ہوئے لگ رہے ہیں۔"

کریم بخش نے قریب پہنچ کر رفیق کا بازو پکڑا اور [اُسے] ایک طرف لے گیا۔ بولا۔ "رفیق پتر، ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ [تمھاری] مدد کی ضرورت ہے۔"

رفیق تو خود بھی خالو کو خوش کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔ وہ سلطانہ کو پسند کرتا تھا اور اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

"حکم کریں، خالو جان!" اُس نے فرمانبرداری سے کہا۔ "نالائق سے آپ کو کیا کام پڑ گیا؟"

"رفیق پتر، بات یہ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے چودھری [رب نواز] ہمارے گھر آیا تھا۔ وہ . . . وہ کمینہ سلطانہ کا رشتہ مانگ [رہا تھا]۔ مم . . . میں نے اُس سے کہہ دیا کہ سلطانہ کی بات تمھارے [ساتھ] ہو چکی ہے۔"

رفیق کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ "سچ . . . سچ؟ کیا [illegible]

[illegible] نے؟"

"میں نے اُسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ سلطانہ کی تمھارے [ساتھ م]نگنی ہو چکی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تمھارے پاس پوچھنے کے لیے [آئے۔ ت]م اُسے کہہ دینا کہ ہاں منگنی ہو چکی ہے۔"

[رف]یق نے بات پر غور کیا اور مکاری سے بولا۔ "یہ تو گھر میں بیٹھ [کر طے ہو]نے والی بات ہے۔"

[ک]ریم بخش نے اُس کی بات سے اتفاق کیا اور دونوں گھر پہنچ گئے۔ [رفیق] کے کہنے پر سکینہ کو بھی گفتگو میں شامل کر لیا گیا۔

[ک]چھ بات چیت کے بعد رفیق نے کہا۔ "خالو، آپ کی عزت کی [خاطر] میری جان بھی حاضر ہے۔ لیکن بات پکی ہونی چاہیے۔"

"پکی بات!" کریم بخش نے حیرانی سے کہا۔ "میں تمھارا مطلب [نہیں س]مجھا۔"

"میرا مطلب ہے کہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر [س]لطانہ کی بات پکی کر لی جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔"

کریم بخش نے اپنی بیوی سے کہا۔ "سُن رہی ہو!"

"[illegible] کوئی غیر تو نہیں ہوں، خالو۔" رفیق نے کہا۔ "اپنے ہی سر [پر ہ]اتھ نہیں رکھیں گے تو کون رکھے گا؟"

"[لو] میاں، ایک مسئلہ تو حل ہو جائے۔" خالو اپنے جوش کو دباتے [ہوئے] بولے۔ "اگر تم ہماری مدد نہیں کرنا چاہتے تو صاف انکار کر دو [illegible] چاہیں۔"

"[illegible] تنی جلدی کس بات کی ہے۔" سکینہ نے بھانجے کے [illegible] مارا۔ "تیرے خالو اِس وقت پریشان ہیں۔ ایک مصیبت [illegible] ٹ جائے، پھر تیرے معاملے پر بھی غور کر لیں گے۔"

[illegible] ہے خالہ کہ جھوٹ بولتے ہوئے کچھ اچھا نہیں [illegible] لیکن کل کو اگر سلطانہ کی شادی کسی اور سے [illegible] میری گردن دبوچ لے گا۔"

"[illegible] کے ابا، بات تو یہ ٹھیک کہتا ہے۔" سکینہ نے [illegible] جب اُس جھوٹ کا پتا چلے گا تو وہ خوش [illegible]

[illegible] نے دل میں [illegible] تو پھر چودھری [illegible] کچھ سوچ بچار کے بعد اُس نے حامی بھر [illegible] یہ تھی کہ اگر چودھری رب نواز نے زیادہ [illegible] کوشش کی تو وہ گاؤں چھوڑ کر چلا جائے گا۔

[illegible] کے بعد رب نواز، رفیق حسین سے ملا اور کہا۔ "رفیق حسین [illegible] بخش کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

[illegible] سے باہر ایک کنوئیں پر ہوئی تھی۔ رب نواز کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔

"آپ نے ٹھیک سنا ہے، چودھری صاحب۔" رفیق نے جواب دیا۔ "کریم بخش میرا سگا خالو ہے۔"

"تم کام کیا کرتے ہو، رفیق حسین؟"

"فی الحال تو جی، بے کار ہوں۔"

رب نواز نے جیب سے چند نوٹ نکال کر رفیق کی طرف بڑھائے اور بولا۔ "یہ لو، یہ کچھ پیسے رکھ لو۔ مجھے بے کار نوجوانوں پر بڑا ترس آتا ہے۔ یہ پیسے رکھ لو اور فی الحال شادی وادی کی بات بھول جاؤ۔ اپنے خالو سے کہہ دینا کہ تم اُس کی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتے۔"

رفیق نے پیسوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بولا۔ "کیوں جناب، شادی کی بات کیوں بھول جاؤں؟"

رب نواز کے ایک ساتھی نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "دیکھ اوئے کاکا، زیادہ سیانا بننے کی کوشش نہیں کر۔ چودھری صاحب کو کڑی پسند آگئی ہے۔ اُس کی شادی ان کے ساتھ ہوگی۔ تجھے کوئی اور رشتہ مل جائے گا۔"

"نہیں جناب، یہ نہیں ہو سکتا۔" رفیق نے جرأت سے کہا۔ "میں بغیر کسی وجہ کے شادی سے انکار نہیں کر سکتا۔"

رب نواز چند لمحوں تک سخت نظروں سے رفیق کو گھورتا رہا۔ پھر اُس نے پیسے جیب میں رکھ لیے اور اپنے ساتھیوں کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "جوان تو یہ بڑا سوہنا ہے، پر کیا کریں۔ اسے خود ہی اپنی زندگی کی پروا نہیں ہے۔"

رفیق اِس دھمکی کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔

کریم بخش نے جب یہ بات سُنی تو وہ فکر مند ہوا اور اُس نے رفیق کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے گاؤں سے چلا جائے لیکن رفیق نے اِس بات کو مذاق میں ٹال دیا۔

چند روز کے بعد اُس کی لاش کھیتوں میں پڑی ہوئی پائی گئی۔ اُسے کلہاڑی کے پے در پے وار کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔

کریم بخش بخوبی جانتا تھا کہ رفیق کا قاتل کون تھا لیکن وہ پولیس [illegible] سا لے معلوم تھا کہ وہ اپنے الزام کا کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکے گا۔ یوں بھی لٹنے جڑنے جاگیردار سے ٹکر لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

اُسے یقین تھا کہ رب نواز اُس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا لہٰذا اُس نے بیوی کے مشورے سے گاؤں چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا لیکن ایک غریب آدمی کے لیے بنا بنایا گھر چھوڑنا اور دوسری جگہ آباد ہونا آسان کام نہیں ہوتا۔ اِس بات کی اطلاع رب نواز کو بھی ہو گئی اور وہ اپنے مطالبے کے ساتھ دوبارہ اُس کے گھر پہنچ گیا۔

"کریم بخش، مجھے رفیق حسین کی موت کا بڑا دکھ ہوا ہے۔" اُس

نے چالاکی سے کہا: "بہت خوب صورت جوان تھا لیکن قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، موت کا ایک دن معین ہے۔"

"ہاں، سُنا تو یہی ہے۔" کریم بخش نے بھولے سے کہا: "لیکن یہ بھی سُنا ہے کہ قاتل کی معافی نہیں ہوتی۔"

"معافی اُن کی نہیں ہوتی جو پکڑے جاتے ہیں۔"

"میں آسمانی عدالت کی بات کر رہا ہوں۔"

"کریم بخش، یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ ان کو چھوڑو۔ میں تاریخ لینے آیا ہوں۔"

"تت . . . تاریخ!" کریم بخش گھبرا گیا۔ "کس چیز کی تاریخ؟"

"شادی کی تاریخ اور کس چیز کی تاریخ۔"

"چودھری صاحب، میں نے ابھی اپنی برادری سے مشورہ بھی نہیں کیا اور دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں کبھی کسی نے خفیہ شادی نہیں کی۔ اس سے لڑکی کی ذات پر حرف آئے گا۔"

"چاچا، ایک بات تو بتا۔" رب نواز نے کہا۔ "کیا تیرا خاندان ہم سے زیادہ عزت والا ہے؟"

"چودھری صاحب، یہ بات میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔"

"جب خفیہ شادی سے میری ذات پر حرف نہیں آسکتا تو تیری بیٹی کی ذات پر کیسے آئے گا۔ یہ گاؤں ہماری جاگیر ہے۔ یہاں کوئی شخص ہمارے خلاف منہ کھولنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ تمھیں برادری سے مشورہ کرنے کے لیے کتنی مہلت چاہیے؟"

"دو چار ہفتے تو لگ ہی جائیں گے۔"

"لیکن سُنو، میں تمھیں برادری سے مشورہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس طرح تو ساری بات ہی کھل جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ دو چار قریبی رشتے داروں سے مشورہ کرلو اور انھیں تاکید کردو کہ بات باہر نہ جائے۔"

سلطانہ اندر بیٹھی یہ ساری گفتگو سُن رہی تھی۔ اُسے اس بات کا بڑا رنج تھا کہ اُس کے ماں باپ کو اُس کی وجہ سے تکلیف اُٹھانا پڑ رہی تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ رب نواز سے خود بات کرے گی۔

چند روز کے بعد رب نواز ایسے وقت ان کے گھر آیا جب کریم بخش کام پر گیا ہوا تھا۔ سلطانہ، رب نواز کے سامنے نہیں جاتی تھی۔ اس روز اس نے ماں سے اجازت لی اور چادر اوڑھ کر بیٹھک میں چلی گئی۔

رب نواز نے اسے دیکھا تو خوش ہوکر بولا: "بسم اللہ! . . . آج تو چودھویں کا چاند چڑھ گیا ہے۔"

سلطانہ کو چودھریوں کی حیثیت اور ان کے ملنے کا سلسلہ

حلیم تھا۔ اُس نے سختی سے پوچھا: "چودھری صاحب ہمارے گھر کیوں آتے ہیں؟"

"تو بھئی، تمھیں ابھی تک یہی نہیں پتا؟" رب نواز نے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "حد ہوگئی، کریم بخش نے تمھیں بتایا

"آپ کو بزرگوں کی عزت کرنا بھی نہیں آتی۔" سلطا کہا: "اولاد کے سامنے اُن کے والدین کا ذکر احترام سے کرنا

"دراصل ہمیں اس طرح بولنے کی عادت ہوگئی ہے" نے کہا: "شادی کے بعد تم سے آداب سیکھنا پڑیں گے۔"

"چودھری صاحب، شادی خوشی سے کی جاتی ہے میں دونوں خاندانوں کی رضامندی کے علاوہ لڑکے اور لڑ مرضی بھی شامل ہونی چاہیے۔"

"یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ آج کل خاندانوں کو کوئی البتہ لڑکے اور لڑکی کی مرضی والی بات تھوڑی بہت ٹھیک میں تو سرسے پیر تک راضی ہوں۔ نکاح کے وقت تمھا ہاں ہوجائے گی۔ اللہ اللہ خیر صلا . . . میں معمولی آدمی ہوں میرے پاس دولت ہے، عزت ہے، دنیا کا ہر عیش میں تمھیں سونے میں پیلا کردوں گا، الگ مکان میں رکھو کی ہر خوشی تمھارے قدموں میں ڈال دوں گا۔"

"جو شخص میرے باپ کو 'تو تُو' کرکے مخاطب کرتا مجھے کیا خوشی دے سکتا ہے؟" سلطانہ نے کہا۔

رب نواز کو دنیاوی جاہ و جلال کا بڑا گھمنڈ تھا۔ وہ آدمی کی دکھاوے کے طور پر بھی عزت نہیں کرسکتا تھا۔ قدرے برہمی سے کہا: "بتایا تو ہے کہ یہ ہماری خاندانی

"کیا آپ اپنے باپ کو بھی اسی طرح مخاطب کرتے

رب نواز کا چہرہ سُرخ ہوگیا، بولا: "میرے وال بڑے چودھری صاحب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، اُن کا بڑا مرتبہ دیا ہے۔ اُن کا اور کمی کمینوں کا کیا جوڑ . . ."

"یہی بات تو میں آپ کو بتانے کی کوشش کر رہی ہو بڑے لوگ ہیں، ہم کمین لوگ ہیں۔ ہمارا اور آپ کا جو ہو سکتا۔"

"یہ الگ معاملہ ہے۔" رب نواز اپنے جوش کو دباتے بولا: "اصل بات یہ ہے کہ ہر اچھی چیز پر پہلا حق ہمارا ہوتا ہے۔ کھیتی باڑی مزارع کرتا ہے، فصل ہم کھاتے ہیں۔ جوتا مو ہے، پہنتے ہم ہیں۔ کپڑا جولاہا تیار کرتا ہے، سجتا ہمارے پر ہے۔ حویلیاں راج مزدور بناتے ہیں، رہتے ہم ہیں۔ سد یہی قانون ہے۔"

"یہ ظالموں کا قانون ہے۔" سلطانہ نے کہا: "مجھے آ

سمجھانا چاہتے ہیں ناکہ غریب کے گھر میں کوئی خوب صورت لڑکی پیدا ہوجائے تو اُس پر پہلا حق جابر جاگیردار کا ہوتا ہے؛ جس طرح حویلی تیار ہو جانے کے بعد راج مزدوروں کو نکال باہر کیا جاتا ہے اُسی طرح خوب صورت لڑکی کے ماں باپ کو دھکا دے کر ایک طرف کردیا جاتا ہے؟"

"تم باتیں بہت کرتی ہو۔ فکر نہ کرو، شادی کے بعد سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔"

"چودھری صاحب، میں آپ کو یہی بتانے آئی ہوں کہ میں آپ سے شادی نہیں کرسکتی۔ آپ ہمارے گھر کے چکر لگانا بند کردیں، اس سے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

رب نواز ایک دم غصے سے کھڑا ہوگیا اور سلطانہ کا بازو پکڑتے ہوئے بولا: "احمق لڑکی، ہم جس چیز پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں وہ ہماری ہوجاتی ہے۔ میں اگر چاہوں تو تمھیں ابھی اور اسی وقت اپنے ساتھ لے جاسکتا ہوں۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ اس تعلق کی ابتدا بُرے طریقے سے ہو۔"

اُس نے سلطانہ کا بازو چھوڑا اور تیز چلتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

شام کے وقت جب کریم بخش کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ پریشان ہوگیا۔ اُس نے سلطانہ اور اُس کی ماں کو راتوں رات ایک قریبی گاؤں بھیج دیا۔

اُس کا پروگرام یہ تھا کہ مکان اور سامان کا بندوبست کرنے کے بعد وہ بھی گاؤں سے چلا جائے گا لیکن وہ اپنے منصوبے پر عمل نہ کرسکا۔ چند روز کے بعد اُس کے مکان کے اندر اُس کی لاش پڑی ہوئی پائی گئی۔ بظاہر وہ ڈکیتی کی واردات معلوم ہوتی تھی لیکن سکینہ بی بی اور اُس کی بیٹی سلطانہ کو یقین تھا کہ کریم بخش کو رب نواز کے غنڈوں نے قتل کیا تھا۔

جس شخص کے گھر میں وہ ٹھہری ہوئی تھیں، وہ کریم بخش کا پرانا دوست تھا۔ اُس نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ فوراً کسی دوسری جگہ چلی جائیں، کیونکہ اُس کے خیال میں بدمعاشوں نے کریم بخش کو ہلاک کرنے سے قبل اُس سے ضرور معلوم کرلیا ہوگا کہ اُس نے اپنی بیوی بچوں کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی ڈرا ہوا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ کریم بخش کی بیوی اور بیٹی کو پناہ دینے کی وجہ سے خود اُس کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔

سکینہ بی بی اپنی بیٹی کے ہمراہ گھر سے نکلی تو اُس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ دونوں کے پاس کپڑوں کی ایک گٹھری اور چند روپے تھے۔ انھوں نے بس پکڑی اور سرگودھا کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچ گئیں۔ وہاں سکینہ کا ایک بھائی رہتا تھا جس سے ملے ہوئے اُسے برسوں ہوگئے تھے۔ اُس کا نام خیر دین تھا اور وہ پرچون کی دکان کرتا تھا۔ سکینہ کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ تھا یا مرچکا تھا۔

دونوں جب بس سے اُتریں تو شام ہوچکی تھی اور اڈے پر اِکّا دُکّا لوگ نظر آرہے تھے۔ سکینہ بی بی نے ایک تانگے والے سے کہا کہ اُسے خیر دین کے گھر جانا ہے۔

"کون سا خیر دین، بی بی؟" تانگے والے نے پوچھا: "یہاں تو کتنے ہی خیر دین ہوں گے۔" اُس نے باری باری دونوں کو گھورا۔ شکل و صورت سے وہ لوفر سا لگتا تھا۔ "کہاں سے آئی ہو؟"

سکینہ بی بی کو اُس کی آنکھوں میں بدنیتی نظر آئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا، مگر اور کوئی خالی تانگا نظر نہیں آیا۔

"خیر دین میرا بھائی ہے۔" اُس نے نوجوان تانگے والے کو بتایا: "کسی زمانے میں اُس کی پرچون کی دکان ہوا کرتی تھی۔"

"تو بھئی، تم تو پھر اپنی پھوپی ہوئیں۔" کوچوان نے کہا: "آجاؤ بیٹھ جاؤ۔ بابا خیر دین میرا تایا ہے۔"

سکینہ بی بی تانگے میں بیٹھنے لگی تو سلطانہ نے کہا: "ماں، ٹھہر جا۔ مجھے یہ آدمی ٹھیک نہیں لگتا۔"

"بیٹھو بہن میری۔" کوچوان نے کہا اور سکینہ کے ہاتھ سے گٹھری لے کر اگلی سیٹ پر رکھ دی۔ "اِدھر اب دوسرا تانگا نہیں ملے گا۔"

دونوں نہ چاہتے ہوئے بھی تانگے پر بیٹھ گئیں۔ تانگا مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا پرچون کی ایک چھوٹی سی دکان کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ دکان میں ایک سفید ریش بوڑھا بیٹھا تھا۔ اُس نے آنکھوں پر گول شیشوں والا پرانا سا چشمہ لگا رکھا تھا۔

"کیا خیر دین!" کوچوان نے آواز لگائی: "یہ دیکھ تیرے پردہنے لے کر آیا ہوں۔ اسی خوشی میں پیسے کا ایک تھڑا لے آ۔ یہ تیری بہن ہے۔"

خیر دین سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے، چشمہ درست کرتا ہوا باہر آ گیا اور باری باری دونوں عورتوں کو گھورنے لگا۔

سکینہ نے اُسے پہچان لیا۔ بولی: "بھائی خیر دین! میں سکینہ ہوں۔ یہ میری بیٹی سلطانہ ہے۔"

"سکینہ!" بوڑھے خیر دین نے حیرانی سے کہا: "اچھا اچھا، میں نے تو تمھیں پہچانا ہی نہیں۔ تم سے ملے ہوئے تو مدت ہی ہو چکی ہے۔ یہ بڑھاپا آج تمھیں کیسے یاد آ گیا؟"

"انسان پر جب وقت پڑتا ہے تو اپنے ہی یاد آتے ہیں۔"

خیر دین نے اُس کی آواز میں چھپے ہوئے درد کو محسوس کیا اور اُنھیں اپنے گھر لے گیا جو دکان کے ساتھ ہی تھا۔

سکینہ نے خالی کمروں میں نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا: "بچے کہاں ہیں؟ بھرجائی کہاں ہے؟"

"تیری بھرجائی چار سال ہوئے فوت ہو چکی ہے۔" خیر دین نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "بچے اِدھر اُدھر بکھر گئے ہیں۔ کوئی اس شہر میں، کوئی اُس شہر میں۔ کوئی کہاں اور کوئی کہاں۔ میں اِدھر اکیلا ہی ہوتا ہوں۔"

"بچے تو آتے جاتے ہوں گے؟"

"کوئی نہیں آتا۔" خیر دین نے مایوسی سے ہاتھ پھیلائے۔ "آدمی بڑھا ہو جائے تو اُس کے پاس کوئی نہیں آتا۔" پھر اُسے سلطانہ کا خیال آیا۔ اُس نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا: "ماشاءاللہ میری بھانجی تو بڑی سوہنی ہے۔ کتنے بہن بھائی ہیں اس کے؟"

"ایک ہی بیٹی ہے۔" سکینہ نے افسردہ لہجے میں کہا: "اللہ کسی غریب کی بیٹی کو خوب صورتی نہ دے۔"

"اللہ خیر کرے، بات کیا ہے؟"

سکینہ نے شروع سے لے کر آخر تک سارا قصہ سنا دیا۔

"بھائی خیر دین، ہمارا کچھ بھی باقی نہیں بچا۔" بات ختم کرنے کے بعد اس نے کہا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے: "گھر بار ختم ہو گیا۔ اس کے باپ کو ظالموں نے قتل کر دیا۔ ہم آخری وقت میں اُس کی شکل بھی نہیں دیکھ سکے۔ یہ چند کپڑے اور تھوڑے سے روپے ہماری کل پونجی ہیں۔"

"فکر نہیں کرو۔ فکر نہیں کرو۔" خیر دین نے اُسے تسلی دی۔ "مجھ پر اللہ کی بڑی مہربانی ہے۔ دکان سے اچھی کمائی ہو جاتی ہے۔ ہم سب کا گزارا ہو جائے گا۔ تمھاری وجہ سے میرے سُونے گھر میں بھی رونق آ جائے گی۔"

"مجھے تو چودھری کا خوف لگا ہوا ہے۔" سکینہ بی بی نے کہا۔ "کہیں وہ یہاں بھی نہ پہنچ جائے۔"

اس بات نے خیر دین کو بھی فکرمند کر دیا۔ اُس نے بظاہر بے پروائی سے کہا: "گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم دونوں خاموشی سے یہاں پڑی رہو۔ گھر سے باہر نکلنے یا زیادہ ملنے جلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

سکینہ بی بی نے اُس کی بات کو پلّے باندھ لیا اور سلطانہ کو بھی تاکید کر دی کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلے۔

اس طرح چند مہینے خیریت سے گزر گئے۔ خیر دین بھی خوش تھا۔ اُسے کھانے پینے کا آرام ہو گیا تھا۔

جس تانگے والے نے سکینہ اور سلطانہ کو خیر دین کے گھر پہنچایا تھا، اُس کا نام شوکت تھا اور وہ خیر دین کا دُور کا رشتے دار تھا۔ شام کو تانگا بند کرنے کے بعد وہ کبھی کبھی خیر دین کی دکان پر آ بیٹھتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اُس نے سکینہ اور سلطانہ کے بارے میں بات چھیڑنے کی کوشش کی، مگر خیر دین نے اُس کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی۔

ایک روز اُس کے ساتھ ایک مسکین صورت نوجوان بھی آیا جس کا اُس نے رحمت علی کے نام سے تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ ایک مِل میں کلرک تھا اور نیا نیا وہاں آیا تھا۔

اُس کے بعد رحمت علی نے بھی کبھی کبھار خیر دین کی دکان پر حاضری دینی شروع کر دی۔ وہ بڑے ادب سے خیر دین کو سلام کرتا اور کہتا: "چاچا، میں آدمی تو بڑا نالائق سا ہوں، پر اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتا دینا۔"

خیر دین کو وہ سیدھا سادہ شریف نوجوان لگا۔ اُس نے دو ایک بار اُس سے چھوٹے موٹے کام کروانے لگا۔ اُس نے دیکھا، رحمت بڑی خوشی سے اُس کے کام کرتا تھا۔ پھر وہ کبھی کبھار سبزی وغیرہ بھی لانے لگا۔ خیر دین نے اعتراض کیا تو اُس نے بتایا کہ اُسے یہ چیزیں مفت مل جاتی ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ تعلق بڑھتا گیا۔ خیر دین رحمت علی پر اعتماد کرنے لگا۔ ایک دن رحمت علی سبزی لے کر آیا تو خیر دین نے اُس سے کہا: "جا، وہ دروازہ کھٹکھٹا کر سبزی چاچی کو پکڑا دے۔"

رحمت علی نے حکم کی تعمیل کی۔ اُس دن کے بعد اس پر گھر کا دروازہ بھی کھل گیا۔ سکینہ بی بی پر بھی اُس کی شرافت کا بڑا اچھا اثر پڑا۔ اُس نے دو تین بار دبے لفظوں میں خیر دین کے سامنے اس کا ذکر بھی کیا۔

خیر دین اُس کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا: "لڑکا تو شریف لگتا ہے، مگر مجھے اس کا آگا پیچھا معلوم نہیں ہے۔ میں شوکت سے پوچھوں گا۔ وہی اس کو لے کر آیا تھا۔"

سکینہ نے محسوس کیا کہ خیر دین بات کرتے ہوئے جھجکتا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ کسی دن وہ خود ہی رحمت سے بات کرے گی۔ چند روز بعد اُس نے رحمت علی سے سودا منگوایا اور جب وہ لے کر آیا تو اُسے اندر بلا لیا۔

"بھائی خیر دین تمھاری بڑی تعریف کر رہے تھے۔" اُس نے کہا۔ "تمھارا گھر بار کہاں ہے؟"

"گھر بار کہاں، چاچی۔ مِل کے پاس ایک چھوٹا سا ٹھکانا ہے۔" رحمت علی نے عاجزی سے کہا: "دو تین دوست اور بھی ساتھ رہتے ہیں۔ بس مل جل کر گزارا کر لیتے ہیں۔"

"ہائے، پھر تو تمھیں کھانے پینے کی بڑی تنگی ہوگی؟"

"تنگی کس بات کی جی۔ ہوٹل سے ہر چیز مل جاتی ہے۔ ہم نے ہوٹل والے سے مہینہ باندھ رکھا ہے۔ کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے گھر میں بھی کھانا پکا لیتے ہیں۔"

"تم ہمارے گھر سے کھانا کھا لیا کرو۔ دو روٹیاں زیادہ پکا لیا کریں گے۔"

"نہیں چاچی، میرا کام چل رہا ہے۔ خواہ مخواہ آپ کو پریشانی ہوگی اور میرا روز روز آنا بھی مشکل ہے۔"

سکینہ بی بی نے اس بات پر زور نہیں دیا۔ کچھ دیر کے بعد پوچھا: "تمھارے ماں باپ کہاں ہوتے ہیں؟"

رحمت علی نے ایک قریبی شہر کا نام لیا اور بتایا کہ وہ تین چار مہینے بعد گھر چلا جاتا ہے۔

"کبھی اپنی ماں کو لے کر آؤ نا۔" سکینہ نے کہا۔

رحمت علی کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، جیسے سکینہ بی بی نے کوئی اَن ہونی بات کہہ دی ہو۔ "یہاں تو میرا عارضی ٹھکانا ہے۔ ماں کو کہاں لاؤں گا۔"

"یہ بھی تو گھر ہے۔" سکینہ بی بی نے کہا۔

رحمت علی نے ٹالنے والے انداز میں کہا: "کبھی موقع ملا تو لاؤں گا۔ ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔"

سکینہ بی بی نے اندازہ لگایا کہ رحمت علی اُس کا مقصد سمجھ گیا تھا اور غالباً سلطانہ سے شادی کرنے پر تیار نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک روز شوکت تانگے والے کے پاس دو اجنبی آئے۔ اُس وقت وہ بسوں کے اڈّے پر واقع ایک ٹی اسٹال پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اتفاق سے رحمت علی بھی اُس کے ساتھ تھا۔ دونوں اجنبی نوجوان اور صاحبِ حیثیت نظر آتے تھے۔

"تم میں سے تانگے والا کون ہے؟" اُن میں سے ایک نے پوچھا۔

"بندہ حاضر ہے جناب۔" شوکت نے کہا: "چلیے، تشریف رکھیں۔"

"ہم لوگ جانے نہیں چاہتے۔" دوسرے اجنبی نے کہا۔ اُس کے لہجے میں تحکم پایا جاتا تھا: "کیا نام ہے تمھارا؟"

"بندے کو شوکت کہتے ہیں۔"

"برخوردار شوکت، ہمیں دو زنانیوں کی تلاش ہے۔ ایک بوڑھی عورت ہے اور دوسری اُس کی بیٹی ہے۔ بیٹی کی عمر اُنیس بیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ بڑی خوب صورت لڑکی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم نے کبھی اُن دونوں کو اپنے تانگے میں بٹھایا ہو۔"

شوکت کا خیال سکینہ بی بی اور اُس کی بیٹی کی طرف گیا، تاہم اُس نے اُن کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بولا: "جناب، میں دن بھر سینکڑوں سواریاں بٹھاتا ہوں۔ اُن میں زنانیاں بھی ہوتی ہیں اور مرد بھی۔ پتا نہیں آپ کن سواریوں کا پوچھ رہے ہیں۔ یہ کب کی بات ہے؟ یہ سواریاں کب اِدھر آئی تھیں؟"

"یہ سات آٹھ مہینے پرانی بات ہے۔" اجنبی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ ان زنانیوں کو گم ہوئے سات آٹھ مہینے سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ جو شخص ہمیں اُن کا اتا پتا بتائے گا، اُس کو انعام دیا جائے گا۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ اِدھر ہی آئی تھیں؟"

"یہی تو معلوم نہیں ہے۔ اگر یہ بات معلوم ہوتی تو ہم آٹھ مہینے کے بعد اِدھر نہ آتے۔ اب تک ہم پچاس ساٹھ دیہاتوں اور شہروں کی خاک چھان چکے ہیں۔ ہم دو دن یہاں رہیں گے۔ ہمارا قیام نورانی ہوٹل میں ہے۔ اگر تمھیں ایسی سواریاں یاد آئیں تو ہمارے پاس آ جانا۔ ویسے ہم ہوٹل کے مالک کے پاس اپنا پتا بھی چھوڑ جائیں گے۔"

رحمت علی بڑے غور سے ساری بات چیت سُن رہا تھا۔ اُس نے پوچھا: "مسئلہ کیا ہے؟ کیا یہ عورتیں کوئی واردات کر کے بھاگی ہوئی ہیں؟"

"ہاں، کچھ ایسا ہی مسئلہ ہے۔" اجنبی نے کہا۔ پھر اُس نے بڑی تفصیل سے دونوں عورتوں کا حلیہ بتایا اور اپنے ساتھی کے ہمراہ رخصت ہو گیا۔

شوکت اُلجھن کا شکار ہوگیا۔ عورتوں کا جو حلیہ اجنبی نے بتایا تھا وہ سکینہ بی بی اور اس کی بیٹی سلطانہ پہ پورا اُترتا تھا۔ اُس نے رحمت علی سے اس ضمن میں کوئی بات نہیں کی اور شام کو خیردین کے پاس پہنچ گیا۔

"تایا خیردین، ایک بڑی پریشانی کی خبر ہے۔" اُس نے کہا "ہماری بستی میں دو اجنبی آئے ہوئے ہیں اور انھیں دو عورتوں کی تلاش ہے۔"

"دو عورتوں کی تلاش ہے!" خیردین نے فکرمندی سے کہا۔ "کون سی دو عورتیں؟"

"اُنھوں نے عورتوں کا جو حلیہ بتایا ہے وہ پھوپی سکینہ اور اُس کی بیٹی پر پورا اُترتا ہے۔"

خیردین نے گھبرا کر کہا "تم نے اُن کو کچھ بتایا تو نہیں؟"

"میں اتنا پاگل بھی نہیں ہوں۔" شوکت نے کہا "ویسے یہ معاملہ کیا ہے؟ وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ عورتیں واردات کر کے بھاگی ہوئی ہیں۔"

خیردین نے شوکت کو ساری بات بتائی اور اُسے تاکید کر دی کہ وہ سکینہ اور اُس کی بیٹی کے بارے میں کسی کو نہ بتائے۔

رات کے کھانے کے بعد خیردین نے علیحدگی میں سکینہ کو بتایا کہ چودھری رب نواز کے آدمی اُنھیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی سکینہ کا چہرہ خوف کے باعث پیلا پڑ گیا۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی تھی کہ رب نواز نے ان کا خیال دل سے نکال دیا ہوگا۔

"بھائی خیردین، میرا خیال ہے کہ ہمیں سلطانہ کی شادی فوراً کر دینی چاہیے۔ کم از کم اُسے ایک سہارا تو مل جائے گا۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"میں نے رحمت علی سے اشارتاً بات کی تھی لیکن شاید وہ میری بات سمجھا نہیں۔ کسی وقت تم بات کر کے دیکھو۔ لڑکا شریف معلوم ہوتا ہے۔"

خیردین نے کہا کہ وہ موقع دیکھ کر بات کرے گا۔

لیکن اُسے موقع تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ چند روز کے بعد رحمت علی نے خود ہی شادی کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ خیردین تو تیار ہی بیٹھا تھا۔ اُس نے رحمت علی سے کہا کہ وہ کسی روز اپنے بڑوں کو لے آئے تاکہ بات پکی کی جا سکے۔

رحمت علی نے تامل کرتے ہوئے کہا "چاچا، بڑوں کو بیچ میں ڈالنے سے بات نہیں بنے گی۔ بڑے خالہ کی لڑکی سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مجھے وہ لڑکی پسند نہیں ہے۔"

خیردین اُسے سکینہ کے پاس لے گیا اور اُسے رحمت علی کی مجبوری سے آگاہ کیا۔

رحمت علی نے کہا "چاچی مجھے نہ تو جہیز کا لالچ ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں چاہتا ہوں کہ شادی خاموشی اور سادگی سے ہو جائے۔ آپ یہیں پر چار آدمی بلا لیں اور نکاح پڑھوا دیں۔ فی الحال میں اپنے گھر والوں کو اس شادی کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا۔ بعد میں اُنھیں راضی کر لوں گا۔"

سکینہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔ اُس کے پاس دینے کو کچھ تھا بھی نہیں۔ دوسرے اُسے ڈر تھا کہیں چودھری رب نواز کو علم نہ ہو جائے۔ یہ شرائط خیردین کو بھی منظور تھیں۔ اُس کے پیسے بچتے تھے۔

سو اُنھوں نے سادگی اور خاموشی سے سلطانہ کی شادی کر دی۔

شادی کے چند ہفتوں کے بعد رحمت علی نے سلطانہ سے کہا کہ سفر کے لیے تیار ہو جائے۔ وہ اُسے اپنے رشتے داروں سے ملوانا چاہتا ہے۔ سلطانہ کو اُس کی نیت کا کچھ علم نہیں تھا۔ وہ تیار ہو گئی۔ سکینہ بی بی نے دونوں کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ اُس نے علیحدگی میں سلطانہ کو تاکید کر دی تھی کہ وہ موقع دیکھ کر رحمت علی کو چودھری رب نواز کے بارے میں سب کچھ بتا دے تاکہ وہ بھی محتاط رہے۔

نرشام کے وقت خروج ہوا تھا۔ کچھ سفر بس کے ذریعے اور کچھ تانگے کے ذریعے۔ جب وہ منزل پر پہنچے تو رات کے دس بج چکے تھے۔

سلطانہ نے محسوس کیا کہ تانگا جس گاؤں میں داخل ہوا، اُس کی گلیاں کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھیں۔ تب وہ پہچان گئی۔ وہ سیدپور تھا۔

"یہ . . . یہ تو سیدپور ہے۔" اُس نے رحمت علی سے کہا "یہاں آپ کس سے ملنے آئے ہیں؟"

"یہاں میں نے ایک مکان خریدا ہے۔" رحمت علی نے کہا "بہت سستا مل گیا ہے۔ تم سیدپور کو کیسے جانتی ہو؟"

سلطانہ اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے بولی "میں نے تو . . . سنا ہے . . . کسی سے . . . بیٹھ کر کرنے والی ہے۔"

جب تانگا رکا تو سلطانہ کو ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ جس گھر کے سامنے تانگا رُکا تھا وہ اُس کا آبائی مکان تھا جس پر تالا پڑا ہوا تھا۔ رحمت نے جیب سے چابی نکالی اور سلطانہ کو ساتھ لیے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

اپنے گھر میں قدم رکھتے ہی سلطانہ کی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ساتھ ہی وہ خوف زدہ بھی ہو گئی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سب کچھ کیا تھا۔ رحمت علی نے یہ وہ مکان خریدا تھا اور کیوں خریدا تھا؟

"تم رو کیوں رہی ہو؟" رحمت علی نے پوچھا "کیا یہ مکان پسند نہیں آیا؟"

"آ . . . آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟" سلطانہ نے التجا یہ لہجے میں کہا "یہ . . . یہ ہمارا اپنا مکان ہے۔ یہ سب سامان ہمارا ہے۔ ہم نے چودھری رب نواز کے ڈر سے یہ جگہ چھوڑ دی تھی۔ وہ . . . وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ مجھے واپس لے چلیں۔"

"واپس لے چلیں! کیسی باتیں کر رہی ہو! اگر یہ تمھارا اپنا گھر ہے تو تمھیں یہاں آ کر خوش ہونا چاہیے۔"

سلطانہ نے رحمت علی کے رویے میں تبدیلی محسوس کی تو ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "میں آپ کی منت کرتی ہوں کہ مجھے واپس چھوڑ آئیں۔ چودھری ہمارا دشمن ہے۔ وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔"

رحمت علی اچانک سخت لہجے میں بولا "زیادہ شور مت مچاؤ۔ تم نے یہ سب کچھ پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اور یہ مکان کی ملکیت کا دعویٰ کر کے تم نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ میں تمھیں یہ بھی بتا دوں کہ میں نے یہ مکان چودھری سے ہی خریدا ہے۔ یہ مسئلہ تمھاری موجودگی میں ہی حل ہوگا۔"

"نہیں نہیں۔ مکان آپ بے شک رکھیں۔" سلطانہ نے کہا "ہمیں مکان نہیں چاہیے۔ مکان تو ہم پہلے ہی چھوڑ چکے ہیں۔"

"یہ تو سارا مسئلہ ہی ٹیڑھا ہو گیا ہے۔" رحمت علی نے کہا "اگر یہ مکان ہے تو چودھری اسے فروخت نہیں کر سکتا۔ میں اس سے بات کروں گا۔"

سلطانہ نے اُس کی بہت منت کی مگر اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان کی یہ بحث چل ہی رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ کا رنگ اُڑ گیا۔ رحمت علی نے دروازہ کھولا اور بولا "آیئے چودھری صاحب۔ آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔"

اُس نے پورا دروازہ کھول دیا۔ رب نواز دو آدمیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ سلطانہ جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"ہمیں پتا چلا کہ تم آ گئے ہو۔ ہم نے سوچا کہ ذرا ملاقات ہی کر لیں۔" چودھری نے اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے کہا "بھئی ہماری بیوی سے تو ملاقات کرواؤ۔"

سلطانہ نے دوسرے کمرے میں یہ بات سُنی تو چھپنے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگی۔ اتنے میں رحمت علی کمرے میں داخل ہوا اور بولا "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ چلو اُدھر، چودھری صاحب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"نہیں نہیں، میں چودھری صاحب سے نہیں ملوں گی۔ ان سے کہہ دو کہ میں پردہ کرتی ہوں۔"

"پردہ . . . اور ہم سے۔" رب نواز نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔ پھر بظاہر چونکتے ہوئے کہا "رحمت علی، یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ یہ تو سلطانہ ہے، میری منگیتر! تم نے اس سے شادی کیسے کر لی؟"

"آپ کی منگیتر!" رحمت علی نے بظاہر حیرانی سے کہا "مجھے تو کسی نے یہ بات نہیں بتائی۔"

"یہ میں کیا سُن رہا ہوں، سلطانہ؟" چودھری آگے بڑھا "تمھیں یاد ہوگا کہ تمھارے مرحوم باپ نے مجھے زبان دی تھی۔ کہتے ہیں کہ مرنے والوں کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔"

سلطانہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی "م . . . مجھے اس بات کا کوئی علم نہیں ہے۔ یہ شادی بڑوں کی مرضی سے ہوئی ہے۔"

"تیری ماں کہاں ہے؟ وہ سکینہ بی بی۔ اُسے یہ بات ضرور یاد ہوگی۔"

سلطانہ نے مدد طلب نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا مگر وہ کچھ نہیں بولا۔ اُس کے چہرے پر کوئی فکر یا گھبراہٹ نہیں تھی۔

"رحمت علی، تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔" رب نواز نے تلخ دار آواز میں کہا "شیر کے منہ سے نوالہ چھیننے والے زندہ نہیں بچا کرتے۔"

"غلطی ہو گئی چودھری صاحب۔" رحمت علی نے ہاتھ جوڑے۔ سلطانہ کو اُس کے چہرے پر کوئی خوف نظر نہیں آیا۔ "آپ حکم کریں تو میں اس کو طلاق دے دیتا ہوں۔"

یہ سُن کر سلطانہ ششدر رہ گئی۔ کوئی مرد اتنی جلدی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ شاید وہ سب کچھ ایک ڈراما تھا۔ رحمت علی نے اُن کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔

"آ . . . آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں!" اُس نے پریشانی سے کہا "میں آپ کی بیوی ہوں، آپ کی عزت ہوں۔ اور عزت کی خاطر تو لوگ جان بھی قربان کر دیا کرتے ہیں۔"

"کوئی شخص جانتے بوجھتے آگ میں چھلانگ نہیں لگاتا۔" رحمت علی نے کہا "چودھری صاحب کا کہنا ہے کہ تم اُن کی منگیتر تھیں۔ اس لحاظ سے تو اصل میں تم اُن کی عزت ہو۔"

"یہ . . . سب جھوٹ ہے . . . میری کسی سے منگنی نہیں ہوئی تھی . . . اگر کوئی منگنی ہوئی بھی تھی تو وہ ٹوٹ گئی، ہو گئی اصل چیز شادی ہے۔ اس وقت میں آپ کی بیوی ہوں۔"

"او نے سراج دین . . ." رب نواز نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی "او فقیر محمد . . . جاؤ، اُدھر سے مولوی ثناء اللہ

کو بلا لاؤ۔ یہ رحمت علی اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہے۔ یہ کام کسی معتبر گواہ کے سامنے ہونا چاہیے۔“

سراج دین مولوی ثناء اللہ کو بلا لایا۔ رحمت علی نے اُس کے سامنے سلطانہ کو تین طلاقیں دے دیں۔ اس اثنا میں سلطانہ روتی رہی اور سب کی منتیں کرتی رہی۔ مگر کسی نے اُس کی بات پر توجہ نہیں دی۔

یہ کارروائی چند منٹ میں ختم ہوگئی۔ مولوی ثناء اللہ طلاق کی توثیق کرنے کے بعد رخصت ہوگیا۔ رحمت علی نے باہر جا کر رب نواز کے ساتھ کچھ بات کی اور باہر سے ہی واپس چلا گیا۔ مکان میں رب نواز اور اُس کے دو ساتھی رہ گئے۔

”سلطانہ، اب تم آرام سے اپنے گھر میں رہو۔“ رب نواز نے کہا۔ ”ایک دو روز میں تمہاری ماں بھی یہاں آجائے گی۔ اُس کے بعد رشتے کی بات چیت ہوگی۔ یہ سراج دین اور فقیر محمد رات کو بیٹھک میں سو جائیں گے۔ دونوں بہت شریف آدمی ہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو اُن کو بتا دینا۔“ وہ جاتے جاتے دروازے میں رکا۔ ”اب تک جو غلطیاں تم سے ہوئی ہیں، اُنھیں میں معاف کرتا ہوں۔ لیکن اب کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔“

اس صورتِ حال میں سلطانہ کے ذہن میں دو خیال آئے۔ اوّل اُسے خودکشی کر لینی چاہیے اور دوم فرار کی کوشش کرنی چاہیے، خواہ اس میں جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

اُس کی نگرانی کرنے والوں نے سونے سے قبل اُس کے کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی تھیں۔۔۔۔ البتہ بیٹھک کی طرف کھلنے والا دروازہ بند نہیں تھا۔ سلطانہ ساری رات فرار کے طریقوں پر غور کرتی رہی اور خود کو ہمت دلاتی رہی۔ صبح کے چار ساڑھے چار بجے اُس نے بیٹھک میں جھانکا۔ دونوں بدمعاش دری پر پڑے سو رہے تھے۔ ایک کے تکیے کے نیچے پستول کا دستہ نظر آ رہا تھا۔ سلطانہ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اُسے پستول پر قبضہ کر کے دونوں بدمعاشوں کو قتل کر دینا چاہیے لیکن یہ خیال فقط سوچنے تک محدود رہا۔ وہ نہ تو پستول چلانا جانتی تھی اور نہ ہی اُس کے اندر اتنی ہمت تھی۔

بیٹھک کے باہر کی طرف کھلنے والے دروازے پر صرف کنڈی لگی ہوئی تھی، تالا نہیں تھا۔ سلطانہ نے چند ضروری چیزیں گٹھری میں باندھیں اور ہمت کر کے دروازے کی طرف بڑھی۔ چند قدموں کا وہ فاصلہ اُسے میلوں لمبا معلوم ہو رہا تھا۔ بالآخر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

باہر نکل کر اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ تھانے پہنچ گئی۔ وہاں رات کی ڈیوٹی دینے والا ایک حوالدار بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ سلطا[نہ نے] رو رو کر اُسے اپنی کہانی سنائی اور مدد کی درخواست کی۔ وہ معمولی حوالدار ایک جاگیردار کے بیٹے کے خلاف کارروا[ئی] کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”بی بی! تمہارے پاس اپنی کہانی کا کوئی ثبوت بھی ہے یا ایسے ہی شکایت کرنے آگئی ہو؟“ حوالدار نے پوچھا۔

”کیا یہ کافی ثبوت نہیں ہے کہ ہمارے مکان پر [اُس] نے قبضہ کر رکھا ہے؟“

”میں نے سنا ہے کہ تمہارے باپ نے اپنا مکان چو[دھری] صاحب کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔“ حوالدار نے کہا۔ ”باقی شادی اور طلاق کی بات، تو یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ ہم کسی آد[می کو] صرف اس بات پر گرفتار نہیں کر سکتے کہ اس نے اپنی بیوی [کو طلاق] دے دی ہے۔ باقی تم نے چودھری رب نواز پر جو الزامات [...] کے لگائے ہیں اُن کا کوئی پکا ثبوت ہونا چاہیے۔ اُس نے [...] ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی؟“

سلطانہ سمجھ گئی کہ پولیس اُس کی مدد نہیں کر سکتی تھی۔

”پتا نہیں آپ زیادتی کس کو سمجھتے ہیں۔“ سلطانہ [...] ”رب نواز نے میرے خالہ زاد بھائی کو قتل کرایا۔ میرے باپ [...] کرایا۔ ہمیں بے گھر کر دیا۔ ہمارے مکان پر قبضہ کر لیا۔ میرے [...] سے ساز باز کر کے مجھے طلاق دلوائی۔ مجھے میرے گھر میں قید [...] اس سے زیادہ اور کیا زیادتی ہوگی۔“

”بی بی! قانون زبانی باتوں کو نہیں مانتا۔ تم ادھر ہی [...] ذرا دن چڑھ جائے تو میں چودھری رب نواز کو بلا کر اُس سے [...] بات پوچھتا ہوں۔ پھر پتا چلے گا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔“

سلطانہ گھبرا گئی۔ حوالدار تو ویسے ہی اُس کی بات ماننے [...] نہیں تھا۔ رب نواز کے سامنے کیا مانتا۔ اُسے احساس ہوا کہ [...] آ کر اُس نے غلطی کی تھی۔ اگر وہ صبح تک وہاں ٹھہری رہی تو [...] اُسے دوبارہ رب نواز کے حوالے کر دے گا۔

اسی خدشے کے پیشِ نظر وہ تھانے سے نکل بھاگی او[ر ...] جانے والی سڑک پر جا پہنچی۔ اُس نے تین گھنٹے تک پیدل سف[ر ...] رات بھر جاگنے کی وجہ سے اُس کی حالت خراب تھی۔ ہر قدم [پر] یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ چکرا کر گر پڑے گی۔

جب وہ آبادی کے قریب پہنچی تو ایک فیکٹری ورکر، سائیکل پر اُدھر سے گزر رہا تھا۔ اُس کی حالت دیکھ کر رک گیا۔ پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے۔

سلطانہ نے دیکھا کہ وہ ادھیڑ عمر کا ایک ہمدرد شخص [...] اس نے اُسے بتایا کہ وہ ایک مصیبت زدہ اور بے سہارا لڑ[کی]

ہے۔ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ مذکورہ شخص، جس کا نام اختر حسین تھا، اُسے اپنے گھر لے گیا۔ اُن دنوں اُس کی بیوی بچوں کے ہمراہ میکے گئی ہوئی تھی اور وہ گھر میں اکیلا رہتا تھا۔

سلطانہ نے مختصر لفظوں میں اُسے اپنا احوال سنایا۔

”تم بے فکر ہو کر یہاں رہو۔“ اختر حسین نے اُسے تسلی دی۔ ”باورچی خانے میں کھانے پینے کی چیزیں موجود ہیں۔ تم ناشتا کر کے آرام کرو۔ اس وقت میں ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔ شام کو تمہارے ساتھ تفصیلی بات ہوگی۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ تم میری بھانجی ہو۔“

اُس ہمدرد انسان کی باتوں سے سلطانہ نے بڑی تقویت محسوس کی اور وہ وقتی طور پر مطمئن ہوگئی۔

اختر حسین کا مکان بستی کے نواح میں واقع تھا۔ اس میں چار کمرے تھے اور کشادہ تھا۔ صحن میں سبزیاں اُگی ہوئی تھیں۔ سلطانہ نے گزشتہ رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ذرا سکون ملا تو اُسے بھوک محسوس ہوئی۔ اُس نے باورچی خانے میں جا کر ناشتا کیا اور پھر بستر پر لیٹ گئی۔

پانچ دن خیریت سے گزر گئے۔

چھٹے دن رب نواز اُس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ اُن میں ایک رحمت علی اور دوسرا فقیر محمد تھا۔ رب نواز پر غصے کی وجہ سے جنون سوار تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر سلطانہ کے ساتھ جو سلوک کیا تہذیب اُس کے ذکر کی اجازت نہیں دیتی۔

اُس کے ذہن میں یہ خیال سما گیا تھا کہ سلطانہ، اختر حسین کے ساتھ گناہ کی زندگی گزار رہی تھی۔ اس خیال کا سبب اختر حسین کے پڑوسیوں کے شکوک و شبہات بھی تھے۔ بعض پست ذہنیت لوگ عورت اور مرد کو تنہا دیکھ کر فوراً بہتان تراشی شروع کر دیتے ہیں۔ اختر حسین کے بعض پڑوسیوں نے بھی یہی کیا۔

رب نواز بار بار یہ کہتا تھا۔ ”جو ہمیں ٹھکراتا ہے اُس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ میرے سامنے بڑی اونچی باتیں کرتی تھی۔ یہاں ایک مزدور کے ساتھ گناہ کی زندگی گزار رہی ہے۔ فکر نہیں کر، اگر تجھے چکلے میں نہ بٹھا دیا تو میرا بھی نام چودھری رب نواز نہیں ہے۔“

یہ ایک شریف لڑکی کو شادی سے انکار کی سزا دی جا رہی تھی۔

شام کو جب اختر حسین گھر پہنچا تو اجنبی لوگوں کو اور اُن کے تیور دیکھ کر ساری بات سمجھ گیا۔ اُس نے رب نواز سے پوچھا کہ وہ کس کی اجازت سے اُس کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ رب نواز نے جواب میں اُسے گالی دی اور اُس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ اختر حسین مضبوط اور جی دار آدمی تھا۔ اُس نے بھی رب نواز کے منہ پر جوابی تھپڑ رسید کیا اور گالی دی۔

رب نواز نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور اُس پر چڑھ دوڑا۔ اختر حسین پیچھے ہٹنے کے بجائے مقابلے پر ڈٹ گیا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر سلطانہ نے اپنی گٹھری بغل میں دبائی اور پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی، لیکن اُس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ باہر نکل کر اُس نے سوچا کہ اُسے خودکشی کر لینی چاہیے۔ سو اُس نے حفیظ خان کی بس کے سامنے چھلانگ لگا دی، لیکن اللہ کو اُس کی زندگی منظور تھی، اس لیے وہ بچ گئی۔

اس کے بعد کے واقعات آپ شروع میں پڑھ چکے ہیں۔ زیادہ تر واقعات زبیدہ بیگم نے سنائے تھے۔ سلطانہ سارا وقت سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔ اُس نے کہیں کہیں زبیدہ بیگم کی مدد کی تھی۔

”سلطانہ بی بی، میں نے سارے واقعات سن لیے ہیں اور ساری بات سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے اُسے تسلی دی۔ ”فکر نہیں کرو۔ تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ مجھے اختر حسین کا اور اپنی ماں کا پتا دے دو۔ میں تمہاری ماں کو یہاں لانے کے لیے اسی وقت اپنا آدمی بھیج دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے رحمت علی کا پتا بھی چاہیے۔“

اُسے سارے پتے زبانی یاد نہیں تھے۔ میں نے مطلوبہ جگہوں کا محلِ وقوع سمجھ لیا اور تھانے پہنچ کر فی الفور چاروں طرف آدمی دوڑا دیے۔ دو سادہ لباس آدمی سید پور کے مولوی ثناء اللہ کے پاس بھیج دیے۔ رب نواز کے پاس کوئی آدمی نہیں بھیجا۔

جن آدمیوں کو میں نے اختر حسین کے گھر بھیجا تھا، اُن میں ایک آدمی نصف گھنٹے کے بعد ہانپتا ہوا تھانے پہنچا اور بتایا کہ اختر حسین کے گھر سے اُس کی لاش ملی ہے جو ایک بوری میں بند کونے میں پڑی تھی اور دو دن پرانی معلوم ہوتی تھی۔

میں نے ایک اے ایس آئی کو ساری بات سمجھا کر ضابطے کی کارروائی کے لیے روانہ کر دیا۔ یہ بات بڑی واضح تھی کہ اختر حسین، رب نواز اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔

اگلے روز دس گیارہ بجے تک باقی آدمی بھی واپس آگئے۔ یہ لوگ سکینہ بی بی، مولوی ثناء اللہ اور رحمت علی کو ساتھ لائے تھے۔ سکینہ بی بی کو میں نے فوراً نرس زبیدہ کے گھر بھیج دیا اور رحمت علی کو الگ کمرے میں بٹھا دیا۔ اُس کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ مولوی ثناء اللہ بھی تھانے میں موجود تھا۔ اُسے میں نے یہ کہہ کر تھانے بلوایا تھا کہ سلطانہ کا سراغ مل گیا ہے اور یہ بات غلط بھی نہیں تھی۔

پھر میں نے مولوی ثناء اللہ کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا "مولوی صاحب، چند روز پہلے آپ نے سیدپور میں ایک طلاق کی تصدیق کی تھی۔ شوہر کا نام رحمت علی اور بیوی کا نام سلطانہ تھا۔ کیا یہ طلاق شرعی انداز میں دی گئی تھی؟"

مولوی صاحب نے جواب دینے میں کچھ تامل کیا۔ غالباً وہ طلاق کے پس منظر سے آگاہ تھے اور اس الجھن کا شکار ہو گئے تھے کہ کہیں اُن کا جواب رب نواز کے خلاف نہ چلا جائے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد انھوں نے کہا: "طلاق تو شرعی انداز میں ہوئی تھی۔ بات کیا ہے؟"

میں نے چالاکی سے کہا "اِس طلاق کے بارے میں تین آدمی گواہی دے چکے ہیں۔ اُن میں چودھری رب نواز، سراج دین اور فقیر محمد شامل ہیں۔ میں نے سوچا آپ سے بھی تصدیق کروا لی جائے۔"

یہ سُن کر وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔ میں نے اُس سے تحریری بیان لے لیا اور اُسے چند منٹ انتظار کرنے کے لیے کہا۔ پھر میں اُس کمرے میں پہنچا جہاں رحمت علی میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا اور اُس کے بالکل سامنے جا ٹھہرا۔ اُس نے دو تین دفعہ آنکھیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور ہونٹوں پر زبان پھیری۔

میں نے ہنس کر کہا "معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کے بغیر بہت اداس ہو گئے ہو!"

وہ اس تذبذب میں مبتلا تھا کہ جانے سلطانہ نے کیا بیان دیا تھا اور یہ بات وہ میرے تاثرات سے معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"جناب، آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ بیوی کے بغیر گھر کا سارا حساب کتاب چوپٹ ہو جاتا ہے۔ سلطانہ ... ویسے بڑی اچھی بیوی ہے، بڑے سلیقے والی ہے، لیکن طبیعت کی ذرا تیز ہے۔ کچھ تھوڑی سی وہ بھی ہے ... وہ کیا کہتے ہیں: ذہنی مریض! بعض اوقات عجیب عجیب باتیں کرنے لگتی ہے اُس کو ... وہم کی بیماری ہے، وہم کی! وہ ہے کہاں؟"

میں نے ایک زور دار تھپڑ اُس کے منہ پر مارا۔ پھر گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور پوچھا "اُس ... اپنے باپ سے کتنے پیسے لیے ہیں تُو نے؟ اُس شیطان نواز سے؟"

تھپڑ کھاتے ہی اُس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ گھبرا کر بولا "جی ... جناب، میں ... شریف آدمی ہوں۔ آ ... آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے۔ مم ... میں نے کسی سے پیسے نہیں لیے۔"

میں نے دو چار تھپڑ اور دو چار تھپڑ مزید رسید کیے "کمینے، ذلیل، میں اب ایک نہیں سنوں گا۔ مولوی ثناء اللہ اِس وقت تھانے میں موجود ہے اور تحریری بیان دے چکا ہے۔ کیا تم نے سلطانہ کو طلاق نہیں دے دی؟"

اُس نے جواب دینے میں تامل کیا تو میں نے اُس کی پسلیوں میں گھونسا مارا "مجھے فوراً جواب چاہیے۔"

"مم ... مجھے چودھری رب نواز نے مجبور کر دیا تھا۔"

"تم اُس کتے کے پاس کیا لینے گئے تھے؟" میں نے اُسے ایک اور تھپڑ مارا "سیدپور میں تمھارا کون ہے؟"

اُس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور اُن سے خون بہنے لگا۔ "کک ... کوئی نہیں ہے جناب۔ سیدپور میں میرا کوئی نہیں ہے۔ پپ ... پانی، ایک گلاس پانی منگوا دیں۔ مم ... رحم کریں۔ میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔ میں بہت کمزور آدمی ہوں۔ اتنی مار برداشت نہیں کر سکتا۔ مر جاؤں گا، سچ مر جاؤں گا۔"

"تمھاری موت پھانسی کے پھندے پر آئے گی بچّو!" میں نے کہا۔ پھر پوچھا "جب تم سلطانہ کو طلاق دے چکے تھے تو پھر اُس کو تلاش کیوں کرتے پھر رہے تھے؟"

"وہ ... وہ چودھری صاحب کا حکم تھا۔"

"کتنے پیسے لیے ہیں تم نے چودھری سے؟"

اُس نے میرا ہاتھ اُٹھتے دیکھا تو جلدی سے بولا "وعدہ تو تین ہزار کا کیا تھا، مگر ابھی صرف دو ہزار دیے ہیں۔"

میں نے ایک رسّی منگوا لی اور کہا "میں پوری کہانی سُننا چاہتا ہوں۔ اُلٹے لٹک کر سناؤ گے یا سیدھے کھڑے ہو کر؟"

اُس نے ہاتھ جوڑے اور سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

وہ شادی شدہ تھا اور اُس کے دو بچے بھی تھے۔ جب سکینہ بی بی نے اُس سے اپنی بیٹی کے رشتے کا ذکر کیا تو اُس نے ٹال دیا، لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ شادی شدہ تھا۔

کچھ عرصے کے بعد جب رب نواز کے آدمیوں نے شوکت تانگے والے سے سکینہ بی بی اور سلطانہ کے بارے میں پوچھا تو اُس کی نیت خراب ہو گئی کیونکہ اُس میں انعام کا لالچ بھی تھا۔

سلطانہ خوب صورت تھی، یتیم تھی اور بے سہارا تھی۔ رحمت علی نے سوچا کہ وہ سلطانہ سے شادی کر کے کچھ عرصہ اُسے اپنے پاس رکھے گا، اُس کے بعد رقم لے کر رب نواز کے حوالے کر دے گا۔ سلطانہ کا کوئی رشتے دار ایسا نہیں تھا جس کا اُس کو ڈر ہوتا۔ اگر کوئی پوچھتا تو وہ یہی جواب دیتا کہ چودھری رب نواز نے اُس کے سینے پر پستول رکھ دیا تھا، لہٰذا اُسے اپنی جان بچانے کے لیے سلطانہ کو طلاق دینا پڑی۔

جب وہ بیان دے چکا تو میں نے مولوی ثناء اللہ کو اندر بلایا اور اُس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "کیا یہی وہ شخص ہے جس نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی؟"

"ہے تو یہی ..." مولوی صاحب نے جواب دیا "پر اِس کو ہوا کیا ہے؟"

میں نے غصیلی نظروں سے مولوی صاحب کی طرف دیکھا اور کہا "مولوی صاحب، یہی حال آپ کا بھی ہو سکتا ہے۔"

وہ گھبرا کر بولا "یہ ... یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"آپ اللہ والے ہونے کے دعوے دار ہیں، اگر سلطانہ آپ کی بیٹی ہوتی تو کیا آپ اتنی خاموشی سے اُس کی طلاق کا فیصلہ سُن کر چلے جاتے؟ آپ نے اُس شوہر سے یہ کیوں نہ پوچھا کہ یہ کیوں اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہے؟ آپ کو چاہیے تھا کہ اُس کو سمجھاتے ..."

"وہ تو بجا فرماتے ہیں آپ، لیکن چودھری رب نواز نے مجھے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے مولوی صاحب۔ آپ اللہ اور رسول کے احکام کو چھوڑ کر ظالم جاگیرداروں کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ آپ کو یقیناً یہ بات معلوم ہو گی کہ اِس کمینے نے رب نواز کے ہاتھ اپنی بیوی فروخت کر دی ہے۔ پوچھیں اِس سے، دو ہزار روپے یہ وصول کر چکا ہے اور ایک ہزار ابھی باقی ہیں۔ کیا اسلام یہی تعلیم دیتا ہے؟"

مولوی صاحب نے اپنی خفت مٹانے کے لیے آگے بڑھ کر رحمت علی کو ایک تھپڑ لگایا اور بولے "کیوں اوئے کافر! تجھے شرم نہ آئی پیسے وصول کرتے ہوئے؟"

"مولوی صاحب، آپ کو شرم نہ آئی تو مجھے کہاں سے آتی۔ کیا آپ نے چودھری سے سو روپے وصول نہیں کیے؟"

مولوی کھسیانے ہونے کے بجائے رحمت علی کو بُرا بھلا کہنے لگے "اوئے بے دینا، وہ تو چودھری صاحب نے مجھے نذرانہ دیا تھا۔ طلاق تم نے اپنی بیوی کو دی اور تھانیدار صاحب کی باتیں ہمیں سننا پڑیں۔"

میں نے مولوی صاحب کو ایک طرف کیا اور رحمت علی سے کہا "تمھیں میں نے اختر حسین کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔ اختر حسین کے پڑوسیوں نے ہمیں بتایا ہے کہ دو روز قبل تم دو آدمیوں کے ہمراہ اپنی بیوی کو تلاش کرتے ہوئے اُدھر آئے تھے اور اختر حسین کے مکان میں گھس گئے تھے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ تم سلطانہ کو طلاق دینے کے باوجود اُس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ سلطانہ نے مجھے بتایا ہے کہ اختر حسین ایک شریف النفس انسان تھا اور اُس نے اُسے پناہ دی تھی۔ میں نے اختر حسین کے پڑوسیوں کو تمھاری شناخت کے لیے یہاں بُلایا ہے، وہ بس پہنچنے ہی والے ہوں گے۔"

رحمت علی کا رنگ سفید پڑ گیا۔ گڑگڑا کر بولا "ملک صاحب، میں سچ کہتا ہوں، اختر حسین کو میں نے نہیں، چودھری رب نواز اور فقیر محمد نے قتل کیا ہے۔ میں تو اُن کو آخر وقت تک روکنے کی کوشش کرتا رہا تھا، مگر چودھری نے چاقو نکال لیا۔ فقیر محمد نے اختر حسین کو قابو کر لیا اور رب نواز اُس پر چاقو کے وار کرتا چلا گیا۔"

مولوی صاحب یہ سب کچھ سُن کر پریشان ہو گئے اور جانے کی اجازت مانگی، لیکن میں نے انھیں روک لیا اور چار آدمی فقیر محمد کے پیچھے بھیج دیے۔ یہ لوگ تین بجے تک واپس آ گئے۔ انھوں نے فقیر محمد کے گھر سے خون آلود کپڑے اور چاقو بھی برآمد کر لیا تھا۔

فقیر محمد کی عمر چھتیس سینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اُس نے بڑی بڑی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں اور خاصا بانکا جوان بندہ تھا۔

چند منٹ کے بعد رب نواز بھی تھانے پہنچ گیا۔ اُس کے ساتھ دو تین آدمی اور بھی تھے۔ میرے حکم پر حوالدار نے اُس کے آدمیوں کو باہر ہی روک دیا اور اُس کو اندر بھیج دیا۔

اُن کے گھر کا کوئی بڑا اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ دراصل بات ہی ایسی تھی، وہ بڑوں کو اِس معاملے سے دُور رکھنا چاہتا تھا۔

"ملک صاحب، یہ کیا تماشا ہے؟" اُس نے آتے ہی کہا "آپ نے میرے آدمی کو کس سلسلے میں بُلایا ہے؟"

میں اُسے اُس کمرے میں لے گیا جس میں رحمت علی، مولوی ثناء اللہ اور فقیر محمد بیٹھے تھے۔ وہاں چند قوی الجثہ سپاہی بھی موجود تھے۔ رب نواز نے جب رحمت علی اور مولوی صاحب کو دیکھا تو اُس کے چہرے پر ہلکی سی فکرمندی نظر آنے لگی۔

"رحمت علی، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"رب نواز، میرے ساتھ بات کر۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا "ہم ملزموں کو آپس میں بات کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔"

"ملزم!" اُس نے انجان بننے کی کوشش کی "ملزم کون ہے یہاں؟"

"مولوی صاحب، ذرا اِس کو بتائیں کہ اِس کے ساتھی نے اِس پر کیا الزام عائد کیا ہے۔" میں نے کہا "اور اُس رات والا واقعہ بھی بیان کریں جس رات اِس نے ایک بے بس لڑکی کو زبردستی

طلاق دلوائی تھی اور اُسے حبسِ بے جا میں رکھا تھا۔"

"ملک صاحب، آپ مجھے کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں؟" مولوی صاحب نے جان چھڑوانے کی کوشش کی۔ "یہ ان کا اور قانون کا معاملہ ہے۔ آپ جانیں اور یہ جانیں۔"

"مولوی صاحب، آپ تو جابر سلطان کے دربار میں کلمۂ حق کہنے والے لوگوں میں سے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ اعانتِ جرم اور اخفائے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ آپ بھی زیرِ حراست ہیں۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" رب نواز نے کہا۔ "میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔"

اُس نے دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ میں نے پیچھے سے اُس کا کالر پکڑ لیا اور اُس کی پسلیوں میں ایک زوردار گھونسا رسید کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کمپنی باغ نہیں ہے برخوردار! تھانہ ہے۔ یہاں نہ کوئی خوشی سے آتا ہے اور نہ خوشی سے جاتا ہے۔ تم قتل کے الزام میں زیرِ حراست ہو — مولوی صاحب، میں نے آپ سے کچھ درخواست کی ہے، سچ بولنے سے نہ کترائیں۔"

مولوی صاحب کو بولنا ہی پڑا۔ "چودھری صاحب، یہ رحمت علی کہتا ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔"

"رحمت علی!" رب نواز نے تلخی سے رحمت علی کی طرف دیکھا۔ "جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔" رحمت علی نے بھی سخت لہجے میں جواب دیا۔ "میں صرف تمھاری وجہ سے اس حال کو پہنچا ہوں۔ اگر تم نہ ہوتے تو نہ میں سلطانہ سے شادی کرتا اور نہ اسے طلاق دیتا۔ اور نہ ہی اختر حسین کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ ہے۔"

میں نے کہا۔ "تھانے میں اس وقت اختر حسین کے لعف درجن چودھری گواہی دینے کے لیے بیٹھے ہیں۔ وہ سب شریف اور معتبر آدمی ہیں۔ تم تینوں میں سے ایک آدمی ضرور پھانسی پر لٹکے گا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" رب نواز نے کہا۔ "ہم نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ قتل اُسی نے کیا ہوگا جس کی بیوی گم ہوئی تھی۔"

میں نے رب نواز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "قتل اُس نے کیا ہے جس کی خریدی ہوئی عورت بھاگ گئی تھی اور جو شخص اُس عورت کی خاطر دو آدمی پہلے بھی قتل کر چکا تھا۔ رب نواز، قدرت انسان کو اتنی زیادہ ڈھیل نہیں دیتی۔ پھانسی کا پھندا تمھاری گردن کے بہت قریب پہنچ چکا ہے۔"

"ملک صاحب، میں آپ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" رب نواز نے کہا۔ "صرف دو منٹ کے لیے۔"

"اگر تم مجھے رشوت پیش کرنا چاہتے ہو تو سب کے پیش کرو۔ میرا کسی سے پردہ نہیں ہے۔"

"میں معمولی باپ کا بیٹا نہیں ہوں۔" اُس نے دھمکی کے انداز میں کہا۔ "آپ اس غلطی پر پچھتائیں گے۔"

میں نے اُس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ "برخوردار! قاتلوں اور بردہ فروشوں کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے والے کبھی نہیں پچھتاتے۔"

اُس شخص نے اپنے نفس کی تسکین کے لیے ایک گھر کو اُجاڑ ڈالا تھا لیکن اس کے باوجود اُسے کوئی ندامت نہ تھی۔

جب اُس نے دیکھا کہ میں رعایت کرنے پر آمادہ نہیں تو وہ کچھ نرم پڑ گیا اور بولا۔ "ہم چند منٹ کے لیے علیحدگی میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں، رحمت علی، فقیر محمد اور مولوی صاحب چند منٹ کے لیے۔ . . ."

میں نے انھیں اجازت دے دی۔

وہ چاروں کمرے کے ایک کونے میں جا کھڑے ہوئے اور آہستہ باتیں کرنے لگے۔ میں دروازے کے قریب ٹھہر کر انتظار کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اُن کی باتوں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ آدھا جملہ میرے کانوں میں بھی پڑ جاتا تھا۔ رب نواز، فقیر محمد اور مولوی صاحب ایک طرف تھے اور رحمت علی ایک طرف۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ رحمت علی کو قربانی کا بکرا بننے کا مشورہ دے رہے تھے اور یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ کیس لے لیں گے لیکن رحمت علی قتل کا الزام اپنے سر لینے کے لیے تیار نظر نہیں آتا تھا۔

جب اُس نے دو ٹوک جواب دے دیا تو رب نواز نے دوسرا حربہ اختیار کیا۔ اُس نے رحمت علی کو دھمکی دی کہ اگر وہ یوں نہیں مانے گا تو وہ دونوں (یعنی رب نواز اور فقیر محمد) اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ بات چیت میں آہستہ آہستہ گرمی آتی چلی گئی۔ کمرے کی دیوار کے ساتھ کسی سپاہی کی رائفل رکھی تھی۔ رحمت علی اچانک بے قابو ہو گیا۔ اُس نے تیزی سے رائفل اُٹھائی اور رائفل کا کُندا پوری قوت کے ساتھ رب نواز کے سر پر دے مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر گر گیا۔ وار مہلک ثابت ہوا۔ رب نواز نے اسپتال پہنچنے سے پہلے دم توڑ دیا۔

میں نے رحمت علی اور فقیر محمد کو قتلِ عمد کے الزام میں بند کر دیا۔ قدرت نے ہمارا کام آسان کر دیا تھا۔

دو خاندانوں کا حوالہ۔ وہ جھوٹی غیرت کے [illegible]

جھوٹی غیرت



زمانے میں شادی ہال اور بیوٹی پارلر نہیں تھے۔ لڑکی کو گھر میں دلہن بنایا جاتا تھا اور جلدی رخصت کر دیا جاتا تھا۔ آج کل مہمانوں کو شادی ہال میں اور دلہن کو بیوٹی پارلر بھیج دیا جاتا ہے۔ مہمان جب دُنیا جہاں کی سیاست پر جھک مار کر ایک دوسرے سے نظریں چرانے لگتے ہیں تب کہیں دلہن کی آمد کا غلغلہ بلند ہوتا ہے۔ کارڈ پر وقتِ طعام سات یا آٹھ یا نو بجے لکھا جاتا ہے لیکن کھانا گیارہ بجے دیا جاتا ہے اور بہت سی تقریبات میں بھی وقت کے ساتھ ایسا ہی مذاق کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارا اجتماعی کردار بن چکا ہے اگر ہم گیارہ بجے کھانا دینا چاہتے

ہیں تو کارڈ پر گیارہ بجے کا وقت لکھتے ہوئے کیوں گھبراتے ہیں اور اگر نو بجے کا وقت دیا ہے تو نو بجے کھانا کیوں نہیں دیتے؟ بہرحال، یہ ایک اجتماعی جھوٹ ہے جسے ہم بولتے ہیں اور تسلیم بھی کرتے ہیں۔ جب ہم ایک بے مقصد جھوٹ سے نہیں بچ سکتے تو بامقصد جھوٹ سے کیسے بچ سکتے ہیں!

تمہید کچھ لمبی ہو گئی۔ دراصل آج جس واردات کا حال بیان کرنے کا ارادہ کیا ہے وہ ایک شادی ہی سے شروع ہوئی تھی، اس لیے موجودہ دور کی شادیوں کی ایک بے قاعدگی کا ذکر آ گیا۔

وہ سردیوں کے دن تھے۔ رات کے نو بجے ایک قتل کی اطلاع ملی۔ میں چند آدمی ساتھ لے کر جائے واردات پر پہنچ گیا۔ وقوعہ پر پہنچ کر پتا چلا کہ واردات شادی والے گھر میں ہوئی تھی اور دولہا کو حجلۂ عروسی میں قتل کر دیا گیا تھا۔

دولہا کا باپ حلوائی تھا اور کھاتا پیتا آدمی تھا۔ اُس کا نام غالباً نواب دین تھا۔ اُس نے روتے ہوئے جوان بیٹے کے قتل کے بارے میں بتایا اور مجھے اُس کمرے میں لے گیا جس میں لاش پڑی تھی۔ مکان خاصا کشادہ تھا اور مہمانوں کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ شادی کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔

مقتول کا نام ظہور الٰہی معلوم ہوا۔ جب میں نے اُس کا چہرہ دیکھا تو اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ تھانے کے ریکارڈ میں ناپسندیدہ آدمی تھا اور اس کی عام شہرت اچھی نہیں تھی۔ وہ ظہور عرف جھورا بدمعاش کے نام سے مشہور تھا۔ گو وہ جرائم پیشہ شخص نہیں تھا لیکن محلے میں دادا گیروں والا رعب داب رکھتا تھا۔ شریفوں کو تنگ کیا کرتا تھا اور معمولی بات پر لڑکوں کی پٹائی کر دیتا تھا۔ ایسی باتوں کی لوگ عموماً رپٹ درج نہیں کرواتے کیونکہ اس قسم کے بدمعاشوں کو پولیس کے نچلے عملے کی آشیرباد حاصل ہوتی ہے۔ رپٹ درج کروانے والا خواہ مخواہ کی مصیبت میں پھنس جاتا ہے۔

مجھے یاد آیا کہ چند ہفتے قبل ظہور نے ایک یتیم لڑکی کو اغوا کر لیا تھا۔ بات تھانے تک نہیں پہنچی تھی کیونکہ نواب دین نے بیچ میں پڑ کے لڑکی اُس کی ماں کے حوالے کر دی تھی اور شاید کچھ دے دلا کر بات ختم کر دی تھی۔

میں اِدھر اُدھر کی اطلاعات کی وجہ سے لڑکی کی ماں سے ملا تھا اور لڑکی کو بھی دیکھا تھا۔ لڑکی کی ماں کا نام بخت بی بی تھا اور وہ ضلع کوہاٹ کی رہنے والی تھی۔ میری یقین دہانی کے باوجود وہ ظہور کے خلاف رپٹ درج کروانے پر تیار نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بیٹی کا نام ریشم جان تھا۔ وہ سرخ و سفید رنگت والی نہایت حسین لڑکی تھی اور اس کی عمر سترہ اٹھارہ برس کے لگ بھگ تھی۔

مقتول کو تیز دھار آلے سے قتل کیا گیا تھا۔ اُس کے جسم پر زخموں کے متعدد نشانات تھے اور مسہری خون سے بھری [illegible] تھی۔ واضح طور پر قاتل نے اُسے بستر سے اٹھنے کی مہلت [illegible] نہیں دی تھی۔

میں نے لاش کا معائنہ کرنے کے بعد نظر اُٹھائی تو کمرے [illegible] کونے میں کوئی عورت بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ اُس نے سرخ [illegible] اوڑھ رکھی تھی۔

"یہ واردات کس طرح پیش آئی؟" میں نے نواب دین سے پوچھا۔ "کیا کوئی جھگڑا ہو گیا تھا؟"

"قاتل کی ساتھی وہ بیٹھی ہے۔" اُس نے سرخ [illegible] والی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم نے اِسے باہر [illegible] نہیں جانے دیا۔"

"یہ کون ہے؟" میں نے لڑکی کی طرف قدم بڑھایا۔

"یہ ڈائن ہے، ڈائن!" نواب دین نے کہا۔ "اگر میں گھر [illegible] عورتوں کو نہ روکتا تو اِدھر اِس کی بھی لاش پڑی ہوئی ملتی۔"

دروازے میں چند عورتیں دوپٹوں اور چادروں سے [illegible] چھپائے کھڑی تھیں۔ اُن میں سے ایک عورت مذکورہ لڑکی [illegible] گالیاں دینے لگی اور اُس پر ظہور الٰہی کے قتل کا الزام عائد کرنے لگی۔ اُس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ مقتول کی ماں تھی۔

سرخ شال والی لڑکی نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ریشم جان تھی اور دلہن بنی ہوئی تھی۔

"یہ تو ریشم جان ہے!" میں نے کہا۔ "بخت بی بی کی بیٹی۔ تمہارے بیٹے کی شادی اِس کے ساتھ ہوئی تھی؟"

"جی ہاں، آپ نے ٹھیک پہچانا ہے۔" نواب دین نے جواب دیا۔ "اِس کی ماں نے اسے زبردستی ہمارے سر منڈھ دیا تھا۔"

"آپ کو جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہیں آتی؟" لڑکی نے نہایت بے خوفی سے کہا۔ "میری ماں تو آپ کے گھر رشتہ دینے نہیں آئی تھی۔ آپ نے میری ماں کے سامنے جھولی پھیلائی تھی۔ کیونکہ آپ کا بیٹا میرے ساتھ شادی کرنے کے لیے مرا جا رہا تھا۔"

"زیادہ زبان مت چلا لڑکی!"

"مجھے زبان چلانے کی عادت نہیں ہے۔ میں نے آپ کے جھوٹ کا پول کھولا ہے۔"

لڑکی نڈر اور بے باک تھی۔ نہ اُسے کمرے میں پڑی ہوئی لاش کا کوئی خوف تھا اور نہ کسی اور بات کا۔ چند لمحوں تک وہ نواب دین حلوائی کی باتوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیتی رہی۔ اُس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ غلط بیانی نہیں کر رہی تھی۔ مجھے بھی اندازہ تھا کہ اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ ظہور کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ اس کی شہرت اچھی نہیں تھی، ایسے آدمی کو کوئی شخص کسی مجبوری کے تحت ہی اپنی بیٹی دے سکتا ہے۔

میں نے دونوں کو خاموش کرایا اور نواب دین سے پوچھا۔ "اس لڑکی کا واردات سے کیا تعلق ہے؟"

"دراصل یہ اس شادی پر راضی نہیں تھی۔" نواب دین نے جواب دیا۔ "اس کی ماں نے زبردستی اپنا بوجھ اُتارا تھا۔ لہٰذا اُس نے اپنے کسی آشنا کے ذریعے میرے بیٹے کو ختم کرا دیا۔"

"تھانے دار صاحب! اِس کو سمجھائیں کہ مجھ پر جھوٹا الزام نہ لگائے۔ اس کی بھی بہو بیٹیاں ہیں۔ اگر یہ باز نہیں آئے گا تو میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔ ہم غیرت والے لوگ ہیں۔ اِن کی طرح دوسروں کی بہو بیٹیاں نہیں اٹھواتے۔"

نواب دین نے ریشم جان کو سخت جواب دینے کا ارادہ کیا مگر میں نے اُسے ٹوکا اور پوچھا۔ "نواب دین، کیا تم قاتل کو جانتے ہو یا تم نے اُسے گھر میں گھستے ہوئے دیکھا تھا؟"

"میں دیکھتا تو اُسے زندہ جانے دیتا؟"

"نواب دین، میرے سوال کا سیدھا جواب دو۔ تمہارا جوان بیٹا تو کچھ کر نہیں سکا، تم کیا کر لیتے؟ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم قاتل کو جانتے ہو یا نہیں؟"

"میں قاتل کو نہیں جانتا۔ لیکن یہ بات پکی ہے کہ وہ اس کا کوئی ساتھی ہے۔" اُس نے ریشم جان کی طرف اشارہ کیا۔

"کیسے یہ بات پکی ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کوئی ثبوت بھی ہے تمہارے پاس؟"

"یہ میرا اندازہ ہے۔ میں نے آپ کو اشارہ دے دیا ہے، بات نکالنا آپ کا کام ہے۔"

اس اثنا میں ریشم جان کی ماں بھی وہاں پہنچ گئی۔ اُس کے ساتھ ایک چھتیس سینتیس سالہ نوجوان اور ایک عورت بھی تھی۔ عورت کی گود میں بچہ تھا۔ اُس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ ریشم جان کی بڑی بہن تھی اور نوجوان اُس کا شوہر تھا۔ اُسے میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

مرد نے اپنا نام فضل کریم بتایا اور کہا۔ "ہمیں ابھی تھوڑی دیر پہلے قتل کی خبر ملی ہے۔ قاتل کا کچھ پتا چلا؟"

میں نے تنقیدی نظروں سے اُس کا جائزہ لیا۔ وہ خاصا مضبوط اور قوی الجثہ شخص تھا۔

"تم کیا کام کرتے ہو؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"میں الیکٹریشن ہوں۔" اُس نے جواب دیا اور بتایا کہ وہ ایک بجلی کی دکان پر کام کرتا ہے۔

بخت بی بی نے کہا۔ "ام ریشم جان کو لینے کے لیے آیا ہے۔ اب اس کا اِدھر کوئی کام نہیں ہے۔ آپ کا اجازت ہے؟"

میں نے چند لمحے سوچا اور پھر اس انتباہ کے ساتھ اُسے اجازت دے دی کہ وہ شہر چھوڑ کر نہیں جائے گی۔

"ام کدھر جائے گا؟" اُس نے کہا۔ "امارا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔"

"جانے سے پہلے ریشم جان کو بیان دینا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ پھر فضل کریم سے پوچھا۔ "تم کہاں رہتے ہو؟"

"ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔" اُس نے جواب دیا۔

"تم بھی شہر چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے صاحب۔"

میں نے سب انسپکٹر کو جو میرے ساتھ موجود تھا، ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کی ہدایت کی اور ریشم جان اور اُس کی ماں کو الگ کمرے میں لے گیا۔

"بخت بی بی، ظہور نے تو ریشم جان کو اغوا کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تم اُس کے ساتھ بیٹی کا رشتہ کرنے پر کیسے تیار ہو گئیں؟"

"صیب، ام بیوہ عورت ہے۔ امارا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ ظہور نے اس معصوم کا عزت خراب کیا۔ پھر اس کے باپ نے رشتہ مانگا۔ امارا منت کیا۔ ام ناسمجھ راضی ہو گیا۔"

"اس کو قتل کس نے کیا ہے؟"

"ام کو کیا معلوم، اللہ جانتا ہے۔ کسی دشمن کا کام معلوم ہوتا ہے۔ اس کا دشمن تو بہت ہے۔"

میں نے ریشم جان سے پوچھا۔ "واردات کے وقت کمرے میں کون کون تھا؟"

"ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔" ریشم جان نے جواب دیا۔ "میں مسہری پر گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ ظہور کمرے میں داخل ہوا اور اندر سے کنڈی لگا دی۔ پھر وہ مسہری پر آ بیٹھا اور میرا گھونگھٹ اُٹھانے لگا۔ اچانک کمرے کی بتی بجھ گئی اور کسی نامعلوم شخص نے جو شاید کمرے میں ہی کہیں چھپا ہوا تھا، ظہور پر حملہ کر دیا۔ اُس کی چیخیں سن کر میں جلدی سے دروازے کی طرف بھاگی۔ لیکن اندھیرے کی وجہ سے دروازہ کھولنے میں دیر لگی۔ اتنی دیر میں قاتل پچھلے دروازے سے نکل کر جا چکا تھا۔ میں نے شور مچا کر گھر والوں کو اکٹھا کیا۔ یہ مجھ ہی کو برا بھلا کہنے لگے اور مجھے کمرے میں بند کر دیا۔ آپ کے حوالے کرنے کے لیے۔"

اُس کا بیان خاصا جاندار تھا۔ لمحہ بھر کے لیے مجھے شک ہوا کہ کہیں اسی نے اپنے شوہر کا کام تمام نہ کیا ہو۔ خاصی مضبوط اور دلیر

لڑکی تھی۔ اُس نے سُرخ جوڑا پہن رکھا تھا۔ میں نے باریکی سے اُس کا جائزہ لیا مگر اُس کے کپڑوں پر خون کا کوئی دھبّا نظر نہیں آیا۔

میں نے دولھن کو توقف کرنے کے لیے کہا اور باہر جا کر زلیب دین کی بیوی سے پوچھا: "دولھن اپنے گھر سے کس جوڑے میں یہاں آئی تھی؟"

"مجھے یاد نہیں رہا۔" اُس نے جواب دیا۔ "شاید گلابی یا ہرے رنگ کے جوڑے میں تھی۔"

میں اُسے خواب گاہ میں لے گیا اور سب انسپکٹر سے کہا کہ وہ اس کی نگرانی میں ریشم جان کے کپڑے چیک کرے اور دیکھے کہ کسی کپڑے پر خون کا کوئی دھبّا تو نہیں۔

اس کے بعد میں نے ایک حوالدار کو بلا کر کہا: "باہر جاؤ اور مکان کے ارد گرد آلۂ قتل کو تلاش کرو۔"

دوسرا خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ شاید یہ کام ریشم جان کے کسی ساتھی نے کیا تھا۔ ریشم جان پہلے سے کمرے میں موجود تھی۔ وہ عقبی دروازہ کھول سکتی تھی۔ تاہم یہ خیال زیادہ قرینِ قیاس نہیں تھا۔ دولھن کو عموماً تنہا نہیں چھوڑا جاتا۔ اگر اُس نے کسی ساتھی کے ساتھ مل کر جھورے کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا تو اُس کے لیے اتنی عُجلت مناسب نہیں تھی۔ گھر والوں کے سونے کے بعد یہ کام کرنا زیادہ بہتر تھا۔ یہ میری سوچ تھی۔ مجرم کی سوچ یقیناً مختلف تھی۔ اُس نے اپنی سہولت کے مطابق فیصلہ کیا تھا اور اپنا کام مکمل کر کے بظاہر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں واپس کمرے میں گیا اور ریشم جان سے پوچھا کہ کیا اُس نے بخوشی ظہور الٰہی سے شادی کی تھی۔

"شادی تو خوشی سے ہی کی جاتی ہے۔" اُس نے جواب دیا۔ "لیکن جب انسان مجبور ہو تو پھر خوشی نہیں ضرورت دیکھی جاتی ہے۔ آدمی بھوکا ہو تو اُسے سوکھی روٹی بھی کھانی پڑتی ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خوشی سے سوکھی روٹی کھا رہا ہے۔"

اُس کا جواب خاصا مدلل تھا۔ نہایت ہوشیار لڑکی تھی۔

"مجبوری کیا تھی؟" میں نے کہا۔ "تم خوب صورت اور کم عمر ہو۔ تمھیں آسانی سے اچھا رشتہ مل سکتا تھا!"

"جس لڑکی کو ایک بدمعاش آدمی نے اغوا کر کے بدنام کر دیا ہو اُس کو اچھا رشتہ نہیں مل سکتا۔ پھر یہ لوگ میری ماں کو دھمکیاں دے رہے تھے۔ اُن کو دھمکیاں کی زبان بھی بولنا نہیں آتی۔"

میں اُس کے اغوا کے بارے میں خاصی تفصیل سن چکا تھا تاہم اب یہ تفصیل اُس کی زبانی سننا ضروری ہو گئی تھی۔ میرے استفسار پر اُس نے جو واقعات بتائے اُنھیں میں پہلے سے کسی

ہوئی تفصیل سمیت اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا

ریشم جان تین بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ اُس مجھے بتایا کہ وہ خاندانی دشمنی کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ آن بسے تھے۔ اُس کا باپ اور ایک بھائی اسی دشمنی کی چڑھ گئے تھے۔ جس علاقے کے وہ رہنے والے تھے وہاں کے نام پر پلک جھپکتے میں آدمی قتل ہو جاتا تھا۔ اُس کا لاپتا ہو چکا تھا۔ پتا نہیں وہ زندہ تھا یا اُسے بھی کسی کر دیا تھا۔

کچھ عرصہ قبل وہ اپنی ماں کے ہمراہ اپنے بہنوئی فضل کے پاس آئی تھی جو پہلے سے وہاں آباد تھا۔ وہ ایک چھو سے تنگ نما مکان میں رہتا تھا۔ اُس کے اپنے تین بچے اور آمدنی محدود تھی۔ اس لیے وہ اپنی ساس اور سالی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

لہٰذا بخت بی بی نے ایک حویلی میں کام شروع کر سے اُسے گزارے ۔۔۔ لائق آمدنی ہو جاتی تھی۔ اپنی مالکہ کے کہنے پر اُس نے ریشم جان کو سلائی کڑھائی سیکھنے کے قابلِ بھروسا عورت کے پاس بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ ابتدا وہ ریشم جان کو خود چھوڑنے جاتی اور خود ہی لے کر آتی اُن کے محلے کی ایک اور لڑکی نے سلائی سیکھنے کے لیے ساتھ جانا شروع کر دیا۔ لہٰذا بخت بی بی نے آہستہ آہستہ ساتھ جانا ختم کر دیا۔

اتفاق سے ایک روز جھورے بدمعاش نے کو دیکھ لیا۔ لڑکی کی خوبصورتی دیکھ کر اُس کی نیت میں ہو گیا۔ ریشم جان کا رکھ رکھاؤ اور خوب صورتی دیکھ کر ابتد یہی سمجھا کہ وہ کسی بڑے گھر سے تعلق رکھتی ہوگی۔ لیکن نے ریشم جان کے بارے میں چھان بین کی تو اُسے پتا چلا کہ وہ رہتی ہے اور ایک بیوہ کی بیٹی ہے۔

اس انکشاف کے بعد اُس نے ریشم جان سے راہ بڑھانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اُس نے دیکھ غریب ضرور ہے مگر کردار کی مضبوط ہے۔

ایک روز اُس نے ایک سنسان گلی میں ریشم جان کا پکڑ لی اور بولا: "شہزادی، کبھی ہماری طرف بھی ہنس کے لیا کر۔ تیرے عشق نے ہمیں برباد کر دیا ہے۔"

"چھوڑ میرا ہاتھ۔" ریشم جان نے غصے سے کہا۔ شور مچا دوں گی۔"

ریشم جان کے ساتھ جو لڑکی تھی اُس کا نام نجمہ تھا۔

کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"شور مچانے سے تیری اپنی عزت خراب ہوگی۔" جھورے نے کہا اور ہاتھ نہیں چھوڑا۔ "یہ اپنا علاقہ ہے۔ یہاں اپنا راج چلتا ہے۔"

ریشم جان نے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا اور ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

جھورا دوسرے ہاتھ سے گال سہلاتے ہوئے بولا: "میری جان، کبھی پھولوں سے بھی چوٹ لگتی ہے! تیرے ہاتھ تو پھولوں جیسے ہیں۔ زور لگانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہاں کوئی تیری مدد کو نہیں آئے گا۔ وہ دیکھ میرے یار اشارے کے منتظر ہیں۔"

ریشم جان نے اشارے کی سمت دیکھا۔ وہاں دو بدمعاش کولھوں پر ہاتھ رکھے بظاہر بے تعلقی سے کھڑے تھے لیکن ریشم جان سمجھ گئی کہ وہ جھورے کے ساتھی تھے اور کسی شریف آدمی کی دخل اندازی کی صورت میں ہنگامہ کر سکتے تھے۔

"میرا ہاتھ چھوڑو اور منہ سے بات کرو۔"

جھورا اُس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے بولا: "یہ ہوئی نا بات!"

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"کبھی کبھی حسن کا دیدار ہوتا ہے۔" جھورے نے ڈھٹائی سے کہا۔ "عاشق کو اور کیا چاہیے۔"

"اگر یہی بات کوئی تمھاری بہن سے کہے تو پھر؟"

"یہ آزاد ملک ہے۔" جھورے نے بے شرمی سے جواب دیا۔ "ہر شخص عشق کرنے میں آزاد ہے۔"

"تم بے غیرت ہو۔" ریشم جان نے کہا۔ "تمھیں اپنی بہنوں کی عزت کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔"

"عشق میں گھر والوں کو بھی سلام کرنا پڑتا ہے۔" جھورے نے کہا۔ "میری بڑی چھوٹی سی خواہش ہے۔ کبھی آمنا سامنا ہو جائے تو ذرا مسکرا کر دیکھ لیا کرو۔ اور کچھ نہیں چاہیے مجھے۔"

"ایسی حرکتیں آوارہ لڑکیاں کیا کرتی ہیں۔"

جھورا اُسے آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا: "میں نے تمھیں اپنی خواہش بتا دی ہے اور میں آدمی ہوں ذرا اُلٹی کھوپڑی کا۔ اگر میری مرضی کے مطابق کام نہ ہوا تو پھر ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنا پڑے گا۔"

ریشم جان نے اُس کے سامنے زمین پر تھوکا اور بولی: "یہ ہے میرا جواب۔ میں کسی میراثی کی بیٹی نہیں، خان زادی ہوں۔ اگر تم نے میری طرف انگلی اٹھائی تو میں اُسے کاٹ کر پھینک دوں گی۔"

اس اثنا میں گلی میں کچھ راہ گیر نمودار ہو گئے تھے اور چند گھروں کے دروازے بھی کھل گئے۔ جھورے بدمعاش نے مُنہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ریشم جان کو دھمکی دی اور وہاں سے رُخصت ہو گیا۔

ریشم جان نے اس بات کا ذکر اپنی بہن سے کیا۔ بہن نے ماں کو بتایا۔ بخت بی بی نے اپنے داماد فضل کریم سے کہا کہ وہ جا کر جھورے سے باز پُرس کرے۔

فضل کریم اس بات کے سخت خلاف تھا کہ ریشم جان کام سیکھنے کے سلسلے میں گھر سے باہر نکلے۔ اس بات پر اس کا اپنی ساس سے جھگڑا بھی ہو چکا تھا۔

"میں نے تو آپ کو پہلے ہی منع کیا تھا کہ لڑکی کو گھر سے باہر مت نکالیں۔" اُس نے کہا۔ "لیکن آپ نے میری بات کی پروا نہیں کی۔ اس کو گھر میں بٹھاؤ یا شادی کرو۔ یہ باہر نکلے گی تو ہر روز یہی ہوگا۔ میں کس کس کے ساتھ جھگڑا کروں گا!"

اُس کی بیوی شیریں جان غصے سے بولی: "شادی کرو ۔ ۔ ۔ شادی کرو ۔ ۔ ۔ مُنہ سے بولنا بہت آسان ہے۔ کس کے ساتھ شادی کرو۔ شادی کے لیے پیسہ کدھر ہے؟ اِدھر تو لوگ جہیز مانگتے ہیں۔ یہ لوگ کہاں سے لائیں گے جہیز؟"

"تو پھر میں کیا کروں!" فضل کریم نے کہا۔ "اس کو بولو اپنا ملک والا مکان بیچ دے اور جہیز بنا لے۔"

"مکان تو ام کبھی نہیں بیچے گا۔" بخت بی بی نے کہا۔ "تم چاہتا ہے کہ ام مکان بیچ کر خوار ہو جائے!"

"انسان مکان بیچنے سے نہیں جوان لڑکی کو باہر نکالنے سے خوار ہوتا ہے۔" فضل کریم نے کہا۔ "اس کا باپ یوسف خان زندہ ہوتا تو باہر نکلنے پر اس کی ٹانگیں توڑ دیتا۔ تم لوگوں کی غیرت ختم ہو گئی ہے۔ ہمارے خاندان کی کسی عورت نے آج تک کسی کے برتن نہیں مانجھے۔ پہلے تم خود باہر نکلیں، پھر بیٹی کو بھی نکالا۔ جب لوگ مجھ سے یہ بات پوچھتے ہیں تو شرم سے میری آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔"

"اوہ ۔ ۔ ۔ ذرا اس کی بات تو سنو ۔ ۔ ۔" شیریں جان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "شرم سے اس کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں! اتنی غیرت ہے اس کے اندر! میرا بھائی وزیر گل اِدھر ہوتا تو اس بدمعاش کو ابھی ختم کر دیتا۔"

"جب سے تمھاری ماں اِس گھر میں آئی ہے میں بہت پریشان ہو گیا ہوں۔" فضل کریم نے کہا۔ "یہ لوگ میری کوئی بات نہیں مانتے۔ میں کیوں اِن کے جھگڑے میں پھنسوں۔ میرے ساتھ وعدہ کرو کہ آج کے بعد ریشم جان گھر سے باہر نہیں جائے

گی "میں ابھی جاکر اس بدمعاش کا دماغ ٹھکانے لگا دیتا ہوں۔"

"سب دنیا کی لڑکیاں باہر نکلتی ہیں۔" ریشم جان نے کہا۔ "میں اکیلی تو نہیں نکلتی۔ صاف بولیں کہ آپ ہماری مدد نہیں کرسکتے۔"

"اچھا۔۔۔! تم کو بھی بولنا آگیا؟" فضل کریم نے کہا۔ "ہمارے خاندان میں تو لڑکیاں بڑوں کے سامنے اونچی آواز سے سانس بھی نہیں لیتیں۔"

جھگڑا لمبا ہوگیا۔ فضل کریم، ریشم جان کو گھر میں پابند کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بخت بی بی اس بات کے حق میں نہیں تھی۔ اس نے اپنے وطن میں اس قسم کی پابندیوں سے بڑے دکھ اٹھائے تھے۔ اب وہ اپنی بیٹی کو پابند نہیں کرنا چاہتی تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ اس نئی جگہ کا ماحول اُن کے ماحول سے بہت مختلف تھا۔ یہاں عورتیں آزادانہ باہر آتی جاتی تھیں۔

چند روز خیریت سے گزر گئے۔ جھورے بدمعاش کی دھمکی کی وجہ سے بخت بی بی نے ریشم جان کے ساتھ جانا شروع کردیا تھا۔ وہ خود اُسے چھوڑ کر آتی اور خود واپس لے کر آتی۔ اس دوران جھورا خاموشی سے ایک طرف ہوگیا۔ لیکن وہ موقع کی تاک میں تھا۔ ایک روز بخت بی بی کو حویلی میں دیر ہوگئی۔

ریشم جان نے کچھ دیر انتظار کیا پھر اکیلی واپس روانہ ہوئی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ ایک تانگا اُس کے قریب پہنچ کر رکا۔ اُس میں جھورا اور اُس کے دو ساتھی بیٹھے تھے۔

جھورا تیزی سے نیچے اترا، ایک ہاتھ ریشم جان کے منہ پر رکھا اور اُسے اُٹھا کر تانگے میں ڈال دیا۔ اُس کے ساتھیوں نے تانگے کے آگے اور پیچھے دو چادریں تان دیں اور تانگا فی الفور ایک طرف روانہ ہوگیا۔

ریشم جان نے مجھے بتایا کہ جھورے کے ہاتھ میں ایک رومال تھا جس میں سے دوائی کی ناگوار سی بُو آرہی تھی۔ اُس رومال سے اُس نے اُس کے منہ اور ناک کو دبائے رکھا۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہوگئی۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے خود کو ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے پایا۔ کمرے میں سگریٹ کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ اُس نے لیٹے لیٹے نظر گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔ دروازے کے قریب ایک کرسی رکھی تھی، جس پر جھورا بدمعاش براجمان تھا۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔

ریشم جان نے آنکھیں بند کرلیں اور سوچنے لگی کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش! اُس کے ہاتھ کوئی ہتھیار لگ جائے جس سے وہ اس بدمعاش کو قتل کرسکے۔

اُس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور حرکت کیے بغیر ایک بار کمرے کا جائزہ لیا لیکن اُسے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جو وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرسکتی۔

اس اثنا میں جھورے کو اُس کے ہوش میں آنے کا پتا چ
وہ اُٹھ کر بستر کے قریب پہنچا اور ریشم جان کے چہرے پر سگریٹ کا دھواں پھینکتے ہوئے بولا: "کیا حال ہے جنگل کی شہزادی کا؟"

ریشم جان تیزی سے اٹھی اور چارپائی کی دوسری جانب جا کھڑی، بولی: "اگر تم نے مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو بُرا ہوگا۔ تم ہمارے خاندان کو نہیں جانتے۔ میں عزت کے لیے جان دے دوں گی، سمجھے؟ مجھ سے دور رہنا۔"

"تم کیوں جان دو گی؟" جھورے نے تو فرانہ انداز میں
"اپنی جان کس دن کام آئے گی۔ بولو تو ابھی پیش کردوں؟"

ریشم جان نے دیکھا کہ قریب ہی میز پر ایک شیشے کا گلاس رکھا تھا۔ اُس نے تیزی سے گلاس اٹھایا اور جھورے کے سر پہ دے مارا لیکن وہ جھکائی دے کر بچ گیا۔ ریشم جان نے اتنے میں میز اٹھالی اور اُسے سر سے بلند کرکے جھورے پر حملہ آور ہوئی۔ چھوٹے سائز کی وہ میز مؤثر ہتھیار ثابت سکتی تھی۔ جھورا اُس کے وار سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگا اور کوئی راہِ فرار نہ پا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

ریشم جان نے میز ایک طرف پھینکی اور فی الفور اندر سے کنڈی لگادی۔ پھر جلدی سے دوسرے دروازے کو چیک کیا۔ اُس کی کنڈی پہلے سے لگی ہوئی تھی۔ کمرے کی واحد کھڑکی میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اُدھر سے کوئی شخص اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

جھورے کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اُس نے پلٹ کر دروازے کو دھکا دیا۔ مگر اُس وقت تک دروازہ بند ہوچکا تھا۔ اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ریشم جان کو دھمکی دی کہ اگر اُس نے دروازہ نہ کھولا تو اُس کا انجام بہت بُرا ہوگا۔

ریشم جان دلیر لڑکی تھی۔ اُس نے جواب دیا: "میں تمھاری دھمکی سے نہیں ڈرتی۔ دروازہ ایسے نہیں کھلے گا۔ پہلے میری ماں کو اور چار شریف آدمیوں کو اِدھر بلاؤ۔"

معلوم ہوتا تھا کہ وہ مکان آبادی کے درمیان تھا اور جھورا شور ہنگامہ کرنے سے گھبرا رہا تھا۔

"یہاں کوئی نہیں آئے گا۔" اُس نے کہا۔ "نہ تمھاری ماں آئے گی اور نہ چار شریف آدمی۔ ہم نے دونوں دروازے باہر سے بند کردیے ہیں۔ تم اس کمرے میں بھوکی پیاسی مرجاؤ گی۔"

یہ بات چیت کھڑکی سے ہو رہی تھی۔ ریشم جان نے کم

رے کے ساتھ اُس کے دو بدمعاش ساتھی بھی وہیں پر د تھے۔

"میں موت سے نہیں ڈرتی۔" ریشم جان نے کہا۔ "اگر میں مر تو تم بھی زندہ نہیں بچو گے۔ میرے گھر والے فوراً سمجھ جائیں گے کہ کس نے اغوا کیا ہے۔"

"اگر تم اس طرح نہیں مانو گی تو ہم دروازہ توڑ دیں گے۔"

"توڑ دو۔۔۔ دیر مت کرو۔ ایک آدمی کو تو میں ضرور ر دوں گی۔ میں خان زادی ہوں، تمھاری عورتوں کی طرح بزدل ہوں۔ جو کمرے میں قدم رکھے گا میں اُس کا سر پھوڑ دوں گی۔"

جھورے کے ایک ساتھی نے کہا: "اُستاد، یہ اس طرح نہیں گی۔ مٹی کا تیل چھڑک کر کمرے کو آگ لگا دو۔"

"اگر اس نے ہماری بات نہ مانی تو یہی کرنا پڑے گا۔"

ریشم جان نے کھڑکی بند کردی اور کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں پائیاں، دو تین صندوق، دو کرسیاں، ایک میز، چند برتن اور موٹی چیزیں تھیں۔ ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا تھا نی پر چند مردانہ کپڑے لٹک رہے تھے۔ کمرے کی مجموعی ت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں صرف مرد رہتے تھے۔

میز اور کرسیاں معمولی لکڑی کی تھیں۔ ریشم جان نے دیکھا کہ نے کی وجہ سے میز کا ایک پایہ اُکھڑ گیا تھا۔ اُس نے تھوڑی ش سے اُس پائے کو الگ کرلیا۔ وہ خاصا بھاری پایا تھا اور ہتھیار استعمال کیا جاسکتا تھا۔

گھڑا پانی سے بھرا ہوا تھا اور برتنوں میں کچھ بچا ہوا کھانا بھی تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ اُس کھانے اور پانی کی مدد سے مال دو تین دن گزار سکتی تھی۔

اُدھر بخت بی بی جب گھر پہنچی تو بیٹی کو گھر میں نہ پا کر ان ہوگئی۔ اُس کا داماد ابھی گھر نہیں آیا تھا۔ اُس نے بڑی بیٹی یں جان کو ساتھ لیا اور ریشم جان کی تلاش میں روانہ ہوگئی۔ سلائی نے والی عورت نے اُسے بتایا کہ اُس کی بیٹی بہت پہلے

ت بی بی پتا پوچھتی ہوئی جھورے کے گھر پہنچی اور نواب دین ا کہ اُس کا بیٹا ظہور کہاں ہے۔

نواب دین کو بیٹے کی حرکتوں کا علم تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ بھی اُس کے بیٹے کی کوئی شکایت لے کر آئی ہیں۔ تاہم اُس ان بنتے ہوئے کہا: "ظہور یہیں کہیں ہوگا۔ تھوڑی دیر وہ یہیں تھا۔" حالانکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ جھورا صبح سے گھر ب تھا اور یہ اُس کا روزمرہ کا معمول تھا۔

"تمھارے بیٹے نے میری بیٹی ریشم جان کو اغوا کرلیا ہے۔" بی بی نے غصے سے کہا۔ "اگر میری بیٹی کو کچھ ہوگیا تو تمھاری خیر نہیں ہوگی۔ ہم غیرت دار لوگ ہیں۔"

نواب دین یہ سن کر فکر مند ہوا اور اپنی بیوی رحمتے کو بُلا کر کہا: "یہ عورتیں کیا کہہ رہی ہیں! یہ کہتی ہیں کہ ظہور نے ان کی بیٹی کو اغوا کرلیا ہے۔"

رحمتے نے بخت بی بی اور شیریں جان کا جائزہ لیا اور اندازہ لگایا کہ وہ غریب عورتیں تھیں، کیونکہ انھوں نے معمولی لباس پہن رکھے تھے۔

"میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔" اُس نے کہا۔ "کیا ثبوت ہے تمھارے پاس؟ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے اُسے اغوا کرتے دیکھا ہے؟"

"آنکھوں سے نہیں دیکھا۔" شیریں جان نے کہا۔ "لیکن کچھ روز پہلے ظہور نے راستے میں ریشم جان کا ہاتھ پکڑا تھا اور اُسے دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اُس کے ساتھ دوستی نہیں کرے گی تو وہ اُسے اٹھالے گا۔"

"ارے جا۔۔۔! پتا نہیں کہاں سے آگئی ہے!" رحمتے نے غصے سے کہا۔ "تمھاری بیٹی خود ہی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی۔"

"یہ لوگ ایسے نہیں مانیں گے۔" شیریں جان نے ماں سے کہا: "آؤ، پولیس کے پاس چلتے ہیں۔"

نواب دین نے سمجھداری کا ثبوت دیا اور کہا: "اگر پولیس کے پاس جانا چاہتی ہو تو بے شک جاؤ۔ لیکن ایک بات سوچ لو۔ ہوسکتا ہے کہ تمھاری بیٹی اپنی مرضی سے گئی ہو۔ میں ظہور کو بُلا کر پوچھتا ہوں۔ اگر لڑکی اُس کے پاس ہوئی تو مل جائے گی۔ جلدی نہ کرو۔"

اُس نے دونوں عورتوں کو گھر میں بٹھایا، کچھ خاطر تواضع بھی کی اور جھورے کی تلاش میں آدمی دوڑا دیے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جھورا جھومتا جھامتا گھر میں داخل ہوا۔ اُسے یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ ریشم جان کی ماں اور بہن اُس کے گھر میں بیٹھی ہیں۔

نواب دین نے سخت لہجے میں اُس سے لڑکی کے بارے میں باز پرس کی۔ وہ چھٹا ہوا بدمعاش ایسی سختی کی کوئی پروا نہیں کرتا تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ اُسے لڑکی کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے البتہ وہ لڑکی کی تلاش میں مدد دے سکتا ہے۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" شیریں جان نے غصے سے کہا۔ "تم نے میری بہن کو راستے میں چھیڑا تھا، اُس کی بے عزتی کی تھی اور اُسے دھمکی دی تھی۔"

جھورا مکاری سے مسکرایا، بولا: "وہ کوئی اور ہوگا۔ میں نے تو آپ کی بہن کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ کیا نام ہے اُس کا؟"

"اُس کا نام ریشم جان ہے۔"

"اگر آپ پولیس میں رپٹ لکھوانا چاہتی ہیں تو چلیں میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" جبورے نے ڈینگ ماری۔ "پولیس تھانے سے اپنی یاری ہے۔"

بخت بی بی کے دل میں طبعی طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر اس بدمعاش کے پولیس سے مراسم ہیں تو اس کے خلاف رپٹ درج کروانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

"ویسے اگر لڑکی شہر کے اندر موجود ہے تو میں خود بھی اُسے تلاش کر سکتا ہوں۔" جبورے نے مزید کہا۔ "میں سب چھوٹے بڑے بدمعاشوں کو جانتا ہوں۔"

وہ سیدھی سادی عورتیں اُس کی باتوں سے متاثر ہو گئیں۔ اس کے علاوہ اہم بات یہ تھی کہ وہ بغیر کسی چرچے کے لڑکی کی بازیابی چاہتی تھیں۔ انھوں نے باقی باتوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے جبورے سے ریشم جان کو تلاش کرنے کے لیے کہہ دیا۔

وہ شیطان اُن کو گھر تک چھوڑنے گیا اور اُن سے کہا۔ "آپ کوئی فکر نہ کریں، میں جب تک ریشم جان کو تلاش نہیں کر لوں گا اُس وقت تک آرام نہیں کروں گا۔"

اُس وقت فضل کریم گھر پہنچ چکا تھا۔ جب اُس نے اپنی بیوی اور ساس کو جبورے سے بات کرتے دیکھا تو وہ غصّے سے بھر گیا۔ اُسے ہنوز ریشم جان کی گمشدگی کا علم نہیں تھا۔ اُس نے نہایت غصّے کے ساتھ اپنی بیوی سے جواب طلبی کی کہ وہ ایک آوارہ گرد بدمعاش کے ساتھ کہاں کی سیر کرنے گئی تھی۔

شیریں جان نے اُسے بہن کی گمشدگی کا احوال سنایا اور کہا کہ وہ بھی ریشم جان کو تلاش کرنے کے لیے نکلے۔

یہ سُن کر فضل کریم کا غصّہ فزوں تر ہو گیا اور وہ بیوی پر ہی لعن طعن کرنے لگا کہ اور بہن کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔

جبورا کچھ دیر گلی میں کھڑا اُن کے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں سنتا رہا، پھر واپس اُس مکان میں جا پہنچا جس میں ریشم جان مقید تھی۔ اُس کے ساتھی کچے مجرم تھے اور ریشم جان کو مزید وہاں قید رکھنے کے حق میں نہیں تھے۔

جبورے نے ریشم جان کو دروازہ کھولنے پر آمادہ کرنے کی بہت کوشش کی، دھمکیاں بھی دیں اور نرمی سے بھی سمجھایا لیکن کامیاب نہ ہوا۔

اگلی صبح اُس نے ریشم جان سے کہا: "تمھاری ماں بہت پریشان ہے۔ وہ رات کو ہمارے گھر آئی تھی۔ تمھارا بہنوئی بہت غصّے میں ہے۔ اگر تم اس کے سامنے چلی گئیں تو وہ تمھیں قتل کر دے گا۔ یہ بات میں نے اُس کے منہ سے سُنی ہے۔"

یہ بات سُن کر ریشم جان قدرے گھبرا گئی۔ "ا[ز]
[کہ جب کوئی] لڑکی گھر سے بھاگ جائے یا اغوا ہو جائے تو [...]
سے زیادہ اپنے اُس کی جان کے دشمن ہو جاتے [ہیں]۔"

جبورے نے اندازہ لگایا کہ اُس کی اس [بات کا اثر]
خاطر خواہ ہوا تھا۔ اُس نے مزید کہا: "اگر تم میری با[ت مانو]
تو میں تمھیں گھر بھی چھوڑ آؤں گا اور تمھاری عزت بھی [بچا لوں گا۔"]

"تم میری عزت بچاؤ گے!" ریشم جان نے کہا۔ "تمھاری تو اپنی کوئی عزت نہیں ہے، تم میری [عزت]
کیا بچاؤ گے!"

"ٹھیک ہے، جو تمھاری مرضی میں آئے کرو [لیکن میری]
بات سن لو۔ میرا یہ یار جیدا حلفیہ بیان دے گا کہ تم اس [سے]
محبت کرتی ہو اور اپنی خوشی سے اس کے ساتھ بھا[گی ہو۔]
ہم اس کی طرف سے گواہی دیں گے۔"

"تم کو ایسا جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہ آئے گ[ی؟" اُس]
نے کہا۔ "میری عزت برباد کر کے تمھیں کیا ملے گا؟"

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ میری بات مان لو۔"

"کون سی بات مان لوں؟"

"کسی کو یہ نہ بتانا کہ میں نے تمھیں اغوا کیا [تھا۔" اُس]
نے کہا۔ "اور دوسری وہی شرط ہے جو میں پہلے بتا چکا [ہوں۔ جب کبھی]
آمنا سامنا ہو جائے تو ذرا مسکرا کر دیکھ لیا کرو۔"

ریشم جان نے اپنی جان بچانے کے لیے اُس کی [دونوں]
شرطیں مان لیں۔ جبورے نے وعدہ کیا کہ وہ رات [کا اندھیرا]
پھیلتے ہی اُسے آزاد کر دے گا اور اُس نے ایسا ہی ک[یا۔ وہ]
اُس کے گھر کے قریب چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

بخت بی بی نے بیٹی کو بخیریت دیکھ کر اطمینان [کا سانس]
لیا لیکن اُس کے داماد نے بہت شور ہنگامہ کیا۔ اُس [نے]
کہہ دیا کہ اب ریشم جان گھر سے باہر نہیں جائے گی۔

"ہمارے بزرگوں کا کہنا ہے کہ عورت کے دو ہی [گھر ہوتے]
ہیں۔" اُس نے مزید کہا۔ "پہلا گھر اور دوسرا گور۔ . ."

بخت بی بی خاموش رہی۔ اگلے روز فضل کریم [کے]
جانے کے بعد ریشم جان نے ماں کو سب کچھ بتا دیا۔

بخت بی بی نے ساری بات سُنی اور گہری سو[چ میں پڑ]
گئی۔ اُس نے اپنی بیٹیوں کو تاکید کر دی کہ وہ اس معا[ملے میں زبان]
نہ کھولیں۔

لیکن ایسی باتیں چھپی ہوئی نہیں رہتیں۔ جیسا کہ [میں بتا]
چکا ہوں کہ یہ بات مجھ تک پہنچی اور میں بخت بی بی [کے پاس]
بھی گیا لیکن اُس نے جبورے کے خلاف کیس کرنے [سے انکار]

کر دیا۔ چونکہ لڑکی گھر آ چکی تھی اور بات پرانی ہو چکی تھی اس لیے میں نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ فقط جبورے کو تھانے بلا کر وارننگ دی اور معاملہ ختم کر دیا۔

چند روز بعد بخت بی بی اپنی بیٹی کے ہمراہ نواب دین کے گھر پہنچی اور اپنی بیٹی کے لیے جبورے کا رشتہ مانگا۔

یہ بات مجھے نواب دین کے حوالے سے معلوم ہوئی تھی۔ بخت بی بی اس بات کی اقراری نہیں تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ پہلے نواب دین اُن کے گھر آیا تھا۔

بہرحال، میں چونکہ ایک خاص زاویے سے یہ واقعہ بیان کر رہا ہوں اس لیے متنازع حصے کو چھوڑ رہا ہوں۔ غور سے پڑھنے والوں پر اصل حقیقت خود بخود منکشف ہو جائے گی۔

نواب دین نے دونوں عورتوں کو عزت سے بٹھایا اور اپنی بیوی رحمتے کو بُلا کر بتایا کہ بخت بی بی اُن کے بیٹے ظہور الٰہی سے اپنی بیٹی کا رشتہ کرنا چاہتی ہے۔

یہ سُن کر رحمتے کو خوشی بھی ہوئی اور تعجب بھی۔ اُس کے آوارہ بیٹے کو برادری کا کوئی شخص رشتہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اب اُسے گھر بیٹھے ایک کم عمر اور پری چہرہ بہو مل رہی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اتنا اچھا رشتہ اُس کے شریکوں کے سینے میں آگ لگا دے گا۔ دل میں اُسے یقین تھا کہ اس رشتے کے لیے یقیناً اس کے بیٹے نے کوئی چال چلی تھی۔

نواب دین نے کہا: "بخت بی بی، تم رشتہ لے کر تو آ گئی ہو لیکن ہماری اور تمھاری ذات بہت مختلف ہے۔"

"بڑی ذات اللہ کی ہے۔" بخت بی بی نے کہا۔ "انسان سب برابر ایں۔ امارا اپنی ذات والوں سے رشتہ ختم او چکا ہے۔"

"اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔" رحمتے نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمھارے رشتے دار دوڑے آئیں۔"

"ام غریب لوگ ایں۔ امارا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔"

نواب دین نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "میرے بیٹے کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ کل کو اس بات کا طعنہ نہیں دینا۔"

"کوئی بُرائی نہیں میرے بیٹے میں۔" رحمتے نے جلدی سے کہا۔ "ابھی نادان ہے، شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گا۔"

بخت بی بی نے کہا: "تمھارے بیٹے کی وجہ سے میری بیٹی بدنام ہوئی اے۔ اگر ام کسی اور جگہ رشتہ کریں گے تو سسرال والے اُس کو طعنے دیں گے۔ اس لیے ام تمھارے پاس آیا اے۔"

بات بظاہر معقول تھی۔ نواب دین اور رحمتے نے آپس میں مشورہ کیا، پھر جبورے کی مرضی پوچھی۔

وہ یہ خبر سُن کر خوشی سے اُچھل پڑا۔

بہرحال، بات چیت طے ہوئی، تاریخ مقرر ہوئی اور شادی ہو گئی۔ لیکن جیسا کہ آپ پہلے سُن چکے ہیں کہ شادی کی رات جب جبورے نے اپنی خوابوں کی ملکہ کا گھونگھٹ اُٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو ایک بے رحم قاتل نے اُسے اُسی کے خون میں رنگین کر دیا۔

ہماری پوری کوشش کے باوجود نہ تو آلۂ قتل ہمارے ہاتھ لگا اور نہ کوئی ایسا ثبوت ملا جس سے یہ ظاہر ہو کہ قتل ریشم جان نے کیا تھا یا وہ بالواسطہ قتل میں ملوث تھی۔ کچھ تھوڑا سا شک مجھے فضل کریم پر بھی تھا۔ اسی شک کی بناء پر میں نے اُس کے گھر کی تلاشی لی، مگر وہاں سے بھی کچھ برآمد نہ ہوا۔

کچھ مہمانوں کی زبانی معلوم ہوا کہ انھوں نے بارات کی واپسی کے وقت ایک مشکوک نوجوان کو جو شکل و صورت سے پٹھان لگتا تھا، دولھا کے گھر میں دیکھا تھا۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ وہ دُلھن والوں کا کوئی رشتے دار ہوگا۔

میں نے بخت بی بی اور اُس کی بیٹیوں سے اُس نوجوان کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ تاہم میں نے محسوس کیا کہ اس نوجوان کے ذکر سے بخت بی بی کچھ پریشان سی ہو گئی تھی۔ میرے ذہن میں دو باتیں آئیں۔ یا تو وہ کوئی ایسا نوجوان تھا جو ریشم جان سے شادی کا خواہش مند تھا اور یا وہ بخت بی بی کا گم شدہ بیٹا وزیر گل تھا جس نے روایتی غیرت کے تحت جبورے کو قتل کر دیا تھا۔

میں نے فضل کریم سے اُس کے آبائی گاؤں کا پتا لیا اور ایس پی علاقہ کی اجازت سے ایک تفتیشی پارٹی وزیر گل کی تلاش میں روانہ کر دی۔

اس کے علاوہ ایک خیال اور بھی میرے ذہن میں آیا۔ قاتل، جبورے کا کوئی اپنا ساتھی بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی ایسا ساتھی جو ریشم جان پر اپنا حق فائق سمجھتا ہو۔

اس خیال کے ساتھ ہی مجھے وہ دو بدمعاش یاد آئے جو اغوا کی کارروائی میں جبورے کے ساتھ تھے۔ میں نے اُن دونوں کو تھانے بلوا لیا۔ اُن میں سے ایک کا نام مجید عرف جیدا اور دوسرے کا نام واجد علی تھا۔ یہ دونوں شادی میں شریک ہوئے تھے اور بلا روک ٹوک گھر کے اندر آتے جاتے تھے۔

واجد علی گورے رنگ کا لمبا تڑنگا نوجوان تھا۔ اُس نے بڑی بڑی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں اور اکڑ کر بات کرتا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا بگڑا ہوا چشم و چراغ تھا۔ اس کے برعکس جیدا جو ذات کا موچی تھا، چھوٹے قد اور

سانولے رنگ کا مکار نوجوان تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو بوقتِ ضرورت اگلے کی جوتیاں بھی چاٹ لیتے ہیں اور کام نکل جانے کے بعد یُوں آنکھیں پھیر لیتے ہیں جیسے کوئی جان پہچان ہی نہ ہو۔

واجد علی خاندانی حیثیت میں جھورے سے بڑھ کر تھا شکل صورت کا بھی اچھا تھا۔ اس لیے وہ بھی ریشم جان کا اُمیدوار ہوسکتا تھا۔

مَیں نے پہلے جیدے کو اپنے پاس بُلایا اور پوچھا "جھورے بدمعاش کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"حضور، مجھے کچھ پتا نہیں۔" اُس نے عاجزی سے جواب دیا۔ "مَیں اُس وقت کرسیاں شرسیاں اکٹھی کر رہا تھا کہ اچانک مکان کے اندر کھپ پڑ گئی۔ میرا خیال ہے کر۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔ "پر جی، کیا فائدہ کسی پر الزام لگانے کا۔"

"اوئے، بندے دا پُتر بن کے بات کر۔" قریب کھڑے اے ایس آئی نے کہا۔ "ہمارے پاس بکواس سُننے کا وقت نہیں ہے۔ جو کچھ تجھے معلوم ہے یا جس بات کا شک ہے، وہ سب بتا دے۔ فیصلہ ہم خود کر لیں گے۔"

"بادشاہو، ناراض کیوں ہوتے ہو۔" اُس نے مکاری سے ہاتھ جوڑے۔ "مَیں تو نوکر ہی آپ کا ہوں۔ آپ کی مہربانی سے وقت پاس ہو رہا ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ قتل ریشم جان نے کیا ہے۔ اس کا نام تو ریشم جان ہے، پر ہے بڑی سخت جان۔ مَیں نے جھورے کو منع کیا تھا، مگر اس نے میری بات نہیں سنی۔"

مَیں نے پوچھا۔ "تم نے کیوں منع کیا تھا؟"

"جناب، اس لڑکی نے جھورے کو بڑی دھمکیاں دی تھیں۔" اُس نے روانی میں جواب دیا۔ "کہتی تھی، مَیں خان زادی ہوں، جان سے مار ڈالوں گی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"یہ چار پانچ ہفتے پہلے کی بات ہے۔"

"ہوں۔۔۔ یہ اُسی دن کی بات ہے نا جس دن تم لوگوں نے ریشم جان کو اغوا کیا تھا؟"

"جج۔۔۔ جی! اغوا کا تو مجھے کچھ پتا نہیں۔"

اے ایس آئی نے اُس کی گردن پر زور کا ہاتھ جمایا۔ بولا "پتا تو تجھے سب کچھ ہے بچے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یادداشت ذرا کمزور ہو گئی ہے۔ کچھ تم کوشش کرو، کچھ ہم کرتے ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی یادداشت واپس آجائے گی۔ یاد آیا، یا ایک ہاتھ اور جماؤں؟"

"جناب۔۔۔! لڑکی خود ہی جھورے سے ملنے آئی تھی۔"

اے ایس آئی نے میرے اشارے پر ایک اور ہاتھ جمایا۔

مَیں نے کہا۔ "ایک طرف تم کہتے ہو کہ لڑکی نے جھورے کو قتل کی دھمکی دی تھی۔ دوسری طرف کہتے ہو کہ وہ خود ہی آ گئی تھی۔ اگر سچ نہیں بولو گے تو تمھارے خلاف اغوا کا کیس درج کر لوں گا۔"

"سچی بات یہ ہے جناب۔۔۔ اغوا جھورے نے کیا تھا۔ مَیں اس کام میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔"

"اگر لڑکی نے تمھارے خلاف بیان دیا اور کہا کہ تم بھی واردات میں شامل تھے تو مَیں تمھاری کھال اُدھیڑ کے رکھ دوں گا۔"

"مم۔۔۔ مَیں جھورے کے کہنے پر تانگہ لے کر آیا تھا۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ لڑکی کو اغوا کرنا چاہتا ہے۔"

"لڑکی تو تمھیں بھی پسند تھی۔" مَیں نے کہا۔ "سچ ہے تو اس کی ماں سے تمھارے لیے بات کریں!"

اُس نے پیلے دانت نکال دیے، بولا "میری تو بیوی ایک ہی بندہ کافی ہے۔ مجھے قتل ہونے کا کوئی شوق نہیں۔"

"تو تمھیں پکا یقین ہے کہ قتل ریشم جان نے کیا ہے؟"

"لگتا تو یہی ہے جی۔ یا تو خود قتل کیا ہے یا کسی سے کرایا ہے۔"

مَیں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "مَیں نے سنا ہے کہ جھورے کی واجد علی سے بڑی گِٹ مِٹ تھی۔ دونوں آپس میں رشتہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جھورے نے چکر چلا کر لڑکی کی ماں کو اپنی حمایت میں کر لیا تھا۔ یہ بات واجد علی کو بہت بُری لگی اور اس نے لڑکی کی مدد سے جھورے کو قتل کر دیا۔"

اُس نے میری باتیں سن کر آنکھیں گھمائیں۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ اچھا۔۔۔! یہ چکر ہے۔ پھر اونچی آواز میں بولا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے جی۔ واجد علی بھی کافی رنگیلا آدمی ہے۔ لڑکی تو اُسے بھی پسند تھی پر پہلا حق جھورے کا ہی تھا۔"

"ہوں۔۔۔ تو اب دوسرا حق واجد علی کا ہے۔" مَیں نے کہا۔ "اور تیسرا حق تمھارا۔ یہ بتاؤ، جس وقت تم کرسیاں شرسیاں اکٹھی کر رہے تھے اُس وقت واجد علی کہاں تھا؟"

اُس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس وقت نظر نہیں آیا۔ تھوڑی دیر پہلے موجود تھا۔ لیکن پھر نظر نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کہ گھر چلا گیا ہو۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جھورے کے کمرے میں جا کر چھپ گیا ہو!"

"جی ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔" وہ بدستور آنکھیں گھماتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ "عورت اور اس کے حسن سے اللہ بچائے۔ اس چکر میں بڑے بڑوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ بھائی، بھائی کا دشمن ہو جاتا ہے اور دوست، دوست کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ اگر بات سچ ہے تو ریشم جان نے واجد علی کو بھی اُلّو ہی بنایا ہوگا۔" آخری فقرہ اُس نے خود کلامی کے انداز میں کہا تھا۔

مَیں نے کہا۔ "کچھ لوگوں نے ایک گورے رنگ کے نوجوان کو مہمانوں کے درمیان دیکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ اُس کا ناک نقشہ پٹھانوں جیسا تھا۔ یہ شخص کون تھا؟"

"دیکھا تو مَیں نے بھی تھا۔" اُس نے جواب دیا۔ "لیکن اُس کے ساتھ کوئی گَل بات نہیں ہوئی۔ شاید لڑکی والوں کا رشتہ دار تھا۔"

اُس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ قتل میں ملوث نہیں تھا۔ آدمی چونکہ مکار تھا، اس لیے اس کے بارے میں اتنی جلدی کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مَیں نے اُسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور واجد علی کو بُلا لیا۔

اُس کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ نظر نہیں آتی تھی۔ اُس نے سلام کیا اور کرسی پر بیٹھنے لگا۔

اے ایس آئی نے پیچھے سے اُس کا کالر پکڑ لیا اور اُسے اُونچا کرتے ہوئے بولا۔ "یہاں بدمعاشوں کو کرسی نہیں ملتی۔ اِدھر دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔"

اُس نے اپنا کالر چھڑوایا اور ناگواری سے اے ایس آئی کو گھورنے لگا۔ پھر بولا۔ "کوئی بات نہیں جناب، آپ اس تھانے کے مالک ہیں۔ تھانہ بھی آپ کا ہے اور کرسیاں بھی آپ کی ہیں۔ ویسے میرا تجربہ یہ ہے کہ اس ملک میں شریف لوگوں کو کرسی نہیں ملتی۔"

مَیں نے اے ایس آئی سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اس کی ٹکور شکور کرتا رہے کیونکہ وہ ایک معصوم لڑکی کے اغوا میں ملوث تھا۔ لہٰذا اُس کی بات سنتے ہی اے ایس آئی نے اُس کے مُنہ پر تھپڑ مارا اور کہا۔ "اوئے، ہم تجھے بدمعاش لگتے ہیں؟"

"کوئی بات نہیں جناب، ایک تھپڑ اور مار لو۔" اُس نے کہا اور سیدھا کھڑا رہا۔ "وقت، وقت کی بات ہے۔"

مَیں نے پوچھا۔ "تم نے جھورے کو قتل کیوں کیا؟"

"مَیں نے جھورے کو قتل کیا!" اُس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ "جھورا تو میرا یار تھا۔ جگری یار۔۔۔! ہمارا ایک ساتھ اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ مَیں اُسے کیسے قتل کر سکتا ہوں!"

"جب ایک خوب صورت لڑکی بیچ میں آجائے تو سب یاریاں ختم ہو جاتی ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "کیا یہ حقیقت نہیں کہ تم بھی ریشم جان کے متوالے تھے اور اُس سے شادی کرنا چاہتے تھے؟"

"یہ۔۔۔ یہ آپ کو کس نے بتایا ہے؟"

اے ایس آئی نے ایک اور تھپڑ مارا اور کہا۔ "سوال نہیں کرو، جواب دو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں جناب۔" اُس نے جواب دیا۔ "میرا اُس لڑکی سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہمارے خاندان میں باہر شادی کرنے کا کوئی رواج نہیں ہے۔"

"پھر تم نے اُسے اغوا کیوں کیا تھا؟"

"اغوا جھورے نے کیا تھا، مَیں تو۔۔۔"

اے ایس آئی نے اُسے لات رسید کی، بولا "لڑکی تمھارے خلاف بیان دے چکی ہے کہ تم اُس کے اغوا میں شامل تھے۔"

"مَیں جھورے کے ساتھ ضرور تھا۔ مگر مَیں نے لڑکی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ یہ بات آپ لڑکی سے پوچھ سکتے ہیں۔"

اے ایس آئی نے اُس کی پسلیوں میں گھونسا مارا، کہا۔ "لو جی، یہ آج نئی بات سُنی ہے، یہ ساتھ تھا، اغوا میں شامل نہیں تھا۔ اوئے، اور کس طرح اغوا میں شامل ہوتے ہیں؟"

مَیں نے کہا "تمھارے یار کا کہنا ہے کہ تم لڑکی سے شادی کے خواہشمند تھے۔"

"کک۔۔۔ کون سے یار کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"سوال نہیں کرو، جواب دو۔" مَیں نے کہا۔ "تمھارے یار کا کہنا ہے کہ جھورے کو تم نے قتل کیا ہے۔ لڑکی کی وجہ سے تم دونوں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔"

"یہ۔۔۔ یہ جھوٹ ہے جناب، جب جھورا قتل ہوا اُس وقت مَیں وہاں سے جا چکا تھا۔ مجھے بڑی دیر کے بعد قتل کی خبر ملی تھی۔ آپ میرے گھر والوں سے پوچھ سکتے ہیں۔"

مَیں نے سوچا، ہو سکتا ہے کہ اُس نے اپنے کسی دوست کی مدد سے قتل کروایا ہو۔

"وہ گورے رنگ کا نوجوان کون تھا؟" مَیں نے پوچھا۔ "ایک مہمان نے اُسے تمھارے ساتھ باتیں کرتے دیکھا تھا۔"

اُس نے بھنویں سکیڑیں۔ "شاید آپ لڑکی کے بھائی کی بات کر رہے ہیں!"

مَیں چونکا۔ بخت بی بی نے اپنے بیٹے کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ مَیں نے کہا۔ "ہاں، مَیں اُسی کی بات کر رہا ہوں۔"

"اُسے مَیں نے ہی شادی کا پیغام پہنچایا تھا۔"

"تم نے اُسے شادی کا پیغام پہنچایا تھا!" مَیں نے پوچھا۔ "تمھیں کس نے پیغام پہنچانے کے لیے کہا تھا؟"

"جھورے نے کہا تھا۔"

"جھورے نے کہا تھا!" مَیں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا جھورا اُسے پہلے سے جانتا تھا؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں، لیکن اُس کی باتوں سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔"

"تفصیل سے ساری بات بتاؤ۔"

"تفصیل کوئی خاص نہیں ہے۔ شادی سے سات آٹھ روز پہلے جھورے نے مجھے ایک پتا دیا اور کہا کہ اِس شخص کو شادی کی اطلاع پہنچانی ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اُس نے بتایا کہ ریشم جان کا بھائی ہے۔ پتا ایک ہوٹل کا تھا۔ یہ گاؤں ضلع کوہاٹ میں واقع ہے۔ میں نے رات کوہاٹ میں بسر کی۔ صبح اس گاؤں میں پہنچا۔ ہوٹل سے پتا چلا کہ پرویز پشاور گیا ہوا ہے اور دو روز کے بعد واپس آئے گا۔ میں نے اُس کے نام پیغام لکھا، یہاں کا پتا لکھا اور ہوٹل کے مالک کو دے کر آ گیا۔ پرویز اُس وقت یہاں پہنچا جب بارات رخصت ہو کر جھورے کے گھر پہنچ چکی تھی۔ اُس نے مجھ سے صرف . . . میرا نام . . . پوچھا تھا اور پیغام پہنچانے کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے نظر نہیں آیا۔"

یہ بڑی اہم خبر تھی۔ میں نے اُن دونوں کو تھانے میں بٹھایا اور فوراً سخت بی بی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ خود گھر میں موجود نہیں تھی۔ اُس کا داماد بھی نہیں تھا۔ گھر میں صرف دونوں بہنیں تھیں۔

رسمی کلمات کے بعد میں نے شیریں جان سے پوچھا "تمھارا بھائی پرویز گل کہاں ہے؟ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ شادی میں شریک ہوا تھا۔"

اُس کے چہرے پر حیرت نمودار ہو گئی۔ بولی "میرا بھائی تو ادھر نہیں آیا۔ اور اُس کا نام وزیر گل ہے، پرویز گل نہیں۔"

اُس کی بات سن کر میں نام کے بارے میں کنفیوز ہو گیا۔ شاید واجد علی نے وزیر گل کہا تھا، یا وہ بھول گیا تھا اور وزیر گل کو پرویز گل بنا دیا تھا۔

"ادھر نہیں آیا کا کیا مطلب؟" میں نے کہا "کئی مہمانوں نے اُسے جھورے کے گھر میں دیکھا تھا۔"

"وہ تو اِدھر کبھی نہیں آیا۔ اُس کو تو ہمارا پتا بھی معلوم نہیں ہے۔ لوگوں نے اُس کو کیسے پہچان لیا!"

"اُس کو جھورے نے پیغام بھیج کر بلوایا تھا۔" میں نے کہا۔ "اُس نے اپنے دوست واجد علی کو خاص طور پر کوہاٹ بھیجا تھا۔ وہ تم لوگوں سے ملے بغیر کیسے واپس چلا گیا؟"

بھائی کا ذکر سن کر ریشم جان بھی کمرے میں آ گئی۔

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" شیریں جان نے کہا "جھورے کو کیا ضرورت تھی ہمارے بھائی کو بلانے کی! اور ہمیں تو معلوم نہیں ہے کہ وہ کوہاٹ میں ہے۔ اگر وہ اِدھر آتا تو ہم سے ملے بغیر نہیں جا سکتا۔"

میں نے دل میں سوچا، نہ ملنے کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ کہ وزیر گل کو اغوا کی حقیقت معلوم ہو گئی اور اُس نے جھورے کو قتل کر دیا ہو گا۔ وہ روایتی غیرت!

"تمھارے بھائی کی طبیعت کیسی ہے؟" میں نے [پوچھا] "بہت غصہ ور ہے یا نرم طبیعت کا آدمی ہے؟"

"تھانے دار صاحب، اُس مٹی میں نرم طبیعت کبھی پیدا نہیں ہوا۔" ریشم جان نے جواب دیا۔ "اُدھر کا [ہر آدمی] غصہ ور ہے اور طمنچہ جیب میں رکھتا ہے۔"

"تم لوگوں نے اپنے بھائی کو اِس شادی کے بارے [میں] اطلاع کیوں نہیں بھیجی؟" میں نے پوچھا۔

"اطلاع کیسے بھیجتے، ہمیں اُس کا ٹھکانا ہی [معلوم] نہیں ہے۔"

"جھورے کو تمھارے گاؤں کا پتا کیسے معلوم ہوا؟"

"شادی سے پہلے وہ دو تین دفعہ ہمارے گھر آ[یا تھا]۔ فضل کریم نے اُس کو ہمارے خاندان کے بارے میں سب [کچھ] بتا دیا تھا۔ گاؤں کا نام بھی بتا دیا ہو گا۔"

"اچھا! تمھارا بھائی شادی کی خبر سے خوش ہوا ہو گا [یا] غصہ آیا ہو گا؟"

"خوش تو نہیں ہوا ہو گا لیکن اُس کو غصہ کرنے کا کیا حق [ہے؟] اُس نے بہنوں کے لیے کیا کیا ہے!"

میں نے ریشم جان سے پوچھا "جس شخص نے اندھیرے میں جھورے پر حملہ کیا تھا، کیا اُس نے منہ سے کوئی آواز بھی [نکالی] تھی یا ساری کارروائی خاموشی سے کی تھی؟"

"جھورے کی چیخوں کی وجہ سے مجھے کچھ پتا نہیں چلا کہ [کیا] ہوا ہے۔" ریشم جان نے جواب دیا۔ "اُس آدمی نے اگر کوئی [آواز] نکالی بھی تھی تو میں سن نہیں سکی۔"

معاملہ کچھ اندرونی معلوم ہوتا تھا، میں نے اندازہ لگ[ایا۔] جھورے کا کوہاٹ سے ایک آدمی کو خاص طور پر بلوانا سمجھ میں [نہیں] آتا تھا۔ خاصی عجیب اور پُراسرار بات تھی۔

میں نے شیریں جان کو ہدایت کی کہ وہ شام کو فضل کر[یم] اور اپنی ماں کو تھانے بھیج دے۔

تھانے پہنچ کر میں واجد علی سے ریشم جان کے بھائی [کے] نام کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہاں درجن بھر افراد میرے منتظر تھے۔ کوئی گواہی دینے آیا تھا، کوئی کسی حوالاتی کی ضمانت [لینے آ]یا تھا اور کوئی رپٹ درج کروانے آیا تھا۔ میں ان کاموں [میں ا]یسا اُلجھا کہ وزیر گل کے بارے میں بالکل بھول گیا۔ شام [کے و]قت ایک واردات کی اطلاع ملی، جو قریبی گاؤں میں ہوئی [تھی۔] مجھے فوراً وہاں جانا پڑا۔

اس طرح سخت بی بی اور اس کے داماد سے بھی بات [نہ ہو] سکی۔ وہ تھانے آئے اور مجھے موجود نہ پا کر واپس چلے گئے۔ پھر یہ معاملہ مؤخر ہوتا چلا گیا۔ اس اثنا میں کوہاٹ والی [رپورٹ] واپس آ گئی۔ پارٹی کے انچارج نے مجھے بتایا کہ وزیر گل [کچھ] عرصہ پہلے وہ علاقہ چھوڑ کر کہیں جا چکا تھا۔ تاہم اُس نے [سخت] بی بی کے خاندان کی دشمنی کی ایک دلچسپ مگر افسوسناک [داستا]ن سنائی۔

اس کہانی کی تصدیق ضروری تھی۔ میں نے مذکورہ اے ایس آئی [کو] ساتھ لیا اور شام کے وقت سخت بی بی کے گھر پہنچ گیا۔ اُس وقت گھر میں تمام افراد موجود تھے۔ فضل کریم [نے] ہمیں اپنے نیم تاریک کمرے میں بٹھایا اور چائے پانی [کا پ]وچھا۔

"چائے پانی کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "ہم زیادہ [دیر ن]ہیں بیٹھیں گے۔ میں ایک معاملے کی تصدیق کے لیے یہاں [آیا ہ]وں۔ میں نے اپنے اس اے ایس آئی کو تفتیش کے سلسلے میں [تمھار]ے گاؤں بھیجا تھا۔ یہ آج ہی واپس آیا ہے اور تمھارے [خاند]ان کے بارے میں بہت ساری خبریں لایا ہے۔"

"امارا خاندان تو ختم ہو گیا ہے۔" سخت بی بی نے کہا "ملک [میں] اب لوگ امارا دشمن ہے۔ اُن سے امارا رشتہ ختم ہے۔"

"رشتہ ختم ہے تو پھر گاؤں کے ایک آدمی کو کس نے [بل]وایا تھا؟" میں نے پوچھا "ایک آدمی اُسے خاص طور [پر ش]ادی میں شرکت کی دعوت دینے گیا تھا۔"

"ہم نے تو کوئی آدمی نہیں بھیجا۔" فضل کریم نے کہا "آپ [نے] ریشم جان کو بتایا تھا کہ اُدھر جھورے نے اپنے کسی دوست [کو] بھیجا تھا لیکن ہم کو اس بات کا علم نہیں ہے۔"

"یہ پرویز خان کون ہے؟" میں نے پوچھا۔ واجد علی نے [میر]ے استفسار پر بتایا تھا کہ جس شخص کو وہ دعوت دینے گیا [تھا] اُس کا نام پرویز خان تھا۔

میری بات سن کر فضل کریم نے سوالیہ نظروں سے اپنی [س]اس کی طرف دیکھا، بولا "پرویز خان تو تمھارے چچازاد بھائی [کے] بیٹے کا نام بھی ہے۔ اُس کا کیا معاملہ ہے؟"

اے ایس آئی نے کہا "پرویز خان کے باپ کا نام شاید [خی]ال خان ہے۔"

سخت بی بی نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا "خیال خان امارا چچازاد بھائی ہے لیکن اُس کے ساتھ امارا تعلق ختم ہے۔"

"اُس کا بیٹا پرویز خان یہاں کیوں آیا تھا؟"

"ام کو کیا پتا، ام نے اُس کو نئیں بلایا۔"

وہ عورت اوپر سے جتنی سیدھی تھی اندر سے اتنی ہی گہری تھی۔ اگر اُس کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو ہمیں اُس سے سچ اگلوانے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔

میں نے فضل کریم سے پوچھا "خیال خان سے تم لوگوں کی دشمنی کی وجہ کیا ہے؟"

"جناب یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔" اُس نے کہا "آپ کا وقت ضائع ہو گا۔ ہمارے ملک میں ایک دفعہ دشمنی شروع ہو جائے تو پھر ختم نہیں ہوتی۔ خاندان کے خاندان ختم ہو جاتے ہیں پر دشمنی ختم نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "میرے وقت کی فکر نہ کریں۔ میں پوری کہانی سننا چاہتا ہوں۔ میرا یہ آدمی تمھارے گاؤں سے پوری کہانی سن کر آیا ہے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اُس کہانی میں کتنا سچ اور کتنا جھوٹ ہے۔"

فضل کریم اور اُس کی ساس نے جو کہانی مجھے سنائی وہ اے ایس آئی کی بیان کردہ کہانی سے مطابقت نہیں رکھتی تھی لیکن بنیادی واقعات میں کوئی فرق نہیں تھا۔

ریشم جان کے باپ کا نام یوسف خان تھا۔ اُس کا ایک چھوٹا بھائی تھا جس کا نام حیات محمد تھا۔ دونوں بھائیوں کے پاس تھوڑی سی زرعی زمین تھی، جس پر اُن کی روزی کا دارومدار تھا۔

سخت بی بی کے چچازاد بھائی خیال خان کی زمین اُن کی زمین سے ملی ہوئی تھی اور پانی وغیرہ کے معاملات میں آپس میں کچھ اختلاف رہتا تھا۔

پانی کا ایک نالہ دونوں زمینوں کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس نالے کے آس پاس کچھ درخت اُگے ہوئے تھے جو سخت بی بی کے بیان کے مطابق اُن کی زمین میں تھے لیکن خیال خان کا دعویٰ تھا کہ درخت اُن کی زمین میں تھے۔

ایک شام یوسف خان کے بھائی حیات محمد نے چند درخت کاٹ لیے۔

خیال خان کے دو بیٹے جو اپنی زمینوں میں کام کر رہے تھے، فوراً وہاں پہنچے اور حیات محمد کے ساتھ جھگڑا کرنے لگے۔ چھوٹے بیٹے کا نام پرویز خان اور بڑے کا نام نواز خان تھا۔ انھوں نے حیات محمد کو کٹے ہوئے درخت اٹھانے سے روکا۔ دونوں

طرف کے مزارعے بھی موقع پر جمع ہو گئے اور بات بڑھتی چلی گئی۔

حیات محمد نے ریوالور نکال لیا اور کہا کہ جس شخص نے اُس کے کام میں رکاوٹ ڈالی وہ اُسے شوٹ کر دے گا۔

"دیکھو چچا، یہ بات اچھی نہیں ہے۔" پرویز خان نے کہا۔ "ہمیں گولی سے نہ ڈرائیں۔ اس طرح بات خراب ہو جائے گی۔ ایسا کریں کہ پٹواری کو بُلا لیں۔ وہ جو فیصلہ کرے گا وہ ہمیں منظور ہو گا۔"

"چھ، تم کل کا بچہ میرے ساتھ کیا فیصلہ کرے گا۔" حیات محمد نے غصے سے کہا۔ "میں یہ درخت ابھی اٹھاؤں گا۔"

پرویز خان، حیات محمد کی بھتیجی ریشم جان کو پسند کرتا تھا اور اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ ذرا ادب کر رہا تھا۔

نواز خان بھائی کو ایک طرف کرتے ہوئے بولا۔ "یہ درخت کوئی فیصلہ ہونے سے پہلے نہیں اُٹھے گا اگر کوئی درخت اُٹھانے کی کوشش کرے گا تو اُس کی لاش بھی ساتھ اُٹھے گی، ہم نے چوڑیاں نہیں پہنی ہوئیں۔"

حیات کے مزارعے جھگڑا ہوتے دیکھ کر ایک طرف ہو گئے۔

نواز خان نے بھی ریوالور نکال لیا لیکن پرویز بیچ میں آ گیا اور بھائی کو سمجھا کر ایک طرف کر دیا۔

"بزدل کہیں کا!" حیات محمد نے کہا۔ "میرے ساتھ جھگڑا کرتا ہے۔"

بزدلی کا طعنہ سُن کر نواز خان کا خون کھول اُٹھا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور یکے بعد دیگرے تین فائر کیے۔ حیات محمد کٹے ہوئے درختوں کے بیچ میں ڈھیر ہو گیا اور وہیں پر دم توڑ دیا۔

ریشم جان کے باپ یوسف خان کو جب بھائی کے قتل کی خبر ملی تو وہ رائفل لوڈ کر کے نواز خان کی تلاش میں نکلا۔ لیکن نواز خان تھانے پہنچ کر اپنی گرفتاری پیش کر چکا تھا۔ اُس وقت وہی سب سے محفوظ جگہ تھی۔ پولیس رپورٹ کے مطابق اُس نے خود حفاظتی میں فائر کیا تھا۔

مقدمہ عدالت میں چلا گیا اور دو مہینے کے بعد نواز خان ضمانت پر رہا ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے بیچ میں پڑ کے صلح کرانے کی کوشش کی مگر یوسف خان راضی نہ ہوا اور ایک روز موقع پا کر نواز خان کو قتل کر دیا۔ اس طرح اسکور برابر ہو گیا۔

اس دشمنی کے باعث یوسف خان کے لیے زمین پر کام کرنا مشکل ہو گیا۔ اُسے ہر وقت اس بات کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ دشمن غافل پا کر ختم نہ کر دے۔ اُس کے بیٹے پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا لہٰذا ایک روز خاموشی چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد یوسف خان خود کو زیادہ تنہا اور کمزور محسوس کرنا شروع کر دیا۔ بھا ہی ختم ہو گیا تھا، اب بیٹا بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ داماد میں حصے دار بننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

ایک شام وہ نماز پڑھ کے مسجد سے نکلا تو کسی نے تین فائر کیے۔ دو فائر خالی گئے۔ ایک گولی اُس کے میں لگی، زخم زیادہ گہرا نہیں تھا، چند روز میں بھر گیا لیکن حملے کے بعد اُس کے لیے گاؤں میں رہنا محال ہو گیا۔

اُس نے اپنی زمین اونے پونے داموں فروخت اور اپنی بیوی سے کہا۔ "میں آج رات یہاں سے جا رہا کہیں ٹھکانا بن گیا تو تم لوگوں کو بھی بُلا لوں گا۔"

یہ سُن کر بخت بی بی فکر مند ہوئی، بولی۔ "ہم ان کے درمیان کس طرح رہیں گے اور ہمارا گزارا کیسے چلے

یوسف خان نے کچھ رقم اُسے دی اور کہا۔ "یہ رکھ لو۔ اگر مجھے کام مل گیا تو میں خرچا بھیجتا رہوں

"اور زمین کا کیا بنے گا؟" بخت بی بی نے پوچھا

"میں نے ساری زمین فروخت کر دی زمین کی فروخت سے ہی حاصل ہوئے ہیں۔"

"یہ تم نے بہت بُرا کیا۔ زمین کے بغیر تو انسان بے حیثیت ہو جاتا ہے۔ تم نے کہاں جانے کا ارادہ کیا

"ابھی کچھ پتا نہیں ہے کہ مالک نے کہاں دا رکھا ہے۔" یوسف خان نے جواب دیا۔ "یہ جگہ اب رہنے کے قابل نہیں رہی۔ اِدھر سے میں سیدھا پشاور جاؤں گا، اُس کے بعد پنڈی جاؤں گا۔ اگر اُدھر بھی کام نہ کسی اور شہر کا رُخ کروں گا۔"

"میں کیا بول سکتی ہوں۔" بخت بی بی بولی۔

"اور دیکھو، خیال خان کا بیٹا پرویز، ریشم جان شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اُس کے باپ کو زبان دی تھی لیکن اب یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ میری یہ بات اچھی طرح سے پلّے باندھ لو۔ خیال خان تمھارا رشتے دار میرا دشمن ہے اور میری بیٹی دشمن کے گھر نہیں جا سک

"وہ تو خود بھی اب یہ رشتہ نہیں کرے گا۔"

"نہیں، وہ اب بھی رشتہ کرنا چاہتا ہے۔ چند پرویز خان مجھے ملا تھا۔ اُس نے بڑے ادب سے کیا تھا اور یہ سلام اُس نے صرف اس لیے کیا

اُسے رشتہ چاہیے۔"

بخت بی بی نے تامّل کرتے ہوئے کہا۔ "اگر اس طرح سے دشمنی ختم ہو سکتی ہے تو ہمیں رشتہ کر دینا چاہیے۔"

یوسف خان نے غصے سے کہا۔ "میں ابھی اتنا بے غیرت نہیں ہوا۔ ہم دشمن کی بیٹی لا سکتے ہیں، دشمن کو بیٹی دے نہیں سکتے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

بخت بی بی نے اپنی بات پر زور نہیں دیا۔

یوسف خان رات کی تاریکی میں گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔

چند ہفتوں کے بعد فضل کریم بھی اپنے بیوی بچوں سمیت وہاں سے چلا گیا۔

بخت بی بی اور اُس کی بیٹی ریشم جان وہاں تنہا رہ گئیں۔ اُس کا دوسرا داماد وہیں رہتا تھا جس کی وجہ سے اُسے کچھ تسلی تھی۔

پانچ مہینے کے بعد لاہور سے ایک خط اُس کے نام آیا۔ لکھا تھا کہ پندرہ روز پہلے یوسف خان کا انتقال ہو گیا تھا اور اُسے مقامی قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا۔ خط میں یہ نہیں لکھا تھا کہ موت کس طرح واقع ہوئی تھی۔

خط سُن کر بخت بی بی کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اُس کے شوہر کو قتل کیا گیا تھا اور یہ قتل خیال خان کے بیٹے پرویز خان نے کیا تھا۔

اس خبر کے چند روز بعد خیال خان اپنی بیوی اور بیٹے کے ہمراہ بخت بی بی سے ملنے آیا۔ اُس نے یوسف خان کی موت پر تعزیت کرنے کے بعد کہا۔ "بخت بی بی، اِس دشمنی کی وجہ سے ہمارا پورا خاندان ختم ہو گیا ہے۔ اب ہمیں یہ دشمنی ختم کر کے صلح صفائی سے رہنا چاہیے۔"

بخت بی بی نے جواب دیا۔ "میں نے تو کسی سے دشمنی نہیں کی۔ میری تو سب کے ساتھ صلح ہے۔ تم لوگوں نے دشمنی کی۔ ایک دوسرے کے آدمی ختم کیے۔ کسی کو کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ اللہ پاک سب پر رحم کرے۔"

خیال خان اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "دیکھا تم نے، میری بہن کتنی اچھی ہے۔ لاؤ وہ انگوٹھی مجھے دو۔"

پھر بخت بی بی سے بولا۔ "ریشم جان کدھر ہے؟"

انگوٹھی اور ریشم جان کے ذکر سے بخت بی بی چونکی، بولی۔ "ریشم جان سے تم کو کیا کام ہے؟"

"ہم اُس کے لیے منگنی کی انگوٹھی لائے ہیں۔"

"کیسی منگنی؟" بخت بی بی کے ذہن میں اپنے شوہر کے الفاظ گونجنے لگے۔ "ہم دشمن کی بیٹی لا سکتے ہیں، دشمن کو بیٹی دے نہیں سکتے!"

"پرویز اور ریشم جان کی منگنی، اور کیسی منگنی۔" خیال خان نے کہا۔ "یوسف خان مجھے زبان دے چکا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اُس نے یہ بات ضرور تمھیں بتائی ہو گی۔"

"جس نے زبان دی تھی اُسی کے پاس جاؤ۔" بخت بی بی نے تلخی سے کہا۔ "تم لوگوں کی وجہ سے ہماری زمین فروخت ہوئی، گھر اُجڑا، بچے یتیم ہوئے۔ اب تم میری بیٹی مجھ سے چھیننے کے لیے آ گئے ہو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

"بڑی اچھی بہن ہے۔" خیال خان کی بیوی نے طنز کیا۔

"اس کی کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ ارے اسی سے بڑی دشمنی کیا ہو گی۔ گھر میں بٹھا کر ذلیل کر دیا۔"

"میں نے تو آپ کو نہیں بُلایا تھا۔" بخت بی بی نے کہا۔ "آپ نے رشتہ مانگا، میں نے انکار کر دیا۔ رشتے زبردستی تو نہیں ہوا کرتے۔"

"لو، ذرا اس کی اکڑ تو دیکھو۔" خیال خان کی بیوی اُٹھتے ہوئے بولی۔ "اس کے پاس کیا ہے؟ کس بات پر اتنی اکڑ دکھا رہی ہے۔ زمین اس کے پاس نہیں، کمانے والا اس کا کوئی نہیں ... ہم تو اس کی یتیم بچی کے سر پر ہاتھ رکھنا چاہتے تھے۔ نہیں مانتی تو چھوڑیں . . . میرے بیٹے کے لیے لڑکیاں بہت ہیں۔"

"بخت بی بی، اچھی طرح سوچ لو۔" خیال خان نے کہا۔ "تمھارے انکار سے دشمنی لمبی ہو جائے گی۔"

"اب کیا باقی بچا ہے؟" بخت بی بی نے کہا۔ "اگر میرے خاوند کو اور دیور کو ختم کرنے سے تمھاری تسلی نہیں ہوئی تو مجھ کو بھی ختم کر دو۔ میری بیٹی کو بھی جان سے مار دو۔"

"ہم نے یوسف خان کو نہیں مارا۔"

"میں اتنی پاگل نہیں ہوں۔ مجھے سب پتا ہے۔"

پرویز خان جو اب تک خاموش بیٹھا تھا، بولا۔ "پھوپھی جان میرے ساتھ تو آپ کی کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"دشمنی تو نہیں ہے، لیکن دوستی بھی نہیں ہے۔ میں اپنی بیٹی کسی فقیر کو دے دوں گی، لیکن تمھیں نہیں دوں گی۔"

"تو بہتر یہ ہے کہ اسے ساری عمر گھر میں بٹھائے رکھیں۔" پرویز خان نے دھمکی دی۔ "اگر آپ نے ریشم جان کی شادی کی تو میں اسے تو کچھ نہیں کہوں گا لیکن اس کے شوہر کو ختم کر دوں گا اور یہ مرد کی زبان ہے۔"

تینوں رخصت ہو گئے لیکن بخت بی بی کو پریشان چھوڑ گئے تھے۔

اس کے چند ہفتے بعد بخت بی بی بیٹی کو ساتھ لے کر

فضل کریم کے پاس آگئی اور یہاں جو واقعہ اس کے ساتھ پیش آیا وہ آپ سُن چکے ہیں۔

پرویز خان کی دھمکی والا حصہ اے ایس آئی نے مجھے بتایا تھا۔ یہ بات اُسے بخت بی بی کے گاؤں میں تفتیش کے دوران معلوم ہوئی تھی۔ لیکن بخت بی بی اور فضل کریم نے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ اس سارے واقعے کا اہم ترین حصہ تھا۔

مَیں نے بخت بی بی سے پوچھا۔ "کیا پرویز خاں نے تمھیں کوئی دھمکی وغیرہ بھی دی تھی؟"

"ہاں! غصّے میں بہت کچھ بولا تھا۔" اُس نے جواب دیا۔ "دھمکی بھی دیا تھا۔"

"کیا اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم نے ریشم جان کی شادی کی تو وہ اس کے شوہر کو ختم کردے گا؟"

"شاید یہ دھمکی بھی دیا تھا۔ ام کو ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔"

"جھورے کو پرویز خان کا پتا کس نے دیا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "تم چاروں اس وقت میرے سامنے موجود ہو۔ تمھارے سوا کسی کو پرویز خان کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ لہٰذا تم چاروں کے سوا کوئی شخص جھورے کو پرویز خان کا پتا نہیں بتا سکتا تھا۔"

"ام نے جھورے کو اپنے سارے حالات بتائے تھے۔" بخت بی بی نے کہا۔ "اپنے گاؤں کا نام بتلایا تھا، رشتے داروں کے نام بتائے تھے اور دشمن کے بارے میں بھی بتلایا تھا۔"

شیریں جان نے قدرے برہمی سے کہا۔ "اتنا سب کچھ بتانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"جب انسان کسی کے ساتھ رشتہ جوڑتا ہے تو اُسے سب کچھ بتانا پڑتا ہے۔" بخت بی بی نے کہا۔ پھر اُس نے اُسے پشتو میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔

بخت بی بی کا جواب گول مول تھا۔ اُس نے براہِ راست جھورے کو پرویز خان کا پتا دینے کا اقرار نہیں کیا تھا لیکن اپنے بیان سے یہ ضرور ظاہر کردیا تھا کہ پتا اُسی کے ذریعے جھورے تک پہنچا تھا۔

یہ سارے شواہد اس بات کی طرف اشارہ کرتے تھے کہ قاتل پرویز خان تھا لیکن یہ صرف اشارہ تھا یقینی ثبوت نہیں تھا۔

ہم بخت بی بی کے گھر سے نکل کر سیدھے نواب دین کے گھر جا پہنچے۔ اُس نے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا اور سب سے پہلے قاتل کی گرفتاری کے بارے میں پوچھا۔

"ہمیں کچھ اشارے ملے ہیں۔" مَیں نے جواب دیا۔ "اُمید ہے کہ قاتل جلد گرفتار ہو جائے گا۔ ہم اسی ضمن میں یہاں آئے ہیں۔"

نواب دین کی بیوی رحمتے بولی۔ "تھانیدار صاحب! آپ مجھے بہت نرم دل آدمی لگتے ہیں۔ اگر آپ اُن عورتوں کو اندر بند کرکے دو چار دن جوتے لگاتے تو سب کچھ اُگل دیتیں۔ یہ سارا کیا دھرا اُنھی کا ہے۔ انھوں نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ مَیں حیران تھی کہ یہ عورت خود بہ خود بیٹی کا رشتہ دینے کیوں آئی ہے؟"

"نواب دین، مَیں نے تمھیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ایک گورے رنگ کا نوجوان یہاں دیکھا گیا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ریشم جان کا بھائی ہے۔ لیکن ہماری اطلاع کے مطابق وہ کوئی اور شخص تھا۔ کیا گھر کے کسی آدمی نے اس نوجوان کو دیکھا تھا؟"

رحمتے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "وہ... سعیدہ نے بھی اس کا ذکر کیا تھا... سعیدہ ہماری چھوٹی بیٹی ہے۔"

میرے کہنے پر اُس نے سعیدہ کو آواز دے کر کمرے میں بُلا لیا۔ وہ تیرہ چودہ سال کی ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ اُس نے ڈھیلا ڈھالا سوتی لباس پہن رکھا تھا۔ وہ جھجکتی ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور اپنی ماں کے کندھے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ دکھائی دیتی تھی۔

رحمتے نے اُس سے کہا۔ "سعیدہ بیٹی! تھانیدار صاحب کو اُس آدمی کے بارے میں بتاؤ جس نے تمھیں کہا تھا کہ وہ دولھن کا بھائی ہے۔"

"وہ اپنی بہن کے لیے کوئی تحفہ لے کر آیا تھا۔" سعیدہ نے کہا۔ "اُس نے مجھے کہا کہ وہ اندر جا کر تحفہ دینا چاہتا ہے۔ صحن کی طرف چونکہ بہت ساری عورتیں تھیں اس لیے مَیں نے پیچھے والا دروازہ کھول دیا۔" سعیدہ نے بتایا۔

"پھر کیا ہوا؟" مَیں نے پوچھا۔

"اُس وقت دولھن کے کمرے میں بہت ساری عورتیں بیٹھی تھیں۔ اس لیے اُس نے کہا کہ وہ تھوڑی دیر انتظار کرلے گا۔"

"کیا وہ کمرے میں داخل ہوا تھا یا باہر ہی ٹھہر گیا تھا؟"

"جی، باہر ہی ٹھہر گیا تھا۔"

"اور تم دروازہ کھلا چھوڑ کر چلی گئیں؟"

"کھلا نہیں چھوڑا تھا، بھیڑ دیا تھا۔ لیکن کنڈی نہیں لگائی تھی۔"

"اگر وہ آدمی تمھارے سامنے آجائے تو کیا تم اُس کو پہچان لو گی؟"

"جی پہچان لوں گی۔"

مَیں نے نواب دین کے ہمراہ وہ دروازہ دیکھا جو سعیدہ نے اجنبی کے لیے کھولا تھا۔ اُس طرف ایک تنگ سی جگہ تھی اور اُدھر سے ایک دروازہ پچھلی گلی میں کھلتا تھا۔ یہ جگہ مَیں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور میرا اندازہ یہی تھا کہ قاتل اُسی دروازے سے فرار ہوا ہوگا۔ تاہم یہ فیصلہ کرنا ہنوز باقی تھا کہ وہ کون تھا، پرویز خان تھا یا واقعی ریشم جان کا بھائی تھا۔

اگلے روز مَیں دو آدمیوں کے ہمراہ کوہاٹ پہنچا اور وہاں کے تھانیدار سے ملاقات کی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا، لیکن میرا خیال ہے کہ بخت بی بی کے گاؤں کو کوہاٹ کا تھانہ ہی لگتا تھا۔ تھانیدار کا نام غالباً سمندر خان تھا۔ مَیں نے اُس کو سارا واقعہ سُنایا اور کہا کہ مَیں پرویز خان کو تفتیش کے لیے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔

سمندر خان نے کہا۔ "اگر آپ وارنٹ گرفتاری ساتھ لے آتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔"

"ابھی کوئی یقینی بات نہیں ہے۔" مَیں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ قاتل کوئی اور شخص ہو۔ فی الحال ہم اس کی گواہوں سے شناخت کروانا چاہتے ہیں۔"

اُس نے اُسی وقت ایک اے ایس آئی اور دو سپاہیوں کو پرویز خان کے گاؤں روانہ کردیا۔ مَیں ساتھ جانا چاہتا تھا، مگر مجھے اُس نے یہ کہہ کر منع کردیا کہ مَیں وہاں کے رسم و رواج نہیں جانتا اور کسی مشکل میں پھنس سکتا ہوں۔

اُس نے ہمارے لیے عمدہ قسم کا کھانا تیار کروایا اور اپنی روایات کے مطابق مہمان نوازی کا حق ادا کیا۔

سہ پہر کے قریب اے ایس آئی، پرویز خان کو لے کر تھانے پہنچ گیا۔ پرویز کا باپ خیال خان اپنے دو عزیزوں کے ہمراہ اُس کے ساتھ آیا تھا۔

پرویز خان گورے چٹے رنگ کا خوش شکل اور دراز قد نوجوان تھا۔

سمندر خان نے اُسے قتل کا تھوڑا سا پس منظر بتانے کے بعد کہا۔ "تمھیں ملک صاحب کے ساتھ جانا پڑے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ تم ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں کھڑا کرو گے۔"

اُس نے بے خوفی سے پوچھا۔ "کیا یہ مجھے گرفتار کر کے لے جا رہیں گے؟"

"اگر مَیں ملک صاحب کی جگہ پر ہوتا تو وارنٹ گرفتاری ساتھ لے کر آتا۔ لیکن اِن کا کہنا ہے کہ یہ پورا ثبوت ملے بغیر آدمی کو گرفتار نہیں کرتے۔ تم اِن کے ساتھ چلے جاؤ۔ اگر کوئی ثبوت نہیں ملا تو کل تک تمھیں چھٹی مل جائے گی۔"

خیال خان نے کہا۔ "ملک صاحب، ہم آپ سے علیٰحدگی میں بات کرنا چاہتے ہیں۔"

سمندر خان نے پُرخیال نظروں سے میری طرف دیکھا اور اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ خیال خان نے اپنے آدمیوں کو بھی باہر بھیج دیا۔

"ملک صاحب، میرے بیٹے کے خلاف رپورٹ کس نے لکھائی ہے؟"

"کسی نے نہیں۔" مَیں نے مختصر جواب دیا۔

"تو پھر آپ اس کو ساتھ کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟"

"خان صاحب، مَیں زیادہ سوالوں کے جواب دینے کا عادی نہیں ہوں۔ آپ کے خاندان کی پوری ہسٹری مجھے معلوم ہے۔ مَیں ظہور الٰہی نامی ایک نوجوان کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں اور اسی تفتیش کے سلسلے میں پرویز کو لینے آیا ہوں۔ ہمیں اس بات کا ثبوت ملا ہے کہ یہ شادی والی رات مقتول کے گھر میں دیکھا گیا تھا۔"

"کسی کی شادی میں شریک ہونا کوئی بڑی بات تو نہیں ہے!"

"میں بحث کرنے نہیں آیا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" پرویز خان نے اکڑ کر کہا۔ "مَیں کسی کی شادی میں شریک نہیں ہوا۔ آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔"

"اس کو ہتھکڑی لگاؤ۔" میں نے اے ایس آئی سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شرافت کی زبان نہیں سمجھی جاتی۔"

میری بات سنتے ہی پرویز اور اُس کے باپ کے ہاتھ اپنے اپنے ریوالوروں پر جا پڑے۔ مَیں نے تیزی سے اپنا ریوالور نکالا اور خیال خان کے سینے سے لگا دیا۔ اے ایس آئی نے پرویز کا ہاتھ مروڑ کر پشت سے لگا دیا۔ اُس نے تیزی سے



اے ایس آئی کے پیٹ میں کہنی سے وار کیا اور بازو چھڑا کر اُس سے لپٹ گیا۔ وہ خاصا مضبوط نوجوان تھا۔

شور کی آواز سُن کر دو تین سپاہی دوڑتے آئے اور پرویز خان کو بے بس کر دیا۔ میں نے دونوں کے ہتھیار قبضے میں کر لیے اور پھر پرویز خان کو ہتھکڑی لگا دی۔

"ملک صاحب، یہ اچھا نہیں ہوگا۔" پرویز نے کہا۔ "ہم سے دشمنی کرنے والا کبھی خوش نہیں رہتا۔"

"اب تمھارے ساتھ منزل پر پہنچ کر باتیں ہوں گی۔" میں نے کہا۔ "یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں، انصاف کے لیے کر رہے ہیں۔ یہ ہماری ڈیوٹی ہے۔ اس کا دشمنی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو چاہتا تھا کہ تم ہتھکڑی کے بغیر ہمارے ساتھ جاؤ مگر تم نے مجبور کر دیا ہے۔"

وہ جوش کا اظہار کرنے لگا لیکن اُس کے باپ نے اُسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔ پھر وہ میرے قریب آیا اور عاجزی سے بولا: "ملک صاحب، میرا یہ آخری بیٹا ہے۔ دو بیٹے پہلے ہی دشمنی میں ختم ہو چکے ہیں۔"

"میں نے ایک بیٹے کے بارے میں سُنا ہے۔"

"بڑا بیٹا بہت پہلے قتل ہو گیا تھا۔" اُس نے کہا۔ "آپ اس کو چھوڑ دیں، بڑی مہربانی ہوگی۔ یہ میرے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ آپ جتنی رقم مانگیں، وہ میں دینے کو تیار ہوں۔"

"گویا آپ کو پتا ہے کہ واردات اسی نے کی ہے۔"

"اس بات کو آپ چھوڑیں۔" اُس نے بڑی سادگی سے کہا۔ "یہ ہماری عزت اور غیرت کا معاملہ ہے۔ ہم لوگ آدمی کی جان کی اتنی پروا نہیں کرتے جتنی عزت اور غیرت کی کرتے ہیں۔ آپ مہربانی کریں، میں آپ کے لیے دعا کروں گا۔"

"اگر میں اس کو چھوڑ دیتا ہوں تو میرے حق میں آپ کی دعا کبھی قبول نہیں ہوگی۔ کیونکہ جو انصاف کو چھوڑ دیتا ہے اُسے خدا سے کبھی خیر نہیں ملتی۔"

"خان بابا، اس کی منت مت کرو۔" پرویز نے غصے سے کہا۔ "ہم لوگ اتنا کم عزت نہیں ہے۔"

خیال خان نے وہاں کے تھانیدار کے ذریعے مجھے رشوت کی پیش کش کی، ساتھ ہی دھمکی بھی دی لیکن میں نے رشوت قبول کی اور نہ دھمکی سے مرعوب ہوا۔

واپس پہنچ کر میں نے پرویز خان کو حوالات میں بند کر دیا اور نواب دین کو پیغام بھیجا کہ وہ اُن لوگوں کو ساتھ لے کر تھانے پہنچے جنھوں نے شادی والے روز ایک پُراسرار اجنبی کو دیکھا تھا نیز اپنی بیٹی سعیدہ کو بھی ساتھ لائے۔

شام کے وقت نواب دین سات آٹھ افراد کے ہمراہ پہنچ گیا۔ اُن میں دو تین عورتیں بھی تھیں۔ میں نے اپنے طور چند معززین کو بھی بُلا لیا اور تھانے کے اندر شناختی پریڈ کا کیا۔ پرویز کو نصف درجن افراد کے ہمراہ ایک روشن کمرے کھڑا کیا اور گواہوں سے کہا کہ وہ باری باری تاریک برآمدے میں ٹھہر کر دروازے سے اندر دیکھیں۔ مقصد یہ تھا کہ ملزم کو نہ دیکھ سکے۔

گواہوں کی تعداد نصف درجن سے اوپر تھی۔ اُن میں کے دونوں دوست بھی شامل تھے۔ اُن سب نے بغیر کسی کے پرویز خان کو شناخت کر لیا۔

واجد علی اور حمید عرف جیدا کو میں نے استغاثہ کے گواہوں میں شامل کر کے رہا کر دیا۔

ملزم ہماری تحویل میں تھا اور گواہ اُسے شناخت کر چکے تھے۔ اب باقی کام اتنا مشکل نہیں تھا۔

میں نے اُسے اپنے کمرے میں بُلا کر کہا: "پرویز خان تمھارے خلاف ہر قسم کا ثبوت مل چکا ہے۔ بلکہ جب تمھارے باپ نے مجھے رشوت پیش کی تھی، میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ جھورے کو تم نے قتل کیا ہے۔ اب بہتر یہ ہے کہ تم اقبالِ جرم کر دے دو، تاکہ نہ تمھیں کوئی تکلیف اٹھانی پڑے اور نہ ہمیں۔"

"میں وکیل سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔" اُس نے کہا۔ اس کا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور وہ خوف زدہ دکھائی دیتا تھا۔ ہی ایسی تھی۔ وہ قتلِ عمد کا واضح کیس تھا۔ اُس کا سزائے موت سے بچنا محال تھا۔

اگلی صبح اُس کا باپ وکیل کے ہمراہ تھانے پہنچ گیا اور میری منت سماجت کرنے لگا۔

وکیل نے کیس کی تفصیل سننے کے بعد پرویز خان کو مشورہ دیا کہ پولیس تشدد سے بچنے کے لیے وہ بے شک اقبالِ جرم کر لے۔ جب کیس چلے گا تو پھر دیکھا جائے گا۔

پولیس اس سلسلے میں خاصی بدنام ہے کہ وہ تشدد کے ذریعے بے گناہ ملزموں سے بھی اقبالِ جرم کروا لیتی ہے۔ اسی لیے ہوشیار وکیل اس قسم کے اقبالِ جرم کو بہ آسانی عدالت میں چیلنج کر دیتے ہیں۔

میں نے اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے پرویز کا مجسٹریٹ کے سامنے بیان ریکارڈ کیا اور پندرہ دن کا ریمانڈ لے لیا۔ اب صرف آلۂ قتل کی ضرورت تھی۔

پرویز خان نے آلۂ قتل کے بارے میں ہمیں چکر دینے شروع کر دیے۔ کبھی کسی جنگل کا پتا بتایا اور کبھی کہا کہ آلۂ قتل دریا میں پھینک دیا تھا۔ میں نے ایک سخت گیر حوالدار کو اس کام پر لگا دیا اور اُسے حکم دیا کہ اُسے تین دن کے اندر ملزم سے آلۂ قتل برآمد کروانا ہے۔ اگر آلۂ قتل برآمد نہ ہو تو کیس مضبوط نہیں ہوتا۔ مذکورہ حوالدار نے دو دن کے اندر آلۂ قتل جو ایک خنجر تھا، برآمد کروا لیا۔ آلۂ قتل کے ساتھ ملزم کی خون آلود قمیص بھی برآمد ہو گئی۔ یہ چیزیں اُس نے بستی سے باہر ایک کھیت کے کنارے پر دفن کر دی تھیں۔

کیس بہت واضح تھا۔ پرویز خان کو سزائے موت ہو گئی۔ اس طرح دو آدمیوں کے معمولی تنازعے نے دو خاندانوں کو تباہ کر دیا۔

اس کیس میں سب سے اہم کردار بخت بی بی کا تھا۔ اُس نے نہایت ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ اپنے دو دشمنوں کو ٹھکانے لگایا تھا، لیکن قانونی گرفت سے محفوظ رہی تھی۔

اگرچہ اُس نے اس بات کا اقرار نہیں کیا، لیکن جب اُس نے ریشم جان کی جھورے سے شادی طے کی تھی تو درحقیقت وہ دو دشمنوں کو ختم کرنے کا منصوبہ تھا۔

یہ بات یقینی ہے کہ اُس نے جھورے کے سامنے پرویز خان کو اپنا بیٹا ظاہر کیا ہوگا اور اُسے مجبور کیا ہوگا کہ وہ اُسے اپنی طرف سے شادی میں مدعو کرے۔ ممکن ہے، یہ عُذر کیا ہو کہ پرویز اس سے ناراض ہے اور اُس کے بُلانے پر نہیں آئے گا۔ اُسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ پرویز، ریشم جان کی شادی کی خبر سُن کر غصے سے بھر جائے گا اور اپنی دھمکی کے مطابق جھورے کو ختم کر دے گا اور ہوا بھی اسی طرح۔ دوسرے لفظوں میں جھورے نے خود اپنے قاتل کو مدعو کیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ جھورے اور ریشم جان کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ جھورے کے دوستوں کا بیان تھا کہ جھورے کو اس بات پر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایک حسین اور پری چہرہ لڑکی اُس کی بیوی بننے والی ہے۔

جب اُس نے حجلۂ عروسی میں اپنی دولھن کا گھونگھٹ اُٹھانے کا قصد کیا ہوگا تو اُس کی خوشی و سرشاری کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوگا۔ اس بے مثال خوشی کے موقع پر جب قاتل کا خنجر اُس کی آنکھوں کے سامنے چمکا ہوگا تو اُس کی جو کیفیت ہوئی ہوگی اُسے الفاظ میں بیان کرنا محال ہے۔

ایک آخری بات بتانے والی رہ گئی ہے۔

جب پرویز خان حوالات میں بند تھا تو ایک صبح ریشم جان اپنی بہن کے ہمراہ اُس سے ملنے کے لیے آئی۔ دونوں اپنی ماں اور فضل کریم سے چھپ کر آئی تھیں۔

ریشم جان نے پرویز سے کہا: "میں تمھارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کہ تم نے میری زندگی بچا لی۔"

پرویز نے حیرانی سے کہا: "میں تمھاری بات نہیں سمجھا۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے اُس بدمعاش کو اپنا شوہر مان لیا تھا جس نے مجھے اغوا کیا تھا اور مجھے بدنام کیا تھا؟"

"تو پھر شادی کیسے ہو گئی؟"

"ماں کے کہنے پر ہو گئی۔"

"تم نے انکار کیوں نہیں کیا؟"

"بہت انکار کیا تھا، ماں نہیں مانی۔"

"یہ زندگی بچانے کا کیا مطلب ہے؟"

"میرے پاس زہر والے دو لڈو تھے۔" ریشم جان نے جواب دیا۔ "ایک لڈو جھورے بدمعاش کے لیے... اور ایک میرے اپنے لیے۔ اگر تم دو تین منٹ اور رُک جاتے تو تمھیں کچھ کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ پھوپھی جان نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔" پرویز نے کہا۔ "انھوں نے مجھے اس لیے تمھاری شادی کی اطلاع بھجوائی تھی کہ میں یہاں آ کر جھورے کو قتل کروں اور خود گرفتار ہو کر پھانسی کی سزا پاؤں؟"

شیریں جان نے کہا: "ہماری ماں پر الزام مت لگاؤ۔ تم اپنے گناہوں کی وجہ سے پکڑے گئے ہو اور ہم اس بات پر بہت خوش ہیں۔"

پرویز نے آہستہ سے کہا: "ریشم جان، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے تمھاری محبت کی وجہ سے جھورے کو قتل کیا ہے۔ صرف ایک بار یہ کہہ دو کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ صرف ایک بار... اس کے بعد اگر مجھے سزائے موت بھی ہو گئی تو میں خوشی سے پھانسی پر چڑھ جاؤں گا۔"

"میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔" ریشم جان نے تلخی سے کہا۔ "تم خوشی سے پھانسی چڑھو یا ناخوشی سے، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم لوگوں کی وجہ سے ہی ہم لوگ برباد ہوئے ہیں، گھر سے بے گھر ہوئے ہیں... میں تم سے کیسے محبت کر سکتی ہوں!"

اُس نے نفرت سے زمین پر تھوکا اور اپنی بہن کے ہمراہ وہاں سے رخصت ہو گئی۔

یہ تفصیل مجھے حوالات کے ایک گارڈ کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔

خزاں

مر جانے والے ایک شخص کا قصہ جس کا آغاز اُس کی موت کے بعد ہوا۔ اُس نے کیا کیا تھا کہ اس کی اولاد نے اُسے قبر میں بھی چین سے سونے نہیں دیا۔ اُس کا مُردہ پولیس والوں کے لیے معمّا بن گیا۔

شور وغُل، پکڑ دھکڑ، زنجیروں کی جھنکار، مجرموں کا تعاقب، پُرخطر لمحات، مظلوموں کی فریادیں، زور آوروں کی لن ترانیاں، گولیوں کی شائیں شائیں اور ڈاکوؤں سے مقابلے... آج یہ سب کچھ قصۂ ماضی بن چکا ہے۔ یہ بھولی بسری یادیں بعض اوقات دل میں عجیب سا احساس پیدا کرتی ہیں۔ اس ضعیف العمری کے دور میں کبھی لان میں ٹہلتے ہوئے اور کبھی آرام کرسی پر اونگھتے ہوئے بسا اوقات دل میں خیال آتا ہے کہ کیا یہ سب واقعات واقعی میرے ساتھ پیش آئے تھے یا میں نے کوئی خواب دیکھا تھا؟ ہاں... شاید دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ زندگی کی ولولہ انگیزیاں یا تو یادوں میں گم ہو جاتی ہیں... یا تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔

تو آیئے، یادوں کے دریچے وا کریں اور جوانی کے ولولہ انگیز دَور کے چند صفحات پر نظر ڈالیں۔

وہ گرمیوں کے دن تھے اور صبح کا وقت تھا۔ میں کلف لگی وردی میں ملبوس تیز چلتا ہوا تھانے میں داخل ہوا۔ وہاں درجن بھر افراد میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں شبینہ ڈیوٹی کے دوران گرفتار ہونے والے افراد بھی تھے اور سائلین بھی۔ میں جلدی جلدی معاملات نمٹانے لگا۔ سائلین میں ایک ادھیڑ عمر عورت بھی تھی۔ اُس نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے اور متوسط طبقے کی فرد معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے ساتھ اُس کا نوجوان بیٹا بھی تھا۔ اُس نے اپنا نام زرینہ اور اپنے بیٹے کا نام تنویر عباس بتایا۔ اُس کا شوہر جس کا نام غلام عباس تھا، گزشتہ رات سے لاپتا تھا اور اُسے ڈر تھا کہ اُس کے ساتھ کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو۔

"تم نے اپنے شوہر کو آخری بار کب دیکھا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "اور وہ کس کام کے لیے گھر سے نکلا تھا؟"

"کل رات کھانا کھانے کے بعد وہ ٹہلنے کے لیے باہر نکلا" اُس نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ اس کے بعد وہ واپس نہیں..."

"کیا مطلب؟ کیا وہ تمھیں خبر ہوئے بغیر واپس آسکتا تھا؟"

"آج کل گرمیوں کی وجہ سے وہ چھت پر سوتا ہے۔ ہم لوگ صحن میں سوتے ہیں۔ رات کو اُس کے جانے کے بعد میں نے... کے کام نمٹائے اور اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ باہر کا دروازہ میں نے... چھوڑ دیا تھا۔ صبح جب میں نے چھت پر جا کر دیکھا تو بستر خالی پڑا..."

"آپس میں کوئی ناراضگی تو نہیں تھی؟"

"ناراضگی تو کوئی نہیں تھی۔ اگر ناراضگی ہو بھی تو وہ گھر چھوڑ کر نہیں جاتا۔"

"تو پھر وہ واپس کیوں نہیں آیا؟ تمھاری کسی سے کوئی دشمنی تو نہیں ہے؟"

"اس قسم کی دشمنی تو کسی سے نہیں ہے۔"

"اس قسم سے تمھاری کیا مراد ہے؟"

"م... میرا مطلب ہے کہ ہمارا کوئی آدمی کبھی گم نہیں ہوا۔" اُس نے جواب دیا۔ "ہم لوگ زبانی کلامی دشمنی سے کبھی آگے نہیں بڑھے۔"

"کیا تم نے اپنے ملنے جلنے والوں اور رشتے داروں کے گھر سے معلوم کر لیا ہے؟"

"جی ہاں، سب جگہ معلوم کرنے کے بعد ہی آپ کے پاس آئے ہیں۔ اللہ خیر کرے، کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو گئی ہو۔"

میں نے رپورٹ درج کروا دی اور زرینہ بیگم کو فوری کارروائی کا یقین دلا کر رخصت کر دیا۔



دو گھنٹے کے بعد ہیڈ کلرک کے کمرے سے جھگڑنے کی آواز سنائی...

...صورتِ حال معلوم کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ ہیڈ کلرک تین آدمیوں کے ہمراہ میرے کمرے میں داخل ہوا۔

ایک آدمی میلی سی سوتی واسکٹ اور دھوتی میں ملبوس تھا۔ واسکٹ کے نیچے قمیص نہیں تھی۔ سانولے رنگ کا وہ مسکین سا آدمی پیروں سے ننگا تھا۔ دیگر دو آدمیوں نے اُسے دائیں بائیں سے پکڑ رکھا تھا اور وہ احتجاج کرتے ہوئے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

جن دو افراد نے اُسے پکڑ رکھا تھا اُن میں سے ایک ادھیڑ عمر اور دوسرا نوجوان تھا۔ اُن کے لباس اور رکھ رکھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ باپ بیٹا تھے اور جس شخص کو اُنھوں نے پکڑ رکھا تھا وہ گورکن تھا۔

"اس کو بند کریں جی!" نوجوان نے کہا۔ "اس نے ہمارے دادا جی کی لاش غائب کر دی ہے۔"

"اس کے بازو چھوڑ دو اور آرام سے ساری بات بتاؤ۔"

"یہ جھوٹ ہے سرکار!" گورکن نے عاجزانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ان کا مردہ خود ہی غائب ہوا ہے۔ ہم جدی پشتی اس قبرستان میں کام کر رہے ہیں۔ ہم نے ان کے سال کا کھلا سڑا مردہ رکھ کر کیا کرنا تھا جی۔"

"او منہ سنبھال کے بات کر۔" ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ "میرے باپ کا ادب سے نام لے۔ اگر دوبارہ گلا سڑا مردہ کہا تو جبڑا حلق میں اُتار دوں گا۔"

"تھانیدار صاحب! اِنھوں نے مجھے بہت مارا ہے جی!" گورکن نے فریاد کی۔ "اِن کے خلاف رپٹ لکھیں جی۔"

"اوئے چُپ کر، کھوتے دا پُتر نہ ہووے تے۔" ادھیڑ عمر شخص نے اُسے مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔

"مار لو، چنگی طراں مار لو۔" گورکن نے رونے والی آواز...



میں کہا: "تمھارے مردے تو میں نے ہی زمین میں گاڑنے ہیں۔ کشتی مار کے پسلیاں نہ توڑیں تو میرا بھی نام خوشی محمد نہیں!"

"تم لوگ خاموش ہو جاؤ!" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا: "آپس میں بات نہیں کرو۔ تمھارا نام کیا ہے؟" میں نے ادھیڑ عمر شخص سے پوچھا۔

"میرا نام صادق علی ہے۔" اُس نے جواب دیا۔ "اور یہ میرا بیٹا اکرم ہے۔ کل میرے والد کا انتقال ہوا۔ اُن کا نام سخاوت علی تھا۔ ہم نے کل ہی اُنھیں دفن کر دیا۔ اس بد بخت نے رات کو اُن کی لاش غائب کر دی۔"

خوشی محمد گورکن نے جواب دینے کے لیے مُنہ کھولا مگر میں نے اُسے چُپ کرا دیا اور صادق علی سے پوچھا: "اس نے لاش کیوں غائب کر دی ہے؟ کیا یہ لاشوں کا کاروبار کرتا ہے؟"

"یہ تو اسی کو معلوم ہوگا۔ اس کو ذرا پھینٹی شینٹی لگائیں، خود ہی سب کچھ اگل دے گا۔"

"تم کو کیوں نہ پھینٹی شینٹی لگاؤں؟" میں نے غصّے سے کہا۔ "تمھارے پاس کیا ثبوت ہے کہ لاش اس نے غائب کی ہے؟"

"اس نے خود ہمیں بتایا ہے۔"

میرے استفسار پر خوشی محمد نے بتایا کہ وہ قبرستان سے ملحق ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے۔ گزشتہ رات تقریباً ڈیڑھ دو بجے کوئی آواز سُن کر اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے باہر نکل کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور دو تین بار آواز بھی لگائی مگر آس پاس کوئی بندہ بشر نظر نہیں آیا۔ وہ اندر جا کر بستر پر لیٹ گیا اور تھوڑی دیر میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ آدھے یا پونے گھنٹے کے بعد اُس نے دوبارہ کھٹکے کی آواز سُنی اور پھر اُٹھ بیٹھا۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہر سُو گہری تاریکی تھی۔ جو آواز اُس نے سُنی تھی وہ قبرستان کی طرف سے آئی تھی۔ وہ پودوں کے درمیان میں سے ہوتا ہوا آگے بڑھا اور تاریک قبرستان میں نظر دوڑائی۔ اچانک اُس نے ایک 'مردے' کو قبر سے نکلتے دیکھا۔ اُس نے یہی لفظ استعمال کیا تھا۔ بقول اُس کے وہ مردہ سر سے پیر تک سفید کپڑے میں... یا بہ الفاظِ دیگر کفن میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ ایک قبر سے نکل کر ایک طرف چل دیا۔

خوشی محمد نے کہا کہ اگرچہ اُس کا ساری زندگی مُردوں سے واسطہ رہا تھا لیکن اُس چلتے پھرتے مردے کو دیکھ کر اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ مردہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا تو وہ ہمت کر کے واپس مڑا اور گھر جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ اُس نے اُس پُراسرار واقعے کو قدرت کے رازوں میں سے ایک راز سمجھا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ بات اُس کے ذہن میں نہیں آئی کہ اس قبر کو جا کر دیکھے جس میں سے مردہ نکلتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اگلی صبح دس بجے کے قریب اتفاقاً سخاوت علی کی قبر پر پڑ گئی۔ قبر کھلی پڑی تھی۔ تب اُسے خ
رات کو اُس نے جس قبر سے مردہ نکلتے دیکھا تھا وہ یہ
سیدھا صادق علی کے پاس پہنچا اور اُسے بتایا کہ اُس کے
قبر میں سے غائب ہو چکا ہے۔ صادق علی نے شور مچا دیا
کو پکڑ کر تھانے لے آیا۔

خوشی محمد کی پوری بات سُننے کے بعد میں نے صا
پوچھا: "تمھیں اس کی بات پر شک کیوں ہے؟ کیا یہ مُردوں
کرتا ہے؟"

"تھانیدار صاحب! آپ خود سوچیں، بھلا یہ بھی کوئی
آنے والی بات ہے کہ لاش قبر سے نکل کر چلی گئی؟"

اُس کے نوجوان بیٹے اکرم نے عقل مندی کا مظا
ہوئے کہا: "اگر اس کی بات مان بھی لی جائے تو دادا جی کو
گھر آنا چاہیے تھا۔"

ہیڈ کلرک نے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے
کو زندہ ہی زمین میں گاڑ دیا تھا۔ جس شخص کے ساتھ ایسا
کیا گیا ہو وہ کیسے گھر واپس جا سکتا ہے۔ میں تو اس بات
ہوں کہ وہ قبر سے نکلا کیسے!"

میں نے صادق علی سے پوچھا: "کیا تم نے خود جا کر
کی قبر کا معائنہ کیا ہے؟"

"نہیں جی۔ اس کی بات سُن کر میرا تو دماغ ہی ٹھکانے
نہیں رہا۔"

"تم لوگ باہر بیٹھو۔" میں نے کہا: "میں فارغ ہو کر تم
ساتھ چلتا ہوں۔"



پندرہ بیس منٹ کے بعد میں اُٹھنے کی تیاری کر
ایک اور شخص میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے تنکوں
ٹوپی پہن رکھی تھی اور عمر اُس کی پچاس سال کے لگ بھگ
ہوتی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ وہ کسی گواہی کے سلسلے میں پہلے بھی
آ چکا تھا۔

اُس نے سلام کرنے کے بعد کہا: "ملک صاحب! مجھے
کسی عامل کامل کے پاس جانا چاہیے تھا مگر میں آپ کے پاس آ گیا
جناب مسئلہ یہ ہے کہ ہماری ایک کوٹھری پر جنات نے قبضہ
ہے۔ یہ کوٹھری مویشیوں کے باڑے کے کونے پر واقع ہے
دن پہلے ہماری ایک بھینس مر گئی، ہم نے کوئی خیال نہیں کیا۔ پھر
مرغیاں غائب ہو گئیں، ہم نے کوئی خیال نہیں کیا لیکن جب دو
بھینس نے رات کے وقت آسمان کی طرف مُنہ کر کے ڈکرانا

کیا تو ہمیں فکر لاحق ہوئی۔ ہم سمجھ گئے کہ آسمانی بلا نے ہمارے باڑے کا راستہ دیکھ لیا ہے۔ ہم نے مولوی صاحب سے بات کی۔ اُنھوں نے عشاء کی نماز کے بعد باڑے میں عمل کرنا شروع کیا۔ تین راتیں خیریت سے گزر گئیں۔ چوتھی رات آسمان سے پتھر برسنے لگے۔ دو پتھر مولوی صاحب کے سر پر لگے۔ اگر اُن کے سر پر پگڑی نہ ہوتی تو اُن کا کام ہو گیا تھا۔ وہ اپنا بوریا سمیٹ کر چلے گئے۔ پر اُنھوں نے مجھ سے کہا: 'ولی محمد! تمھاری کوٹھڑی پر کسی بہت ہی خبیث جن نے قبضہ کر لیا ہے۔ اس سے ٹکر لینا بہت مشکل ہے۔ تم اپنے مویشی یہاں سے ہٹا لو۔' جناب! میں نے مولوی صاحب کے مشورے پر عمل کیا اور مویشی دوسری جگہ باندھنے شروع کر دیے۔ کل رات باڑے کی طرف سے نلکا چلنے کی آواز آئی۔ اُس وقت رات کے دو یا تین بجے ہوں گے۔ میری بیوی نے ڈرتے ڈرتے دیوار کے اوپر سے باڑے کی طرف دیکھا تو جناب! اُس نے عجیب نظارہ دیکھا۔ نلکا چل رہا تھا، پانی بھی گر رہا تھا، مگر چلانے والا کوئی نہیں تھا۔ میری بیوی کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ اگر میں اُسے سنبھالا نہ دیتا تو وہ ختم ہو جاتی۔"

میں نے کہا: "ہو سکتا ہے کہ اندھیرے کی وجہ سے اُسے نلکا چلانے والا نظر نہ آیا ہو۔"

"جناب میری گھر والی نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

"تم نے خود کیوں نہیں دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

وہ جھجکتے ہوئے بولا: "میرا دل بڑا کمزور ہے جی۔ حکیم جی نے مجھے ایسی چیزوں سے دور رہنے کا مشورہ دیا ہے اس لیے ذرا احتیاط ہی کرتا ہوں۔"

"یہ کیسے پتا چلا کہ نلکا چلانے والا کوئی جن تھا؟"

"جناب! میں ثبوت اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔" اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پیلے رومال میں لپٹی ہوئی کوئی چیز میری طرف بڑھائی۔ "یہ دیکھیں۔ صبح میں نے چار آدمی ساتھ لیے اور کوٹھری میں جا کر دیکھا۔ نلکا کوٹھری کے بالکل ساتھ ہے۔ یہی کوئی چار قدم کا فاصلہ ہوگا۔ وہاں سے یہ دو چیزیں ہمارے ہاتھ لگیں۔"

میں نے پیلا رومال کھولا تو اندر سے چاندی کی ایک انگوٹھی اور روئی کی ایک معطر پھریری برآمد ہوئی۔

"یہ انگوٹھی تو کھرے پر پڑی تھی۔" اُس نے مزید کہا: "اور یہ پھریری کوٹھری کے دروازے کے نیچے سے ملی ہے۔"

"اور تمھارا خیال ہے کہ یہ دونوں چیزیں اُس خبیث جن کی ملکیت ہیں جس نے تمھارے باڑے پر قبضہ کر رکھا ہے؟"

"اور کس کی ہو سکتی ہیں؟" اُس نے کہا: "میں نے سنا ہے کہ چاندی اور خوشبو جنات کی پسندیدہ چیزیں ہیں۔"

"تم نے اپنا نام کیا بتایا ہے؟"

"ولی محمد۔"

"دیکھو میاں ولی محمد! یہ جو ہمارا قانونِ تعزیرات ہے، میری معلومات کے مطابق یہ جنات پر لاگو نہیں ہوتا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔"

"ملک صاحب! میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں نے خود اپنے کانوں سے نلکے کی آواز سنی تھی۔"

"نلکا چلانا کوئی جرم نہیں ہے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا: "اور میں اس قسم کے جنات کو نہیں مانتا جو پُراسرار طاقتوں کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔"

"اب مکان ہی بیچنا پڑے گا۔" اُس نے مایوسی سے کہا: "میری گھر والی کئی بار کہہ چکی ہے کہ یہ ساری خرابی قبرستان کی وجہ سے ہے۔ قبرستان کے پاس گھر ہوگا تو یہی ہوگا۔"

قبرستان کے نام پر میں چونکا۔ میں نے اُس کا پتا نوٹ کر لیا اور کہا کہ وہ گھر جا کر میرا انتظار کرے۔



پرانے وقتوں کے اُس قبرستان میں جھاڑیاں اور درخت کثرت سے اُگے ہوئے تھے۔ قبروں میں کوئی ترتیب نہیں تھی اور بیشتر قبریں بارش کی وجہ سے بیٹھ گئی تھیں۔

خوشی محمد ایک قبر کے سامنے جا ٹھہرا اور بولا: "جناب! یہ ہے ان کے دادا کی قبر۔"

قبر کھدی ہوئی تھی اور خالی تھی۔ میں نے دیکھا کہ لحد کے نیچے کی زمین بھی کھدی ہوئی تھی۔

میں نے صادق علی سے پوچھا: "کیا تمھیں یقین ہے کہ تمھارے والد کو اسی قبر میں دفن کیا گیا تھا؟"

اُس نے قبر کے سرہانے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک چھوٹی سی تختی گڑی ہوئی تھی۔ اس پر متوفی کا نام اور تاریخ وفات وغیرہ لکھی تھی۔ "یہ تختی میں نے اپنے ہاتھ سے یہاں گاڑی تھی۔"

گورکن نے تصدیق کرتے ہوئے کہا: "قبر تو یہی ہے جی۔"

میں نے گورکن سے کہا: "اور تمھارا کہنا یہ ہے کہ اس قبر سے تم نے مردے کو نکل کر جاتے دیکھا تھا۔"

"اللہ ہی بہتر جانے کہ وہ کیا چیز تھی۔ مردہ تھا، کوئی فرشتہ تھا یا کوئی انسان۔ وہ جو کوئی بھی تھا سفید کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ اللہ گواہ ہے، میں قبرستان میں کھڑا ہوں۔ مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اُسے اسی قبر سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ سامنے میرا مکان ہے۔"

اُس نے ایک نیم پختہ مکان کی طرف اشارہ کیا جو قبرستان کی چار دیواری کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ دیوار مختلف جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور اسے ایک بچہ بھی پھلانگ سکتا تھا۔ مکان کے قریب سے اندر داخل ہونے کا راستہ بھی نظر آ رہا تھا۔ اسی راستے سے کہیں بھی جایا جا سکتا تھا کیونکہ اس میں

کوئی دروازہ یا پھاٹک نہیں تھا۔
"دوسری بار آنکھ کھلنے کے بعد میں قبرستان میں داخل ہوا اور چند قدم اندر پہنچ کر رُک گیا۔" خوشی محمد بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں سے اس قبر تک زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ اُس وقت اچھا خاصا اندھیرا تھا لیکن پھر بھی مجھے کفن میں لپٹا ہوا مردہ نظر آ گیا۔ وہ اِس قبر سے نکلا اور اُس طرف چلا گیا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اُس کا دم ہی نکل جاتا!"

جس طرف اُس نے اشارہ کیا تھا اُس طرف قبرستان سے پرے مکان نظر آ رہے تھے۔ میں دوبارہ قبر کا جائزہ لینے لگا۔ قبر کو باقاعدہ کھودا گیا تھا۔ ساری مٹی باہر پڑی تھی۔ بالفرض اگر کوئی زندہ انسان قبر میں دفن ہو جاتا تو وہ باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ تاہم اگر وہ اپنی روحانی اور جسمانی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے باہر نکل بھی جاتا تو اُسے ساری مٹی نکالنے کی ضرورت نہیں تھی۔

"ملک صاحب! یہ جھوٹ بولتا ہے!" صادق علی نے کہا۔ "سوچنے کی بات ہے کبھی مردے بھی قبروں سے نکلے ہیں اور بات صرف لاش کی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"دوسری باتوں کو چھوڑیں ابا جی!" اکرم نے جلدی سے کہا۔ "قبروں کی رکھوالی کرنا اس کی ذمے داری ہے۔ اگر دادا جی کی لاش نہ ملی تو ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

مجھے محسوس ہوا کہ بیچ میں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ کوئی خفیہ راز تھا جسے وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اور وہ راز یا تو قبر سے تعلق رکھتا تھا یا اُس لاش سے۔

میں نے کہا۔ "خوشی محمد! یہ تو کسی تگڑے آدمی کا کام معلوم ہوتا ہے۔ لحد بھی کھدی ہوئی ہے۔ مردے میں اتنی جان کہاں سے آ گئی! اور پھر اس کو نیچے کھدائی کرنے کی کیا ضرورت تھی!"

"جناب! یہ بات تو وہی جانے جس نے یہ کام کیا ہے۔" خوشی محمد نے کہا۔ "یا اللہ جانے۔ میں نے تو جو دیکھا تھا وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں ہے۔"

اُس کے لہجے میں عاجزی تھی۔ وہ جھوٹا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں صادق علی کو ایک طرف لے گیا اور کہا۔ "صادق علی! اس معاملے میں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ میں اس بات میں تمھارے ساتھ اتفاق کرتا ہوں کہ قبر باہر سے کھودی گئی ہے۔ کسی نے باقاعدہ لاش نکالی ہے لیکن اس میں خوشی محمد کا ہاتھ نظر نہیں آتا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ لاش کے جسم پر کوئی قیمتی چیز تو نہیں تھی؟ کوئی سونے یا ہیرے کی انگوٹھی وغیرہ؟"

بات کرتے وقت میری نظر اُس کے چہرے پر تھی۔ وہاں مجھے ایسے تاثرات نظر آئے جو میرے اندازے کی تصدیق کرتے تھے۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" اُس نے تامل کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی شخص ایک انگوٹھی کے لیے پوری لاش غائب نہیں کر سکتا۔"

یہ بات بھی معقول تھی۔ تب ہی مجھے وہ چاندی کی انگوٹھی یاد آ گئی جو ولی محمد نامی شخص نے مجھے دکھائی تھی۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ اس انگوٹھی کا مرنے والے سے کوئی تعلق ہو۔ اگرچہ وہ اتنی قیمتی انگوٹھی نہیں تھی لیکن اُس کی کوئی عملی اہمیت بھی ہو سکتی تھی۔ یعنی وہ کسی بزرگ کا تحفہ یا کوئی کراماتی انگوٹھی بھی ہو سکتی تھی۔

لاش کی گمشدگی کی بات بستی میں پھیل چکی تھی اور لوگ قبرستان میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے۔

میں نے صادق علی کو ساتھ لیا اور ولی محمد کا پتا پوچھتے ہوئے اُس کے دروازے پر پہنچ گیا۔

وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اُس نے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا اور جلدی سے شربت بنا کر لے آیا۔ پھر اُس نے جنات کی کہانی شروع کر دی۔ میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ولی محمد! میں وہ چاندی کی انگوٹھی دوبارہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ اندر گیا اور پہلے رومال میں لپٹی ہوئی انگوٹھی لے آیا۔ انگوٹھی کے ساتھ خوشبودار پھریری بھی موجود تھی۔

"میں نے یہ انگوٹھی مولوی صاحب کو بھی دکھائی ہے۔" اُس نے کہا۔ "اُن کا کہنا ہے کہ یہ جناتی انگوٹھی ہے۔ اُنھوں نے مجھے اس جیسی سونے کی انگوٹھی بنوانے کا حکم دیا ہے۔ یہ انگوٹھی بطور تاوان جنات کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔"

میں نے وہ چاندی کی انگوٹھی صادق علی اور اُس کے بیٹے کو دکھائی اور پوچھا۔ "کیا تم نے یہ انگوٹھی پہلے بھی کبھی دیکھی ہے؟"

صادق علی نے انگوٹھی دیکھ کر بھویں سکیڑیں اور اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "پتر اکرم! یہ انگوٹھی تو..."

"ہاں جی! یہ تو چاندی کی انگوٹھی ہے۔" اکرم نے جلدی سے کہا۔ "ہم نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

نوجوان اپنے باپ سے زیادہ ہوشیار نظر آتا تھا۔ اُس نے دوسری دفعہ باپ کی بات کا رُخ بدلا تھا۔ واضح طور پر دونوں نے اُس انگوٹھی کو پہچان لیا تھا لیکن میں نے اس موضوع کو زیادہ نہیں چھیڑا اور دونوں کو رخصت کر دیا۔

ولی محمد نے کہا۔ "ملک صاحب! آپ وقوعے کا معائنہ بھی کرتے جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ اُدھر سے کوئی اور ثبوت آپ کے ہاتھ لگ جائے۔"

"چلو!" میں نے کہا۔ "وقوعہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

وہ مجھے [illegible] سے باڑے میں لے گیا۔ خاصا کشادہ باڑا تھا۔ ایک طرف چھپر کے نیچے کھرلی بنی ہوئی تھی اور ساتھ ہی ایک کچا کوٹھا تھا جس کے قریب ہی ایک نلکا تھا۔ داہنی طرف والی دیوار کے اوپر سے قبرستان نظر آتا تھا۔ درمیان میں ایک کچی سڑک تھی۔ باڑے کے بیرونی دروازے کا ایک پٹ ٹوٹا ہوا تھا جس کا مطلب یہ تھا

کہ کوئی بھی شخص بہ آسانی اندر آ سکتا تھا۔
باڑا سنسان پڑا تھا۔ اِدھر اُدھر سوکھا چارا بکھرا پڑا تھا۔ میں نے نلکا چلا کر دیکھا۔ وہ ٹھیک کام کرتا تھا۔ کھرے میں لال مٹی نظر آ رہی تھی۔ یعنی کسی نے کیچڑ آلود ہاتھ یا پیر دھوئے تھے۔
میں نے ولی محمد سے پوچھا۔ "کیا یہاں کسی نے ہاتھ پیر دھوئے تھے؟"
"جنات نے دھوئے ہوں گے۔" اُس نے جواب دیا۔ "جب سے یہ مشہوری ہوئی ہے اُس کے بعد سے کوئی بندہ اِدھر نہیں آتا۔"
میں نے کچے کوٹھے میں نظر ڈالی۔ اندر سوائے ایک کدال کے کچھ نہیں تھا۔
ولی محمد نے جھکتے ہوئے اندر نظر ڈالی اور بولا۔ "یہ کدال پتا نہیں کس کی ہے!"
میں کدال کو اُٹھا کر باہر لے آیا اور اُس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "یہ کدال قبرستان کی معلوم ہوتی ہے۔"
کدال کے پھل پر مٹی لگی ہوئی تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اِسے حال ہی میں استعمال کیا گیا تھا۔ واضح طور پر سخاوت علی کی قبر اسی سے کھودی گئی تھی۔ میں لوٹتے ہوئے دروازے کے قریب گیا اور وہاں سے قبرستان کی طرف نگاہ دوڑائی۔ خوشی محمد گورکن نے قبر سے نکلنے والے مردے کا جو رُخ بتایا تھا وہ باڑے کی عمومی سمت میں تھا۔
میرے ذہن میں صورتِ حال کا نقشہ کچھ یوں بنا۔ سخاوت علی کی قبر کھودنے والا شخص اپنا کام مکمل کرنے کے بعد باڑے میں آیا تھا۔ اُس نے کدال کوٹھے کے اندر رکھ دی تھی اور نلکے پر ہاتھ پیر دھوئے تھے۔ ہاتھ دھوتے وقت اُس نے اپنی انگوٹھی اُتار کر کھرے کے کنارے پر رکھ دی تھی اور جاتے وقت اُسے اُٹھانا بھول گیا تھا۔ پھریری غالباً اُس کے کان سے گر گئی تھی۔
لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ سخاوت علی کی لاش کہاں تھی؟ گورکن کے بیان سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ جاتے وقت وہ خالی ہاتھ تھا۔ کم از کم اُس کے پاس لاش جیسی بھاری چیز کوئی نہیں تھی۔ کدال شاید اُس کے پاس تھی اور بوجہ تاریکی نظر نہیں آئی ہو گی۔
یہ ثبوت ملنے کے بعد گورکن کی پوزیشن تقریباً صاف ہو گئی تھی۔ میں نے سفید پوش شخص کو دیکھ کر جو اندازہ لگایا تھا وہ ٹھیک تھا۔
میں نے ولی محمد کو تسلی دی اور اُسے یقین دلایا کہ اُس کے باڑے میں جنوں کا قبضہ نہیں ہے۔ وہ سونے کی انگوٹھی پر پیسے ضائع نہ کرے۔ چاندی کی انگوٹھی اور پھریری کو میں نے رومال میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔
جب میں باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ گورکن ہاتھ ہلاتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر پائی جانے والی چمک سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُسے کوئی نئی بات معلوم ہوئی تھی۔

میں رُک گیا۔
اُس نے قریب پہنچ کر کہا۔ "جناب! میرا خیال ہے کہ لاش کا پتا چل گیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم قبر کھود کر دیکھ لیں۔"
"کیا مطلب؟ قبر کھود کر دیکھ لیں؟"
"آپ میرے ساتھ آئیں۔" اُس نے کہا۔ "یہ بات موقع پر ہی سمجھ میں آئے گی۔"
میں اُس کے ہمراہ دوبارہ کھدی ہوئی قبر پر پہنچ گیا۔
"جناب! میرا دماغ ہی چکرایا ہوا تھا۔ ورنہ یہ بات مجھے پہلے ہی نظر آ جاتی۔ بات یہ ہے کہ میں ایک قبر پہلے سے تیار رکھتا ہوں۔ یہ جو قبر آپ دیکھ رہے ہیں، دراصل یہ خالی قبر تھی۔" اُس نے ایک نئی بنی ہوئی قبر کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن کسی نے اسے بند کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس کسی نے یہ حرکت کی ہے اُس نے بوڑھے کی لاش اس قبر میں دفن کر دی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسے کھود کر دیکھ لیا جائے۔"
"اچھی طرح سوچ لو۔" میں نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ یہ کسی اور کی قبر ہو۔"
"مجھے پورا یقین ہے جناب!"
اتنے میں صادق علی اور اُس کا بیٹا اکرم لوگوں کو ہٹاتے ہوئے ہمارے قریب پہنچے۔ اُن کے چہروں سے فکرمندی اور پراگندگی عیاں تھی۔ دونوں گورکن کو گھورنے لگے۔
"کیا ہوا؟" اکرم نے پوچھا۔ "سنا ہے کہ دادا جی کی لاش کا پتا چل گیا ہے۔"

گورکن نے اُنھیں نئی قبر کے بارے میں بتایا۔ اُنھوں نے قبر کا جائزہ لیا اور آپس میں مشورہ کرنے لگے۔
"یہ قبر تو واقعی خالی تھی۔" صادق علی نے کہا۔ "یہ بات تو مجھے بھی یاد ہے۔ یہ تو کوئی معجزہ ہی لگتا ہے۔"
آس پاس کھڑے ہوئے کچھ اور لوگ بھی گفتگو میں شامل ہو گئے اور اس واقعے کو غیب کی طرف منسوب کیا جانے لگا۔
ایک شخص جو اَن پڑھ فاضل معلوم ہوتا تھا بولا۔ "یہ سب قدرت کا کرشمہ ہے۔ سخاوت علی بڑا ذکر فکر کرنے والا بندہ تھا۔ ایسے بندوں کا انتظام اللہ خود کرتا ہے۔ وہ جگہ اس فانی فی اللہ بندے کے لیے موزوں نہیں تھی۔ اللہ نے اس کے لیے یہ جگہ پسند کی ہے۔"
پاس کھڑے ہوئے لوگ سبحان اللہ... سبحان اللہ کا ورد کرنے لگے۔ ہماری قوم اس قسم کی باتوں سے فوراً متاثر ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ ترمیم و اضافے سے اُسے معجزہ بنا دیتی ہے۔ جب کوئی عینی گواہ اس قسم کی کرامت کا ذکر کرتا ہے تو اکثر صورتوں میں درحقیقت وہ اپنی اہمیت کو اجاگر کر رہا ہوتا ہے اور اپنے زورِ بیان کے ذریعے وہ تمام سقم دور کر دیتا ہے جن پر اعتراض وارد ہو سکتا ہو۔
سخاوت علی کے معاملے میں بھی ایسی ہی صورت پیدا ہو سکتی تھی لیکن

دو تین روز کے اندر بعض ایسے حیرت انگیز اور عبرت اثر حقائق منظرِ عام پر آئے کہ سارا معاملہ ہی اُلٹ گیا۔

"اس قبر کو اب کوئی ہاتھ نہ لگائے۔" مذکورہ اَن پڑھ فاضل شخص بات جاری رکھتے ہوئے بولا "صادق علی یہاں سنگِ مرمر کا عمدہ سا کتبہ لگوا دو اور جمعرات کو اپنے باپ کی نذر نیاز نکال دیا کرو۔ ایسے کراماتی بندے بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔"

ایک شخص بولا "اللہ اللہ... کیسے کیسے نیک بندے دنیا سے اُٹھ جاتے ہیں۔"

واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور میں ایک شخص نے کہا۔ "سخاوت علی نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اُس کا خزانہ اُس کے ساتھ ہی قبر میں جائے گا۔ شاید وہ قبر خزانے کے لیے ٹھیک نہیں تھی۔"

یہ بات دیگر باتوں کے شور میں دب گئی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ اکرم نے یہ بات بڑے غور سے سُنی تھی اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا اور اس بات نے مجھے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"تھانیدار صاحب! یہ معاملہ ختم ہی سمجھنا چاہیے۔" اکرم نے مجھ سے کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو تکلیف اُٹھانا پڑی۔"

میں پوری طرح مطمئن نہیں تھا لیکن میں واپس آ گیا۔

شام کے وقت ہیڈ کلرک نے مجھے بتایا کہ جس شخص کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی گئی تھی وہ واپس آ گیا ہے۔

"کس شخص کی بات کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اُس کا نام غلام عباس ہے۔" ہیڈ کلرک نے کہا "آپ کو یاد ہو گا صبح اُس کی بیوی رپورٹ درج کروانے آئی تھی۔ اُس کا بیٹا اطلاع لے کر آیا ہے۔ اُدھر میرے کمرے میں بیٹھا ہے۔"

"اُس کو میرے پاس بھیجو۔"

وہ گیا اور ایک نوجوان کو لے کر واپس آیا۔

نوجوان کو دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ صبح وہ اپنی ماں کے ساتھ گمشدگی کی رپورٹ درج کروانے آیا تھا۔ اُس کا نام تنویر عباس تھا۔

"تمھارا باپ کدھر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی وہ گھر پر ہیں۔" اُس نے جواب دیا "انھیں کوئی ضروری کام تھا جس کی وجہ سے وہ صبح صبح گھر سے نکل گئے تھے۔ ہم یہ سمجھے کہ وہ رات کو گھر واپس نہیں آئے۔"

"انھیں ... اطلاع دینے خود آنا چاہیے تھا۔" میں نے کہا "اُن سے کہنا کہ وہ ... گمشدگی کا حال بتا جائیں اور آئندہ احتیاط کرنا۔ سوچ سمجھ کر رپورٹ لکھوانی چاہیے۔ ہم ... اتنے فالتو نہیں ہیں۔"

اُس نے اپنی جلد بازی پر افسوس کا اظہار کیا اور سلام کر کے ... ہو گیا۔

چند منٹ کے بعد ایک سپاہی نے مجھے بتایا کہ وہ نوجوان صادق علی کا بھتیجا تھا۔

"کون سا صادق علی؟" میں نے پوچھا۔

"جناب وہی صادق علی جس کے باپ کی لاش گم ہو گئی تھی۔"

میں نے چونک کر پوچھا "تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

"میں سمجھا کہ آپ کو یہ بات معلوم ہو گی۔"

اس انکشاف سے میرے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوئے اور ان سوالات کے جواب معلوم کرنے کے لیے غلام عباس سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔

ضروری کاموں سے فارغ ہوتے ہوتے رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ ... سے فارغ ہو کر میں پہلے گھر گیا۔ وہاں کھانا کھایا، تھوڑا سا آرام کیا اور لباس تبدیل کر کے غلام عباس کے گھر پہنچ گیا۔ دستک کے جواب میں ایک لڑکی نے دروازہ کھولا اور میرے استفسار پر بولی "ابا جی تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"کہاں گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں پوچھ کر آتی ہوں۔" وہ دروازہ بھیڑ کر اندر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد اُس کی ماں دروازے پر آئی۔ پہلے تو اس نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو بولی "وہ تو اس وقت نہیں ہے۔ لڑکے نے آپ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ میں اُسے صبح تھانے بھیج دوں گی۔"

"کیا وہ آج بھی سیر کرنے گیا ہے؟"

اُس نے تامل کرتے ہوئے کہا "وہ کسی کام سے لائلپور گیا ہے صبح تک واپس آ جائے گا۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اپنے باپ کی موت کا کوئی دکھ نہیں ہے ... کا باپ فوت ہوا ہے اور وہ سیر کرتا پھر رہا ہے۔"

"ایسی تو بات نہیں ہے جی۔" زرینہ بیگم نے جواب دیا "وہ ابا جی کی وفات کے سلسلے میں ہی گیا ہے۔"

میں نے جیب سے چاندی کی وہ انگوٹھی نکالی جو دلی محمد کے باڑے سے ملی تھی اور اُسے دکھا کر پوچھا "اس انگوٹھی کو پہچانتی ہو؟"

وہ رات کا وقت تھا اور صحن میں لگے ہوئے بلب کی مدھم روشنی دروازے تک پہنچتی تھی۔ زرینہ نے انگوٹھی ہاتھ میں لے کر دیکھی تو اُس کے چہرے پر الجھن نمودار ہو گئی۔

"چاندی کی انگوٹھی لگتی ہے۔" اُس نے انگوٹھی واپس کرتے ہوئے جواب دیا "یہ کس کی انگوٹھی ہے؟"

"زرینہ بی بی! یہ بات تو میں نے تم سے پوچھی ہے۔ کیا تم نے اس انگوٹھی کو پہچانا نہیں؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی "ایسی ایک انگوٹھی میرے آدمی

... ہے۔ پر پتا نہیں...."

... نے وہ انگوٹھی پہچان لی تھی لیکن وہ اپنی پہچان کا اظہار ... چکچا رہی تھی۔ یہی معاملہ صادق علی اور اس کے بیٹے کے ... تھا۔ انھوں نے بھی انگوٹھی پہچان لی تھی لیکن اقرار نہیں ...

"... تمھارے گھر میں کوئی خوشبو وغیرہ تو ضرور ہو گی۔"

"خوشبو!" اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کوئی عطر شطر۔" میں نے کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"... مطلب یہ ہے کہ اندر جا کر عطر کی شیشی لے آؤ۔ تمھارا آدمی بہت شوقین ہے۔"

وہ ہچکچاتی ہوئی اندر گئی اور ایک چھوٹی سی عطر کی شیشی اُٹھا ... میں نے اُس کے ہاتھ سے شیشی لے کر اُسے سونگھا پھر جیب ... کی پھریری نکال کر اُسے بھی سونگھا۔ دونوں کی خوشبو ... تھی۔ غالباً وہ چنبیلی کا عطر تھا۔

اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ قبر کھودنے والا ... ہی تھا۔ تاہم یہ بات ہنوز تفتیش طلب تھی کہ اُس نے ... کیا تھا۔

"تمھیں اپنے سُسر کی قبر کا معاملہ تو معلوم ہو چکا ہو گا۔" ... نے کہا "گزشتہ رات کسی نے اُس کی قبر کھود کر لاش دوسری ... دفنا دی ہے۔ تمھارا دیور اس سلسلے میں تھانے آیا تھا مگر ... میاں نظر نہیں آیا۔"

"ہمیں اس معاملے کا کوئی علم نہیں ہے جی۔ یہ حرکت صادق علی کی ہو گی۔ ہمارا اُن سے زیادہ میل جول نہیں ہے۔"

"لاش غائب ہونے والی بات تو ساری بستی میں مشہور ہو چکی ہے۔" میں نے کہا "لوگ قبرستان کے چکر لگا رہے ہیں۔"

"میرا بیٹا تنویر بھی پتا کرنے گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ قبر کے بارے ... فہمی ہو گئی تھی۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ لوگوں کو وہم ... گا۔ بھلا کبھی لاش بھی غائب ہوتی ہے!"

"غلام عباس لائلپور کیا کرنے گیا ہے؟"

"اُس نے مجھے بتایا نہیں۔ مردوں کے کام مرد ہی جانیں۔"

"میں عطر کی یہ شیشی ساتھ لے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا "تمھارا ... تھ واپس بھجوا دوں گا۔ وہ جیسے ہی واپس آئے اُسے ... بھیج دینا۔"

ابھی تک سارا معاملہ پولیس کے دائرۂ اختیار سے باہر تھا۔ آدھی ... کے وقت قبر کھودنا، لاش کو دوسری قبر میں دفن کرنا یا کسی ویران

باڑے کے نلکے پر ہاتھ پیر دھونا کوئی جرم نہیں تھا لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اُس معاملے کی تہ میں کہیں نہ کہیں کوئی جرم چھپا ہوا تھا۔

میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ علی الصباح قتل کی ایک اطلاع ملی۔ ایک شخص قبرستان میں قتل ہو گیا تھا۔

میں گھر سے تیار ہو کر سیدھا قبرستان پہنچ گیا۔ وہاں تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ ایک اے ایس آئی ضابطے کی کارروائی میں مصروف تھا۔ چند سپاہی لوگوں کو پیچھے ہٹا رہے تھے۔ عورتیں قبرستان سے باہر کھڑی تھیں۔ اُدھر سے رونے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

مقتول ایک ایسی قبر پر پڑا تھا جو آدھی کھدی ہوئی تھی۔ اُس کی ٹانگیں قبر کے اندر تھیں اور اوپر کا دھڑ باہر تھا۔ اُسے کسی تیز دھار آلے سے قتل کیا گیا تھا۔ اُس کا خون قبر کی مٹی میں جذب ہو چکا تھا۔

اے ایس آئی نے مجھے سلام کیا اور میرے استفسار پر بتایا کہ مقتول کا نام غلام عباس تھا اور جس قبر میں وہ پڑا تھا وہ اُس کے باپ کی تھی۔ تب ہی میں نے غور سے قبر کا جائزہ لیا۔ یہ وہی قبر تھی جس میں مبینہ طور پر بوڑھے سخاوت علی کی لاش دفن کی گئی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ اس شخص کا دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا۔" میں نے مقتول کے بارے میں اظہارِ خیال کیا "کل رات اس نے اپنے باپ کی لاش اصل قبر سے نکال کر اس قبر میں دفن کی تھی۔ آج یہ غالباً اسے واپس اصل قبر میں دفن کرنا چاہتا تھا۔"

اے ایس آئی نے کہا "اس بات کا ابھی تک پتا نہیں چلا کہ گزشتہ رات کس نے قبر کھودی تھی لیکن آپ کی دوسری بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ یہ شخص اپنے باپ کی لاش اصل قبر میں ہی دفن کرنا چاہتا تھا اور لوگوں کا بھی یہی خیال ہے۔"

اے ایس آئی میری گزشتہ روز والی تفتیش کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا "غلام عباس کے قتل کے بارے میں لوگوں کا کیا خیال ہے؟"

"زیادہ تر لوگ اسے قدرت کا انتقام قرار دے رہے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ غلام عباس نے قدرت کے کام میں دخل دے کر خود ہی موت کو آواز دی تھی۔"

گزشتہ روز جس شخص نے قبر کی تبدیلی کو قدرت کا کرشمہ قرار دیا تھا وہ سپاہی سے اجازت لے کر آگے آیا اور سلام کرنے کے بعد بولا "تھانیدار صاحب! یہ بڑے جاہل لوگ ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کل میں نے سب کو سمجھایا تھا کہ کوئی شخص اس قبر کو ہاتھ نہ لگائے۔ دیکھ لیں! جو میں نے کہا تھا وہی ہوا۔ سخاوت علی بڑا پہنچا ہوا شخص تھا۔ قدرت نے اس کے بیٹے کو بھی معاف نہیں کیا۔ آپ میری طرف سے یہ اعلانِ عام کر دیں کہ جو شخص اس ولی اللہ کی قبر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرے گا، وہ زندہ نہیں بچے گا۔ اللہ اللہ... کیسی شان والا بندہ تھا!"

میں نے مقتول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ یہ چھری قدرت نے چلائی ہے؟"

"اور کیا جناب! قدرت کی چھری بے آواز ہوتی ہے۔"

میں نے ہجوم کی طرف دیکھا تو مجھے اُس شخص کا چہرہ نظر آیا جس نے گزشتہ روز خزانے کی بات کی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کا پڑھا لکھا شخص معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُسے اشارے سے قریب بلایا اور نام پوچھا۔ اُس نے اپنا نام ساجد حسین بتایا۔

میں اسے ایک طرف لے گیا۔ "ساجد حسین! کل تم نے کسی خزانے کا ذکر کیا تھا۔"

وہ تھوڑا سا گھبرایا، بولا۔ "وہ تو صرف سنی سُنائی بات تھی۔"

"میں بھی یونہی پوچھ رہا ہوں۔ پوری بات کیا ہے؟"

"پوری بات تو... چاچا امام بخش کو ہی معلوم ہوگی۔" اُس نے جواب دیا۔ "اُن کی اور سخاوت علی کی بڑی پُرانی دوستی تھی۔ میں نے اُسی سے یہ بات سُنی تھی۔"

میں نے اُس سے چاچا امام بخش کا پتا پوچھ کر ڈائری میں نوٹ کرلیا اور اُسے فارغ کر دیا۔

ایک طرف غلام عباس کے رشتے دار پریشان کھڑے تھے۔ اُن میں اُس کا بھائی صادق علی بھی تھا اور بیٹا تنویر بھی تھا۔ میں نے اُن سے سرسری گفتگو کی۔ وہ سب بھی قدرت کے انتقام کی بات کر رہے تھے۔ خاصے توہم پرست لوگ تھے۔

ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ موقع کے گواہوں کے بیانات قلمبند کیے اور ایک اے ایس آئی کے ہمراہ غلام عباس کے گھر پہنچ گیا۔

وہاں رونا پیٹنا مچا ہوا تھا۔

میں نے غلام عباس کی بیوہ زرینہ بیگم کو الگ بلا کر کہا ــــ

"مجھے تمہارے شوہر کی موت پر بہت افسوس ہے اور میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ اگرچہ غم کی وجہ سے تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے مگر ہمیں اپنی کارروائی بھی مکمل کرنا ہے اور اس سلسلے میں میں تم سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اب سوال جواب سے کیا فائدہ۔" اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "جو ہونا تھا سو ہو چکا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم تمہارے شوہر کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتے لیکن اُس کے قاتل کو قانون کے سامنے تو پیش کر سکتے ہیں۔"

"ہم نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ جس نے یہ ظلم کیا ہے اُسے اللہ پکڑے گا اور انشاء اللہ جلد پکڑے گا۔"

"زرینہ بی بی! کل جب تم اپنے شوہر کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آئی تھیں تو تم نے میرے سوال کے جواب میں کہا تھا کہ تم لوگ زبانی کلامی دشمنی سے کبھی آگے نہیں بڑھے مگر آج بات زبانی سے آگے بڑھ چکی ہے۔ تمہارے خیال میں یہ حرکت کس کی ہے؟"

"تھانیدار صاحب! میں کسی کا نام نہیں لے سکتی۔ میں کسی پر شک کر کے کیوں گناہ گار بنوں۔"

"پرسوں رات تمہارا شوہر گھر پر نہیں تھا مگر تم لوگوں نے غلط بیانی سے کام لیا اور کہا کہ وہ صبح صبح گھر سے نکل گیا تھا۔ کل تم نے مجھے بتایا کہ تمہارا شوہر کسی ضروری کام سے لائلپور گیا ہوا ہے جبکہ اُس وقت گھر میں ہی تھا۔"

"یہ تو آپ ہم پر شک کر رہے ہیں۔"

"میرے پاس ثبوت موجود ہے کہ پرسوں رات بھی تمہارا شوہر قبرستان میں تھا اور اُس نے اپنے باپ کی قبر کھودی تھی۔ کل بھی وہ قبر ہی کھود رہا تھا لیکن قاتل نے اُسے کام مکمل نہیں کرنے دیا۔ کیا تمہارا شوہر پاگل ہو گیا تھا؟"

"نہیں جی! وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔"

"پھر اُس نے اپنے باپ کی قبر کیوں کھودی تھی؟ کیا اُسے قبر کے اندر سے کوئی خزانہ ملنے کی اُمید تھی؟"

خزانے کے ذکر سے اُس کے چہرے پر تھوڑی سی تبدیلی آئی۔ بولی۔ "مجھے اس بات کا کوئی علم نہیں ہے۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ غلام عباس کان میں عطر کی پھریری رکھتا تھا؟"

اُس نے تامل کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں! یہ صحیح ہے۔"

"کل صبح جب وہ گھر واپس آیا تو کیا تم نے اُس سے پوچھا تھا کہ اُس نے رات کہاں گزاری تھی اور رات بھر کیا کرتا رہا تھا؟"

"تھانیدار صاحب! وہ مجھے باہر کی کوئی بات نہیں بتاتا تھا۔ اگر وہ مجھے بتا کر گھر سے جاتا تو میں تھانے میں رپورٹ درج کروانے کیوں آتی۔ کل جب میں تھانے سے واپس گھر پہنچی تو وہ اندر پڑا سو رہا تھا۔ اس کے بعد جب اُٹھا تو میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ ساری رات کہاں رہا تھا لیکن اُس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ کل رات گھر سے نکلتے وقت اُس نے یہی کہا تھا کہ وہ لائلپور جا رہا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کس چکر میں ہے تو میں اُسے روکنے کی ضرور کوشش کرتی۔"

"تمہارے سسر کہاں رہتے تھے؟"

"میرے دیور کے گھر میں رہتے تھے۔ میرے آدمی کے ساتھ اُن کی بالکل نہیں بنتی تھی۔" قدرے توقف کے بعد اُس نے اضافہ کیا۔ "ویسے تو کسی کے ساتھ بھی نہیں بنتی تھی لیکن صادق علی نے دولت کے لالچ میں انھیں اپنے پاس رکھ لیا تھا۔"

"کیا تمہارے سسر کے پاس بہت دولت تھی؟"

"ہوگی۔ ہم نے تو کبھی نہیں دیکھی۔ جھوٹ کیوں بولوں۔"

"کوئی جائیداد وغیرہ بھی نہیں؟"

"جائیداد بھی تھی لیکن انھوں نے تھوڑی تھوڑی کر کے سب بیچ دی۔"

"یعنی جو کچھ بھی تھا نقدی وغیرہ کی صورت میں تھا؟"

"یہ باتیں تو آپ صادق علی سے ہی پوچھیں۔"

لیکن میں صادق علی سے پہلے امام بخش سے ملنا چاہتا تھا۔

امام بخش کی عمر اسّی اور نوّے برس کے آس پاس معلوم ہوتی تھی۔ گھر کے کشادہ صحن میں ایستادہ پیڑ کے نیچے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اُٹھ بیٹھا۔

اُس کے کندھے کشادہ اور قد لمبا تھا۔ اُس کا ڈھانچا بتا رہا تھا کہ کبھی وہ خاصا مضبوط شخص رہا ہوگا لیکن اب وہ ہڈیوں کا ڈھانچا تھا۔ اُس نے ململ کا کُرتا پہن رکھا تھا جس میں سے اُس کی پسلیاں واضح نظر آ رہی تھیں۔

ایک لڑکا ہمارے بیٹھنے کے لیے موڑھے لے آیا۔ اُس گھر میں بہت کم لوگ نظر آئے۔

"او کاکا! تھانیدار صاحب کے لیے کوئی لسّی پانی لے کر آ۔" بوڑھے نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ "بیٹھو سرکار! تم کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ وردی کی جھلک دیکھ کر میرے پیروں میں پنکھ لگ جاتے تھے۔ میں دیواریں اور کوٹھے پھلانگتا ہوا یہ جا وہ جا ہو جاتا تھا۔"

میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ ماضی میں کیا رہا ہوگا۔ میں نے کہا۔ "چاچا! وردی اتنی خوفناک چیز بھی نہیں ہے۔"

"پُتر تھانیدار! وقت وقت کی بات ہے۔ اُس زمانے میں مجھے وردی سے زیادہ خطرناک کوئی چیز نہیں لگتی تھی۔ یہ تمہارے پیدا ہونے سے پہلے کی باتیں ہیں۔ پچھلی صدی کے قصے ہیں۔ اُس زمانے کی باتیں جب ایک آنے سیر چھوٹا گوشت ملتا تھا اور دس روپے میں جوان کی شادی ہو جاتی تھی۔"

"سچ کہتے ہو چاچا!" اے ایس آئی نے کہا۔ "وقت بڑے بڑوں کو ڈاؤن کر دیتا ہے۔ خیر سے جوانی میں دھندا کیا تھا تمہارا؟"

بوڑھے نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا، بولا۔ "کاکا! تو ابھی کچا ہے۔ تھانیدار میری بات سمجھ گیا ہے۔ کبھی موقع ملے تو اپنے تھانے کی پُرانی فائلیں ضرور دیکھنا۔ اُن میں امام بخش گوجر اور سکھے کا نام ضرور ہوگا۔"

اے ایس آئی نے آنکھیں پھیلا کر میری طرف دیکھا۔

"ویسے سب رولا ہی رولا ہے۔" امام بخش نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بندہ کچھ بھی کر لے آخر ایک دن اُس کی پھونک نکل جاتی ہے۔ جب میں جوان تھا تو بڑا رعب داب تھا میرا۔ شریف غرفا مجھے دیکھ کر راہ چھوڑ دیتے تھے لیکن اب میں حرکت کرتا ہوں تو ہڈیاں کھڑکھڑ کرتی ہیں۔ ایک بچہ بھی دھکا دے دے تو منہ کے بل جا گروں۔"

میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "چاچا! جوانی کے قصے تو کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ہم تم سے سخاوت علی کے بارے میں کچھ پوچھنے آئے ہیں۔"

"سخاوت علی! یعنی سکھے ڈاکو کے بارے میں؟"

"میں غلام عباس اور صادق علی کے باپ کی بات کر رہا ہوں جس کا تین دن پہلے انتقال ہو گیا تھا۔"

بوڑھے امام بخش نے ہنسنے کی کوشش کی مگر کھانسی روک نہ سکا۔ ذرا سنبھل کر بولا۔ "میں بھی اُسی کی بات کر رہا ہوں۔ ایک ہی ساتھی رہ گیا تھا۔ بڑا اچھا دلدار بندہ تھا۔ چیتے کی طرح تیز اور لومڑی کی طرح مکار۔ سکھے کی موت کے بعد اب میں بھی زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گا۔ وہ ملنے آجاتا تھا تو پُرانی باتیں کر کے جی بہل جاتا تھا مگر اب میری باتیں سننے والا کوئی نہیں رہا۔"

"میں نے سنا ہے سخاوت علی یعنی سکھے کے پاس کوئی خزانہ تھا جسے وہ چھپا کر رکھتا تھا؟"

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ کبھی فرصت میں آنا تو سناؤں گا۔ اس وقت تو تم جلدی میں معلوم ہوتے ہو۔"

"آپ کہانی سنائیں۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔"

بوڑھے امام بخش نے خاصی لمبی چوڑی کہانی سُنائی۔ میں اُس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں۔



بیسویں صدی کے اوائل میں سخاوت علی عرف سکھے ڈاکو کا کام خاصا زوروں پر تھا۔ چوری ڈکیتی اور راہزنی اُس کا پیشہ تھا۔ اُس نے بڑے بڑے سیٹھوں کی تجوریاں خالی کی تھیں اور بے حساب دولت لوٹی تھی لیکن یہ دولت اُس کے ہاتھ میں کبھی ٹکی نہیں تھی۔ جیسے آتی تھی ویسے ہی نکل جاتی تھی۔

جب اُس کی جوانی ڈھلنے لگی تو اُسے گھر کے آرام کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اُس نے امام بخش سے اس بات کا ذکر کیا۔ امام بخش نے بھی اُس کی تائید کی۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ دو چار لمبے ہاتھ مارنے کے بعد انھیں کوئی کاروبار شروع کر دینا چاہیے۔

"لیکن ہم اپنے علاقے میں کاروبار نہیں کر سکتے۔" سکھے نے خیال ظاہر کیا۔ "یہاں پولیس ہمیں ایک دن بھی چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ چوری ڈکیتی کی ہر واردات ہمارے کھاتے میں ڈال دے گی اور ایک بات اس کے علاوہ بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" امام بخش نے پوچھا۔

"وہ یہ کہ یہاں کوئی شریف آدمی ہمیں جینے نہیں دے گا۔"

"تو کیا تُو شادی کرنا چاہتا ہے؟"

"دیکھ امام بخش! شرافت سے زندگی گزارنے کے لیے شادی بہت ضروری ہے۔ اگر آدمی اکیلا ہو تو محلے والے اُسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھتے ہیں۔"

"دیکھ یار سکھے! میں یہ جھنجھٹ نہیں پالنا چاہتا۔ میں نے سُنا ہے کہ بندہ جب بھی مار کھاتا ہے بیوی سے کھاتا ہے۔"

"اوئے۔ فکر نہیں کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

بہر حال، دونوں نے بڑی دیکھ بھال کے بعد ایک علاقہ منتخب کیا اور وہاں جائیداد بنانی شروع کر دی۔ جب وہ اس علاقے میں جاتے تو شریفوں والا حلیہ بنا لیتے اور آنکھیں نیچی رکھتے۔ چند سالوں میں انھوں نے وہاں اچھی خاصی جائیداد بنالی اور بھینسیں پال کر دودھ کا کاروبار شروع کر دیا۔ چونکہ وہ اپنے آپ کو عزت دار ثابت کرنا چاہتے تھے اس لیے ہر شخص کے ساتھ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتے تھوڑے ہی عرصے میں اُن کا بھینسوں کا کاروبار خوب چل نکلا اور دونوں نے شادیاں کر لیں۔

لیکن اُن کی بدقسمتی کہ اُن کا ایک پُرانا ساتھی جس کا نام جمال تھا جیل سے فرار ہو کر اُن کے پاس پہنچ گیا۔

کچھ عرصہ خیریت سے گزر گیا۔ ایک رات جمال نے دو ساتھیوں کے ہمراہ ایک قریبی گاؤں میں ڈکیتی کی واردات کی۔ جب وہ واردات مکمل کر کے نکل رہے تھے تو گاؤں والوں نے اُن پر ہلّہ بول دیا۔ انھوں نے جم کر مقابلہ کیا۔ جمال زخمی ہو گیا اور گاؤں کے دو آدمی مارے گئے۔

جمال کے ساتھیوں نے اُسے سخاوت علی کے پاس چھوڑا اور اپنا حصہ لے کر راتوں رات وہاں سے نکل گئے۔ اگلی صبح پولیس گاؤں میں پہنچی اور جمال کے ساتھ سخاوت اور امام بخش کو بھی گرفتار کر لیا۔ اُس وقت تک کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ سخاوت علی اور امام بخش پیشہ ور ڈکیت تھے۔

اس بات کا سب سے زیادہ صدمہ سخاوت علی کی بیوی فاطمہ کو ہوا۔ اُس وقت وہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔

سخاوت علی اور امام بخش نے سزا سے بچنے کے لیے اپنی ساری جائیداد داؤ پر لگا دی لیکن چونکہ ان کا پچھلا ریکارڈ اچھا نہیں تھا اس لیے صفائی کی مضبوط شہادتوں کے باوجود دونوں کو تین سال کی قید با مشقت ہو گئی۔

جب وہ جیل سے باہر آئے تو خالی ہاتھ تھے۔ اُن کی تمام پونجی قانونی کارروائیوں کی نذر ہو چکی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ دونوں کی بیویاں ناراض ہو کر میکے جا چکی تھیں اور اب اُن کے ساتھ رہنے پر تیار نہیں تھیں۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر سخاوت علی نے امام بخش سے کہا۔

"امام بخشا! اس وقت ہمیں بیویوں کے پیچھے پڑنے کے بجائے اپنے مالی حالات کی فکر کرنی چاہیے۔ پلّے مال ہو تو عورت کو منانا آسان۔"

"اوئے بڑ بیر مضبوط ہوں تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ہمیں کوئی ٹھوک کاروبار کرنا چاہیے۔"

"ٹھوک کاروبار!" امام بخش نے شک آمیز نظروں سے سخاوت علی کو گھورا۔ "کس قسم کا ٹھوک کاروبار؟"

"ہم از سرِ نو کام شروع کریں گے۔ یہ سوچ کر کہ آج ہمارے کام کا پہلا دن ہے۔"

"او چھڈ یار! ساری کیتی کرائی کھوہ کھاتے پے گئی۔" امام بخش نے کہا۔ "میرا تو دل چاہتا ہے کہ گُڑیلا کھا کے مر جاؤں۔"

"اوئے جھلیا! میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔ سن، میں تجھے ایک مثال بتاتا ہوں۔ فیکے کے پاس ایک لاکھ روپے تھے اور شیدے کے پاس صرف ایک ہزار روپے تھے۔ فیکے کے نوّے ہزار چوری ہو گئے باقی کتنے بچے؟"

"باقی... دس ہزار بچے۔ پر بات کیا بنی؟"

"ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔ شیدے نے ہزار روپے کا کاروبار کیا اور رکھانی کے ہزار روپے نفع کما لیا۔ اس طرح اُس کے پاس دو ہزار ہو گئے۔ زیادہ کس کے پاس ہوئے؟"

"مجھے یہ بجھارتیں اچھی نہیں لگتیں۔" امام بخش نے کہا۔ "سیدھی سی بات ہے۔ زیادہ فیکے کے پاس ہوئے لیکن بات کیا بنی؟"

"بات یہ بنی کہ فیکے کو دل کا دورہ پڑ گیا اور شیدا خوشی سے ناچنے لگا۔ حالانکہ خوش، زیادہ پیسے والے کو ہونا چاہیے تھا۔ اصل میں ساری بات سوچ کی ہے۔ اگر بندے کا نقصان ہو جائے تو اسے اپنی سوچ کو تھوڑا پیچھے لے جانا چاہیے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم نقصان پر رونے کے بجائے یہ سوچ لیتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ آج ہمارے کام کا پہلا دن ہے۔ اگر سوچ صحیح ہو تو بندہ اپنے آپ کو سو دکھوں سے بچا سکتا ہے اور دوسروں کو سو طرح سے بے وقوف بنا سکتا ہے۔"

امام بخش نے مجھے بتایا کہ سکھے کی اس بات سے اُس کے دل میں بڑی طاقت پیدا ہوئی، انھوں نے پوری ہمت سے کام... شروع کر دیا اور چند سالوں میں دوبارہ جائیداد بنالی لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ کیا کام شروع کیا تھا۔

سخاوت علی عرف سکھے ڈاکو نے اُسے ایک اور گُر سمجھایا۔

"امام بخشا! بندے کی عزت پیسے سے ہوتی ہے۔ پیسہ تھوڑا ہو تو تھوڑی عزت ہوتی ہے زیادہ ہو تو زیادہ......۔ اگر میرے پاس ایک ہزار روپے ہوں تو میں دس ہزار والی ٹور بنا سکتا ہوں اور اگر دس ہزار ہوں تو ایک لاکھ والی ٹور بنا سکتا ہوں۔ جب ہم بیویوں

لینے جائیں گے تو ایسی ہی ٹور بنا کر جائیں گے۔ میری بات سمجھے ہو نا؟"

"سمجھ تو رہا ہوں، پر...؟"

"اوئے کوئی فکر فاقہ نہ کر۔ لوگ یہ نہیں کہتے کہ مال دکھاؤ بس بندے کی ٹور شور دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں۔"

دونوں نے اس نسخے پر عمل کرتے ہوئے اپنے لیے عمدہ کپڑے سلوائے، بیوی بچوں کے لیے تحفے خریدے اور بڑی آن بان کے ساتھ اپنے سسرال پہنچے۔ اُن کی "ٹور شور" کا خاطر خواہ اثر ہوا اور سسرال والے ان کی بیویوں کو رُخصت کرنے پر راضی ہو گئے۔

امام بخش نے مجھے بتایا کہ سکھے کی بیوی فاطمہ خوش نہیں تھی۔ گھر والوں کے دباؤ میں آ کر رخصت تو ہو گئی پر اُس نے سخاوت علی کو دل سے قبول نہ کیا۔ اُس نے اولاد کے دل میں بھی باپ کے لیے نفرت کا بیج بو دیا۔

یوں زندگی گزرتی رہی اور فاصلے بڑھتے رہے۔

اُن کی اولادیں جوان ہو گئیں اور اُن کی شادیاں بھی ہو گئیں۔

سخاوت علی اور امام بخش بوڑھے ہو گئے۔ ان کی بیویاں فوت ہو گئیں اور پھر وہ وقت بھی آ گیا کہ اُن کی اولاد بھی بڑھاپے کے دَور میں داخل ہو گئی۔

سخاوت علی کبھی ایک بیٹے کے گھر میں رہتا اور کبھی دوسرے کے گھر میں لیکن کوئی اس کی پروا نہیں کرتا تھا۔

ایک روز وہ گھر سے چلا گیا اور پندرہ بیس روز کے بعد واپس آیا۔ گھر والوں کے استفسار پر اُس نے بتایا کہ ایک قریبی علاقے میں اُس کی جائیداد تھی جسے وہ فروخت کر آیا ہے۔ اُس کی جائیداد کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوتی رہی تھیں لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ جائیداد کہاں تھی۔

سخاوت علی نے اپنے چند خاص دوستوں کو بتایا کہ اُسے جائیداد کی فروخت سے خاصی بڑی رقم ملی ہے لیکن چونکہ اولاد اُس کا خیال نہیں رکھتی اس لیے یہ دولت اُس کے ساتھ ہی قبر میں جائے گی۔

یہ بات اُس کے دونوں بیٹوں کو بھی معلوم ہوئی اور وہ ساری رنجشیں بھلا کر باپ کی خدمت پر کمربستہ نظر آنے لگے۔ یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت تھی۔ سخاوت علی کے بارے میں یہ بھی سُنا گیا کہ اُس نے جائیداد بیچ کر سونا خرید لیا تھا۔ بعض لوگوں نے حلفیہ بیان کیا کہ اُنھوں نے سخاوت علی کے پاس سونے کی مُہر شدہ ٹکیاں دیکھی تھیں۔ اس قسم کی ایک ٹکیہ عموماً دس تولے کی ہوتی ہے۔

ان افواہوں کی روشنی میں چھوٹے بیٹے صادق علی نے زیادہ محبت کا مظاہرہ کیا اور باپ کو مستقل اپنے گھر میں رکھ لیا۔ اُس نے اپنے بچوں کو تاکید کر دی کہ وہ دادا کی خدمت اچھی طرح کریں اور انھیں کسی شکایت کا موقع نہ دیں۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ سخاوت علی نے اولاد کے سامنے کبھی دولت کا ذکر نہیں کیا تھا۔ نہ کبھی یہ کہا تھا کہ وہ جس سے خوش ہوگا اُس کو اپنی دولت دے دے گا۔ لوگوں نے اُسے ہمیشہ یہی کہتے سُنا کہ وہ اپنی دولت اپنے ساتھ قبر میں لے جائے گا۔

اس بیان کی روشنی میں قبر کھودنے والا معاملہ حل ہو گیا۔ غلام عباس نے دولت کی تلاش میں اپنے باپ کی قبر کھودی تھی۔

لیکن ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ مرنے والا.... اپنی دولت بذاتِ خود قبر میں کیسے دفن کر سکتا تھا۔

میں نے امام بخش سے یہ بات پوچھی تو اُس نے جواب دیا۔

"یہ سب ٹور شور کا چکر تھا۔ میرا یار ایسا ہی تھا۔ میں نے اُس کی دولت پر کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ حالانکہ ایک دفعہ اُس نے مجھے سونے کی ٹکیہ دکھائی بھی تھی۔"

امام بخش کے ساتھ اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں لیکن میں طوالت کے خیال سے اُن کا ذکر چھوڑتا ہوں۔

وہاں سے اُٹھ کر میں صادق علی کے گھر گیا مگر وہاں سے پتا چلا کہ وہ بھائی کی لاش لینے اسپتال گیا ہوا تھا۔

شام تک غلام عباس کی تجہیز و تکفین مکمل ہو گئی۔

اگلی صبح صادق علی خود ہی تھانے حاضر ہوا اور کہا کہ وہ اپنے بھائی کے قتل کی رپورٹ لکھوانے آیا ہے۔

"وہ رپورٹ ہم نے گزشتہ روز ہی درج کر لی تھی لیکن میں نے رپورٹ کا ذکر نہیں کیا اور کہا۔ "میں نے تو سُنا ہے کہ تمھارے بھائی کی موت میں قدرت کا عمل دخل ہے۔"

اُس نے گردن کھجلاتے ہوئے کہا۔ "لوگ تو یہی کہتے ہیں، آگے اللہ بہتر جانے۔ میں تو اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ کل آپ ہمارے گھر آئے تھے۔"

"میں یہی پوچھنا چاہتا تھا کہ غلام عباس کی موت کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے۔" میں نے کہا۔ "اور دوسری بات میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمھارا بھائی قبر کیوں کھود رہا تھا؟ کیا قبر کے اندر کوئی خزانہ دبا ہوا ہے؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ غالباً اس کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ سچ بولے یا جھوٹ۔ بالآخر اُس نے کہا۔ "ملک صاحب! اباجی کے خزانے کے بارے میں کئی افواہیں مشہور تھیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُن کے پاس سونے کی اینٹیں تھیں جو اُنھوں نے کہیں دبا رکھی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سونا انھوں نے قبرستان میں کہیں دبا رکھا ہو۔ میرا خیال ہے کہ بھائی غلام عباس نے اسی سونے کے لالچ میں قبر کھودی تھی۔"

"اگر ۔۔۔ لیں کہ اُن کے پاس سونا تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی قبر میں خود کیسے سونا دبایا تھا؟"

"اُن کی وفات کے بعد ہمیں پتا چلا کہ وہ اکثر قبرستان جاتے رہتے تھے اور اپنی قبر کی جگہ کا انتخاب بھی انھوں نے خود ہی کیا تھا۔ اس بات کا ہمیں اُس وقت پتا چلا جب ہم اُن کا جنازہ لے کر قبرستان پہنچے۔ یہ بات ہمیں خوشی محمد گورکن نے بتائی کہ اباجی نہ صرف قبر کی قیمت بلکہ گورکن کی مزدوری بھی ادا کر چکے تھے۔"

"تو کیا سخاوت علی نے اپنی موت سے قبل اپنا خزانہ قبر میں دبا دیا تھا؟" میرے دل میں سوال پیدا ہوا اور کیا گورکن کو اس خزانے کا علم تھا؟

"کیا انھوں نے اپنی زندگی میں ہی قبر تیار کروالی تھی؟"

"ملک صاحب یہ بھی بڑی عجیب بات ہے۔ گورکن نے ہمیں بتایا ہے کہ اباجی نے وفات سے صرف پندرہ دن پہلے قبر تیار کروائی تھی۔ خوشی محمد نے انھیں بہت کہا کہ ضرورت کے وقت قبر تیار ہو جائے گی مگر وہ نہیں مانے۔ شاید انھیں اپنی موت کا علم ہو گیا تھا۔"

میں نے اس کی بات پر گرہ لگائی "سنا ہے کہ تمھارے اباجی بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے؟"

"ہاں بہت نیک آدمی تھے۔" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ہر وقت کوئی نہ کوئی وظیفہ کرتے رہتے تھے۔ آخری دنوں میں تو قبر میں بیٹھ کر اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ یہ بات بھی خوشی محمد نے بتائی ہے۔"

بات کھلتی جا رہی تھی۔ قبر میں بیٹھ کر ذکر بھی کیا جا سکتا تھا اور خزانہ بھی دبایا جا سکتا تھا۔

میں نے پوچھا "یہ بات تمھیں کب معلوم ہوئی ہے؟"

"یہ بات بھی اباجی کی وفات والے دن ہی معلوم ہوئی تھی۔"

میرے دل میں خوشی محمد کے بارے میں شکوک پیدا ہوئے۔ ممکن ہے کہ اُسے خزانے کے بارے میں علم ہو گیا ہو اور اُس نے سخاوت علی کو کسی دوسری قبر میں دفنا دیا ہو۔ یہ بات اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ سخاوت علی نے اپنے لیے کون سی قبر مخصوص کروائی تھی۔

"صادق علی کیا تمھیں یقین ہے کہ تمھارے اباکی تدفین اُسی قبر میں ہوئی تھی جو انھوں نے خود اپنے لیے مخصوص کی تھی؟"

میرا سوال سن کر وہ چونک گیا۔ غالباً اُس کے ذہن میں بھی وہی بات آئی تھی جو میرے ذہن میں آئی تھی۔

"جب ہم جنازہ لے کر قبرستان پہنچے تو وہاں دو تیار قبریں تھیں۔ خوشی محمد نے ہمیں جس قبر کے بارے میں بتایا ہم نے اسی میں جنازہ دفن کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہو۔" آخری جملہ اُس نے خود کلامی کے انداز میں کہا تھا۔

میں نے پوچھا "تمھیں اپنے بھائی کے قتل کے بارے میں کسی پر شک تو نہیں؟"

اُس نے جواب دیا کہ اُسے کسی پر شک نہیں ہے۔

دوپہر کے بعد میں ایک اے ایس آئی کے ہمراہ خوشی ۔۔ گھر پہنچا۔ ابھی ہم دور ہی تھے کہ ہم نے ایک نوجوان کو اُس کے ۔۔ سے نکلتے دیکھا۔ وہ چند قدم ہماری سمت چلا پھر ہمیں دیکھ کر ۔۔ رُکا جیسے اُسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ پھر واپس مڑا اور تیز قدم اُٹھ۔۔ ہوا مکان کے عقب میں غائب ہو گیا۔

"یہ لڑکا تھانے بھی آیا تھا۔" اے ایس آئی نے کہا "غالباً ۔۔ کا بیٹا ہے۔ اکرم اس کا نام ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس کے باپ نے اسے یہاں بھیجا ہے" ۔۔ نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ خزانے والی بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔"

خوشی محمد نے ہمیں آتے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے باہر آ کر سلام کیا ۔۔ ہمیں ایک نیم تاریک کمرے میں لے گیا جس میں دو کھری چارپائیاں ۔۔ رکھی تھیں۔

میں نے پوچھا "یہ اکرم یہاں کیا کرنے آیا تھا؟"

"پتا نہیں جی اُلٹی سیدھی باتیں کر رہا تھا۔" اس نے جواب ۔۔ "کہہ رہا تھا کہ میں نے اس کے دادا کو صحیح قبر میں دفن نہیں کیا ۔۔ کہتے تھے مردہ غائب کر دیا۔ اب کہتے ہیں قبر صحیح نہیں۔ پتا نہیں ۔۔ یہ لوگ مجھ غریب کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں!"

"کیا تم نے سخاوت علی کو صحیح قبر میں دفن کیا تھا؟" میں نے ۔۔

اُس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا پھر پوچھا "کیا انھوں نے میرے خلاف ایک اور رپٹ لکھا دی ہے؟"

"رپٹ کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بات میں اپنے طور پر پوچھ ۔۔"

"دفن تو انھوں نے خود ہی کیا تھا۔ میں نے صرف قبر کے ۔۔ میں بتایا تھا۔ بڈھے نے زندگی میں ہی اپنی قبر تیار کروالی تھی۔"

"میں نے سنا ہے کہ وہ قبر میں بیٹھ کر وظیفہ کیا کرتا تھا۔"

"وظیفہ تو جی اللہ ہی بہتر جانے۔ میں نے اُس کے ہاتھ میں ۔۔ تسبیح وغیرہ نہیں دیکھی۔ ہاں اُسے دو دفعہ قبر میں ضرور اُترتے دیکھا تھا۔ بڑا عجیب آدمی تھا۔ ہر مہینے اپنے لیے ایک قبر بنوا لیتا تھا۔ ہر دفعہ یہی کہتا تھا 'یہ میرا آخری مہینہ ہے۔ مجھے خبر مل گئی ہے۔ میں مرنے والا ہوں۔' جناب کبھی نہ کبھی تو آدمی مر ہی جاتا ہے۔ اور ۔۔ سالہ بڈھے کا کیا بھروسا!"

اس کی باتوں میں سادگی تھی۔ میں نے اُس سے سیدھی بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"خوشی محمد وہ ہر مہینے قبر تبدیل کیوں کر لیتا تھا؟"

"جناب اتنے زیادہ عرصے قبر کھلی نہیں رکھی جا سکتی۔ بارش میں ۔۔ خراب ہو جاتی ہے۔ میں خود ہی وہ قبر کسی اور کو دے دیتا تھا اور اُس کا نام دوسری قبر پر لگا دیتا تھا۔"

"کیا تم نے اس سے پہلے بھی اُسے کسی قبر میں اُترتے دیکھا تھا؟"

"نہیں جی پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"اُس نے اب تک کُل کتنی قبریں اپنے نام لگوائی تھیں؟"

"تقریباً آٹھ نو ہوں گی۔"

"کیا تم ان سب قبروں کی نشاندہی کر سکتے ہو؟"

"جی کیا کر سکتا ہوں؟"

"نشاندہی۔ میرا مطلب ہے کہ کیا تم اُن قبروں کے بارے میں بتا سکتے ہو؟"

"ہاں جی بتا سکتا ہوں۔ ساری ایک ہی قطار میں ہیں۔"

لمحہ بھر کے لیے میرے ذہن میں خیال آیا کہ سخاوت علی کا خزانہ ان قبروں میں سے کسی ایک قبر میں دفن ہو گا بشرطیکہ واقعی کوئی خزانہ تھا۔ ویسے جیسا کہ امام بخش نے کہا تھا ساری بات فقط افواہ بھی ہو سکتی تھی۔

"لوگوں کا خیال ہے کہ سخاوت نے اپنی جائداد بیچ کر اس کا سونا خرید لیا تھا۔" میں نے کہا "اور وہ سارا سونا اُس نے کسی قبر میں دبا دیا تھا۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

"مجھے ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہے۔" اُس نے جواب دیا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں وہ سونا نکال نہ لیتا؟"

اگر اُسے سونے کا علم ہوتا یا اُس نے سونا نکالا ہوتا تو وہ یہ بات نہ کہتا۔

میں نے پوچھا "خوشی محمد جس قبر میں سخاوت علی کو دفن کیا گیا تھا کیا یہ وہی قبر تھی جس میں تم نے اُس کو اُترتے دیکھا تھا؟"

"ہاں جی وہی قبر تھی۔" اُس نے جواب دیا۔ "جب لاش قبر میں اُتار دی گئی تو ایک آدمی قبر میں اُتر آیا اور اُس نے کہا کہ وہ مرنے والے کی وصیت کے مطابق ایک تعویذ میت میں رکھنا چاہتا ہے۔ میں اُس وقت لحد کو بند کرنے لگا تھا۔ میں نے کہا۔ رکھ دو۔ اُس نے جیب سے کوئی چیز نکال اور کفن کا کنارہ ہٹا کر اُسے میت پر رکھ دیا۔"

"وہ کیا چیز تھی؟"

"اُس نے میری طرف پیٹھ کر کے وہ چیز میت پر رکھی تھی۔ میں دیکھ نہیں سکا۔ شاید وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ میں نہ دیکھوں۔"

"یہ بات اور کس کو معلوم ہے؟"

"پتا نہیں۔ وہ آدمی تعویذ رکھنے کے بعد میری مدد کرنے لگ گیا تھا۔ لوگ یہی سمجھے ہوں گے وہ ثواب کی خاطر وہ کام کر رہا ہے۔ میں نے غلام عباس کو یہ بات بتائی تھی۔ وہ پرسوں میرے پاس آیا تھا اور اپنے باپ کے بارے میں ایسے ہی سوالات کر رہا تھا

جیسے آپ کہہ رہے ہیں۔"
"تم نے اور کس کو یہ بات بتائی ہے؟"
"اور کس کو بتانی تھی جی... اوہ ہاں! ابھی اکرم کو بھی یہ سارا قصہ بتایا ہے۔"
وہ یا تو بہت سیدھا آدمی تھا یا بہت زیادہ چالاک۔
"کیا تم اُس شخص کو جانتے ہو جس نے میّت پر تعویز رکھا تھا؟"
"نام نہیں جانتا۔ اگر سامنے آجائے تو شکل سے پہچان لوں گا۔"
اے ایس آئی نے کہا۔"اُس آدمی کو تلاش کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ کئی اور لوگوں نے بھی اُسے قبر میں اُترتے دیکھا ہوگا۔"
"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔"تم خوشی محمد کو ساتھ لے لو اور اُسے تلاش کر کے تھانے لے آؤ۔"
اے ایس آئی نے کہا کہ مجھے بھی ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ اُسے یقین تھا کہ مذکورہ شخص کو تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اگر وہ مل گیا تو کھڑے کھڑے بات ہو جائے گی۔

اُس کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ جنازے میں شریک چند لوگوں سے بات کرنے پر اُس کا نام اور پتا معلوم ہو گیا۔
بیس منٹ کے بعد ہم اُس کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔ اُس کا نام شفیق الرحمن تھا اور وہ اسکول ٹیچر تھا۔
دستک کے جواب میں اُس نے خود ہی دروازہ کھولا اور ہمیں دیکھ کر کچھ فکرمند سا نظر آنے لگا۔ وہ ادھیڑ عمر کا خوش اخلاق اور دیانت دار شخص نظر آتا تھا۔
رسمی کلمات کے بعد میں نے کہا۔"شفیق صاحب! خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے معاملے کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں۔"
"حکم کریں۔"
"یہ خوشی محمد گورکن ہے۔" میں نے خوشی محمد کی طرف اشارہ کیا۔
"اس نے ہمیں بتایا ہے کہ سخاوت علی کی تدفین کے موقع پر آپ نے کوئی چیز کفن کے اندر رکھی تھی۔ وہ کیا چیز تھی؟"
"وہ ایک تعویز تھا۔"
"میرا خیال ہے کہ تعویز عموماً زندہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔"
"میں نے صرف مرحوم کی خواہش پوری کی تھی۔" اُس نے جواب دیا۔"ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ اگر انسان کے اندر تعویز نہ ہو تو باہر کا تعویز اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔"
"سخاوت علی نے یہ تعویز آپ کو کب دیا تھا؟"
اُس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔"یہ کوئی سات آٹھ مہینے پُرانی بات ہے۔ اُس نے ایک بڑے سائز کا تعویز مجھے دیا تھا اور مجھ سے یہ وعدہ لیا تھا کہ اُس کی وفات کے بعد میں وہ تعویز اُس وقت اُس کے کفن کے اندر رکھ دوں جب اُس کی میّت لحد میں اتار دی جائے گی۔ نیز یہ بھی وعدہ لیا تھا کہ میں اُس تعویز کا اُس کی موت سے قبل کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔ میں نے اس کام کو ایک بوڑھے شخص کی آخری خواہش سمجھ کر کرنا قبول کر لیا تھا۔ ورنہ ذاتی طور پر مجھے وہ کام بے حکمت ہی معلوم ہوا تھا۔"
"آپ کے خیال میں اُس تعویز کے اندر کیا چیز تھی؟"
"جناب! میں نے کبھی امانت میں خیانت نہیں کی۔ اُس تعویز کو میں نے دو دفعہ دیکھا تھا۔ ایک دفعہ اُس وقت جب سخاوت علی نے اُسے میرے سپرد کیا تھا اور دوسری دفعہ اُس وقت جب اُس کی وفات ہوئی۔ باقی سارا عرصہ میں نے اُسے صندوق میں بند رکھا۔ میری فطرت میں تجسس نہیں ہے۔ ویسے وہ عام تعویزوں سے بہت مختلف تھا۔ اُس کا سائز بھی خاصا بڑا تھا اور وزن بھی زیادہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس کے اندر کسی دھات کا ٹکڑا تھا۔"
"آپ نے اُسے یونہی رکھ دیا تھا یا باندھ دیا تھا؟"
"باندھنے کا موقع نہیں تھا۔" اُس نے جواب دیا۔"میں نے کفن کا کنارہ اٹھا کر اُسے میّت کے سینے پر رکھ دیا تھا۔"
"پھر تو وہ کہیں گر گیا ہوگا۔" میں نے سوچا۔ لاش ایک قبر سے نکال کر دوسری قبر میں دفن کی گئی تھی اور یہ کام رات کے اندھیرے میں کیا گیا تھا۔ اس عمل کے دوران تعویز یا تو گر گیا تھا یا غلام عباس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔
میں نے ماسٹر شفیق الرحمن کا شکریہ ادا کیا۔ خوشی محمد کو چھٹی دے دی اور اے ایس آئی کے ہمراہ واپس تھانے پہنچ گیا۔
وہ پُراسرار تعویز میرے لیے اچانک اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ سخاوت علی عرف سکھا ڈاکو معقول انسان نہیں تھا۔ وہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا۔ ایسے لوگوں کی اپنی ایک مخصوص سوچ ہوا کرتی ہے۔ میں نے سوچا کہ اُس نے اپنی دولت کی تشہیر اور پُراسرار تعویز کا سلسلہ اپنی ناخلف اولاد سے انتقام لینے کے لیے کھڑا کیا تھا۔ اُس کا بڑا بیٹا یعنی غلام عباس اس انتقام کا نشانہ بن چکا تھا۔ جس شخص نے اُسے قتل کیا تھا اُس نے بھی سخاوت علی کی مبینہ دولت کے بارے میں وہی اندازہ لگایا تھا جو غلام عباس نے لگایا تھا۔ یعنی اُس کا بھی یہی خیال تھا کہ دولت کا راز سخاوت کی قبر کے اندر یا پُراسرار تعویز کے اندر تھا۔
کوئی عجب نہیں کہ تعویز کے اندر کوئی نقشہ، کوئی ہنڈی یا کسی خفیہ صندوق کی چابی بند ہو۔ مجھے خیال آیا کہ غلام عباس کا قاتل موقع ملتے ہی سخاوت علی کی قبر کھودنے کی کوشش کرے گا۔
لہٰذا قبرستان کی نگرانی ضروری تھی۔

ت کے نو بجے میں نے ولی محمد کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُس وقت ساتھ ایک اے ایس آئی اور دو سپاہی تھے۔ ہم چاروں سادہ تھے۔
ک صاحب! آپ اس وقت!" ولی محمد نے حیرانی سے آنکھیں "کیا پھر کوئی واردات ہو گئی ہے؟"
ہم تمھارے جنّات سے ملنے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔"آج ہم تمھارے باڑے میں گزاریں گے۔"
یریت تو ہے نا؟"
یریت تو صبح ہی معلوم ہوگی۔" میں نے کہا۔"تم ایسا کرو کہ باڑے ے لیے چارپائیوں اور بستروں کا انتظام کرو لیکن سارا کام دشی سے ہونا چاہیے۔ آس پاس خبر نہ ہو۔"
ں نے سپاہیوں کو ساتھ لیا اور چند منٹوں میں باڑے کے ی صفائی کر کے وہاں چارپائیاں بچھا دیں اور کھانے پینے ہ میں پوچھا۔
م گھر سے کھا پی کر آئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔"اگر کسی چیز ت ہوئی تو مانگ لیں گے اور اب تم جا کر آرام کرو۔"
رات کے گیارہ بجے تک جاگتے رہے۔ اس اثنا میں سپاہی نگرانی کرتے رہے۔ انھیں میں نے قبرستان کی دیوار کے جگہ پر بٹھا دیا تھا جہاں سے سخاوت علی کی قبر صاف نظر یسے بھی وہ رات کے وقت قبرستان میں قدم رکھتے ہوئے ے۔ جس مقام پر وہ ڈیوٹی دے رہے وہاں درختوں کی تاریکی تھی۔
نے سپاہیوں کو تاکید کر دی تھی کہ اگر وہ قبرستان میں کوئی یں یا آواز سنیں تو از خود کوئی کارروائی نہ کریں اور بلا تاخیر یں۔
کے وقت قبرستان میں دو سپاہی پہرا دیتے رہے تھے۔ کے وقت میں نے اُن کی ڈیوٹی ختم کر دی تھی۔ اس کے علاوہ ں کو تاکید کر دی تھی کہ رات کے وقت اگر اُسے قبرستان ی آواز سنائی دے تو وہ گھر سے باہر نہ نکلے۔

ت کے تقریباً پونے دو بجے ایک سپاہی نے مجھے جھنجوڑ ہولے سے بولا۔"ملک صاحب! جلدی سے اُٹھ جائیں، ایک آدمی چل پھر رہا ہے۔"
جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ اے ایس آئی مجھ سے پہلے ہی تھا۔ میں نے جلدی سے جوتے پہنے، ہولسٹر کندھے پر ے سے نکل کر قبرستان کی دیوار کی طرف بڑھا۔ سپاہی اور ی میرے پیچھے تھے۔ ہم نے فلیٹ بوٹ پہن رکھے تھے تاکہ چلتے وقت قدموں کی آواز پیدا نہ ہو۔
رات گرم اور سنسان تھی۔ ابتدائی راتوں کا چاند غروب ہو چکا تھا اور حشرات الارض کی آوازیں رات کے سناٹے میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ قبرستان کی طرف دیکھ کر دل پر خوف سا طاری ہوتا تھا۔
سپاہی نے قبرستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"تھوڑی دیر پہلے اُس طرف کوئی چیز حرکت کرتی دکھائی دی تھی۔"
میں نے اشارے کی سمت دیکھا مگر کوئی متحرک شے دکھائی نہیں دی۔"کوئی جانور ہوگا۔"
"جانور نہیں لگتا تھا۔" سپاہی نے کہا۔"خاصی قد آور شے تھی۔"
"اوئے! یہ شے کیا ہوتی ہے؟" اے ایس آئی نے کہا۔"آدمی ہوگا یا کوئی جانور۔"
"جناب! قبرستان میں کوئی تیسری شے بھی ہو سکتی ہے۔" اُس کا اشارہ بھوت پریت یا روح کی طرف تھا۔
ہم بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ ہماری نظریں قبرستان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ آسمان پر پھیلے ہوئے اَن گنت ستارے زمین پر مدھم اجالا کر رہے تھے۔ ویسے ہمارے پاس ٹارچیں بھی تھیں لیکن ہم انھیں اشد ضرورت کے سوا استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے۔
دس بارہ منٹ کے بعد قبرستان میں ایک ہیولا سا حرکت



کرتا دکھائی دیا۔ وہ بہت احتیاط سے چل رہا تھا۔ کبھی کبھار کوئی خشک پتا اُس کے پیر کے نیچے آکر چرچراہٹ پیدا کرتا تو وہ لمحہ بھر کے لیے رُک جاتا۔ بالآخر وہ سخاوت علی کی قبر کے قریب پہنچ کر رُک گیا اور غلام عباس کے ادھورے کام کو مکمل کرنا شروع کر دیا۔

مجھے یہ بات بتلانے کا خیال نہیں رہا کہ میں نے تفتیش ضرورت کے تحت سخاوت علی کی قبر پر مٹی ڈالنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ قبر آدھی سے زیادہ کُھدی ہوئی تھی۔

قبر کھودنے والا بہت احتیاط سے کام کر رہا تھا۔ مٹی نکالنے سے بہت مدھم آواز پیدا ہو رہی تھی۔

اے ایس آئی نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اسے گھیر کر پکڑ لینا چاہیے۔"

"ابھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اسے اپنا کام مکمل کر لینے دو۔"

اے ایس آئی نے قدرے تلخی سے کہا۔ "کیا آپ اسے لاش کی بے حرمتی کرنے کی اجازت دے رہے ہیں؟"

یہ بات مجھے بھی پسند نہیں تھی۔ لمحہ بھر کے لیے میرا ارادہ تبدیل بھی ہوا۔ میں نے سوچا قبل اس کے کہ وہ لاش کو قبر سے نکالے ہمیں اُسے گرفتار کر لینا چاہیے لیکن میں نے اپنے ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ دراصل میں معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اگر میں اُسے مزید قبر کھودنے سے روک دیتا تو گو وہ شخص ایک بڑے نقصان سے بچ جاتا مگر وہ بات سامنے نہ آتی جو اس عبرت انگیز واقعے کو آپ تک پہنچانے کا محرک بنی۔

قبر کھودنے والا کافی گہرائی میں جا چکا تھا اور صرف اُس وقت نظر آتا تھا جب وہ مٹی باہر پھینکتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کیا۔ درختوں اور پودوں کی اوٹ میں کتبوں کی اوٹ میں یہاں تک کہ ہم چند قدم کے فاصلے پر پہنچ گئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ میرے حکم کے بغیر کوئی حرکت نہ کریں۔

کچھ دیر کے بعد قبر کھودنے والے نے اپنا کام موقوف کر دیا اور قبر کے اندر غائب ہو گیا۔ غالباً اب وہ اس چیز کی تلاش میں تھا جس کے لیے اُس نے ساری محنت کی تھی۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ جب وہ قبر سے باہر نکلے گا تو میں اُسے گرفتار کر لوں گا۔ قبر کے اندر مدھم روشنی نظر آئی۔ شاید کوئی چھوٹی ٹارچ تھی۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ قبر کے اندر سے ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔ وہ آواز جو پورے قبرستان میں گونجتی چلی گئی تھی اُس میں ایسی دہشت اور ایسی شدت تھی کہ ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چند لمحوں کے لیے ہم اپنی جگہوں پر ساکت ہو گئے۔

قبر کھودنے والا قبر سے باہر نکلا اور چیخیں مارتا ہوا ایک طرف بھاگا۔ اُسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ اس کے راستے میں کیا چیز آ رہی تھی۔ وہ قبروں جھاڑیوں اور اونچی نیچی جگہوں کو پھلانگتا چلا جا رہا تھا۔

"اسے روکو۔" میں نے چیخ کر کہا اور اُس کے تعاقب میں بھاگا۔ میرے ساتھیوں نے بھی میری تقلید کی۔

مذکورہ شخص دو تین دفعہ گرا مگر اُس نے دوڑنا موقوف نہیں کیا۔ گرنے کی وجہ سے اُسے واضح طور پر اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں تاہم اُس کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ہم اسے پکڑ نہیں سکیں گے۔

قبرستان کی دیوار پھلانگنے کے بعد وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم چونکہ قبروں سے بچ کر بھاگ رہے تھے اس لیے ہمیں لمبا راستہ اختیار کرنا پڑ رہا تھا۔

قبرستان کی دیوار پھلانگنے کے بعد میں رُک گیا۔ ایک طرف سے رونے اور گڑگڑانے کی آواز آ رہی تھی۔

میں آگے بڑھا تو دیکھا کہ مذکورہ شخص سجدے میں پڑا تھا اور اپنا دایاں ہاتھ زور زور سے زمین پر مارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "اللہ توبہ... اللہ میری توبہ... مجھے آگ کے عذاب سے بچا... مجھے آگ کے عذاب سے بچا..."

ہم چاروں اُس کے قریب کھڑے ہو کر حیرت سے اُس کی حالت کا مشاہدہ کرنے لگے۔ میں نے اُس پر ٹارچ سے روشنی ڈالی اور جھک کر اُس کا چہرہ دیکھا۔

"اوہ... یہ تو صادق علی کا بیٹا اکرم ہے۔" اے ایس آئی نے کہا۔ "ارے کیا ہوا ہے تمہیں؟"

ایک سپاہی نے اُسے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ وہ بُری طرح کانپ رہا تھا اور اپنے دائیں ہاتھ کو کبھی جھٹکتا، کبھی بغل میں دباتا اور کبھی دونوں ٹانگوں میں دباتا تھا۔ لیکن یہ بات بڑی واضح تھی کہ اُس کی تکلیف کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی۔

"کہیں اسے سانپ نے تو نہیں کاٹ لیا؟" ایک سپاہی نے کہا۔ "بھئی! ذرا اپنا ہاتھ تو دکھاؤ۔"

"نہیں نہیں! مجھے سانپ نے نہیں کاٹا۔" اکرم نے تکلیف برداشت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے کسی چیز نے نہیں کاٹا۔ میں نے خدا کے عذاب میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ جہنم کی آگ میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ کوئی شخص اُس قبر کے اندر نہ جائے... اُسے فوراً بند کرا دو۔ اُس قبر کے اندر جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں... میرے گناہ گار دادا کو قبر کا عذاب دیا جا رہا ہے... کوئی اُس قبر کے قریب نہ جائے... اللہ میرے گناہ معاف کرے... میں زندہ نہیں بچوں گا۔"

میں نے بڑی مشکل سے اُس کا ہاتھ دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے دہکتی ہوئی آگ میں ہاتھ ڈال دیا ہو۔

صورتِ حال انتہائی پُراسرار تھی۔ میں نے اُسے قبر کے پاس لے جانا چاہا مگر وہ قبرستان میں قدم رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ بولا۔ "تم مجھے کر دو جان سے مار ڈالو مگر میں اُس قبر کے پاس نہیں جاؤں گا۔"

اے ایس آئی نے کہا۔ "پھر بتاؤ تو سہی کہ وہاں ہے کیا؟"

اُس کی باتوں نے ہمیں بھی خوف زدہ کر دیا تھا۔ میں نے اُسے سپاہی کے پاس چھوڑا اور باقی دو آدمیوں کے ہمراہ دوبارہ قبرستان میں داخل ہوا۔

رات کے اُس سناٹے میں سخاوت علی کی قبر کے قریب جاتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا۔

ہم قبر کے کنارے پر ٹھہر گئے اور ٹارچ سے اندر روشنی ڈالی۔ جو کچھ ہمیں نظر آیا وہ ہمارے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔ لحد میں پڑی ہوئی لاش صاف نظر آ رہی تھی۔ سینے والی جگہ کے پاس سے کفن ہٹا ہوا تھا اور عین دل کے مقام پر سونے کی دہکتی ہوئی ٹکیہ چپکی ہوئی تھی۔ اے ایس آئی گھبرا کر پیچھے ہو گیا۔ "استغفراللہ... استغفراللہ..." اُس نے کہا۔ "یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں! یہ... یہ کیا چیز ہے؟"

میں بھی پیچھے ہو گیا۔ لاش سے چپکے ہوئے سونے کے اُس ٹکڑے کو دیکھ کر دل پر عجیب سی ہیبت طاری ہو رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ یہ وہ تعویز ہے جو ماسٹر شفیق الرحمٰن نے اُن کی لاش پر رکھا تھا۔"

"لیکن تعویز تو کسی کپڑے وغیرہ میں بند ہوتا ہے۔"

"تعویز کا کپڑا ابھی اُدھر پڑا ہے۔" سپاہی نے کہا۔ "آپ نے شاید دھیان نہیں کیا۔ کپڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی لاش کے پہلو میں پڑی ہے۔"

میں نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر قبر میں ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ تھیلی واقعی قبر میں موجود تھی۔

"یہی وہ دولت ہے جس کی سخاوت علی نے تشہیر کر رکھی تھی۔" اے ایس آئی نے کہا۔ "اُس کی کل دولت یہی ایک سونے کا ٹکڑا تھی جس کے بارے میں وہ کہتا رہتا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ قبر میں جائے گی۔"

اے ایس آئی نے کہا۔ "سونے کے ٹکڑے کا تھیلی سے نکل کر اور گرم ہو کر لاش سے چپک جانا سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید قبر کی گرمی سے کیمیکل ری ایکشن ہوا ہے۔"

اُس وقت میں نے بھی کچھ ایسا ہی اندازہ لگایا تھا لیکن اُس کی اصل توجیہہ بہت عرصے کے بعد میری سمجھ میں آئی۔ ایک روز میں نے قرآن کریم میں پڑھا کہ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اُسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے قیامت کے دن اُس سونے چاندی کو آگ میں تپایا جائے گا اور اُس سے اُن کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ وہ دولت ہے جسے تم اپنی جانوں کے لیے جمع کیا کرتے تھے۔ (۹:۳۵)

اُس وقت ہم میں سے کوئی بھی قبر میں اُترنے اور لاش کا کفن درست کرنے پر تیار نہیں ہوا۔ ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ کام صبح کیا جائے گا۔

جب ہم سپاہی کے پاس پہنچے تو وہ پریشان کھڑا تھا۔ میں نے اکرم کے بارے میں پوچھا تو اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں نے اشارے کی سمت دیکھا تو اکرم کو بے ڈھنگے انداز میں زمین پر پڑے ہوئے پایا۔

"جناب! میرا خیال ہے کہ یہ شخص ختم ہو چکا ہے۔" سپاہی نے کہا۔ "مرنے سے پہلے اس نے اقبالِ جرم کر لیا تھا۔"

"مر گیا!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے تو یہ بالکل ٹھیک تھا۔ تم نے تو کچھ نہیں کیا؟"

"نہیں جناب! میں نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

میں نے قریب جا کر ٹارچ کی روشنی میں اُس کا معائنہ کیا۔ وہ واقعی مر چکا تھا۔

مرنے سے پہلے اُس نے سپاہی کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اپنے تایا غلام عباس کو اُسی نے قتل کیا تھا۔ غلام عباس کی طرح اُسے بھی اپنے دادا کی دولت کی تلاش تھی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ قبر میں کوئی پُراسرار تعویز دفن کیا گیا ہے تو وہ رات کی تاریکی میں قبرستان پہنچ گیا۔ وہاں اُس کا تایا پہلے سے قبر کھودنے میں مصروف تھا۔ اس بات سے اُسے یقین ہو گیا کہ قبر میں واقعی کوئی دولت موجود ہے۔ لہٰذا اُس نے تایا کو اپنے راستے سے ہٹا دیا اور اگلی رات دوبارہ قبرستان پہنچ گیا۔

قبر کھودنے کے بعد اُس نے چھوٹی سی ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ سونے کی ایک ٹکیہ لاش کے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔ سونے کی ایک ہی ٹکیہ دیکھ کر اُسے کچھ مایوسی ہوئی لیکن جیسے ہی اُس نے ٹکیہ کو پکڑا اور اُسے جسم سے الگ کرنے کی کوشش کی تو اُسے یوں لگا جیسے اُس نے کسی دہکتی ہوئی انگیٹھی میں ہاتھ ڈال کر انگارا پکڑ لیا ہو — اس کے ساتھ ہی اُس کے حلق سے دلدوز چیخ برآمد ہوئی اور وہ قبر سے نکل کر اندھا دھند ایک طرف بھاگا۔

سونے کے ایک ٹکڑے نے دو انسانوں کی جان لے لی اور پیچھے رہنے والوں کے لیے عبرت کا سامان کر گیا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس عبرت انگیز واقعے کے بعد بعض لوگوں نے اپنے فالتو زیور بیچ کر اُن کی رقم غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دی تھی۔

اس نقب زن کا واقعہ جو پہرے داری کے ساتھ خود بھی سو گئے

نقیب

چند روز قبل ایک ممتاز سیاست دان نے نجی گفتگو کے دوران کہا کہ ہمارے ملک کی سیاست میں شرافت نہیں چل سکتی۔ اس بات میں کتنی سچائی ہے، اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں، لیکن اُس کی بات سُن کر مجھے ایک پرانا واقعہ یاد آ گیا۔

اُن دنوں میں ایک چھوٹے سے قصبے میں تعینات تھا۔ اُس قصبے میں ایک ایسا جاگیردار بھی رہتا تھا، جس کا مقامی سیاست میں خاصا عمل دخل تھا۔ اُس کا نام ہم چودھری نظام دین فرض کر لیتے ہیں۔ اُسے انتخاب میں حصّہ لینے یا عہدہ حاصل کرنے کا شوق نہیں تھا، تاہم اُس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ سیاسی اور بلدیاتی اداروں میں اُس کے زیادہ سے زیادہ آدمی کرسیاں حاصل کریں۔ وہ دھونس، دھاندلی اور جوڑ توڑ میں خاصا ماہر تھا۔ دھونس اور دھاندلی کے لیے وہ ناپسندیدہ عناصر سے کام لیتا تھا۔

نورا لوہار بھی انھی لوگوں میں سے تھا۔ اُس کا اپنے علاقے میں بڑا دبدبہ تھا اور چھوٹے موٹے دُکانداروں سے باقاعدہ بھتّا وصول کرتا تھا۔ مجھے اُس علاقے میں ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ ایک شام ایک ادھیڑ عمر شخص تھانے میں آیا اور بہ آوازِ بلند داد فریاد کرنے لگا۔ میں اپنے کمرے سے باہر نکلا اور شخص مذکور سے پوچھا کہ اُس پر کیا آفت نازل ہوئی ہے؟

اُس نے اپنا نام شاکر علی بتایا اور کہا اُس نے حال ہی میں پرچون کی دُکان کھولی تھی۔ کچھ دیر پہلے اُس کی دُکان پر ایک نوجوان آیا اور کچھ سامان خریدا۔ اس میں چاول، گھی، گُڑ اور کچھ دیگر چیزیں شامل تھیں۔

شاکر علی نے اُس کی مرضی کے مطابق تمام چیزیں تول کر لفافوں میں ڈال دیں۔ نوجوان نے وہ اشیا کپڑے کے ایک تھیلے میں ڈالیں اور قیمت ادا کیے بغیر چل دیا۔ شاکر علی نے اُسے آواز دی اور کہا: "میاں، پیسے تو دیتے جاؤ۔"

"پیسے بھی مل جائیں گے۔" نوجوان نے رُکے بغیر کہا: "میرا لوہا ہے۔ بازار کے سب لوگ مجھے جانتے ہیں۔"

شاکر علی دُکانداری چھوڑ کر نوجوان کے پیچھے لپکا اور اُس کا راستہ روکتے ہوئے بولا: "میں اُدھار کا کاروبار نہیں کرتا۔ اگر پیسے نہیں ہیں تو سامان رکھ دو۔"

نوجوان نے اُسے ایک طرف دھکّا دیا اور چلتا رہا۔ شاکر علی نے دوبارہ اُس کا راستہ روکا۔ اس مرتبہ نوجوان نے اُس کے مُنہ پر اُلٹے ہاتھ کا تھپّڑ مارا مگر رُکا نہیں۔ شاکر علی نے بازار میں کھڑے ہو کر شور مچایا، مگر کوئی شخص مدد کو نہ آیا۔ تب وہ دُکان بند کر کے تھانے پہنچ گیا۔

میں نے اُسے تسلّی دی اور ایک حوالدار کو بُلایا جو کافی عرصے سے تھانے میں کام کر رہا تھا۔

"یہ نورا لوہار کون ہے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

حوالدار نے کان کے پیچھے کھُجلایا اور قدرے تامّل کرتے بولا: "یونہی پھنّے خان قسم کا آدمی ہے۔ اکڑ، شکّر دکھانے کا بڑا شوقین ہے۔"

"تم لوگوں نے اس کے خلاف کارروائی کیوں نہیں کی؟"

"کارروائی تو جناب جُرم پر کی جاتی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ حوالدار پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے غصّے سے کہا: "ایک آدمی ساتھ لے جاؤ اور اُسے فوراً تھانے حاضر کرو۔ میں بھی تو اس کی صورت دیکھوں۔"

حوالدار نے ایک بار پھر تامّل کیا، بولا: "اگر آپ اجازت دیں تو میں اُدھر ہی تصفیہ کروا دوں!"

"تمھاری کیا رشتے داری ہے اُس کے ساتھ؟"

"جناب... رشتے داری تو کوئی نہیں ہے۔"

"تو جاؤ پھر، جو میں نے کہا ہے، وہی کرو۔"

حوالدار سلام کر کے رُخصت ہو گیا۔ میں نے شاکر علی کو اپنے کمرے میں بٹھا لیا۔

تقریباً پونے گھنٹے کے بعد ایک قوی الجثّہ اور طویل القامت نوجوان جھومتا جھامتا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور گلے میں ریشمی مفلر ڈالا ہوا تھا۔





اُس کے گھونگریالے بال پیشانی پر پھیلے ہوئے تھے۔ خاصے ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ قد سوا چھ فٹ کے لگ بھگ تھا۔

"السلام علیکم، سرکار۔ ۔ ۔" اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی کے سامنے کیے اور سر کو خم کیا۔ "نوکر حاضر ہے جناب"

حوالدار اُس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ "ملک صاحب، یہ نورا لوہار ہے"

میں نے سر سے پیر تک اُس کا جائزہ لیا۔ اُس کے چہرے پر کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔ اُس کا رنگ سانولا اور جلد بھینسے کی طرح سخت تھی۔ یعنی معمولی پھینٹی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "سنا ہے تم بڑے بدمعاش بنے پھرتے ہو۔ شریف لوگوں کو تنگ کرتے ہو"

"کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے، سرکار" اُس نے بہ ظاہر عاجزی سے کہا۔ لیکن اُس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔ "میں شریف آدمی ہوں، جی۔ سارا محلہ میری شرافت کی گواہی دے سکتا ہے"

میں نے شاکر علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے اس شریف آدمی کی دُکان سے سودا لیا اور جب اس نے پیسے مانگے تو تم نے اس کو مارا اور دھکے دیے"

"یہ جھوٹ ہے، سرکار! یہ شخص میرے باپ کے برابر ہے۔ میں اسے کیسے ہاتھ لگا سکتا ہوں۔ ہاں، پیسے میں نے واقعی نہیں دیے۔ دراصل ۔ ۔ ۔"

"پیسے کیوں نہیں دیے؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "کیا تم اپنے باپ کی دُکان سمجھ کر مال لے گئے تھے؟"

"دراصل اُس وقت میری جیب میں پیسے نہیں تھے" اُس کے ہونٹوں پر بدستور شیطانی مسکراہٹ تھی۔ "یہ بات مجھے سامان تُلوانے کے بعد معلوم ہوئی تھی۔ میں نے چاچا سے کہا بھی کہ گھر سے پیسے لاکر دے جاتا ہوں، مگر اس نے میرا گریبان پکڑ لیا اور گالیاں دینے لگا"

"اوئے، کوئی خدا کا خوف کر" شاکر علی نے اُس سے کہا۔ "جھوٹ نہ بول، ایک دن اللہ کو جان دینی ہے"

"چاچا، جان تو تم نے بھی اللہ کو دینی ہے" نورے نے ڈھٹائی سے کہا۔ پھر جیب سے پیسے نکال کر شاکر علی کی طرف بڑھاتے، بولا۔ "لو، اپنے پیسے لے لو۔ اگر کچھ جرمانہ چاہیے تو وہ بھی لے لو۔ میں شریف آدمی ہوں۔ میں نے تمھیں کہا بھی تھا کہ تھوڑی دیر میں پیسے بھجوا دیتا ہوں، مگر تم مانتے ہی نہیں"

شاکر علی نے پیسے لے لیے، پھر بولا۔ "جناب، اس نے مجھے دھکے دیے تھے اور مارا بھی تھا"

"کیوں بھئی! تم نے اسے مارا کیوں تھا؟" میں نے پوچھا۔

وہ آدمی ہوشیار تھا، بولا۔ "سرکار، یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس نے میرا گریبان پکڑ لیا تھا اور میں نے اسے ہلکا سا دھکا دیا تھا اگر آپ کو میری بات پر یقین نہ ہو تو بے شک اس کا ڈاکٹری معائنہ کروالیں۔ بندہ مارے تو کسی تگڑے کو مارے۔ اس بیمار کو کیا مارنا"

"دیکھ اوئے نورے! آج تو میں تمھیں چھوڑتا ہوں" میں نے کہا۔ "آئندہ اگر مجھے اس بات کی شکایت ملی کہ تم نے کسی دکان سے قیمت ادا کیے بغیر سامان اُٹھایا ہے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ سمجھے؟"

"بہت بہتر، سرکار!" اُس نے جواب دیا اور شاکر کو گھورتا ہوا رخصت ہوگیا۔

*

اگلے روز ایک شخص، جس نے سیاہ شیروانی اور طرّے دار پگڑی پہن رکھی تھی، بڑے کروفر سے تھانے میں داخل ہوا۔ اس کی گھنی مونچھوں میں سفیدی جھلک رہی تھی اور کندھے پر رومال لٹک رہا تھا۔ اُس کے ساتھ تین یا چار مصاحب بھی تھے جن کو اُس نے باہر روک دیا اور ایک خاص انداز سے چلتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی چال میں تکبر اور تحکم پایا جاتا تھا۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اُس شخص کو ناپسند کرنا شروع کر دیا۔

"آپ شاید اس تھانے میں نئے آئے ہیں!" اُس نے رسمی کلمات کے بغیر کہا۔ "کیا نام ہے آپ کا؟"

میں نے اُس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اس تھانے میں نیا ہوں، کام میں نیا نہیں۔ کیا آپ کوئی رپورٹ درج کرانا چاہتے ہیں؟"

"شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں"

میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "پہچان، پہچان کروانے سے ہوتی ہے۔ آپ کام کی بات کریں"

"میں ۔ ۔ ۔ چودھری نظام دین ہوں" اُس نے تیوری چڑھالی۔ "میرے علاقے میں جو بھی نیا تھانیدار آتا ہے، وہ مجھے سلام کرنے ضرور آتا ہے"

"سلام کرنا سنّت رسول اور نیک کام ہے" میں نے کہا۔ "کہتے ہیں کہ جو شخص کسی کے گھر یا دفتر میں داخل ہو، سلام کرنا اس پر واجب ہوتا ہے"

وہ میری اس بات پر تلملا کر رہ گیا۔

میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "مجھے ملک محمد حیات کہتے ہیں۔ اگر کبھی ضرورت پڑی تو میں آپ کے پاس ضرور آ جاؤں گا"

"میں نے سنا ہے کہ آپ نے کل ایک بے گناہ شخص کو تھانے بلاکر ڈرایا دھمکایا تھا" وہ اصل بات کی طرف آگیا۔

میں اُس کا اشارہ سمجھ گیا۔ میں نے کہا۔ "جس شخص نے آپ کو یہ خبر دی ہے اُس نے جھوٹ بولا ہے۔ میں یہاں غریبوں اور کمزوروں کو لُوٹنے نہیں، اُن کی حفاظت کرنے آیا ہوں"

وہ غصّے سے بولا۔ "ملک صاحب، یہاں وہی تھانیدار رہتا ہے جسے ہماری خوشنودی حاصل ہوتی ہے"

"اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں یہاں آکر خوش ہوا ہوں تو آپ کا اندازہ ٹھیک نہیں ہے۔ اور جہاں تک خوشنودی کی بات ہے تو مجھے اپنے افسروں کی خوشنودی حاصل ہے۔ مجھے اور کی خوشنودی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے"

وہ کھل کر سامنے آگیا، بولا۔ "نور دین میرا آدمی ہے"

"غالباً آپ نورے لوہار کی بات کر رہے ہیں" میں نے کہا۔ "وہ ایک غریب پرچون فروش کی دُکان سے بغیر پیسے دیے سودا لے کر چلتا بنا تھا۔ صرف یہی نہیں، اُس نے پیسوں کے مطالبے پر پرچون فروش کو مار پیٹا بھی تھا۔ میں نے اُسے تنبیہ کے بعد چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ آپ کا آدمی ہے تو اُسے سمجھائیں، اُس کی حرکتوں سے آپ کی پوزیشن خراب ہوگی"

"آپ اپنی پوزیشن کا خیال بھی رکھیں" چودھری نے کہا اور بہ سُرعت دفتر سے نکل گیا۔

چند روز کے بعد شاکر علی پرچون فروش کی دُکان میں آگ لگ گئی اور اُس غریب کی ہر شے جل کر راکھ ہوگئی۔ یہ بات واضح تھی کہ آگ نورے لوہار نے لگائی تھی۔ لیکن شاکر علی رپورٹ درج کروانے نہیں آیا۔ نہ ہی اُس نے کسی پر شک کا اظہار کیا۔ ہم کسی مدعی کے بغیر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ غالباً نورے لوہار نے شاکر علی کو دھمکی وغیرہ بھی دی تھی۔

میں نے شاکر علی کو پیغام بھیجا کہ وہ بغیر کسی ڈر خوف کے آتشزدگی کی رپورٹ درج کروا دے۔ ہم اُس کی پوری مدد کریں گے۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ وہ نورے لوہار کی دھمکی سے سخت خائف تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ آگ اتفاقاً لگ گئی تھی۔ اُسے کسی پر شک نہیں ہے۔

●

نورے لوہار کی زیادتیوں کی خبریں ہمیں وقتاً فوقتاً ملتی رہتی تھیں، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کوئی شخص مدعی بننے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اُسے چودھری نظام دین کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ایک بات مجھے یہ بھی معلوم ہوئی کہ پولیس کے بعض

نچلے درجے کے اہلکار بھی نورے سے ملے ہوئے تھے۔ نورا جو بھتّا وصول کرتا تھا اُس میں یہ لوگ بھی شریک تھے۔

ان حالات میں کسی بدمعاش پر ہاتھ ڈالنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ ایسی پکڑ دھکڑ کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا جس میں کوئی مضبوط کیس نہ ہو۔ ملزم چار روز کے بعد ضمانت پر رہا ہو جاتا ہے اور دوبارہ دندناتا پھرتا ہے۔

میں نے نورے پر نظر رکھی ہوئی تھی اور کسی مضبوط کیس میں اُسے قابو کرنا چاہتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد لوکل باڈیز کے انتخابات کا اعلان ہوا اور امیدواروں نے انتخابی مہم شروع کر دی۔

جس قصبے کی میں بات کر رہا ہوں اُس میں کل تین امیدوار تھے۔ پہلا امیدوار نورا لوہار تھا۔ اُس نے جو پوسٹر وغیرہ چھپوائے اُس میں نورا ز ورداد قسم کا نام لکھا۔ کسی نے اُسے صلاح دی کہ بھٹی ذات اور لوہار کی بھٹی میں کوئی خاص فرق نہیں، اس لیے اُسے خود کو لوہار کے بجائے بھٹی لکھنا چاہیے۔ لہٰذا وہ نورا لوہار سے نور دین بھٹی ہو گیا۔

دوسرا امیدوار ایک چھوٹا زمیندار تھا اور زیادہ پاپولر نہیں تھا۔ اُس کے بارے میں یہ افواہ تھی کہ وہ درپردہ چودھری نظام دین سے ملا ہوا تھا۔ تیسرا امیدوار ایک ڈاکٹر تھا۔ اُس کا نام بشارت علی تھا۔ وہ کوالیفائیڈ ڈاکٹر نہیں تھا بلکہ صرف میڈیکل پریکٹیشنر تھا اور سات آٹھ سال سے عوام کی خدمت کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں اللہ نے شفا رکھی تھی۔

چھتیس سینتیس سالہ ڈاکٹر بشارت علی خوش اخلاق اور نرم مزاج شخص تھا۔ قصبے کا ہر شخص اُسے جانتا تھا اور پسند بھی کرتا تھا۔ اس لیے اُس کی کامیابی یقینی تھی۔

چودھری نظام دین کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اُس نے ڈاکٹر بشارت علی کے پاس اپنا آدمی بھیجا اور اُسے مشورہ دیا کہ وہ انتخابات سے دستبردار ہو جائے۔ لیکن بشارت علی نے مشورہ ماننے سے انکار کر دیا۔

چودھری نے اندازہ لگایا کہ معمولی ڈاکٹر ہے۔ اُسے پیسوں کا لالچ ہو گا۔ لہٰذا اُس نے ڈاکٹر کو اپنی حویلی میں بلایا اور مختلف قسم کے لالچ دیے، مگر کامیاب نہ ہوا۔ بشارت علی نے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا۔

اس کے دو روز بعد چودھری کے چند آدمی تھانے میں آئے اور کہا کہ بشارت علی کے آدمیوں نے نورے کے نہتے اور پُرامن کارکنوں کو مارا پیٹا ہے۔ لہٰذا اُن کے خلاف رپورٹ لکھی جائے۔ اُنھوں نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ چودھری نظام دین کے آدمی تھے۔ جو شخص اُن کی ترجمانی کر رہا تھا اُس کا نام غالباً خواجہ مہر دین تھا۔ میں نے اس شخص سے پوچھا کہ جن پُرامن کارکنوں کو مارا پیٹا گیا ہے، وہ کہاں ہیں؟

"وہ لوگ... مرہم پٹی کروانے گئے ہیں؟" اُس نے جواب دیا۔ لیکن اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ "آپ اپنا کوئی آدمی ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ وہ موقع دیکھ لے۔"

میں نے ٹوپی اُٹھائی اور کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "میں خود تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"جناب! آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔" ایک شخص نے کہا۔ "یہ کوئی اتنا بڑا معاملہ تو ہے نہیں۔"

"میری ڈیوٹی کے بارے میں تم زیادہ جانتے ہو یا میں جانتا ہوں؟" میں نے اُسے گھورا۔

"آپ لوگ ذرا صبر کریں۔ خواجے نے دونوں ہاتھوں سے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوا اور دھیمی آواز میں بولا۔ "ملک صاحب، یہ سیاسی رپورٹ ہے۔ مار ماری دونوں طرف ہوئی ہے۔ لیکن کوئی خاص نقصان نہیں ہوا۔ ہم مخالف پارٹی پر دباؤ رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ رپورٹ درج کر لیں، کارروائی بے شک نہ کریں۔" اس نے اپنی جیب میں ہاتھ مارا۔ "ہم گئے گزرے لوگ نہیں ہیں کہ آپ کی خدمت نہ کر سکیں۔ جیتنا تو بھٹی صاحب نے ہی ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے نورے لوہار نے؟"

"اوجی، لوگ تو خواہ مخواہ نام بگاڑ دیتے ہیں۔" اُس نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور انگلیوں میں دبا کر مجھے دینا چاہے۔ "یہ بھٹی صاحب نے کچھ نذرانہ بھیجا ہے۔"

"یہ تھانہ ہے، اگر تم نے حد سے گزرنے کی کوشش کی تو میں تمھارا دماغ درست کر دوں گا۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "یہاں نذرانے نہیں وصول کیے جاتے۔"

اُس نے پیسے جیب میں رکھ لیے اور بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "جیسے آپ کی مرضی جناب! پھر تو رپورٹ لکھوانا بھی بے کار ہی ہے۔"

اُس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔

چند روز کے بعد ایک افسوسناک واقعہ میرے علم میں آیا۔ اس واقعے کی بیشتر تفاصیل مجھے بعد میں معلوم ہوئیں۔ میں اُنھیں یک جا کر کے یہ واقعہ آپ کو سُناتا ہوں۔

اس واقعے کا تعلق ڈاکٹر بشارت علی اور اُس کی بیوی عذرا بشارت سے ہے۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ بشارت علی ایک خوش اخلاق اور نامی قسم کا شخص تھا، اور انتخاب میں اُس کی کامیابی کا خاصا امکان تھا۔ چودھری نظام دین اُسے خریدنے کی کوشش کے باوجود ناکام رہا تھا۔ لہٰذا اُسے راستے سے ہٹانے کا ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا۔ اور وہ تھا دھونس کے ذریعے۔

بشارت علی کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی اور اُس کا بچہ کوئی نہیں تھا۔ اُس کی بیوی عذرا ایک غریب گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکی تھی اور چار ماہ کی حاملہ تھی۔

ہفتے کے روز رات کے نو بجے بشارت علی اپنی ڈسپنسری سے گھر کے لیے روانہ ہوا تو اُسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اُس کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔

وہ اکتوبر کے آخری ایام تھے اور راتوں کو خاصی ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ سردی کی وجہ سے قصبے کی گلیاں اور بازار سنسان پڑے تھے۔ یوں بھی اُس زمانے میں چھوٹے علاقوں کے لوگ جلدی سو جاتے تھے۔

جب بشارت علی گھر کے سامنے پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ بیرونی دروازہ کھلا پڑا تھا اور اندر غیر معمولی خاموشی تھی۔ وہ فکرمند ہوا اور بیوی کو آواز دیتا ہوا اندر داخل ہوا۔ جیسے ہی اُس نے تاریک کمرے میں قدم رکھا کمرے کی بتی جل اُٹھی اور نصف درجن افراد، جنھوں نے اپنے چہروں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے، اُس کے گرد جمع ہو گئے۔

یہ صورت حال دیکھ کر بشارت علی کے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک شریف آدمی تھا اور اس صورت حال سے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ اسے سب سے پہلے اپنی بیوی کا خیال آیا۔ تب اُس نے دیکھا کہ [illegible] ایک کونے میں سہمی کھڑی تھی اور دہشت سے اُس کا بُرا حال تھا۔

"تت... تم لوگ [illegible]" بشارت نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "اور... [illegible] کیا چاہتے ہو؟"

ان میں سے ایک شخص نے، جو خاصا لحیم شحیم تھا، بشارت کو گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور بولا۔ "ہم ناچ دیکھنے آئے ہیں۔"

"نن... ناچ! لیکن... یہاں تو کوئی ناچنے والا نہیں ہے۔ تم لوگ غلط جگہ پر آ گئے ہو۔ مم... میں ڈاکٹر بشارت علی ہوں۔ اگر تم کو پیسوں کی ضرورت ہو تو..."

لحیم شحیم شخص نے بشارت کو دوسری طرف دھکیل دیا اور بولا۔ "ہم ناچ دیکھیں گے ناچ۔ تم دونوں میں سے کون ناچے گا، تم یا تمھاری بیوی؟"

ایک شخص نے بشارت علی کی سہمی ہوئی بیوی کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا اور اُسے بھی اپنے گھیرے میں لے آیا۔

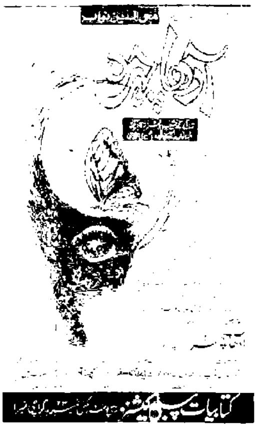
عذرا دہشت سے تھرتھر کانپ رہی تھی۔ وہ کبھی ایک شخص کو دیکھتی تھی اور کبھی دوسرے کو۔

"جلدی بولو کون ناچے گا؟" لحیم شحیم شخص نے پوچھا۔

"مم... میری بیوی کو کچھ مت کہو۔" بشارت علی نے کہا۔ "یہ... یہ امید سے ہے۔ اسے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ میں ناچنے کے لیے تیار ہوں۔"

ایک شخص نے اُس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا میڈیکل بیگ چھین کر ایک طرف پھینک دیا اور بولا۔ "کپڑے اُتار۔ ہم ننگا ناچ دیکھنے آئے ہیں۔"

بشارت علی پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ ایک عزت دار شخص تھا۔ اتنے لوگوں کے سامنے برہنہ ہونا اُس کے لیے موت کے مترادف تھا۔ اُس نے عاجزی سے منت کرتے ہوئے کہا۔ "میں ایک شریف اور عزت دار آدمی ہوں۔ میرے ساتھ یہ سلوک مت کرو۔ تم... میری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں ہے۔ آخر... تم



لوگ میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کر رہے ہو؟"

لیم شیم شخص نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "اگر تم نہیں ناچو گے تو تمہاری بیوی ناچے گی۔" پھر اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ "اتارو، اس عورت کے کپڑے۔"

وہ لوگ اس مذموم حرکت پر تلے بیٹھے تھے۔

عذرا کے بدن سے دہشت کے باعث ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا تھا اور اُس پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی وقت بھی گر پڑے گی۔

بشارت علی نے بیوی کی حالت سے پریشان ہو کر کپڑے اتارنا شروع کر دیے۔

اُس کے بعد جو کچھ ہوا تہذیب اُس کے بیان کی اجازت نہیں دیتی۔

یہ بات بڑی واضح تھی کہ لیم شیم شخص نورا لوہار تھا۔ بشارت علی نے اُسے پہچان لیا تھا اور اپنے ایک قریبی دوست کو بعد میں اس کے بارے میں بتایا بھی تھا۔

نورے لوہار اور اُس کے ساتھیوں نے بشارت علی کو اُس کی بیوی کے سامنے ذلیل کیا اور آخر میں اُسے برہنہ حالت میں گھسیٹ کر گلی میں لے گئے۔

بشارت علی برہنہ حالت کے باعث اپنی مدد کے لیے شور بھی نہیں مچا سکتا تھا۔ نورے نے اُسے گلی میں لے جا کر کہا۔ "بشارت علی، سیاست تمہارے جیسے شریف آدمیوں کا کھیل نہیں ہے۔ اگر باز نہیں آؤ گے تو اگلی دفعہ تمہیں اپنی بیوی کا ناچ دیکھنا پڑے گا۔"

اس کے بعد یہ شیطانوں کا ٹولا قہقہے لگاتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ بشارت علی سردی اور احساسِ ذلت سے کانپتا ہوا اندر پہنچا۔ شور کی آواز سن کر کچھ لوگ گلی میں نکل آئے تھے اور صورتِ حال جاننے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ بشارت علی نے جلدی سے کپڑے پہنے اور اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا جو ٹھنڈے فرش پہ بے ہوش پڑی تھی۔ اُس نے عذرا کو اٹھا کر بستر پر لٹایا اور اسے ضروری طبی امداد دینے لگا۔

گلی میں نکل آنے والے پڑوسیوں نے اُس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ جلدی سے دروازے پر پہنچا اور لوگوں کے استفسار پر صرف اتنا کہا کہ اُس کی بیوی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اور کوئی بات نہیں تھی۔

بشارت علی کی پوری کوشش کے باوجود عذرا کی حالت نہیں سنبھل سکی اور اُس نے چوبیس گھنٹے کے بعد دم توڑ دیا۔

وہ سراسر قتل کی واردات تھی۔ لیکن بشارت علی نے رپورٹ درج نہیں کروائی۔ وہ اُس تذلیل کے باعث، جو اُسے نورے اور اُس کے ساتھیوں کے ہاتھوں برداشت کرنا پڑی تھی۔ ایسا دل برداشتہ ہوا کہ کئی روز تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ پھر انتخابات سے چند ہفتے قبل وہ خاموشی سے قصبہ چھوڑ کر چلا گیا۔

مجھے اُس کے جانے کے بعد حقیقت معلوم ہوئی۔ ورنہ میں نورے کے خلاف ضرور قانونی کارروائی کرتا۔

*

بشارت علی کے جانے کے بعد دوسرے یا تیسرے ... چودھری نظام دین کی حویلی میں چوری ہو گئی۔

صبح صبح دو آدمی تھانے پہنچے اور چوری کی اطلاع دی۔ اُس وقت تھانے میں رات کی ڈیوٹی والا عملہ چھٹی کی تیاری کر رہا تھا۔ حوالدار نے روزنامچے میں چوری کی رپورٹ درج کر لی اور دو آدمی حویلی روانہ کر دیے۔ میں تقریباً آٹھ بجے تھانے پہنچا اور ضروری کام نمٹانے کے بعد ایک اے ایس آئی کے ہمراہ حویلی پہنچ گیا۔

چودھری نظام دین بہت غصے میں تھا اور نوکروں پر برس رہا تھا۔ میں نے اُسے سلام کیا اور چوری کی تفصیل دریافت کی۔

"ملک صاحب! دس بارہ سال کے عرصے کے دوران یہ اس حویلی میں پہلی چوری ہوئی ہے۔" اُس نے بڑے جارحانہ لہجے میں کہا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اُس چوری کا میں ذمے دار تھا۔ "میں نے ایس پی علاقہ اور آئی جی کو بھی اس واردات کی اطلاع بھجوا دی ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں جہاں چوری ہوئی ہے۔"

"یہاں کئی تھانیدار آئے اور کئی گئے۔" وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن کبھی کسی نے حویلی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ لیکن آپ کے آنے کے چند ماہ بعد ہی چوری ہو گئی۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چوری میں نے کروائی ہے؟" میں نے اپنی آواز میں تھوڑی سی تیزابیت گھولتے ہوئے پوچھا۔ "یا میری نااہلی کی وجہ سے چوری ہوئی ہے؟"

"اس بات کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔ مگر آپ کو یہ بات ضرور یاد ہو گی کہ آپ نے یہاں آتے ہی سب سے پہلے میرے ساتھ اپنے تعلقات خراب کیے تھے۔ لہٰذا میں یہ سوچ سکتا ہوں کہ یہ چوری اُس واقعے کی ایک کڑی ہو سکتی ہے۔"

"پھر آپ نے مجھے عبث یہاں بلایا۔" میں نے غصے سے کہا۔ "جہاں تک تعلقات کی خرابی کا تعلق ہے تو اُس میں

ں اور نورے لوہار کی زیادہ مہربانی شامل ہے۔ جانے سے یں آپ کو ایک بات ضرور کہنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ نورا شرفاء کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اُس سے آپ بے خبر ہوں گے۔ چونکہ وہ آپ کی پشت پناہی حاصل ہونے کی ے یہ سب کچھ کر رہا ہے، اس لیے آپ اُس کے ظلم سے نہیں ہیں۔ وہ قانون کی گرفت میں آئے یا نہ آئے، مگر وہ اپنی ں کے بدانجام سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔"

میری باتیں سن کر وہ چپ سا ہو گیا۔ پھر قدرے توقف ہ بولا۔ "میرا خیال ہے کہ میں آپ کو سمجھ نہیں سکا۔ آپ تلف قسم کے تھانیدار معلوم ہوتے ہیں۔"

پتا نہیں یہ بات اُس نے میری تعریف میں کہی تھی یا پنی اُلجھن کا اظہار کیا تھا۔

"آئیں میرے ساتھ۔" اُس نے مزید کہا۔ "وہ کمرا دیکھ ں میں چوری ہوئی ہے۔"

میں نے دیکھا، اُس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تلخی میں کوئی ی واقع نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال، میں اُس کے ہمراہ ایک ے میں پہنچ گیا۔ وہ ایک قسم کا اسٹور تھا۔ اُس میں رکھے چند صندوق کھلے پڑے تھے۔ اُن کے تالے ٹوٹے تھے۔ بیرونی دیوار میں تقریباً دو فٹ قطر کا ایک رخنہ نظر چور نقب لگا کر اندر داخل ہوا تھا اور اپنا کام مکمل کر تان سے واپس چلا گیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اُس م از کم ایک گھنٹا ضرور لگا ہوگا۔ وہ کسی ماہرِ فن کا کام تھا۔ دوسری بات میرے ذہن میں یہ آئی کہ نقب گھر کے بھیدی کا تعاون حاصل تھا۔ کیونکہ اُس نے کمرے میں نقب لگائی تھی جس میں قیمتی سامان موجود تھا۔

میں نے چودھری سے پوچھا۔ "چوری کیا کچھ ہوا ہے؟"

"زیور اور نقدی۔" اُس نے جواب دیا۔ "چور نے کسی دوسری نہیں لگایا۔"

میں نے صندوقوں سے نکلے ہوئے سامان پر نظر ڈالی۔ ن بکھرا ہوا نہیں تھا، رکھا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا یہ اسی طرح پڑا ہوا تھا یا کسی نے ان چیزوں کو سمیٹ کر

"نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ صبح میری بیٹی کسی کام ئی اور دیوار میں سیندھ لگی دیکھ کر اُس نے شور مچا دیا۔ نے اندر آ کر ان کھلے ہوئے صندوقوں کا جائزہ لیا کر زیورات کے ڈبے اور نقدی غائب ہے۔ اُس ادھر اُدھر نہیں کیا۔ جو چیز جہاں تھی وہیں رہنے دی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ چور نے بڑے اعتماد سے واردات کی ہے۔ یعنی اُس نے افراتفری میں کوئی کام نہیں کیا۔" میں چودھری کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور ہولے سے کہا۔ "مجھے یہ کسی گھر کے بھیدی کا کام لگتا ہے۔ آپ کا اپنے ملازموں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ہیں تو سب بھروسے کے آدمی۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ کمین لوگ ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی کی نیت خراب ہو گئی ہو۔"

میں نے اسٹور کا دروازہ بند کر دیا اور پچھلی طرف، جہاں دیوار میں نقب لگائی گئی تھی، ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دی۔

پھر میں چودھری کے ہمراہ بیٹھک میں جا بیٹھا اور غیر ضروری افراد کو باہر بھیجنے کے بعد پوچھا۔ "آپ نے حال ہی میں کسی ملازم کو نوکری سے جواب تو نہیں دیا، یا سزا وغیرہ تو نہیں دی؟"

"ہم ملازموں کو نوکری سے جواب نہیں دیتے، سیدھا کر کے رکھتے ہیں۔" اُس نے جواب دیا۔ "چند روز پہلے میں نے ایک ملازم کو چغلی کرنے پر کچھ چھینٹی شینٹی لگائی تھی۔ لیکن یہ کام تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس بات سے کسی کو اتنی بڑی جراءت نہیں ہو سکتی۔"

"چودھری صاحب! نقب لگ چکی ہے۔" میں نے صورتِ حال کو منطقی انداز میں واضح کیا۔ "جس نے جراءت کرنا تھی وہ کر چکا ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون مائی کا لال ہے جس نے یہ جراءت کی۔ آپ کو ذاتی طور پر کسی پر شک تو نہیں؟"

میں نے دیکھا میری باتوں سے اُس کے چہرے کی تلخی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے میرے بارے میں جو رائے قائم کی تھی وہ واضح طور پر تبدیل ہو رہی تھی۔

"شک تو پھر سب پر ہی کیا جا سکتا ہے۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے ملازموں سے تھوڑی سی پوچھ گچھ کر لیں۔"

اُس نے بغیر کسی تامل کے اجازت دے دی۔

جس ملازم کو اُس نے چند روز پہلے چھینٹی لگائی تھی، اُس کا نام جیونا تھا۔ وہ پچیس چھبیس سال کا خاصا مضبوط جوان تھا۔ جب میں نے اُس سے پوچھ گچھ شروع کی تو اُس نے جواب دینے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

میں نے باقی ملازموں کو اے ایس آئی کے سپرد کیا اور جیونے کو چودھری کی اجازت سے تھانے لے گیا۔

"سرکار! میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔" اُس نے میرے استفسار پر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "اُدھر میں چودھری ہوراں کے ڈر سے کھل کر گل نہیں کر سکتا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔" میں نے کہا۔ "یہاں کھُل کر ساری گل بات کرو۔ جھوٹ بولو گے تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ چودھری نے تمہیں مارا کیوں تھا؟"

اُس نے جواب دیا۔ "سرکار! اس بات کے بتانے پر ہی تو پھینٹی پڑی تھی۔ آپ کو بتاؤں گا تو پھر پھینٹی پڑے گی۔"

"تم تسلی رکھو۔ میں چودھری کو یہ بات نہیں بتاؤں گا۔"

میرے اطمینان دلانے پر اُس نے جو قصہ سُنایا اُس کا تعلق نورے لوہار سے تھا۔

اُس نے بتایا کہ چند روز پہلے صدیق نامی ایک شخص چودھری کے پاس آیا اور نورے لوہار کی شکایت کی۔

صدیق ایک چھوٹے سے ہوٹل کا مالک تھا اور ادھیڑ عمر کا ایک وضعدار شخص تھا۔ اُس نے چودھری کو بتایا کہ گزشتہ روز نورا لوہار تین افراد کے ہمراہ اُس کے ہوٹل میں آیا اور کھانا منگوا کر کھایا۔ کھانے کے بعد وہ پیسے دیے بغیر اُٹھ کر جانے لگا۔

ہوٹل کے بیرے نے اُس سے پیسے مانگے تو اُس نے اُس کے مُنہ پر زور سے تھپڑ مارا اور اُس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کھانے کی ٹرے گرادی۔ بیرا نورے کی اصلیت نہیں جانتا تھا۔ اُس نے اُس کا گریبان پکڑ لیا اور جوابی تھپڑ مار دیا۔ اُس پر نورے اور اُس کے ساتھیوں نے بیرے کو بُری طرح مارا اور ہوٹل میں خوب توڑ پھوڑ مچائی۔ آخر میں نورے نے بیرے کی گردن پر پیر رکھا اور اسے مجبور کیا کہ وہ فرش پر گرا ہوا کھانا جانوروں کی طرح مُنہ سے کھائے۔

جیونے نے مجھے بتایا کہ یہ بات سُن کر چودھری نے صدیق کو کچھ پیسے دیے اور کہا۔ "وہ نورا لوہار کتا ہے، کتا! میں نے اُسے کتا سمجھ کر پالا ہوا ہے اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ کتا مالک کے مہمانوں پر بھی بھونکنے سے باز نہیں آتا۔ میں اُسے سمجھا دوں گا۔"

جیونا اُس وقت آس پاس ہی موجود تھا۔ اُس نے ساری بات سُنی اور سُن کر بہت خوش ہوا۔ کیونکہ وہ نورے لوہار کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس نے باہر جا کر لوگوں کو مزے لے لے کر یہ بات بتائی کہ چودھری نے نورے کو کتا سمجھ کر پالا ہوا ہے۔

یہ بات ہوتے ہوتے نورے کے کانوں تک جا پہنچی۔ اُس نے جیونے کو پکڑ کر مارا بھی اور پھر چودھری کے پاس کچھ مرچ مسالہ لگا کر شکایت بھی کر دی۔

چودھری نے پہلے تو نورے کو بلا کر ڈانٹا اور کہا۔ "اوئے تو بندے دا پتر بن جا۔ میں تجھے انتخاب میں جتانے کی فکر میں لگا ہوا ہوں اور تو شہدوں اور اُچکوں جیسی حرکتیں کرتا پھر رہا ہے۔ اپنے طور طریقے ٹھیک کر لے۔"

نورا انتہائی مکار شخص تھا۔ وہ چودھری کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا تھا۔ اُس نے چودھری کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

چودھری نے اُسے معاف کر دیا اور جیونے کی اُس کی موجودگی میں پھینٹی لگائی۔

جیونے کا بیان سُن کر میں نے سوچا، ہو سکتا ہے کہ نورے نے انتقامی کارروائی کے طور پر خود چوری کی ہو یا کسی عادی چور کے ذریعے واردات کروائی ہو۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ شام تک تھانے میں ہی بیٹھے۔

گیارہ بارہ بجے کے قریب دو اشخاص تھانے میں آئے۔ ایک معمر اور باریش شخص تھا اور چہرے مہرے سے نیک آدمی نظر آتا تھا۔ اُس نے میلے سے کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ اُس کے ساتھی کی عمر چالیس پینتالیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔

معمر شخص نے اپنا نام صاحب علی بتایا اور رسمی کلمات کے بعد بولا۔ "جناب، ہم کوئی رپورٹ درج کرانے نہیں آئے۔ ہمیں ایک جوتا ملا ہے، جو ہمارے خیال سے کسی چور کا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ کے گھر میں کوئی چور گھسا تھا جو آپ کے بیدار ہونے پر بھاگ گیا اور جوتا پیچھے چھوڑ گیا!"

"نہیں جی، یہ بات نہیں ہے۔"

میں نے اُس کے ہاتھ سے کپڑے میں لپٹا ہوا جوتا لیا اور کپڑا ہٹا کر اُس کا معائنہ کیا۔ وہ کافی استعمال شدہ پمپ شو تھا اور اس کی ایڑھی اور تلوا خاصا گھِسا ہوا تھا۔

"جی؟" میں نے صاحب علی کی طرف دیکھا۔ "اس جوتے کی کیا کہانی ہے؟"

"یہ میرے پڑوسی شریف صاحب ہیں۔" صاحب علی نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم روزانہ صبح کی اذان سے پہلے اُٹھ جاتے ہیں اور سیر کے لیے کھیتوں کی طرف جاتے ہیں۔ آج ہم سیر کے لیے نکلے تو ہم نے ایک شخص کو دیکھا جس نے چادر کی بُکل مار رکھی تھی، مشتبہ حالت میں ایک مکان سے نکلتے دیکھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ آدمی کچھ گھبرا سا گیا اور تیز تیز چلنے لگا۔ ہمیں اس پر شک ہوا۔ شریف صاحب نے اُسے آواز دی اور ہم تیزی سے اُس کی طرف بڑھے۔ اس پر وہ شخص تیزی سے ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ شریف صاحب اُس کے پیچھے بھاگے لیکن وہ بہت پھرتیلا شخص تھا۔ بندر کی طرح قلانچیں بھرتا ہوا ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن اُس کا یہ جوتا پیر سے نکل کر رہ گیا۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ جوتا اُسی شخص کے پیر سے نکلا تھا؟"

"ہم نے اپنی آنکھوں سے اسے گرتے دیکھا تھا۔"

"کیا آپ نے اُس گھر کے مالک سے بات کی جس گھر سے وہ مشتبہ شخص نکلا تھا؟"

"اُس وقت ہم نے گھر والوں کی نیند خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔" شریف نے جواب دیا۔ "لیکن جب نماز کے بعد ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو گھر کا مالک آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا اور آتے ہی ہمیں بے نقط سنانے لگا۔ کیونکہ بقول اُس کے ہم نے آدھی رات کے وقت اُس کی نیند خراب کر دی تھی۔"

"دراصل وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔" صاحب علی نے کہا۔ "ہمیں معلوم نہیں تھا، ورنہ ہم کبھی اُس کا دروازہ نہ کھٹکھٹاتے۔"

"اُس آدمی کا نام کیا ہے؟"

"نورا لوہار۔ آج کل وہ نوردین بھٹی بنا ہوا ہے۔ اگر انتخاب جیت گیا تو چودھری نوردین بھٹی بن جائے گا۔"

نورے لوہار کا نام سُن کر میں چونک گیا۔ میں نے دونوں حضرات کو رخصت کر دیا اور اے ایس آئی کو بلا کر ایک چھاپا مار پارٹی ترتیب دینے کو کہا۔ ایک مشتبہ آدمی کا نورے کے گھر سے نکلنا خالی از علت نہیں تھا۔

●

سہ پہر کے وقت ہم نے نورے کے مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور دروازے پر دستک دی۔

لمحہ بھر کے بعد ایک عورت نے دروازہ کھولا اور باہر پولیس دیکھ کر جلدی سے دروازہ بند کر کے واپس چلی گئی۔ چند لمحوں کے بعد نورا لوہار باہر آیا اور جھومتا جھامتا میری طرف بڑھا۔

"کیا بات ہے، ملک صاحب؟" اُس نے سلام کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔ "کیا ادھر کوئی واردات ہو گئی ہے؟"

میں نے اُسے مشتبہ شخص کا پمپ شو دکھایا اور پوچھا۔ "اس جوتے کو پہچانتے ہو؟"

اُس نے جھوٹ سکیڑیں۔ بولا۔ "کچھ جانا پہچانا لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کچھ معتبر لوگوں نے اس جوتے کے مالک کو آج صبح، اذان سے پہلے، تمہارے گھر سے مشتبہ حالت میں نکلتے دیکھا تھا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ آج صبح تمہارے گھر میں کیا کر رہا تھا؟"

"کسی نے خواب دیکھا ہوگا۔" اُس نے بے پروائی سے کہا۔ "صبح کے وقت ہمارے گھر کوئی نہیں آیا۔ ہاں۔۔۔ یاد آیا، صبح صبح دو نمازی آئے تھے۔ شاید کچھ وعظ و نصیحت کرتے۔"

"اور تم نے اُنھیں ذلیل کر کے بھگا دیا۔"

"اگر نیند کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں اُنھیں اچھی طرح سبق سکھا کر بھیجتا۔ آپ خود سوچیں، صبح صبح دروازہ پیٹنا کہاں کی شرافت ہے۔ نیند کا سارا مزہ خراب کر دیا۔۔۔"

"ہم تمہارے گھر کی تلاشی لینے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "عورتوں سے کہو کہ ایک طرف ہو جائیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ میں شریف آدمی ہوں۔ آپ کس قانون کے تحت میرے گھر کی تلاشی لینے آئے ہیں؟"

شور کی آواز سُن کر آس پاس رہنے والے گلی میں نکل آئے تھے۔ میں نے سختی سے کہا۔ "اگر شرافت سے اجازت نہیں دو گے تو ہمیں دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کچھ فاصلے پر کھڑے ایک نوجوان کو آواز دے کر کہا۔ "اوئے ٹیپلے، ذرا نٹھ کے جا، چودھری نظام دین کو بُلا لا۔"

میں نے اُسے گردن سے پکڑا اور دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ "چلو اندر، ہم تمہارے باپ کے نوکر نہیں ہیں۔ ہمارے پاس اور بھی بہت کام ہیں۔"

اُس نے گالی نکالی، گردن چھڑائی اور چار قدم پیچھے ہٹ کر تیزی سے کمانی دار چاقو نکال لیا، بولا۔ "اگر کوئی آگے آیا تو میں اُس کی انتڑیاں نکال دوں گا۔"

میں نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور ریوالور نکال لیا۔ سپاہیوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اُس نے ایک سپاہی پر چاقو سے وار کرنے کی کوشش کی۔ سپاہی پیچھے ہٹا تو وہ بڑک مار کر گھیرے سے نکلا۔ ایک سپاہی نے دوڑ کر پیچھے سے اُس کا گریبان پکڑا اور اُس کی کمر پر لات رسید کی۔ وہ چاقو کا وار کرنے کے لیے پلٹا۔ اے ایس آئی نے اُس کے چاقو والے ہاتھ پر رول سے شدید ضرب لگائی۔ اُس کے ساتھ ہی چاقو اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ سپاہی کے ساتھ لڑھکتا ہوا زمین پر گر گیا۔ اس کے بعد اُس پر قابو پانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اے ایس آئی نے اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔

ہم اُسے ساتھ لیے ہوئے اندر گئے اور عورتوں کو ایک طرف ہونے کا کہہ کر گھر کی تلاشی لینا شروع کی۔ وہ تین کمرے کا مکان تھا۔ تلاشی لینے میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوا۔ لیکن کوئی خاص چیز برآمد نہیں ہوئی۔ گھر میں ایک دو مرد اور بھی تھے لیکن

کوئی ہمارے کام میں مزاحم نہیں ہوا تھا۔ اُن میں نورے لوہار کا بوڑھا باپ بھی تھا۔

تلاشی تقریباً ختم ہوگئی۔ مجھے تھوڑا سا افسوس بھی ہوا کہ میں نے کارروائی کرنے میں عجلت سے کام لیا تھا پھر بھی میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہاں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔

اس ساری کارروائی کے دوران نورا گالیاں بکتا رہا اور ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا رہا۔ اُس ناکامی کے باوجود میں اُسے چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ چودھری نے اُسے کُتا کہا تھا۔ اور میرا اندازہ یہ تھا کہ اُس نے اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے چودھری کے گھر میں نقب لگوائی تھی۔ ابھی اُس جوتے کا مسئلہ حل ہونا باقی تھا جو اُس کے گھر سے نکلنے والے مشتبہ شخص کے پیر سے نکل کر گر گیا تھا۔

اُس وقت ہم اندرونی برآمدے میں کھڑے تھے اور دو آدمی باورچی خانے کی تلاشی لے کر باہر نکل رہے تھے۔ اُن میں ایک حوالدار اور ایک سپاہی تھا۔

حوالدار باورچی خانے کے دروازے میں رُک گیا اور مڑ کر تنقیدی نظروں سے ایک ایک چیز کو دیکھنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ ہم نے یہ اناج کی کوٹھی نہیں دیکھی۔“ اُس نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور اندر چلا گیا۔

اسی لمحے چودھری نظام دین اپنے چند مصاحبوں کے ہمراہ مکان میں داخل ہوا اور بے رُخی سے بولا۔ ”ملک صاحب، یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

میں نے اُسے مشتبہ شخص کا جوتا دکھایا اور مختصر الفاظ میں تفصیل بتائی۔ جوتا دیکھ کر اُس کے چہرے پر اُلجھن نظر آنے لگی۔ اُس نے جوتے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا۔ ”یہ جوتا تو میرے ہی کسی آدمی کا لگتا ہے۔ یہ میرا اُترا ہوا جوتا ہے۔ میری پرانی چیزیں نوکروں کے کام آجاتی ہیں۔“

ابھی وہ یہ بات کر ہی رہا تھا کہ حوالدار کی پُرجوش آواز سُنائی دی۔ ”ملک صاحب! ذرا اِدھر تشریف لائیں۔“

میں جلدی سے باورچی خانے میں پہنچا۔ چودھری نظام دین نے بھی میری تقلید کی۔ باورچی خانے کے کونے میں غلّہ رکھنے کی ایک کوٹھی بنی ہوئی تھی اور حوالدار اس کوٹھی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ اُس نے ہاتھ میں مخمل کا ایک ڈبا پکڑا ہوا تھا۔ اُس نے وہ ڈبا مجھے تھمایا اور کوٹھی کے اندر سے مزید ڈبے نکالنے لگا۔

چودھری نے چونک کر ڈبا میرے ہاتھ سے لیا، اُسے کھول کر دیکھا اور بولا۔ ”یہی ہے، یہی ہے۔ یہ ہمارا زیور ہے۔ یہ۔۔۔ یہاں کیسے پہنچا؟“

”واہ چودھری صاحب!“ میں نے کہا۔ ”بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ آپ کی حویلی میں نقب لگی ہے اور آپ پوچھ رہے ہیں کہ یہ زیور یہاں کیسے پہنچا۔“

چودھری کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ یہ کارستانی نورے کی ہے؟“

نورا برآمدے میں دو سپاہیوں کی نگرانی میں کھڑا تھا۔

میں نے کہا۔ ”میرے خیال میں یہ نورے کے کسی ساتھی کا کام ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں نے مل کر یہ کام کیا ہو۔“

نورا شور مچانے لگا کہ اُس کا اس واردات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُسے کچھ پتا نہیں ہے کہ وہ زیور وہاں کیسے پہنچا ہے۔

”لیکن اس نے میرے ساتھ یہ حرکت کیوں کی؟“ چودھری کو غصہ بھی آرہا تھا اور وہ حیران بھی تھا۔ ”میں تو اس کمینے کو زمین سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”چودھری صاحب! گندگی کا کیڑا صاف جگہ پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس نے آپ سے اپنی ذلت کا انتقام لیا ہے۔ آپ نے اسے کُتا کہا تھا، کُتا سمجھ کر پالا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ کُتا اگر پاگل ہو جائے تو وہ مالک کو کاٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔“

چودھری نے ہاتھ میں اُس وقت جوتا پکڑا ہوا تھا۔ اُس نے اُسی جوتے سے نورے کو مارنا شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر پہلے دھمکیاں دینے والا نورا [illegible] کی طرح ہوگیا۔ وہ جوتے بھی کھا رہا تھا اور اپنی بے گناہی کی قسمیں بھی۔

چودھری کا ہاتھ تھک گیا تو اُس نے کہا۔ ”ملک صاحب! اسے تھانے لے جائیں اور اچھی طرح پھینٹی لگائیں۔ اس کے ساتھی کا بھی پتا لگائیں۔ میں انھیں سزا دلائے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ ہمارا کُتا اور ہمیں ہی کاٹے۔“

میں نے چند معززین کو بُلا کر مشیر نامہ تیار کیا، سامان ایک گٹھڑی میں باندھا اور نورے لوہار کو ساتھ لے کر تھانے پہنچ گیا۔ ابھی مشتبہ شخص کے جوتے کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک اے ایس آئی کو جوتا دے کر حویلی بھیج دیا تاکہ وہ ملازموں سے اُس جوتے کے بارے میں پتا کر سکے۔ [illegible] کے بیان سے یہ بات یقینی ہوگئی تھی کہ وہ جوتا اُس [illegible] ملازم کا تھا۔

*

نورا لوہار بالکل ڈھے سا گیا تھا۔ اُسے دیکھ کر یہ لگ [illegible] درحقیقت اندر سے ایک گدھا تھا، جس نے شیر کی کھال پہنی تھی۔ اور وہ کھال چودھری کی پُشت پناہی تھی۔ اُس کے ظلم اور زیادتیاں میری نظروں میں تھیں۔ اُس نے [illegible] پر بڑے ظلم کیے تھے، شرفا کی پگڑیاں اُچھالی تھیں۔ [illegible] معصوم عورت کا قتل بھی اُس کی گردن پر تھا۔ میں اُس [illegible] سارے جرائم کا اقبالِ جرم کروانا چاہتا تھا۔ نیز اُس سے [illegible] کے ساتھی کے بارے میں بھی پوچھنا تھا۔

جو اے ایس آئی جوتے کے بارے میں پتا کرنے گیا [illegible] ایک گھنٹے کے بعد واپس آگیا۔ اُس نے ایک حیرت انگیز [illegible] کیا۔ وہ جوتا جیونے کا تھا۔

جیونا ابھی تھانے میں ہی تھا۔ میں نے اُسے اپنے کمرے [illegible] اور جوتے کے بارے میں پوچھا۔

اُس نے جوتے پر نظر ڈالی اور بولا۔ ”یہ۔۔۔ میرا ہی جوتا [illegible] چودھری صاحب نے مجھے دیا تھا۔“

[illegible] بات اُلجھ گئی تھی۔ جیونا، نورے کا ساتھی نہیں ہو سکتا [illegible] کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے بیری تھے۔ پھر سوال یہ [illegible] تھا کہ جیونا، نورے کے گھر کیا کرنے گیا تھا؟

میں نے کہا۔ ”تمھیں پتا ہے کہ یہ جوتا ہمیں کہاں سے ملا [illegible]

”نہیں سرکار! مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔“

”آج صبح اذان سے پہلے دو معزز آدمیوں نے تمھیں نورے کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ اُن کا کہنا ہے کہ جب اُنھوں نے آواز دی تو تم بھاگ کھڑے ہوئے۔ تم نورے کے [illegible] کرنے گئے تھے؟“

”جھوٹ ہے جی، میں اپنے کوٹھے میں تھا۔ آپ بے شک [illegible] والی سے پوچھ لیں۔ میں اذانوں کے وقت اُٹھا تھا اور [illegible] کے لیے چارا تیار کیا تھا۔“

میں نے اُسے دھمکایا تو وہ قسمیں کھانے لگا۔ کہنے لگا کہ [illegible] کے سارے ملازم اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ رات حویلی سے باہر نہیں نکلا تھا۔

مجھے خیال آیا کہ غالباً حویلی کے کسی دوسرے ملازم نے [illegible] جوتا پہن کر کارروائی کی تھی۔ میرے استفسار کے جواب [illegible] نے کہا کہ جوتا اُس نے کوٹھری میں رکھا تھا اور دوسرا [illegible] ہونا چاہیے۔

[illegible] بات تفتیش طلب تھی۔ اس لیے میں نے اسے ایک [illegible] آئی کے حوالے کیا۔ اس بھاگ دوڑ میں خاصا [illegible] تھا۔ میں نے نورے کو ایک حوالدار کے سپرد کر دیا اور خود آرام کرنے گھر چلا گیا۔ آرام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میں نورے سے رات کے وقت پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔

تقریباً پانچ گھنٹے آرام کرنے کے بعد میں رات کے گیارہ بجے دوبارہ تھانے پہنچ گیا اور نورے کو پوچھ گچھ کے کمرے میں طلب کیا۔ دو مضبوط قسم کے حوالدار بھی کمرے میں بُلا لیے۔

حوالدار نے نورے کے ہاتھ چھت سے لٹکنے والے دو کڑوں میں ڈال کر انھیں اتنا اونچا کر دیا کہ نورا صرف پنجے فرش پر لگا سکتا تھا۔

”ہاں بھئی نورے بدمعاش! اب بتاؤ اس سے پہلے کہاں کہاں چوریاں کی ہیں تم نے؟“

”جج۔۔۔ جناب، میں چور نہیں ہوں۔“

میں نے اُس کے مُنہ پر تھپڑ مارا، پھر پوچھا۔ ”چور نہیں ہو تو پھر کیا ہو؟“

اس پر تھپڑ کا مطلق اثر نہیں ہوا، بولا۔ ”میں چودھری کا آدمی ہوں جناب۔ جو کچھ کرتا ہوں چودھری کے حکم پر کرتا ہوں۔“

حوالدار نے اُسے پیچھے سے لات رسید کی۔

”اوئے، یہ چودھری کا آدمی کیا ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”تو نے چودھری سے نکاح پڑھوا رکھا ہے؟“

”نہیں جی، میرا مطلب ہے کہ میں چودھری کا خاص آدمی ہوں۔“

اے ایس آئی نے اُس کی پسلیوں پر مکا مارا، بولا۔ ”یہ سرکاری سانڈ ہے جی۔ اس نے غریبوں پر بڑے ظلم کیے ہیں۔“

”حضور! میں نے چودھری کے حکم کے بغیر کوئی کام بھی نہیں کیا۔“

وہ اپنے سارے کارنامے چودھری کے سر تھوپنے پر تُلا ہوا تھا۔ اور کسی حد تک یہ بات صحیح بھی تھی۔ اُس کی ساری پھوں پھاں چودھری کے دم سے تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ تم نے چودھری کی حویلی میں سیندھ کس کے حکم سے لگائی تھی؟“

”یہ حرکت میں نے نہیں کی۔“

میں نے اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا۔ ”مال کس کے گھر سے برآمد ہوا ہے؟“

”م۔۔۔ مال تو جی، میرے ہی گھر سے برآمد ہوا ہے۔“

اے ایس آئی نے کہا۔ ”جناب! اس نے کسی عادی چور سے یہ کام کروایا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”چودھری نے تمھارے بارے میں کہا تھا کہ اُس نے تمھیں کُتا سمجھ کر پالا ہوا ہے۔ یہ بات سُن کر تم خوش

ہوئے قصے یاد آرہے ہوئے تھے۔"

"جناب! اتنی بڑی گالی سن کر کون خوش ہو سکتا ہے۔ لیکن۔۔۔"

میں نے اُس کی ٹانگ پر ٹھڈا مارا اور کہا۔ "ہم یہ کیوں نہ سمجھ لیں کہ تم نے اس گالی کا بدلہ لینے کے لیے چودھری کے گھر میں سیندھ لگوائی ہے؟"

"م۔۔۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔"

میں نے اُسے ایک اور ٹھڈا مارا، اور کہا۔ "تیرے جیسے بے ایمان اور بدکردار کی قسموں کا کیا بھروسا۔ اپنے ساتھی کا نام بتا، ورنہ یہاں سے چھٹکارا نہیں ملے گا۔ آج صبح دو نمازیوں نے ایک شخص کو تمہارے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ نمازیوں کو دیکھ کر بھاگا تو اُس کا ایک جوتا پیچھے رہ گیا۔ ہم نے اس جوتے کی مدد سے اُس کا سراغ لگا لیا ہے۔"

"میں ساری بات سمجھ گیا ہوں جی۔ یہ سارا کھیل چودھری نے مجھے پھانسنے کے لیے کھیلا ہے۔ اُس نے اپنے کسی آدمی کے ذریعے سیندھ لگوائی ہے اور مال میرے گھر میں رکھوایا ہے۔ وہ کسی دوسرے آدمی کو الیکشن میں کھڑا کرنا چاہتا تھا لیکن میں بیٹھنے پر تیار نہیں تھا۔ جو جوتا آپ کو ملا ہے وہ اُس کے آدمی کا ہے۔ جب آپ نے اُسے جوتا دکھایا تو اُس نے خود یہ بات کہی تھی۔ آپ اُس کے آدمی کو میرے حوالے کریں، میں اُسے ایک دن میں سیدھا کر دوں گا۔"

اے ایس آئی نے اُس کے پیٹ میں گھونسا رسید کیا، بولا۔ "پہلے ہم تجھے تو سیدھا کر لیں۔"

اُس کے منہ سے پانی بار ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔

میں نے پوچھا۔ "تم دکانداروں سے بھتہ وصول کرتے ہو؟"

"نہیں جناب، میں نے کبھی کسی کو مجبور نہیں کیا۔"

"یعنی دکاندار تمہیں خوشی سے بھتہ دیتے ہیں؟"

"م۔۔۔ میں تو جی آپ لوگوں کے حکم پر کام کرتا ہوں۔ روپے میں بارہ آنے آپ کے آدمی وصول کرتے ہیں۔"

حوالدار نے بڑے زور سے اُس کی کمر پر لات جمائی۔ بولا۔ "یہ جھوٹ بکتا ہے جی۔ ہم لوگوں کو بدنام کرنا چاہتا ہے۔"

حوالدار نے پہلی بار زور سے لات رسید کی تھی۔ نورا لات کھا کر بل گیا، بولا۔ "مارو بچو، مارلو۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ دوست کی اور ایک لوہار کی۔ میں لوہار بچہ ہوں۔ لوہے کا بنا ہوا ہوں۔ جب میری باری آئے گی تو ایک بھی نہیں سہہ سکو گے۔ تم بھی بھتے میں حصے دار ہو۔"

حوالدار نے اُس کی پسلیوں میں تابڑتوڑ مکّے برسائے۔ وہ

چیخ اُٹھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

میں نے پوچھا۔ "شاکر علی کی دکان میں آگ کس نے لگائی تھی؟"

پہلے اُس نے انکار کیا، مگر تھوڑی سی چھترول کے بعد مان گیا کہ آگ اُسی نے لگائی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "صدیق ہوٹل والے بیرے کو کس نے مارا تھا؟"

"جناب! اُس نے بدتمیزی کی تھی۔"

"تم نے کھانے کے پیسے دیے تھے؟"

"م۔۔۔ میں پیسے نکالنے لگا تھا، مگر اُس نے [illegible] پکڑ لیا۔ لہٰذا میں نے اُس کی پٹائی کر دی۔"

"تم واقعی گتے ہو، نرے گتے۔" اے ایس آئی نے [illegible] نے کبھی کسی شریف آدمی کا گریبان تو نہیں پکڑا۔ تم نے [illegible] کیوں پکڑ لیا؟"

"جناب! یہ بات تو اسی کو معلوم ہو گی۔"

میں نے کہا۔ "میں تمہارے منہ سے سچ سننا [illegible] ابھی اور بہت سی باتیں ہیں۔ تم نے ڈاکٹر بشارت [illegible] کی بیوی کے ساتھ جو کچھ کیا، میں اُس کی تفصیل بھی [illegible] ہوں۔ صبح تک ساری باتیں سوچ رکھو، تو بار بار [illegible] انسان بن کر رہو گے۔ جب تک سچ نہیں بولو گے [illegible] رہو گے۔"

وہ چیخنے لگا، اور ہر بات بتانے کا اقرار کر [illegible] مجھے معلوم تھا کہ وہ اتنی آسانی سے سیدھی راہ پر نہیں [illegible] میں رات کے کھانے کو [illegible] کے پاس ہی ہدایات [illegible] گھر چلا گیا۔

●

صبح جب میں نے نورے لوہار کو اپنے کمرے [illegible] تو اُس کا برا خاصا ترم ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں [illegible] رہی تھیں اور قوتِ مزاحمت کمزور ہو چکی تھی۔

میں نے کہا۔ "کیوں بھئی نورے! تمہاری یاد [illegible] ٹھیک ہو گئی ہے یا ابھی کوئی کسر باقی ہے؟"

"جناب! یادداشت تو پہلے ہی ٹھیک تھی [illegible]" جواب دیا۔ "م۔۔۔ میں تو رات کو ہی سب کچھ بتانے کے لیے تیار تھا۔"

"ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "[illegible] اور سوچ لو۔"

"جناب! مجھ پر رحم کریں، میں ساری رات نہیں سویا

سارا پنڈا اکڑ گیا ہے۔"

"بچو! تو نے شریف لوگوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ اگر تجھے دو چار راتیں جاگنا پڑ گیا تو کون سی آفت آ جائے گی۔ ابھی تو پہلی رات ہے۔"

اُس نے خوف سے آنکھیں پھیلائیں، پوچھا۔ "کیوں جی، مجھے ابھی اور جاگنا پڑے گا؟"

"یہ تھانہ ہے، تھانہ۔ یہاں ہم بدمعاشوں اور لوفروں کو بستر نہیں دیا کرتے۔"

اُس نے روتے ہوئے کہا۔ "جناب! میں مر جاؤں گا۔ مجھ پر رحم کریں۔ رات کو آپ کے جانے کے بعد حوالدار نے مجھے بہت مارا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں نے بھتے کی بات کیوں بتائی۔"

"اس کا بھی بندوبست کر لیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم اپنی بات کرو۔ رحم اُس پر کیا جاتا ہے جو دوسروں پر رحم کرتا ہے۔ میرے سوالوں کا صحیح جواب دیتا، اگر جھوٹ بولا تو اس دفعہ الٹا لٹکا دوں گا۔"

"میں سچ بولوں گا جی۔"

"صدیق ہوٹل والے کے بیرے کو مارا تھا؟"

"ہاں جی! مارا تھا۔ چودھری میرے اِن کاموں پر خوش ہوتا تھا۔ میں اسی کی شہ پر یہ کام کرتا تھا۔"

"اور نے چودھری نے تو صدیق ہوٹل والے کو [illegible] بیسے کھلانے کے پیسے دیے تھے اور اُس کے سامنے تمہیں [illegible] کہا تھا۔ وہ کیسے اِن جرائم کو شہ دے سکتا ہے؟"

"ملک صاحب! آپ چودھری کو نہیں جانتے۔ وہ بہت اونچا سیاست دان ہے۔ ہمیں کہتا ہے کہ شریفوں کو لوٹو اور تنگ کرو۔ جب لوگ اُس کے پاس شکایت لے کر جاتے ہیں تو اُن کے سامنے ہمیں گالیاں نکالتا ہے اور اُن کو تسلیاں دیتا ہے۔ اگر اس کا کوئی آدمی پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو اُسے چھڑوا لیتا ہے۔"

"اس ڈرامے کا مقصد؟"

"مقصد یہ کہ لوگ اُسے نیک، خدا ترس اور صاحبِ اختیار سمجھیں، یعنی اُس کی شان بڑھتی رہے اور ہماری مٹی پلید ہوتی رہے۔"

اے ایس آئی نے غصے سے کہا۔ "اوئے کھوتے دیا پترا! جب تمہیں یہ سب کچھ معلوم ہے تو پھر اُس کے اشاروں پر کیوں ناچتے ہو؟"

"حضور! کچھ روزی بھی تو کمانی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "ڈاکٹر بشارت علی اور اُس کی بیوی کے ساتھ جو سلوک تم نے کیا وہ کس کے اشارے پر کیا تھا؟"

اُس نے ذرا تامل کیا، پھر بولا۔ "وہ بھی چودھری کے حکم پر کیا تھا۔ چودھری نے اُس سے کہا تھا کہ وہ اپنا نام واپس لے لے۔ چودھری نے اسے رقم بھی پیش کی تھی۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ پھر چودھری نے ہمیں بھیجا کہ جا کر اُس کا دماغ ٹھیک کرو۔ میں اُس کام میں اکیلا نہیں تھا۔"

"اور کون کون تھا تمہارے ساتھ؟"

اُس نے چار پانچ نام گنوائے۔ اُن میں چودھری کے بھانجے کا نام بھی شامل تھا۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ چودھری کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے حسبِ سابق طُرّے دار پگڑی، سیاہ شیروانی اور سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ دانستہ [illegible] پر اُس نے نورے کی بات سن لی تھی۔ [illegible] چھڑی سے ایک زوردار ضرب نورے کو لگائی۔

"ملک صاحب! اس خبیث کو الٹا لٹکا کر ماریں۔"

"چودھری صاحب! میں اپنے کام کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ اس چھڑی کو اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ [illegible]"

"[illegible] آپ نے ایسا پیشہ [illegible]"

"اچھا! آپ نے [illegible] [illegible] اور مجھے گرفتار کریں۔"

میں نے اُس کی بات کو [illegible] آپ کو یہ بات معلوم ہو گی کہ [illegible] ڈاکٹر بشارت علی اور اُس کی بیوی سے [illegible] کیا تھا۔ بشارت علی کی حاملہ بیوی اس [illegible] روز فوت ہو گئی تھی۔ [illegible] آپ کا بھانجا بھی شامل تھا۔ [illegible] آپ کے حکم پر دی گئی تھی۔"

"ملک صاحب! کیا آپ ایک بدمعاش کے بیان پر ایک معزز اور صاحبِ حیثیت شخص پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں گے؟"

"چودھری صاحب! یہ کمینہ بدمعاش ایک روز پہلے تک آپ کا منظورِ نظر تھا۔ آپ نے اس کا نام [illegible] اسے الیکشن میں کامیاب کروانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہلی دفعہ جب آپ اس کی خاطر تھانے میں آئے تھے تو آپ نے اسے معصوم اور بے گناہ قرار دیا تھا۔

"چھوڑیں ملک صاحب! آپ کس چکّر میں پڑ گئے!"

"اس شخص کا یہ بھی کہنا ہے کہ سیندھ آپ نے خود لگوائی ہے۔" میں نے مزید کہا۔ "یہ بات آپ کو معلوم ہو چکی ہوگی کہ ہمیں جو جوتا اس کی گلی سے ملا ہے وہ آپ کے ملازم جیونے کا ہے۔ لیکن اُس کا کہنا ہے کہ وہ ساری رات حویلی سے باہر نہیں نکلا۔"

"یہ... یہ بات اس نمک حرام نے کہی ہے!" چودھری نے ایک بار پھر اُسے چھڑی سے مارنا چاہا۔ "یہ کُتّے کا بچّہ مجھ پر الزام لگاتا ہے۔"

اس دفعہ نورے نے چودھری کے ہاتھ سے چھڑی چھین لی اور گھٹنے پر مار کر اُس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ پھر اطمینان سے بولا۔ "کُتّوں کو ہر طرف کُتّے ہی نظر آتے ہیں۔"

اُس کے چہرے پر کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔

چودھری کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ وہ کبھی اپنی ٹوٹی ہوئی چھڑی کو اور کبھی نورے کو دیکھتا تھا۔ نورا بھی پوری آنکھیں کھول کر اُسے گھورنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ نورے کا دماغ اُلٹ چکا ہے اب وہ چودھری کا کُتّا نہیں رہا تھا۔

"نورے! تو نے میری چھڑی توڑ کر اچھا نہیں کیا!" چودھری نے کہا اور تیزی سے واپس پلٹ گیا۔

*

اگلے روز خبر ملی کہ نورے کی چودہ پندرہ سالہ بہن نذیراں اغوا ہو گئی ہے۔ یہ خبر تھانے میں بند نورے نے بھی سُنی اور کچھ نہیں بولا۔

یہ بات بڑی واضح تھی کہ نذیراں کو چودھری نے اغوا کرایا تھا۔ نورے کا بوڑھا باپ تھانے میں اغوا کی رپورٹ درج کروانے آیا۔ اُس کے ساتھ دو نوجوان بھی تھے۔ رپورٹ درج کروانے کے بعد اُنھوں نے نورے سے بات کرنے کی اجازت مانگی، جو میں نے دے دی۔ وہ لوگ نورے سے بات کر کے چلے گئے۔

بعد میں حوالات کے سامنے ڈیوٹی دینے والے سپاہی نے مجھے بتایا کہ نورے نے چودھری کو دھمکی آمیز پیغام بھجوایا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اگر شام تک اُس کی بہن گھر نہ پہنچی تو اچھا نہ ہوگا۔ لیکن چودھری نے اس کی دھمکی کی کوئی پروا نہیں کی۔

رات کو نورا حوالات سے فرار ہو گیا۔

تھانہ انچارج کے مطابق گشتی سپاہیوں نے رات کے بارہ بجے دو مشتبہ نوجوانوں کو گرفتار کیا اور اُنھیں حوالات میں بند کرنے کے لیے تھانے لائے۔

لیکن جب حوالات کا دروازہ کھولا گیا تو نورا لوہار تیزی سے باہر آ گیا۔ اُن تینوں نے بڑی تیزی کے ساتھ حوالات کے سامنے موجود سپاہیوں کو بے بس کیا اور دو سپاہیوں کی رائفلیں چھین کر فرار ہو گئے۔

اس جگہ ایک ضمنی بات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بعد میں مجھے اُن گشتی سپاہیوں پر شک ہوا جو دو مشتبہ نوجوانوں کو گرفتار کر کے لائے تھے۔ اس سلسلے میں جب تفتیش کی گئی تو میرا شک صحیح ثابت ہوا۔ سپاہیوں نے نورے کے آدمیوں سے رشوت لی تھی اور اُسے فرار ہونے میں مدد دی تھی۔ ان دونوں کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کی گئی۔ تاہم یہ ایک الگ کہانی ہے۔

مجھے تقریباً نصف گھنٹے کے بعد فرار کی اطلاع ملی۔ اس عرصے میں نورا اپنا کام کر چکا تھا۔

وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سیدھا چودھری کی حویلی پہنچا۔ تینوں دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے اور سب سے پہلے چوکیدار پر قابو پا کر اس کی ڈبل بیرل شاٹ گن چھین لی۔ پھر اُنھوں نے حویلی کا اندرونی دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ چودھری کے اکلوتے بیٹے نے کھولا۔

نورے نے دروازہ کھلتے ہی اُسے شوٹ کر دیا۔ چودھری کا چھبیس ستائیس سالہ گبرو جوان دو گولیاں کھا کر دروازے پر ہی ڈھیر ہو گیا۔

گولیاں چلنے کی آواز سُن کر حویلی میں کھلبلی مچ گئی۔ چودھری کی تین بیٹیاں تھیں، جن میں سے ایک شادی شدہ تھی اور اپنے گھر میں رہتی تھی۔

نورے کو حویلی کا سارا نقشہ معلوم تھا۔ وہ سیدھا چودھری کی خواب گاہ میں گھسا اور چھوٹی لڑکی کو، جس کی عمر اٹھارہ اُنیس سال کے لگ بھگ تھی، قابو کر لیا۔

چودھری ریوالور ہاتھ میں پکڑے، ننگے پیر اور ننگے سر موقع پر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ نورے کے دونوں ساتھی بندوقیں تانے کھڑے تھے اور نورے نے اُس کی نوجوان بیٹی کو اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔ لڑکی چیخ رہی تھی۔

"چودھری! ریوالور پھینک دے!" نورے نے گرج دار آواز میں کہا۔ "نہیں تو میں تیری بیٹی کا گلا گھونٹ کر ختم کر دوں گا!"

چودھری کی بیوی اور حویلی کے ملازم بھی وہاں پہنچ گئے۔ لیکن کسی کو تنی ہوئی رائفلوں کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

"نورے! اس حرکت سے باز آ جا۔ تو نے میرا نمک کھایا ہے۔ میرے ساتھ آرام سے بیٹھ کر بات کر۔ میں تجھے پولیس سے چھڑوا دوں گا۔ مقدمہ ختم کرا دوں گا۔"

چودھری کو ابھی اپنے بیٹے کی موت کا علم نہیں ہوا تھا۔

نورے نے گرج کر کہا۔ "چودھری! اب اور مقدمے قائم ہوں گے۔ تو مجھے پولیس سے کیا چھڑائے گا۔ میرے بازوؤں میں بہت دم ہے۔ ریوالور جلدی نیچے پھینک، ورنہ تیری بیٹی کی لاش گرے گی۔"

چودھری نے ریوالور پھینک دیا۔ لیکن نورے نے لڑکی کو نہیں چھوڑا۔ بولا۔ "میری بہن کہاں ہے؟"

"م... میں تیری بہن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" چودھری ریوالور پھینکنے کے بعد ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

نورے نے ریوالور اُٹھا لیا اور بولا۔ "اگر تجھے میری بہن کا پتا نہیں تو یہ لڑکی ہمارے ساتھ جائے گی۔ جو حشر میری بہن کا ہوگا، وہی اس کا ہوگا۔"

چودھری کی بیوی مسلسل چیخ رہی تھی۔

نورے نے اپنے ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کیا اور خود دروازے کی طرف بڑھا۔

"نورے! رُک جا!" چودھری نے کہا۔ "میں تیری بہن کے بارے میں پتا کرتا ہوں۔"

"تو پتا نہیں کرے گا۔ ہم تیرے ساتھ چلیں گے۔"

نذیراں حویلی کے ایک کمرے میں بند تھی۔ نورے نے بہن کو دیکھے بغیر چودھری کی بیٹی کو نہیں چھوڑا۔

نذیراں نے نورے کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ خیریت سے ہے اور اُس کی عزت بھی محفوظ ہے۔

نورے نے جاتے جاتے چودھری سے کہا۔ "چودھری! اب کُتّا نہیں شیر بن چکا ہے۔ میں جنگلوں میں جا رہا ہوں۔ میرے گھر والوں کو کوئی نقصان پہنچا تو میں تیری تینوں بیٹیوں کو اُٹھا کر لے جاؤں گا۔"

جانے سے پہلے اُس نے چودھری کی تجوری بھی خالی کر ڈالی۔

جب ہم حویلی میں پہنچے تو وہاں ماتم بپا تھا۔

یہ ساری تفصیل، جو آپ نے اوپر پڑھی ہے، مختلف لوگوں کے بیانات سے میرے علم میں آئی تھی۔

●

اور یوں نورا لوہار، نورا ڈاکو بن گیا۔ جس شخص کی وجہ سے وہ ڈاکو بنا، وہ شخص بھی اُس کے شر سے محفوظ نہ رہا۔ ہم نے بھی پولیس ہیڈ کوارٹر کے تعاون سے نورے کے پیچھے کئی چھاپہ مار پارٹیاں روانہ کیں، مگر کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ چند روز کے بعد نورے کا خاندان بھی قصبہ چھوڑ کر چلا گیا۔

بیٹے کی موت کے سبب چودھری کو سخت صدمہ پہنچا۔ تاہم اس کے طور طریقوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ نورے کے جانے کے بعد اُس نے دو اور بدمعاش پال لیے۔ شاید یہ اُس کی مجبوری بھی تھی۔ کیونکہ سیاسی رقابتوں اور خاندانی دشمنیوں کی وجہ سے یہ لوگ غنڈے پالنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

چند ہفتوں کے بعد نورے ڈاکو کی وارداتوں کی خبریں ملنے لگیں۔ اس نے جو راستہ اختیار کیا تھا... یہ جو راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوا تھا اُس میں ڈکیتیوں کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔

چودھری کے گھر میں جو نقب لگی تھی، وہ نورے کے فرار کے بعد معمّا بن گئی تھی۔ جیونے کے بارے میں ہم نے ہر طرح کی تفتیش کر لی تھی۔ وہ ذاتی طور پر اس واردات میں ملوث نہیں تھا۔

جوتے کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوا تھا۔ جوڑے کا دوسرا جوتا جیونے کے کوٹھے میں موجود تھا اور اُس پر جمی ہوئی گرد اس بات کو ظاہر کرتی تھی کہ وہ جوتا کئی روز سے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اس چھان بین سے ہم اس نتیجے پر پہنچا کہ چور نے وہ جوتا بھی چوری کیا تھا اور ہمیں غلط راستے پر لگانے کے لیے

اُسے گلی میں پھینک گیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ چودھری یا نورے کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات بتا دوں کہ نورے کے گھر سے جو مسروقہ زیور برآمد ہوا تھا وہ چودھری کے بیان کے مطابق پورا نہیں تھا۔ یعنی کچھ زیور کم تھا۔ اس بات کے ذکر کا مجھے خیال نہیں رہا۔

*

تقریباً چھ یا سات ماہ بعد قریبی علاقے کی پولیس نے ایک شخص کو مسروقہ زیور فروخت کرتے ہوئے گرفتار کیا۔ جب اس شخص سے پوچھ گچھ کی گئی تو اُس نے بتایا کہ مذکورہ زیور اُس نے چودھری نظام دین کے گھر سے چوری کیا تھا۔

اس بات کی تصدیق اور ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد یہ شخص ہمارے سپرد کر دیا گیا۔

اُس نے اپنا نام اشرف خان بتایا۔ اُسے دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ کیونکہ اُس کی عمر پینتالیس اور پچاس سال کے درمیان تھی۔ اور وضع قطع سے وہ معقول آدمی معلوم ہوتا تھا۔ یعنی وہ روایتی چوروں سے خاصا مختلف نظر آتا تھا۔ اُس کا جسم دُبلا پتلا اور قد درمیانہ تھا۔

میں نے جب اُسے پوچھ گچھ کے لیے بلایا تو اُس نے عاجزی سے کہا۔ "جنابِ عالی! میں اُدھر سے بہت مار کھا کے آیا ہوں۔ اگر آپ نے بھی یہی کام کیا تو بندہ فوت ہو جائے گا، اور کفن دفن کا انتظام آپ ہی کو کرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔ "اگر سچ بولو گے تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"یہی تو سارا مسئلہ ہے۔" اُس نے کہا۔ "میں سچ بولوں گا تو آپ یقین نہیں کریں گے اور مجھے جھوٹ بولنے پر مجبور کریں گے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں تھانے کا بہت تجربہ ہے۔"

"آپ صحیح فرماتے ہیں، جناب! میں نے پندرہ سال چوریاں کی ہیں اور پانچ سال جیل میں گزارے ہیں۔"

اُس کی صاف گوئی پر مجھے تعجب ہوا۔ میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم عادی چور رہے ہو؟"

"تھا... " اُس نے جواب دیا۔ "تیرہ سال پہلے توبہ کر لی تھی۔"

"پھر دوبارہ چوری کیوں کی؟"

اُس کے چہرے پر کرب نمودار ہو گیا۔ کچھ دیر تک چپ رہا۔ پھر بولا۔ "حالات نے مجبور کر دیا تھا۔"

"... کیسے حالات تھے؟"

"یہ بڑی دُکھ بھری کہانی ہے۔" وہ خیالوں میں کھو گیا۔ "میں نے فیصلہ کیا تھا کہ چوری کا مال اپنے پاس نہیں رکھوں گا، مگر آخری وقت پر شیطان نے بہکا دیا اور میں نے چند چیزیں جیب میں ڈال لیں۔ اسی وجہ سے پکڑا گیا۔"

"نورے سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"وہی، جو ایک شریف آدمی کا کسی بدمعاش سے ہو سکتا ہے۔"

"اشرف خان، پہیلیاں نہیں ڈالو۔ سیدھی بات کرو۔"

"جنابِ عالی! بات ذرا لمبی ہے، اگر آپ کے وقت کا حرج نہ ہو تو عرض کرنے کی جرأت کروں۔"

میں نے اُس سے کہا کہ میں پوری بات سُننا چاہتا ہوں۔

●

اُس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ وہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں جرائم کی دُنیا میں داخل ہوا تھا۔ اُس کے والدین انتہائی غریب اور پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جب وہ پانچ چھ سال کا تھا تو اُنھوں نے اُسے ایک ایسے شخص کے سپرد کر دیا جو ایک سرکس میں جسمانی کرتب دکھاتا تھا۔ اُس نے اُسے ہر قسم کے جسمانی کرتب سکھائے اور خوب ماہر بنا دیا۔

لیکن اُس کی بدقسمتی کہ تیرہ چودہ سال کی عمر میں وہ ایک ماہر نقب زن کے ہتھے چڑھ گیا۔ اُس نقب زن نے محسوس کیا کہ لڑکا اپنی جسمانی مہارت کی وجہ سے اُس کے بہت کام آسکتا ہے۔ لہٰذا اُس نے اشرف کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اُسے چوری و نقب زنی میں ماہر بنا دیا۔ وہ بندر کی طرح پھرتیلا تھا۔ بڑی آسانی سے دیواروں اور چھتوں پر چڑھ جاتا تھا۔ روشن دانوں سے بند کمروں میں کود جاتا تھا۔ فضا میں قلابازیاں لگا سکتا تھا۔ دوڑنے میں چیتے کی طرح تیز تھا۔

چوری اور نقب زنی کے ساتھ ساتھ اُس نے جیبیں کاٹنے کا فن بھی سیکھا۔ اُس کا کمال یہ تھا کہ وہ واردات کے دوران کبھی قابو نہیں آتا تھا۔ اپنی جرائم کی زندگی میں اُسے دو دفعہ سزا ہوئی تھی۔ اور دونوں دفعہ اپنے ساتھیوں کی وجہ سے گرفتار ہوا تھا۔

پچیس سال کی عمر میں اُس نے شادی کر لی۔ اُس کی بیوی غریب مگر پڑھی لکھی اور نیک سیرت لڑکی تھی۔ اُس نے شادی کے فوراً بعد اشرف خان کو چوری چکاری کا پیشہ ترک کرنے کی تلقین شروع کر دی۔ ایک سال کے بعد اُن کے ہاں بچی پیدا ہوئی جس کا نام انھوں نے عذرا رکھا۔ وہ بڑی خوبصورت اور ذہین بچی تھی۔

اشرف خان نے مجھے بتایا کہ جب وہ اپنی نیک سیرت بیوی اور خوبصورت بچی کو دیکھتا تو اُسے اپنے پیشے سے نفرت سی ہونے لگتی۔ وہ اکثر سوچتا کہ جب اُس کی بیٹی

بڑی ہوگی تو وہ اُس کے بارے میں کیا سوچے گی۔ جب کوئی اُس سے پوچھے گا کہ اُس کا باپ کیا کام کرتا ہے تو وہ کیا جواب دے گی۔ کیا یہ کہے گی کہ اُس کا باپ ایک چور ہے۔

یہ اس سوچ کا نتیجہ تھا کہ جب عذرا پانچ سال کی ہوئی تو اشرف خان نے جرائم سے توبہ کر لی اور اپنا علاقہ چھوڑ کر دوسری جگہ چلا گیا۔

اُس نے اپنی بیٹی کو تعلیم دلائی اور تقریباً ڈیڑھ سال قبل ڈاکٹر بشارت علی سے اُس کی شادی کر دی۔

ڈاکٹر بشارت علی اور اُس کی بیوی کا ذکر آپ ابتدائی صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

اشرف خان اس بات پر بہت خوش تھا کہ اُس کی بیٹی اچھی جگہ بیاہی گئی تھی۔

لیکن آٹھ نو ماہ قبل جب اُسے عذرا کی اچانک موت کی خبر ملی تو اُسے اور اُس کی بیوی کو ناقابلِ بیان صدمہ پہنچا۔

اُس کے داماد بشارت علی نے اپنے ساتھ پیش آنے والے سانحے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ لیکن عذرا کی وفات کے بعد وہ قصبہ چھوڑ کر اپنی سسرال چلا گیا اور ہر وقت بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ پھر ایک روز اُس نے خاموشی سے خودکشی کر لی۔

اُس کی موت کے بعد اشرف خان کی بیوی کو اُس کے سامان میں سے چند کاغذات ملے، جن میں نورے اور چودھری [illegible]م دین کے ناروا سلوک کا سارا احوال درج تھا۔

اشرف خان نے بتایا کہ ظلم کی یہ داستان پڑھ کر اُس کے سینے میں آگ سی لگ گئی۔ اُسے نہ نیند آتی تھی اور نہ بھوک لگتی تھی۔

چند روز پریشان رہنے کے بعد وہ ہمارے قصبے میں آگیا اور نورے سے انتقام لینے کی تدبیر سوچنے لگا۔ اُس نے کسی کو یہ بات نہیں بتائی کہ وہ ڈاکٹر بشارت علی کا سسر تھا۔ تاہم وہ لوگوں سے نورے کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا رہتا تھا۔

اُس نے کہا کہ اگر وہ چاہتا تو رات کے اندھیرے میں نورے کو قتل کر سکتا تھا۔ لیکن یہ بات اُس کے اصول کے خلاف تھی۔ جس [illegible] نے اُسے نقب زنی سکھائی تھی اُس نے اُس سے پہلی بات [illegible] جی بھول کر بھی کسی انسان کو قتل نہ کرنا۔ قاتل قانون سے نہیں بچتا۔ لیکن اگر قانون سے بچ بھی جائے تو [illegible] ساری زندگی عذاب بنی رہتی ہے۔" اشرف خان نے کہا [illegible] اُس نے یہ بات پلے باندھ لی تھی اور انسان پر وار کرنے سے ہمیشہ گریز کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنی بیٹی اور داماد کے قاتلوں پر بھی ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا۔

اُسے معلوم تھا کہ نورا لوہار، نوردین بھٹی بن کر انتخاب [illegible] تھا اور چودھری کی پشت پناہی کی وجہ سے اُس کا جیتنا یقینی تھا۔ اشرف خان نے سوچا کہ اگر نورا انتخاب جیت گیا تو اُس کے [illegible] میں اضافہ ہو جائے گا اور وہ لوگوں پر پہلے سے زیادہ ظلم ڈھائے گا۔ لہٰذا اُسے سب سے پہلے اس کام میں فیل کرنا ضروری [illegible]

اشرف خان نے چودھری کے ملازموں سے میل جول بڑھانا شروع کیا۔ ان ملازموں میں اللہ رکھا نامی ایک ملازم بھی تھا۔ وہ مسکین صورت اور سیدھا سا آدمی تھا۔ اشرف خان کو پتا چلا کہ اللہ رکھا مغرب کی نماز کے بعد ایک حلوائی کی دکان پر دودھ پینے جاتا تھا۔

ایک شام اشرف خان بھی حلوائی کی دکان پر پہنچ گیا اور ایک پیالہ دودھ کا لے کر اللہ رکھے کے پاس بنچ پر جا بیٹھا۔

کچھ دیر تک دونوں خاموشی سے دودھ پیتے رہے۔ [illegible] چار گاہک دوسرے بنچ پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

اشرف خان نے اللہ رکھے کو سلام کیا اور رازدارانہ [illegible] میں کہا، "میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ پر ڈر بھی لگتا ہے۔"

"چاچا! بات کیا ہے؟" اللہ رکھے نے پوچھا۔ "اور ڈر کس بات سے لگتا ہے؟"

اشرف خان نے دھیمی آواز سے کہا۔ "تم شکل و صورت سے شریف آدمی لگتے ہو، اس لیے میں نے تم سے بات کرنے کی ہمت کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم کسی اور سے اس بات کا [illegible] نہیں کرو گے۔"

"مجھے چغل خوری کی عادت نہیں ہے۔"

اشرف خان، اللہ رکھے کے قریب سرک آیا اور [illegible] آواز میں بولا۔ "بات یہ ہے کہ میری جوان بیٹی اغوا ہو گئی ہے۔ [illegible] کی عمر سولہ سترہ سال کے قریب ہے۔ رنگ گورا چٹا ہے۔ [illegible] میں سونے کی نتھ ہے۔ پرسوں جب وہ گھر سے غائب ہوئی [illegible] اُس نے ہرے رنگ کا پھولدار سوتی جوڑا پہنا ہوا تھا۔ [illegible] چاندی کا کڑا تھا۔ میں اور میری بیوی اُس کی وجہ سے بہت پریشان [illegible] ہیں۔ کسی نے مجھے بتایا ہے کہ سلیمہ کو اس بستی کے کسی بدمعاش نے اغوا کیا ہے۔"

اللہ رکھا نوجوان اور غیر شادی شدہ تھا۔ لڑکی کے ذکر سے اُس کے دل میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اُس نے ہولے سے کہا۔ "بابا! اس بستی میں تو ایک ہی بدمعاش ہے۔ اُس کا نام نورا لوہار ہے۔ اگر اُس نے تیری بیٹی کو اغوا کیا ہے تو پھر معاملہ بہت مشکل [illegible]

[illegible]ی لیے تو میں نے تم سے بات کی ہے۔ تم جوان آدمی [illegible]ے دو چار یار بیلی بھی ہوں گے۔"

"[illegible]کل ہے۔" اللہ رکھے نے کہا۔ "بہت مشکل ہے۔ میں [illegible]ی ہوں اور چودھری نظام دین کا نوکر ہوں۔ اگر میں نے [illegible] معاملے میں دخل دیا تو چودھری میری ہڈی پسلی ایک [illegible] نورا، چودھری کا خاص آدمی ہے۔"

[illegible]رف خان چپ سا ہو گیا۔ دودھ ختم کرنے کے بعد [illegible] رکھے کے دودھ کے پیسے بھی ادا کر دیے اور اُس [illegible] طرف چل پڑا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے چودھری [illegible] کے قریب پہنچ گئے۔ اللہ رکھا رک گیا۔

[illegible]رف خان حویلی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "حویلی [illegible]ی ہے۔ اگر نورا، چودھری کا خاص آدمی ہے تو اُس [illegible] بیٹی کو اس حویلی میں چھپا رکھا ہوگا۔"

"[illegible]ویلی میں ایسی کوئی لڑکی نہیں آئی۔" اللہ رکھے نے کہا۔ "[illegible] مجھے ضرور پتا چل جاتا۔ کوئی رونے پیٹنے کی آواز ہی [illegible]

"[illegible]ویلی میں ضرور کوئی خفیہ کمرا ہوگا۔" اشرف خان اصل مقصد [illegible] گیا۔ وہ حویلی کے کمروں کا حال جاننا چاہتا تھا۔ "کوئی [illegible]رہ ہوگا۔"

"[illegible]خانہ کوئی نہیں ہے۔ کمرے میرے دیکھے بھالے ہیں۔ [illegible] جھاڑ وغیرہ صاف کرنے کے لیے اندر جا چکا ہوں۔"

[illegible] رکھا اشرف کی باتوں میں آ چکا تھا۔ اشرف خان اُس [illegible]یک کمرے کے بارے میں پوچھنے لگا۔ یہاں تک کہ [illegible] مطلب کے کمرے کا حال معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس پہلی ملاقات کے بعد اشرف خان نے روزانہ اللہ رکھے سے ملنا شروع کر دیا۔ باتوں کے دوران اُسے نورے اور جیونے کے تنازعے کا علم ہوا۔ یہ بھی پتا چلا کہ چودھری نے نورے کو منع کیا ہے۔ اور یہ بات جیونے کے ذریعے نورے کے علم میں آ چکی ہے۔ اور یہ کہ نورا اس بات پر خوش نہیں ہے اور چودھری نے جیونے کو چغلی کرنے پر خوب پھینٹی لگائی ہے۔

اشرف خان نے اس معاملے کو اپنے حق میں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ رات کے تین بجے، نقب زنی کے سامان کے ساتھ چودھری کی حویلی میں داخل ہوا۔ پہلے جیونے کے کوٹھے سے اُس کا جوتا چوری کیا اور پھر اسٹور کی دیوار میں نقب لگائی۔

اُس نے سارا کام نہایت اطمینان اور اعتماد کے ساتھ کیا۔ صندوق کے تالے توڑنے میں اُسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ ایک گھنٹے تک اپنے کام میں مصروف رہا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اس دوران میں وہ چوکیدار کی آوازیں سنتا رہا اور یہ اندازہ لگاتا رہا کہ وہ کس طرح چکر لگاتا ہے۔ گشتی پولیس کے بارے میں اُس نے بتایا کہ وہ تین چار بجے کے بعد عموماً سو جاتے ہیں۔ یہ اُس کا تجربہ تھا۔

اپنا کام مکمل کرنے کے بعد اُس نے زیورات ایک گٹھڑی میں باندھے اور بستی کی سنسان گلیوں سے ہوتا ہوا نورے کے گھر پہنچ گیا۔ اُس کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ اُس نے نورے کے باورچی خانے میں بیٹھ کر رات کا بچا ہوا کھانا کھایا اور اس دوران میں زیور چھپانے کے لیے موزوں جگہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر اُس کی نظر غلے کی کوٹھی پر ٹھہر گئی۔ جب وہ

زیورات کے ڈبے کو فصیل میں چھپا رہا تھا تو اُس کی نیت میں فتور آ گیا۔ اُس نے چند زیور اپنی جیب میں رکھ لیے، اور یہی اُس کی گرفتاری کا موجب بن گئے۔

اس سارے کام سے فارغ ہو کر وہ صحن کے دروازے میں جا کر ٹھہر گیا اور کسی نمازی یا چوکیدار کا انتظار کرنے لگا۔ یہ اُس کے کام کا بہت ضروری حصہ تھا۔ وہ نورے کے مکان کی نشان دہی کرنا چاہتا تھا تا کہ جب حویلی میں ہونے والی تفتیش [illegible] ہو تو نورے کے مکان سے نکلنے والے مشتبہ شخص کا [illegible] بھی آ سکے۔

کچھ دیر بعد اُس نے دو آدمیوں کو گلی میں نمودار ہوتے دیکھا۔ جب دونوں قریب پہنچے تو وہ مشتبہ انداز میں باہر نکلا اور [illegible] قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔

نتیجہ اس کی توقع کے عین مطابق نکلا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، ان نمازیوں کے نام [illegible] حب علی اور محمد شریف تھے۔ شریف نے اشرف خان کو [illegible] کے لیے کہا اور اُس کے پیچھے لپکا۔

اشرف خان بڑھاپے کے باوجود خاصا پھرتیلا تھا۔ اُس [illegible] دوڑ لگا دی اور ہاتھ [illegible] جو تا [illegible] دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اُس کا احوال آپ پچھلے صفحات [illegible] چکے ہیں۔

*

بات ختم کرنے کے بعد اشرف خان نے گلوگیر آواز میں کہا: [illegible] صاحب، بیٹی [illegible] کی موت کے بعد میری زندگی میں کوئی خوشی نہیں رہی۔ آپ مجھے جیل بھجوا دیں یا پھانسی دلوا دیں، میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

میں نے کہا: "اشرف خان، تم چوری کا مال فروخت کرتے ہوئے پکڑے گئے ہو اور اپنے جرم کا اقرار بھی کر چکے ہو۔"

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ [illegible] سرکار، میں نے آپ سے رحم کی اپیل تو نہیں کی۔ آپ وہی کریں جو آپ کا فرض ہے۔"

میں نے اُس کا کندھا تھپتھپایا، پھر کہا: "تم مظلوم انسان ہو۔ تم پر ظلم ہوا ہے۔ میں تمہارے لیے کچھ سوچتا ہوں۔ یہ کہانی جو تم نے مجھے سنائی ہے، اگر چودھری کے علم میں آ گئی تو وہ تمہیں سزا دلوانے کی پوری کوشش کرے گا۔ بلکہ کوئی عجب نہیں کہ کسی بدمعاش کے ذریعے تمہیں قتل کروا دے۔ کیونکہ تمہاری کارروائی کی وجہ سے اُس کا اکلوتا بیٹا قتل ہو چکا ہے۔ [illegible] تم یہ کہانی کسی اور کو نہ سنانا۔"

"بہت بہتر، سرکار۔"

اُسے بچانے کے لیے مجھے کیا کچھ کرنا پڑا، یہ ایک [illegible] کہانی ہے، اور اُس کا جاننا آپ کے لیے ضروری نہیں [illegible] اتنا بتا دینا مناسب ہوگا کہ عدالت نے اُسے چند پیشیوں [illegible] بعد بری کر دیا۔

کچھ عرصے کے بعد میرا اُس علاقے سے تبادلہ [illegible] تقریباً ایک سال بعد مجھے پتا چلا کہ نورا لوہار ایک پولیس [illegible] میں مارا گیا تھا۔

چند روز کے بعد میری ملاقات ایک حوالدار [illegible] جو ہنوز چودھری نظام دین کے علاقے میں متعین تھا۔ باتوں کے دوران اُس نے کہا: "ملک صاحب [illegible] کہ وہ نورا لوہار تو ضرور یاد ہوگا؟"

"بالکل یاد ہے۔" میں نے کہا: "سنا ہے کہ وہ [illegible] مقابلے میں مارا گیا ہے۔"

"وہ [illegible] پولیس مقابلے میں [illegible] گرفتار کر لیا تھا اور اُس کو عدالت کے حوالے کرنا [illegible] مگر چودھری نظام دین نے [illegible] کر کے اُسے مروا دیا۔ [illegible] چودھری [illegible] ہم لوگ اُسے رات کے وقت جنگل میں لے گئے [illegible] پیروں میں بیڑیاں ڈال کر چھوڑ دیا [illegible] دیکھنے والی تھی۔ [illegible] رہا تھا اور تڑپتی ہوئی [illegible] سے بچنے [illegible] رہا تھا لیکن پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیاں [illegible] چلنے دیتی تھیں۔ [illegible] چودھری [illegible] مانگ رہی تھی۔ اُس کی چیخوں سے [illegible] دوسرے لوگ بھی [illegible] گئے کہ وہ پوری چھ گولیاں کھانے کے بعد زمین پر [illegible] پھر بھی زندہ تھا۔ پھر [illegible] کی بیڑیاں [illegible] کے آدمیوں نے اُس کے پیروں میں رسی باندھ [illegible] مردہ کتے کی طرح گھسیٹتے ہوئے بستی تک لائے [illegible] نہیں تھا۔ وہ زندہ تھا اور کھلی آنکھوں سے اپنا [illegible] رہا تھا۔"

حوالدار اس کے آخری لمحات کی کہانی سنا [illegible] سوچ رہا تھا کہ چودھری نظام دین نے ٹھیک [illegible] اُس نے نورے لوہار کو واقعی کتا سمجھ کر پال رکھا [illegible]



تازیانہ

غلطی کو خیر [illegible]

ایک صبح میں تھانے میں پہنچا تو پتا چلا کہ دریا سے ایک نوجوان عورت کی لاش برآمد ہوئی ہے [illegible] نے چند آدمیوں کو ساتھ لیا اور فوراً موقع پر پہنچ گیا۔ وہاں [illegible] ڈیوٹی والا اے ایس آئی ضابطے کی کارروائی میں مصروف تھا۔ لاش چادر سے ڈھکی ہوئی ایک طرف پڑی تھی۔ تماشائیوں [illegible] چھوٹا سا ہجوم بھی موقع پر موجود تھا۔

وہ بہار کا موسم تھا اور دریا سست روی سے بہہ رہا تھا۔ اے ایس آئی نے میرے استفسار پر بتایا کہ وہ خودکشی [illegible] معلوم ہوتا تھا۔

میں نے پوچھا: "متوفیہ کے ورثا کا کچھ پتا چلا؟"

"عورت دوسرے علاقے کی معلوم ہوتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "لاش بہتی ہوئی یہاں پہنچی ہے۔"

دریا میں ڈوبنے کے اِکا دُکا واقعات ہوتے رہتے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد شوقیہ نہانے والوں کی ہوتی تھی۔ کبھی کبھار خودکشی کا کیس بھی ہو جاتا تھا جن میں سسرال یا شوہروں کی ستائی ہوئی نوجوان عورتیں یا معاشی بدحالی کا شکار لوگ شامل ہوتے تھے۔ عورتیں عموماً کنوئیں یا دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرتی تھیں۔ غالباً اُن کے لیے یہ سہل طریقہ تھا۔

میں نے لاش کے چہرے سے چادر ہٹا کر دیکھا۔ وہ گول چہرے والی خوبصورت عورت تھی۔ اس کے نقوش تیکھے تھے اور عمر چھبیس ستائیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔

اچانک مجھے اس کی گردن پر کچھ نشانات دکھائی دیے۔ میں پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور بغور ان نشانات کا معائنہ کیا۔ نشانات خاصے نمایاں تھے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ کسی کپڑے سے اس کا گلا گھونٹا گیا تھا۔

گویا وہ خودکشی کا نہیں قتل کا کیس تھا۔

لاش کا چہرہ دیکھنے کے لیے کافی لوگ میرے اردگرد اکٹھے ہوگئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا کوئی شخص اس عورت کو پہچانتا ہے؟ لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، ان میں سے کوئی بھی اسے نہیں پہچانتا تھا۔

عورت کے کانوں میں سونے کی بالیاں اور ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ کسی نے اسے لوٹنے کے لیے قتل نہیں کیا تھا۔

میں نے چادر مزید ہٹائی تو مجھے کالے رنگ کا ایک دوپٹا بھی دکھائی دیا جو ویسے ہی لاش کے اوپر رکھا تھا۔ میرے دل میں سوال پیدا ہوا کہ اگر لاش دور سے بہتی ہوئی آئی تھی تو دوپٹا جسم سے الگ کیوں نہیں ہوگیا تھا؟

میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔ ”لاش کس نے دریافت کی تھی؟“

”نواب دین مچھیرے نے۔“ اس نے جواب دیا۔

نواب دین کی جھگی وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ میں نے ایک آدمی بھیج کر اُسے بلایا اور پوچھا کہ اسے لاش کہاں اور کس حالت میں ملی تھی۔

وہ ادھیڑ عمر کا سیدھا سادہ آدمی تھا اور ماہی گیری کرتا تھا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ رات کو دریا کے آرپار ایک لمبی ڈور لگا دیتا تھا جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پچیس تیس کانٹے لگے ہوتے تھے۔ اس ڈور کو وہ دونوں کناروں پر گڑی ہوئی مضبوط لکڑیوں سے باندھ دیتا تھا۔

علی الصباح وہ معمول کے مطابق اپنی چھوٹی سی بیڑی میں بیٹھ کر کانٹے چیک کرنے لگا۔ موسم اچھا تھا اور تقریباً ہر کانٹے میں ایک آدھ مچھلی پھنسی ہوئی تھی۔ وہ مچھلیوں کو کانٹوں سے الگ کر کے کشتی میں ڈالتا جاتا تھا۔

دفعتاً اس نے ایک بھاری شے کانٹے کے ساتھ اٹکی ہوئی دیکھی۔ پوری ڈور اس کے وزن سے کھنچی جا رہی تھی۔ اس نے قریب جا کر دیکھا تو وہ ایک عورت کی لاش تھی جس کا لباس ایک کانٹے میں پھنس گیا تھا۔

اس نے کانٹا الگ کیا اور لاش کو کشتی میں ڈال کر کنارے پر پہنچایا۔ پھر اپنے ایک رشتے دار کو فوراً تھانے روانہ کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ دوپٹا کہاں تھا؟“

”جناب، دوپٹا گلے میں بندھا ہوا تھا۔“ اس نے ... سے جواب دیا۔ ”بیچ میں گرہ لگی ہوئی تھی۔ میں نے اتار کر ... کے اوپر ڈال دیا۔“

میں نے لاش کے اوپر رکھا ہوا دوپٹا نکال ... نواب دین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جس طرح یہ دوپٹا لاش کے گلے میں بندھا ہوا تھا اس طرح اپنے گلے میں باندھ کر دکھاؤ۔“

یہ سن کر اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

”توبہ، توبہ...!“ اس نے کہا۔ ”اللہ معاف کرے، نامحرم عورت کا کپڑا ہے۔ میں اسے گلے میں نہیں ڈال سکتا۔“

میں نے قریب کھڑے لوگوں پر نظر ڈالی۔ ایک نوجوان نے مفلر گلے میں ڈال رکھا تھا۔ میں نے اس سے مفلر لے کر نواب دین مچھیرے کو دیا اور کہا۔ ”میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ دوپٹا کس طرح گلے میں بندھا ہوا تھا۔ یہ مفلر اپنے گلے میں باندھ کر دکھاؤ۔“

میرے ذہن میں دو خیال آئے تھے۔ یا تو اس عورت نے چھت سے لٹک کر خودکشی کر لی تھی اور اس کے سسرال والوں نے بدنامی کے خوف سے اس کی لاش دریا میں پھینک دی تھی اور یا دوپٹے سے اس کا گلا گھونٹا گیا تھا۔

نواب دین نے مفلر میرے ہاتھ سے لے لیا اور اُسے گلے میں ڈال کر وسط میں ایک گرہ لگائی، بولا۔ ”جناب یہ دوپٹا اس طرح گلے میں بندھا ہوا تھا۔“

میں نے پوچھا۔ ”گرہ ڈھیلی تھی یا سخت؟“

اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”زیادہ ڈھیلی نہیں تھی۔“

واضح طور پر عورت کو دوپٹے سے پھندا لگا کر قتل کیا گیا تھا اور وہ کسی دوسرے علاقے سے بہتی ہوئی وہاں آئی تھی۔ دریا کے جس مقام سے لاش برآمد ہوئی تھی۔ وہاں سے سو سوا سو گز دور پہلے بھی ایک واردات ہوئی تھی۔ تقریباً ایک سال قبل وہاں سے طارق نامی ایک بچے کی لاش برآمد ہوئی تھی۔ اس واردات کا حال آپ انھی صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

بہرحال ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ یہ بات یقینی تھی کہ متوفیہ اس قصبے کی رہنے والی نہیں تھی۔ تھانے پہنچ کر میں نے ایک پولیس پارٹی تیار کی اور اسے دریا کے بالائی حصے میں واقع دیہات کی طرف روانہ کر دیا۔ اس کے علاوہ میں نے پولیس کے مخبروں کو بھی سن گن لینے کی ہدایت کی۔

پولیس پارٹی شام کو ناکام واپس آگئی۔

اگلی صبح ایک مخبر نے مجھے بتایا کہ موضع ٹاہلیاں کی ایک نوجوان شادی شدہ عورت جس کا نام صفیہ عرف صفو بتایا جاتا ہے چند روز ہوئے گھر سے بھاگ گئی تھی لیکن گھر والوں نے رپٹ درج نہیں کروائی اور بات کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میں نے دو آدمیوں کو ساتھ لیا اور تانگے میں بیٹھ کر موضع ٹاہلیاں پہنچ گیا۔ میرے پاس متوفیہ کی ایک تصویر بھی تھی جو میں نے گزشتہ روز تیار کروائی تھی۔

یہ گاؤں دریا سے ڈیڑھ دو فرلانگ مشرق کی طرف تھا، اس طرف ایک نیم پختہ سڑک جاتی تھی۔ گاؤں زیادہ بڑا نہیں تھا۔ نمبردار کو ہماری آمد کے بارے میں پتا چلا تو وہ خود ہمارے استقبال کے لیے دوڑا آیا اور ہمیں اپنی حویلی میں لے گیا۔

اس کا نام چودھری نور جمال تھا اور اس سے میری پرانی شناسائی تھی۔

”ملک صاحب، خیریت تو ہے؟“ اس نے رسمی کلمات کے بعد پوچھا۔ ”کس مفرور کے پیچھے آئے ہیں؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ادھر سے گزر رہے تھے۔ سوچا، دو گھونٹ پانی پیتے جائیں۔“

”پانی کا تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے۔“ نمبردار نے کہا۔ ”آپ کھانا بھی ادھر ہی کھائیں گے۔“

”ہم زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔“

اس نے ایک لڑکے کو آواز دے کر قریب بلایا اور کہا۔ ”کاکا، جلدی سے چاچی کے پاس جا۔ اسے کہہ کہ اپنے تھانے دار صاحب آئے ہیں۔ جلدی سے دو ککڑ بھون لے اور دیسی گھی پر پراٹھے پکا لے...“

اے ایس آئی نے کہا۔ ”چودھری صاحب، بیس پچیس پراٹھے کون کھائے گا۔“

”او باشاؤ، کھایا پیا کرو۔“

تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان لسی سے بھرا ہوا ڈول اور تین چار گلاس لے آیا۔ خاصی گاڑھی لسی تھی۔ اوپر مکھن تیر رہا تھا۔ ہم نے لسی پی اور کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

گاؤں میں ہماری آمد کی خبر ہوچکی تھی اور کئی لوگ ہمیں سلام کرنے آرہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دو لڑکے اندر آئے اور دونوں ہاتھوں سے باری باری مجھے سلام کیا۔ ان کی شکلیں کچھ جانی پہچانی سی لگیں۔

”میرا نام لطیف ہے جی۔“ ایک لڑکے نے کہا۔ ”اور یہ میرا دوست جلیل ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کوئی کام تو نہیں ہے؟“

”تسی ساہنوں پہچانا نہیں؟“ لطیف نے کہا۔

”چھڈ یار، میں نے تمھیں پہلے ہی کہا تھا۔“ جلیل نے ہولے سے کہا۔ ”پہچان لیا تو انعام شام دینا پڑے گا۔“

اے ایس آئی نے کہا۔ ”کی گل اے کاکا؟ بڑا اوکھا پیا بولنا ایں۔“

”ملک صاحب جی، میں طیفی ہوں اور یہ جیلا ہے۔“

تب ہی مجھے یاد آیا کہ ان دونوں نے ایک سربریدہ لاش کے سلسلے میں مخبری کی تھی اور اس وقت بھی انعام کی بات کی تھی۔ میں نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر طیفی کو دیے اور کہا۔ ”ہاں بھئی، انعام کے تو تم واقعی مستحق تھے۔ اس کے بعد تم ملے ہی نہیں۔ یہ رکھ لو۔ آدھے آدھے بانٹ لینا۔“



"ملک صاحب، تُسی تکلیف نہ کرو جی" چودھری نور جمال نے کہا۔ "ان کو ہم انعام دے دیں گے۔ او کاکا! چل، ملک صاحب دے پیسے واپس کر۔۔!"

طیفی کا منہ لٹک گیا۔ اس نے پیسوں والا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا، بولا "لو جی، واپس لے لو۔۔!"

"رکھ لو، رکھ لو" میں نے کہا "انعام واپس نہیں لیا جا سکتا۔ جاؤ، عیش کرو۔"

دونوں کن انکھیوں سے نمبردار کی طرف دیکھتے ہوئے باہر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے سرسری انداز میں کہا "نمبردار، سنا ہے کہ پنڈ کی ایک لڑکی گھر سے بھاگ گئی ہے۔"

اس نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا، بولا "آپ کو کس نے بتایا ہے؟"

"بس، اِدھر اُدھر سے سُن لیا" میں نے کہا "ہمارے پاس ہر رنگ کے آدمی آتے رہتے ہیں۔"

قدرے تامل کے بعد اس نے کہا "سنا تو میں نے بھی ہے لیکن مجھے پوری بات معلوم نہیں ہے۔ لڑکی کے گھر والے بات چھپا رہے ہیں۔"

"کون لوگ ہیں یہ؟"

"لڑکی کے سسر کا نام غلام حیدر ہے" اس نے جواب دیا "بوڑھا آدمی ہے [illegible] سال عمر ہوگی۔ اب اس کے پاس پیسہ آگیا ہے۔ [illegible] کی فکر میں ہے۔ اس کے بیٹے یونس [illegible] نوکری مل گئی تھی۔ اُدھر کسی تیل کی کمپنی میں کام کرتا تھا۔ تین سال بعد واپس آیا ہے۔ سنا ہے کہ آتے ہی بیوی کے ساتھ جھگڑا ہوگیا اور وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ پہلے یہ بہت غریب لوگ تھے۔ ان کے گھر میں کئی کئی روز چولھا نہیں جلتا تھا۔"

"یونس کی بیوی کا نام کیا ہے؟"

"اس کا نام صفو ہے۔"

"آپ نے اسے دیکھا تو ہوگا؟"

"دیکھا تو ضرور ہوگا لیکن۔۔۔ معاملہ کیا ہے؟"

میں نے جیب سے دریا میں ڈوب کر ہلاک ہونے والی عورت کی تصویر نکال کر اُسے دکھائی "ذرا یہ تصویر تو دیکھو۔"

اس نے میرے ہاتھ سے تصویر لی بھویں سکیڑ کر اُسے گھورنے لگا۔ اس کے چہرے پر دم بہ دم حیرت نمودار ہوتی جا رہی تھی "اسے کیا ہوا ہے؟" اس نے پوچھا "کیا یہ مر چکی ہے؟"

"ہاں، اس کی لاش دریا سے برآمد ہوئی ہے۔ کیا یہ صفو کی تصویر ہے؟"

"لگتی تو وہی ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا "ٹھہریں، میں اپنی بیوی سے پوچھتا ہوں۔"

وہ اندر چلا گیا۔

اے ایس آئی نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔"

"ابھی تو صرف شناخت کا مسئلہ حل ہوا ہے" میں نے کہا "قتل کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔"

"قتل خاوند نے کیا ہوگا اور کون کر سکتا ہے۔ جب غریب آدمی کے ہاتھ دولت آجائے تو پہلی بیوی اس کی نظروں سے گر جاتی ہے۔"

"پہلی بیوی؟"

"میرا مطلب ہے، ہو سکتا ہے کہ اس نے اُدھر کسی ایرانی عورت سے شادی کر لی ہو۔"

نمبردار واپس آیا اور افسردگی سے سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ "یہ صفو کی تصویر ہے۔ میری بیوی نے اسے پہچان لیا ہے۔ بے چاری تین سال سے اپنے آدمی کا انتظار کر رہی تھی۔"

میں نے تصویر لے کر جیب میں رکھی اور اٹھتے ہوئے کہا "فی الحال کسی سے اس بات کا ذکر نہ کریں۔ اپنی بیوی سے بھی کہہ دیں اور کسی آدمی کو ہمارے ساتھ کر دیں۔ ہم صفو کے شوہر یونس سے ملنا چاہتے ہیں۔"

اس نے ایک لڑکا ہمارے ساتھ کر دیا اور اسے سمجھایا کہ ہمیں غلام حیدر کے گھر لے جائے۔

"ملک صاحب، کھانا تیار ہو رہا ہے۔ اُدھر سے فارغ ہو کر ادھر آجائیں۔"

تانگے والے نے گھوڑا کھول دیا تھا اور ایک پیڑ کے سائے میں بیٹھا چند دیہاتیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر سب لوگ کھڑے ہو گئے۔

تانگے والے نے عاجزی سے پوچھا "حضور، تانگا جوت لوں؟"

"ابھی آرام سے بیٹھو۔" اے ایس آئی نے کہا "نمبردار کھانا وانا تیار کروا رہا ہے۔ آج دیر ہو جائے گی۔"

وہ کچھ نہیں بولا تاہم اس کے چہرے پر ناگواری نمودار ہوگئی۔ وہ دوبارہ سائے میں بیٹھ گیا اور چابک زمین پر مارنے لگا۔

غلام حیدر کا گھر گاؤں کے عام گھروں جیسا تھا البتہ اس کے صحن کی دیوار پختہ اینٹوں کی تھی اور نئی معلوم ہوتی تھی۔ وہاں زیادہ تر مکانوں کی دیواریں گارے کی بنی ہوئی تھیں۔ جن چار [illegible] کی پیدائش لگی ہوئی تھی۔

دستک کے جواب میں ایک نوجوان لڑکی دروازے [illegible] اور آنکھیں پھیلا کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔

جو لڑکا ہمارے ساتھ آیا تھا اس نے لڑکی سے کہا۔ [illegible] بھائی کو باہر بھیجو۔ تھانیدار صاحب اس سے ملنے آئے ہیں۔"

لڑکی کے چہرے پر پریشانی نظر آنے لگی، بولی "یونس تو شہر گئے ہوئے ہیں۔ بات کیا ہے جی؟"

"بات تمہارے مطلب کی نہیں ہے" میں نے کہا "گھر [illegible] اندر کون ہے؟"

لڑکی نے صاف ستھری سوتی شلوار قمیص پہن رکھی تھی [illegible] سوتی چادر تھی۔ چہرے مہرے سے سمجھدار لگتی تھی۔

[illegible] گھر میں بابا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"جاؤ، اسے ہمارے بارے میں بتاؤ۔"

"اچھا جی۔۔" لڑکی نے کہا اور اندر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک سفید ریش بوڑھا کھانستا ہوا دروازے [illegible]۔ اس نے چھوٹے سائز کے گول شیشوں والا نظر کا چشمہ [illegible] تھا۔ گلی کے کچھ ننگ دھڑنگ بچے ہمارے اردگرد جمع [illegible] تھے۔

[illegible] کون ہو تُسی؟" بوڑھے نے ہمارا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ [illegible] نے رپٹ درج کرائی ہے ہمارے خلاف؟"

[illegible] چاچا، ہم بڑی دور سے آئے ہیں" اے ایس آئی نے [illegible] کوئی کمرا کھلواؤ۔ اندر بیٹھ کر بات کریں گے۔"

بوڑھے نے اندر منہ کر کے کہا "کاکی جیراں، بیٹھک وا [illegible]۔ پروہنے آئے ہیں۔"

بیٹھک سستے فرنیچر سے آراستہ تھی، دیواروں پر پرانے [illegible] کی تصویریں چسپاں تھیں۔

[illegible] ایس نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد کہا "چاچا، ہم تمہاری [illegible] سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"میری بہو سے؟"

اس کا نام صفو ہی ہے نا؟"

نام تو اس کا یہی ہے۔ پر وہ تو ادھر نہیں ہوتی۔"

کیوں، کیا تمہارے بیٹے نے اسے گھر سے نکال دیا ہے؟" [illegible] گھر سے تو نہیں نکالا، پر کوئی گڑبڑ ہے ضرور۔ مجھے یہ لوگ [illegible] بتاتے۔"

ایک ادھیڑ عمر عورت چادر سے کانا پردہ کرتی ہوئی کمرے [illegible] خاصے مضبوط جسم کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ [illegible] سال کا ایک بچہ بھی تھا۔ جیراں نامی لڑکی بھی جھجکتی ہوئی اندر آگئی۔

"بات کیا ہے جی تھانیدار صاحب؟" عورت نے مضبوط لہجے میں پوچھا "کیا صفو نے ہمارے خلاف کوئی پرچہ درج کروا دیا ہے؟"

"یہ میری بڑی بہو ہے" بوڑھے غلام حیدر نے کہا۔

"پرچے کی بات چھوڑو بی بی مجھے یہ بتاؤ کہ صفو ہے کہاں؟ پرچہ تو ابھی کٹے گا۔"

"آپ سچ سننا چاہتے ہیں؟"

"تمھارا کیا خیال ہے کہ میں اتنی دور سے جھوٹ سننے کے لیے آیا ہوں؟"

"سچی بات یہ ہے جی کہ کُڑی گھر سے بھاگ گئی ہے۔" عورت نے کہا "ہمیں اس کا کچھ پتا نہیں ہے۔"

"تم لوگوں نے تھانے میں رپٹ کیوں نہیں لکھوائی؟"

"رپٹ لکھوانی کوئی ضروری تو نہیں ہے" بوڑھے نے کہا "بندے کو خاندان کی عزت کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟ صفو کو گھر سے بھاگے ہوئے کتنے روز ہوئے ہیں؟"

"نی جیراں، ذرا حساب تے لا۔۔!"

جیراں کچھ پڑھی لکھی معلوم ہوتی تھی، بولی "آج انگریزی کی ستائیس تاریخ ہے۔ یونس چاچا بائیس تاریخ کو شہر آیا تھا۔ صفیہ چاچی اسی دن گھر سے چلی گئی تھی۔"

"آج اسے گھر سے نکلے ہوئے پانچواں روز ہے" میں نے کہا "وہ گھر سے نکل کر کہاں گئی تھی؟"

جیراں کی ماں جس کا نام بعد میں سکینہ معلوم ہوا، بولی۔ "ہمیں کیا پتا کہاں گئی تھی۔ اپنے گھر جاتی تو پتا چل جاتا۔ اس کی بوڑھی ماں نے تو رو رو کے برا حال کر لیا ہے۔"

"گھر سے بھاگنے کی وجہ کیا تھی؟"

"ہمیں کیا پتا" سکینہ نے جواب دیا "میرا دیور تین سال کے بعد گھر آیا اور آتے ہی بیوی سے جھگڑا ہو گیا۔ دونوں اُدھر پچھلے کمرے میں جا کر کچھ کھسر پھسر کرتے رہے پھر یونس زور زور سے بولتا ہوا باہر آیا۔ ہمیں کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ بات کیا ہوئی تھی۔ یونس کہہ رہا تھا کہ وہ ۔۔"

"تھانیدار صاحب، میں اس روز سے ٹھیک طرح کھانا نہیں کھا سکا" بوڑھے غلام حیدر نے نہایت صفائی سے اپنی بہو کی بات کاٹی "پتا نہیں کس کو ہمارے گھر کی نظر لگ گئی ہے۔ یونس کے آنے کی سب کو بڑی خوشی تھی۔ اس کی بیوی تو ناچتی پھرتی تھی۔ اس کے تو پیر زمین پر نہیں ٹکتے

تھے۔ ایک ہفتے سے گھر سجانے میں لگی ہوئی تھی لیکن یونس کے آتے ہی پتا نہیں کیا ہوا۔ دونوں میاں بیوی میں جھگڑا ہوگیا اور گھر کی رونق کا بیڑا غرق ہوگیا۔"

میں نے سکینہ سے پوچھا "جب یونس پچھلے کمرے سے باہر آیا تو وہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"کہنا کیا تھا جی...." بوڑھے نے اپنی بہو کو بولنے کا موقع نہیں دیا۔ "یہی کہہ رہا تھا کہ نہ آتا تو اچھا تھا...."

بوڑھا خاصا ہوشیار شخص معلوم ہوتا تھا۔ ہماری آمد کی وجہ سے اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کی بہو کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوچکی ہے اور غالباً سکینہ کوئی ایسی بات کہنے والی تھی جو یونس کے خلاف جاسکتی تھی۔

"یونس واپس کب آئے گا؟" میں نے پوچھا۔

بوڑھے اور اس کی بہو نے بیک وقت جواب دیا۔ اور دونوں کے جواب ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

سکینہ نے جواب دیا کہ یونس نے بارہ ایک بجے تک واپس آجانے کا وعدہ کیا تھا۔ بوڑھے نے جواب دیا کہ اس کا بیٹا اگلے روز واپس آئے گا۔

اس اثنا میں سکینہ نے جیراں کے کان میں کچھ کہا اور وہ کمرے سے نکل گئی۔

میں نے بوڑھے سے کہا "چاچا! تمھارا بیٹا اپنی بیوی کے پیچھے تو ضرور گیا ہوگا۔"

"مجھے کچھ پتا نہیں ہے جی۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ "یہ لوگ مجھے کچھ بتاتے ہی نہیں۔ اوّل تو وہ پیچھے گیا نہیں ہوگا۔ اگر گیا ہوگا تو صفو واپس آنے پر راضی نہیں ہوئی ہوگی۔"

"یونس، بیوی کے پیچھے نہیں گیا۔" سکینہ نے کہا۔ "پھر صفو کا تو کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ کہاں گئی ہے۔ نہ اپنی ماں کے گھر گئی اور نہ کسی رشتے دار کے گھر۔"

"اس کا مطلب ہے کہ صفو کا آج تک کچھ پتا نہیں چلا۔"

"کچھ پتا چلتا تو ادھر گاؤں میں ہی ہوتی۔"

اس اثنا میں جیراں شربت کے دو گلاس بنا کر لے آئی۔ میں نے ایک گلاس اے ایس آئی کو دیا اور ایک سپاہی کے لیے بھجوا دیا، جو باہر کھڑا تھا۔

جیراں نے پوچھا "آپ کے لیے اور شربت لاؤں؟"

"نہیں۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے لسی پی ہے۔"

اے ایس آئی شربت پی چکا تو میں جانے کے لیے کھڑا ہوگیا اور جاتے جاتے پوچھا "یونس، شہر کب گیا تھا؟"

"کل دوپہر کے وقت گھر سے نکلا تھا۔" سکینہ نے جواب دیا۔ "اس نے کہا تھا کہ وہ رات اُدھر ہی رہے گا۔"

میں نے بوڑھے سے کہا کہ یونس جیسے ہی گھر آئے اسے تھانے بھیج دے۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے رخصت ہوگیا۔

نمبردار کی حویلی کی طرف جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ یونس کل سے غیر حاضر تھا۔ رات کو گھر نہیں پہنچا تھا اور صفو کو گزشتہ رات ہی قتل کیا گیا تھا۔ اس اعتبار سے یونس کی پوزیشن سخت مشکوک تھی۔

حویلی میں نمبردار ہمارا منتظر تھا۔

"کیوں جناب، ہوگئی ملاقات؟" اس نے پوچھا۔

"ملاقات تو نہیں ہوئی۔" میں نے جواب دیا۔ "یونس گاؤں سے باہر گیا ہوا ہے۔ ویسے یہ آدمی کیسا ہے؟"

"پہلے تو بڑا بھلا آدمی تھا۔ اب پیسہ ہاتھ میں آنے کے بعد تھوڑا سا پھنے خان بن گیا ہے۔"

"آپ ایسا کریں کہ اپنا کوئی بھروسے والا آدمی غلام .... کی گلی میں بٹھا دیں۔ اس سے کہیں کہ یونس جیسے ہی واپس آئے ہمیں خبر کر دے۔ کوئی لڑکا ہو تو زیادہ مناسب رہے گا۔"

"آپ کے دو شاگرد کیسے رہیں گے؟"

"کون سے شاگرد؟"

"وہی، جن کو آپ نے انعام دیا ہے۔ وہ طیفی اور جیلا۔"

"ہاں، وہ دونوں خاصے ہوشیار لڑکے ہیں۔"

اس نے دونوں لڑکوں کو بلایا اور انھیں سمجھا کر غلام .... کی گلی میں بھیج دیا۔

تقریباً دو بجے لڑکوں نے آکر خبر دی کہ یونس گھر پہنچ گیا ہے۔ میں نے اسے ایس آئی کو بھیج کر اسے نمبردار کی بیٹھک میں بلا لیا۔ وہ تیس بتیس سال کا خاصا سوہنا جوان تھا۔ اس نے تیکھی قسم کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں اور بوسکی کا کرتا پہن رکھا تھا۔ شلوار سفید لٹھے کی اور پیروں میں پشاوری چپل تھی۔

اس نے پہلے چودھری نور جمال کو اور پھر مجھے سلام کیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ پائی جاتی تھی۔

"بیٹھو، محمد یونس۔" نمبردار نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور متوقع نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"جناب نے مجھے کس لیے یاد فرمایا ہے؟" بالآخر اس نے پوچھا۔

"تمھاری بیوی صفو کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔" اس نے بلاجھجک جواب دیا۔ "میرا اب اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

"وہ گھر چھوڑ کر کیوں گئی ہے؟"

"جناب، یہ تو اسی کو معلوم ہوگا۔"

میں نے سوال کا انداز بدل دیا۔ "اور تمھارا اس سے واسطہ کیوں نہیں رہا؟"

"جو عورت گھر سے بھاگ جائے اس سے کوئی شریف آدمی واسطہ نہیں رکھ سکتا۔"

وہ سیدھا سادہ جواب دینے پر تیار نہیں تھا۔

"محمد یونس، ہمیں گھمن گھیریوں میں ڈالنے کی کوشش نہیں کرو۔ تمھارا اپنی بیوی سے جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟"

"جھگڑا! آپ کس جھگڑے کی بات کر رہے ہیں؟"

اے ایس آئی جو یونس کے جوابات پر خاصا تلملا رہا تھا، اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب، یہاں کی فضا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ادھر تانگے والا بھی پریشان ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ باقی باتیں تھانے چل کر کرلیں گے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم چلو، میں چودھری صاحب سے بات کرکے آتا ہوں۔"

"مجھے اجازت ہے جناب؟" یونس بھی کھڑا ہوگیا۔

اے ایس آئی نے پوچھا "کس بات کی اجازت؟"

"جناب، گھر جانے کی اجازت مانگ رہا ہوں۔"

"گھر تو ہم تمھیں ضرور پہنچائیں گے۔" اے ایس آئی نے کہا۔ "ابھی تو تم ہمارے ساتھ تھانے چل رہے ہو۔"

"لیکن.... جناب.... میرا قصور ــــ؟"

اے ایس آئی نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور اُسے دھکیلتا ہوا باہر لے گیا۔

میں نے چودھری نور جمال کو ایک طرف کر کے کہا۔ "چودھری صاحب، ہمارے جانے کے بعد اس کے رشتے داروں کو صفو کی موت کے بارے میں بتا دیں اور ان سے کہیں کہ جا کر اس کی لاش لے جائیں۔"

چودھری نے پوچھا "کیا آپ کے خیال میں صفو کو اسی نے قتل کیا ہے؟"

"لگتا تو یہی ہے لیکن اصل بات تفتیش کے بعد ہی معلوم ہوگی۔"

چودھری قدرے تامل کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے صفو کے بارے میں ایک بات سنی تھی۔ پتا نہیں سچی ہے یا جھوٹی۔ ادھر موچیوں کا ایک لڑکا ہے۔ بدر دین اس کا نام ہے۔ ویسے بدری کے نام سے مشہور ہے۔ کچھ پہلوانی وغیرہ بھی کرتا ہے اور ذرا بدمعاش ٹائپ کا لڑکا ہے۔ سنا ہے کہ اس کی صفو سے کچھ بات چیت وغیرہ تھی۔"

"یہ بات آپ کو کہاں سے معلوم ہوئی ہے؟"

"یہ بات میں نے گامی کمہار سے سنی تھی۔ اس کا بدری سے بہت میل میلاپ ہے۔"

اس بات کی تصدیق ضروری تھی۔ میں نے اے ایس آئی کو رکنے کے لیے کہا اور سپاہی کو ایک مقامی نوجوان کے ہمراہ گامی کمہار اور بدری کو بلانے کے لیے بھیج دیا۔

وہ پندرہ بیس منٹ کے بعد واپس آگیا۔ اس کے ساتھ ایک چھیچھڑا سا نوجوان تھا جس نے میلی سی دھوتی اور بنیان پہن رکھی تھی۔ سر اس کا گھٹا ہوا تھا اور پیروں سے ننگا تھا۔ اس نے آتے ہی جھک کر مجھے سلام کیا اور عاجزی سے ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

"یہ گامی کمہار ہے جناب۔" سپاہی نے کہا۔ "بدری کے متعلق پتا چلا ہے کہ وہ پنڈ سے باہر گیا ہوا ہے۔"

میں نے گامی سے کہا۔ "سنا ہے تمھاری بدری بدمعاش سے بڑی دوستی ہے۔"

"ناں جناب، میں غریب کمہار۔ سارا دن بھانڈے بناتا ہوں۔ میری کسی بدمعاش سے یاری نہیں ہے۔" اس نے عاجزی سے کہا۔ "مجھے تو مٹی گارے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔"

"تم نے نمبردار کو بدری اور صفو کے بارے میں کیا بتایا تھا؟"

"وہ تو جناب، بڑی پرانی بات ہے۔ ایک روز ہم ادھر کھوہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بدری ڈنڈ بیٹھکیں نکالنے کے بعد ادھر نہانے کے لیے آیا تھا۔ نہانے کے بعد اس نے اپنی اور صفو کی محبت کا قصہ سنایا۔ کہنے لگا کہ صفو اس سے چھپ چھپ کر ملتی ہے۔ میں نے یہ بات چودھری صاحب کو بتا دی۔"

"کیا تم نے کبھی صفو کو بدری سے ملتے دیکھا تھا؟"

"ناں جناب، میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ میں تو صفو کو شریف عورت سمجھتا ہوں۔ وہ ایک موچی کو منہ نہیں لگا سکتی۔ بدری کو تو چھڑیں مارنے کی عادت ہے۔"

میں نے اُسے رخصت کر دیا۔ بدری کے بارے میں پتا چلا کہ وہ گاؤں سے باہر گیا ہوا تھا۔ نمبردار نے کہا کہ وہ بدری کو تھانے حاضر ہونے کی تاکید کر دے گا۔

ہم نے یونس کو ساتھ لیا اور تانگے میں رخصت ہوگئے۔

شام کے وقت یونس کے رشتے دار صفو کی لاش لینے

پہنچ گئے۔ ان میں یونس کا بڑا بھائی بھی شامل تھا۔ وہ یونس سے ملنا چاہتے تھے، مگر میں نے اجازت نہیں دی۔

اگلی صبح میں نے یونس کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ایک رات حوالات میں گزارنے کے بعد اس کا مزاج خاصا ٹھیک ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "محمد یونس، اب تو تمھیں یاد آ گیا ہوگا کہ تمھاری بیوی کہاں ہے؟"

"جناب، میں سچ کہتا ہوں مجھے صفو کا کچھ علم نہیں ہے۔ وہ ناراض ہو کر گھر سے چلی گئی تھی۔" اس نے عاجزی سے جواب دیا۔ "اس کے بعد مجھے اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔"

"جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟"

"وہ... جی معمولی سی بات تھی۔" اس نے تامل کرتے ہوئے جواب دیا۔ "کچھ روپے پیسے کی بات تھی... آپ کو تو پتا ہی ہے کہ عورتیں فضول خرچ ہوتی ہیں...۔"

اس کا چہرہ اور طرزِ تکلم بتا رہا تھا کہ وہ بات اس نے اسی وقت گھڑی تھی۔

"برخوردار، اتنی معمولی بات پر کوئی عورت گھر چھوڑ کر نہیں جایا کرتی۔" میں نے کہا۔ "اگر جائے بھی تو اپنے میکے جاتی ہے۔ ہمیں سچ اگلوانا بڑی اچھی طرح سے آتا ہے۔ تم شریف آدمی ہو، اس لیے ہم دوسرا طریقہ استعمال نہیں کرنا چاہتے۔ بہتر یہی ہے کہ شرافت سے سب کچھ بتا دو۔ تم تین سال کے بعد گھر آئے ہو۔ تمھارے باپ نے مجھے بتایا ہے کہ صفو تمھاری آمد کی خبر سن کر بہت خوش تھی اور سارے گھر میں ناچتی پھرتی تھی۔ وہ کئی دنوں سے گھر سجانے میں لگی ہوئی تھی۔ پھر ایسی کون سی بات ہو گئی تھی کہ تم نے آتے ہی اسے گھر سے، بلکہ گاؤں سے ہی نکال دیا؟"

"مم... میں یہ بات نہیں بتا سکتا۔"

"ہمیں ساری بات معلوم ہو چکی ہے۔" میں نے اسے چکر دیا۔ "موچیوں کے بیٹے بدری اور گاما نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے، لیکن میں تمھارے منہ سے بھی یہ بات سننا چاہتا ہوں۔"

"بب... جی!" وہ پریشانی سے بولا۔ "بدری نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کمینے نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی کو یہ بات نہیں بتائے گا۔"

تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ میں نے کہا۔ "اس ٹٹ پونجیے بدمعاش کی کیا جرأت کہ وہ ہم سے کچھ چھپا سکے لیکن میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس شخص کی باتوں میں جھوٹ کتنا ہے۔"

ایک طویل توقف کے بعد یونس نے ساری بات بتا دی۔

اس نے بتایا کہ جب اس کی شادی ہوئی تو ان کے مالی حالات بہت خراب تھے۔ اتنے خراب کہ بعض اوقات انھیں فاقے کرنے پڑتے تھے۔ وہ تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا۔ شادی کے دو ماہ بعد وہ ملازمت کی تلاش میں لاہور چلا گیا۔ وہاں تین چار مہینے تک چھوٹے موٹے کام کرتا رہا، پھر اُسے ایک واقف کار کی مہربانی سے ایران کی ایک تیل کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ وقت تھوڑا تھا، اس لیے وہ گھر والوں سے ملنے بھی نہ آ سکا۔

ایران میں تنخواہ بہت اچھی تھی۔ اوور ٹائم کرنے کے مواقع بھی تھے۔ وہ ڈبل ڈیوٹی کرتا رہا اور خود تکلیف اٹھا کر رقم گھر بھیجتا رہا۔ تین سال کے دوران اس نے بہت کم آرام کیا۔ وہ ہر وقت اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ خاص طور پر صفو اُسے بہت یاد آتی تھی۔ وہ اپنے ہر خط میں یہی لکھتی تھی کہ جلدی واپس آ جاؤ۔

گاؤں کو جو ریلوے اسٹیشن لگتا تھا۔ وہ تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھا۔ آگے کا سفر تانگے پر کرنا پڑتا تھا۔

یونس نے مجھے بتایا کہ جب وہ ریلوے اسٹیشن پر اُترا تو بہت خوش تھا۔ اس کا صندوق تحفوں سے بھرا ہوا تھا اور دل گھر پہنچنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

اسٹیشن پر تین افراد اسے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان میں ایک بدری بھی تھا۔ بدری اگرچہ اچھا آدمی نہیں تھا، تاہم یونس سے اس کی پرانی یاری تھی۔

جب وہ ایک دوسرے سے گلے مل چکے تو بدری یونس کو ایک طرف لے گیا اور بولا۔ "یونس، میں تمھیں ایک بہت بُری خبر سنانے والا ہوں۔ ذرا اپنے دل کو مضبوط کر لو۔"

"بُری خبر؟" یونس نے گھبرا کر پوچھا۔ "ابا تو خیریت سے ہے نا؟"

"چاچا خیریت سے ہے۔" بدری نے کہا۔ "خبر تمھاری بیوی کے بارے میں ہے۔ میری بات کا بُرا نہ ماننا۔ میں تمھارا پرانا یار ہوں۔ تمھارے دکھ میرے دکھ اور تمھاری خوشی میری خوشی ہے۔ میں تمھیں اپنا سمجھ کر بات کر رہا ہوں...۔"

"بات کیا ہے، بدری؟" یونس نے بے چینی سے پوچھا۔

"یونس، بات یہ ہے کہ تمھاری غیر حاضری میں بھرجائی ٹھیک نہیں رہی...۔"

"بدری ــــ!" یونس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "ذرا سوچ کر بات کرنا۔ یہ عزت اور غیرت کی بات ہے۔"

"اگر بات غلط نکلے تو میری گردن حاضر ہے۔" بدری نے

"بھرجائی نے گاؤں کے کسی جوان سے یارانہ لگا رکھا تھا۔ راتوں کو چھپ چھپ کر اس سے ملتی تھی۔"

"اوہ، میرے خدا!" یونس نے سر پکڑ لیا۔ "بدری، تم نے بڑی بات کہہ دی ہے۔ تمھارے پاس کوئی ثبوت بھی ہے یا سنی سنائی بات کر رہے ہو؟"

"میں اتنی بڑی بات بغیر ثبوت کے کیسے کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے صفو کو ایک مرد سے ملتے دیکھا تھا۔ وہ آٹے کی چکی کے پیچھے والے کنوئیں پر ملاقاتیں کرتے تھے۔ تم بھرجائی سے صرف اتنا پوچھنا کہ وہ راتوں کو آٹے کی چکی کے پیچھے والے کنوئیں پر کس سے ملنے جاتی تھی۔"

یونس نے بتایا کہ اس خبر سے اس کے سینے میں آگ لگ گئی۔ اس کی ساری خوشی غارت ہو گئی پھر بھی اُسے بدری کی بات پر پورا یقین نہیں تھا۔ وہ سارے راستے یہی دعا کرتا آیا کہ اللہ کرے بدری کی بات جھوٹی نکلے۔

گھر پہنچ کر وہ جلدی جلدی سب سے ملا، پھر صفو کو اپنے کمرے میں لے گیا اور کہا۔ "صفو، تم تین سال بھی میرا انتظار نہ کر سکیں۔"

یہ سن کر صفو کا رنگ سفید پڑ گیا۔ بولی۔ "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"صفو، عشق اور مشک چھپانے سے نہیں چھپ سکتا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم چکی کے پیچھے والے کنوئیں پر راتوں کو کسی شخص سے ملاقاتیں کرتی تھیں۔"

یونس نے مجھے بتایا کہ یہ سن کر صفو پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی، مگر منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ یہ دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ بدری نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔

"مجھے اس شخص کا نام بتاؤ۔" اس نے کہا۔

لیکن صفو کچھ نہیں بولی۔ یونس نے کہا کہ وہ کچھ دیر تک اس سے اس کے آشنا کا نام پوچھنے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر وہ کمرے سے نکل گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد پتا چلا کہ صفو گھر سے بھاگ گئی ہے۔ وہ پچھلے دروازے سے نکل گئی تھی۔

یونس نے مجھے ساری بات نہیں بتائی تھی۔ واضح طور پر اس نے بہت سی باتوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ تاہم ان کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

میں نے پوچھا۔ "جب صفو گھر سے بھاگ گئی تو تم نے کیا کیا؟"

"میں نے اپنے گھر والوں سے کہہ دیا کہ کوئی شخص صفو کے پیچھے نہیں جائے گا۔ اس کے علاوہ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"برخوردار، جھوٹ بولنے سے جان نہیں چھوٹے گی۔ یہاں مشکوک چال چلن والی بیویوں کو لوگ قتل کر دیا کرتے ہیں۔ یہی اس علاقے کی ریت ہے اور تم نے بھی یہی کیا ہے۔"

"جی ... یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"تمھاری بیوی کی لاش برآمد ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم سے غلطی یہ ہوئی کہ تم نے دوپٹا اس کے گلے میں ہی رہنے دیا۔"

"مم... میری بیوی کی لاش! کک... کیا صفو مر چکی ہے؟ یہ... یہ کب کی بات ہے؟"

"یہ بات تو تم بتاؤ گے، بچو!" میں نے کہا۔ "فی الحال تم حوالات میں بیٹھ کر سوچو۔ تمھارے رشتے دار صفو کی لاش گاؤں لے گئے ہیں اور اس کی تجہیز و تکفین بھی ہو چکی ہوگی۔"

یہ سن کر اس نے رونا شروع کر دیا۔

میں نے شام تک بدری کا انتظار کیا، مگر وہ نہیں آیا۔ اگلے روز میں چند آدمیوں کو ساتھ لے کر دوبارہ موضع ٹاہلیاں پہنچ گیا۔ چودھری نور جمال نے بتایا کہ اس نے بدری کو تھانے پہنچنے کی ہدایت کر دی تھی۔

میں نے بدری کا پتا پوچھا اور کوئی انتظار کیے بغیر اس کے گھر پہنچ گیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے میں نے دو آدمی مکان کے پچھواڑے کی طرف بھجوا دیے۔ سامنے کی طرف دو دروازے تھے۔ ایک صحن کی طرف اور ایک بیٹھک کا۔ لہٰذا میں نے بیٹھک کے دروازے پر دستک دی۔

کچی دیوار کے اوپر ایک سر نمودار ہوا اور فوراً غائب ہو گیا۔ میں نے دوبارہ قدرے زور سے دستک دی۔ کچھ دیر بعد بیٹھک کا دروازہ کھلا اور ایک عورت کی جھلک دکھائی دی۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟" اس نے پوچھا۔

"بدری کو باہر بھیجو۔" میں نے کہا۔ "اس سے کہو تھانیدار آیا ہے۔"

جب میں یہ بات کر رہا تھا تو میں نے ایک عورت کو صحن والے دروازے سے باہر نکلتے دیکھا۔ اس نے سفید شٹل کاک برقع پہن رکھا تھا۔ اس کے پیروں میں گرگابی تھی جس کے اوپر سرخ شلوار کے پائنچوں کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

"بدر دین تو گھر پر نہیں ہے جی۔" عورت نے جواب دیا۔

لیکن میرا دھیان برقع والی عورت کی طرف ہو گیا تھا۔ اس میں مجھے چند خامیاں محسوس ہوئیں۔ مثلاً گرگابی اس کے

پیروں میں تنگ تھی اور شلوار کچھ اونچی تھی۔ تیسری خامی اس کی چال میں تھی۔ اگرچہ وہ آہستہ چل رہی تھی مگر اس کا قدم خاصا لمبا تھا۔ میں نے حوالدار کو اشارہ کیا اور تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔

اس نے ہمیں اپنی طرف آتے دیکھا تو گلی پار کر کے تیزی سے ایک کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہو گئی۔

"دوڑو۔" میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور خود بھی برقع والی کے پیچھے دوڑا۔

جس دروازے میں وہ داخل ہوئی تھی، وہ ایک کھلے صحن کا دروازہ تھا۔ اندر چند مویشی بندھے ہوئے تھے اور دروازے میں قدم رکھتے ہی میری نظر دو چیزوں پر پڑی۔ دروازے کی اندرونی جانب سفید برقع اور گرگابی پڑی تھی۔ دوسری طرف ایک نوجوان جس نے سرخ شلوار پہن رکھی تھی، سامنے والی دیوار پھاند رہا تھا۔

میں نے سپاہیوں کو گلی کی طرف بھگایا اور دوڑتے دوڑتے ریوالور نکال کر ایک ہوائی فائر کیا۔

سرخ شلوار والا بدری تھا۔ وہ میری وارننگ کی پروا کیے بغیر گلی میں کود گیا۔ گارے کی بنی ہوئی وہ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں دیوار کے اوپر چڑھا اور گلی میں کودتے ہی ایک اور ہوائی فائر کیا۔

بدری گلی میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ ابھی وہ گلی کے سرے سے کچھ ادھر ہی تھا کہ دوسری طرف سپاہی نمودار ہوا۔ بدری گھبرا کر واپس مڑا اور ایک اور دیوار پھاندنے کی کوشش کی۔ سپاہی تیزی سے اس کے قریب پہنچا اور اس کی ٹانگ پکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ دھپ سے گلی میں گرا لیکن آدمی بڑا جی دار تھا۔ گرتے ہی کھڑا ہو گیا اور بڑی پھرتی سے سپاہی کو ایسا دھوبی پٹرا مارا کہ وہ چاروں شانے چت ہو گیا۔

تب مجھے نمبردار کی بات یاد آئی کہ بدری پہلوانی بھی کرتا تھا۔ سپاہی اس کے مقابلے میں خاصا کمزور تھا۔

فائرنگ اور شور کی آواز سن کر گاؤں والے بھی گھروں سے نکل آئے تھے۔ کچھ نوجوانوں نے بدری کو گھیرنے کی کوشش کی مگر وہ کبڈی کے داؤ لگا رہا تھا اور چکنی مچھلی کی طرح ہاتھوں سے نکل جاتا تھا۔ اسی اثنا میں میں بھی اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"رک جاؤ، بدری۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "ورنہ میں گولی مار دوں گا۔"

اسے رکنا ہی پڑا۔ حوالدار نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی جس سپاہی کو اس نے دھوبی پٹرا مار کر گرایا تھا۔ اس نے آتے ہی چند کرارے ہاتھ جما دیے۔

منظر ویسے عجیب تھا۔ بدری نے ٹخنوں سے اونچی سرخ زنانہ شلوار پہن رکھی تھی اور پیروں سے ننگا تھا۔ خاصا تنومند جوان تھا۔

"تھانیدار صاحب! مجھے کس جرم میں پکڑا گیا ہے؟" اس نے گردن پھلا کر پوچھا۔ "میں شریف آدمی ہوں۔"

حوالدار نے اسے گریبان سے پکڑ کر کہا۔ "تمھارا جرم یہ ہے کہ تم برقع پہن کر چوری کی نیت سے پرائے گھر میں گھسے تھے۔"

میں نے ایک سپاہی سے کہا۔ "جاؤ، اُدھر سے اس کا برقع اور گرگابی اٹھا لاؤ۔"

بدری نے کہا۔ "جناب، میں نے تو آپ لوگوں کے ڈر سے برقع پہنا تھا۔ میں چور نہیں ہوں جی۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "ہم سے کس بات کا ڈر ہے تمھیں؟ کیا ہم تمھارے دشمن ہیں؟"

"پھر بھی جناب، ڈر تو ہوتا ہی ہے۔"

"پھر تو ان لوگوں کو بھی برقعے پہن کر گھروں سے نکلنا چاہیے۔" میں نے وہاں جمع ہو جانے والوں کی طرف اشارہ کیا۔

لوگ اس کا حلیہ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

"مائی باپ، مجھے شلوار بدلنے کی اجازت تو دے دیں۔" اس نے کہا۔ "یہ لوگ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔"

"یہی تو تمھارے جرم کا ثبوت ہے۔" حوالدار نے کہا۔

ہم اسے لے کر نمبردار کی حویلی پہنچ گئے۔ نمبردار کا آدمی حسب سابق لسی کا ڈول بھر کے لے آیا۔

کچھ دیر دم لینے کے بعد میں نے بدری سے پوچھا۔ "تم تھانے کیوں نہیں آئے؟ چودھری صاحب نے تمھیں پیغام بھی دیا تھا۔"

"حضور، میں بس آنے ہی والا تھا۔"

"برقع پہن کر؟"

"بس جی غلطی ہو گئی۔" اس نے مکاری سے ہاتھ جوڑے۔ "میں سمجھا، آپ مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "تم نے یہ کیوں سمجھا؟"

"پرسوں آپ میرے یار کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہیں مجھے بھی نہ پکڑ لیں۔"

"او، پر کیوں؟" میں نے زور دے کر پوچھا۔ "کیا جرم کیا ہے تم نے؟"

"جرم تو کوئی نہیں کیا۔ میں ذرا وہمی بندہ ہوں۔"

"وہم تو ہم تیرا تھانے میں جا کر نکالیں گے۔" اے ایس آئی نے کہا۔ "یہاں تو سیدھی بات نہیں کرے گا۔"

"جناب، بات ہی کوئی نہیں ہے۔ میں تو ہر بات بتانے کو تیار ہوں۔ آپ جو چاہیں، پوچھ لیں۔"

میں نے پوچھا۔ "یونس کو تو نے کیا بتایا تھا؟"

"کس بارے میں؟" اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"اس کی بیوی صفو کے بارے میں۔"

"مم... میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔" وہ تھوڑا سا گھبرایا۔ "جو حقیقت تھی وہی بتائی تھی۔"

"وہ حقیقت ہم بھی سننا چاہتے ہیں۔"

"جناب، وہ کیا کہتے ہیں... کہ مرنے کے بعد کسی کی برائی نہیں کرنی چاہیے۔"

میں نے نمبردار سے پوچھا۔ "حویلی میں کوئی خالی کمرا ہو گا؟"

"یہی کمرا خالی کر دیتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "آپ آرام سے اپنی کارروائی کریں۔"

"چودھری صاحب، میں شریف آدمی ہوں۔" بدری نے عاجزی سے کہا۔ "ذرا میری سفارش کر دیں..."

"اوئے شریف آدمی اڑی نہیں کیا کرتے۔" نمبردار نے کہا۔ "بندے دا پتر بن کے ساری بات بتا دے۔ ملک صاحب جو سوال کریں تو اس کا سیدھا جواب دے۔"

"حضور، بات ذرا پردے والی ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ لوگ ذرا باہر چلے جائیں۔ میں ملک صاحب کو سب کچھ بتا دیتا ہوں۔"

نمبردار نے سخت نظروں سے اسے گھورا اور اپنے آدمیوں سمیت اٹھ کے باہر چلا گیا۔

"حضور، بات صرف اتنی ہے کہ... صفو کا کسی سے یارانہ تھا۔ وہ رات کو کھوہ پر اس سے ملا کرتی تھی۔ میں نے یہ بات یونس کو بتا دی کیونکہ وہ میرا لنگوٹیا یار ہے۔ اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے۔"

"اس آدمی کا نام کیا ہے جس سے صفو ملا کرتی تھی؟"

"مم... میں اس آدمی کو نہیں جانتا۔"

"اوئے، اس کا کیا مطلب ہے؟ گاؤں میں تو ہر شخص ایک دوسرے کو جانتا ہے۔ کیا وہ گاؤں کا آدمی نہیں ہے؟"

"ہو گا تو گاؤں کا ہی، پر میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔"

میں نے حوالدار کو اشارہ کیا۔ اس نے بدری کی گردن پر زوردار ہاتھ جمایا۔

"اوئے، تو نے آدمی کو دیکھے بغیر ایک شریف لڑکی پر الزام لگا دیا۔ تجھے کوڑے پڑنے چاہئیں۔" میں نے کہا۔

"ملک صاحب، اس کو تو پھانسی پر لٹکا دینا چاہیے۔" حوالدار نے کہا۔ "یہ اس معصوم لڑکی کا قاتل ہے۔"

"تھانیدار صاحب، میں بالکل بے قصور ہوں جی۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ بتا دیا۔"

"اوئے، پھر وہی بات۔ کیا دیکھا تھا تو نے؟ آدمی کی شکل تو تو نے دیکھی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا ماما ہو، چاچا ہو یا بھائی ہو۔ تو نے دیکھے بغیر اپنے یار کا گھر اجاڑ دیا۔ لڑکی اپنی جان سے گئی۔ تجھے میں سزا دلائے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ اگر تیرے جیسے بدمعاش لوگوں کی بہو بیٹیوں کی نگرانی کرنے لگے تو پھر کسی کی عزت بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ چلو، اس کو تھانے لے چلو۔ وہاں چل کے اس کا دماغ ٹھیک کریں گے۔"

"ملک جی، ٹھہر جاؤ جی، میں آپ کو ساری بات سچ سچ بتا دیتا ہوں۔"

حوالدار نے ایک اور ہاتھ اس کی گردن پر جمایا، بولا۔ "اوئے، ابھی کوئی سچ باقی ہے؟"

"میں نے جی، ایک شریف آدمی کی عزت کی خاطر اصل بات چھپائی تھی لیکن اب میں کچھ نہیں چھپاؤں گا۔"

"اچھا، اصل بات بھی سن لیتے ہیں۔"

اس نے بتایا کہ چند ماہ قبل وہ آٹے کی چکی کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اس نے کنوئیں کی طرف سے کسی آدمی کے بولنے کی آواز سنی۔ وہ رات کا وقت تھا اور کھیتوں میں گہری تاریکی تھی۔ آواز سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ پھر اس نے کسی عورت کی آواز بھی سنی۔ وہ کماد کی اوٹ میں چلتا ہوا آگے بڑھا اور ایک پیڑ کے پیچھے جا ٹھہرا۔

مرد کی آواز جانی پہچانی تھی۔ اس نے آواز پر کان لگائے۔ وہ فتح محمد پٹواری کی آواز تھی۔

بدری تھوڑا سا اور آگے بڑھا۔ تاریکی میں اسے فتح محمد کے علاوہ ایک عورت کا ہیولا بھی دکھائی دیا۔ وہ سر جھکائے چپ کھڑی تھی۔ فتح محمد پٹواری اسے کسی بات پر ڈانٹ رہا تھا۔ بدری کے دل میں خیال آیا کہ وہ فتح محمد کے گھر کی کوئی عورت تھی جو ناراض ہو کر اُدھر آ گئی تھی لیکن جب فتح محمد نے اسے صفو بیٹی کہا تو بدری کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "صفو بیٹی، شریف بہو بیٹیوں کو ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔ وہ جو کوئی بھی ہے اسے بھول جا۔ آج کے بعد اس طرح گھر سے قدم نہ نکالنا۔ تیرا آدمی پردیس میں دھکے کھاتا پھر رہا ہے اور تو یہاں ایسی حرکتیں

کرتی پھرتی ہے اگر کسی نے تجھے دیکھ لیا تو سارے گاؤں میں تیرا نام بدنام ہو جائے گا اور یونس تو تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"چاچا! میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ ادھر نہیں آؤں گی۔" صفو نے کہا۔ "تو نے مجھے بیٹی کہا ہے تو بیٹی سمجھ کر ہی میری پردہ پوشی کرنا۔"

"چل، میں تجھے گھر چھوڑ آؤں۔" فتح محمد نے کہا۔

بدری نے کہا کہ دونوں کے جانے کے بعد اس نے کنوئیں کے آس پاس چل پھر کر دیکھا، مگر وہاں اسے کوئی بندہ دکھائی نہیں دیا۔

میں نے اسے حوالدار کی تحویل میں چھوڑا اور نمبردار کے ایک آدمی کو ساتھ لے کر فتح محمد پٹواری کے گھر پہنچ گیا۔ ہماری دستک کے جواب میں ایک ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک صحت مند اور خوش اخلاق عورت تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ فتح محمد پٹواری کی بیوی آمنہ بی بی تھی۔

رسمی کلمات کے بعد اس نے مجھے بیٹھک میں بٹھایا اور میرے استفسار کے جواب میں بتایا کہ اس کا شوہر سرکاری کام کے سلسلے میں تحصیل ہیڈ کوارٹر گیا ہوا ہے۔

"واپسی کب تک ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"امید ہے کہ پانچ چھ بجے تک آجائیں گے۔"

میں نے اٹھنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔ "تو میں پھر چلتا ہوں۔ کل کسی وقت آجاؤں گا۔"

"آپ غالباً صفو کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں۔" اس نے مجھے چونکا دیا۔ اس کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پڑھی لکھی اور خاندانی عورت تھی۔

میں نے پوچھا۔ "آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں صفو کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں؟"

اس نے سادگی سے جواب دیا۔ "ایک نہ ایک دن تو یہ بات کھلنی ہی تھی کہ صفو نے ہمارے گھر میں پناہ لی تھی۔"

"جی!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "صفو نے آپ کے گھر میں پناہ لی تھی، یہ کب کی بات ہے؟"

"ملک صاحب! اگر صفو زندہ ہوتی تو میں یہ بات چھپانے کی کوشش کرتی۔ مگر اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بے چاری منوں مٹی تلے دب چکی ہے۔ اس کے ظالم شوہر نے اسے مار کر ہی دم لیا۔"

اس کی نوجوان بیٹی بھی کمرے میں آگئی۔ اس کا نام رضیہ تھا اور اس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ صفو کی گہری دوست تھی۔ دونوں باری باری صفو کے بارے میں بتانے لگیں۔

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی ذمے دار آدمی کو یہ باتیں بتانے کے لیے سخت بے چین تھیں۔

انھوں نے خاصی حیرت انگیز تفصیل بتائی۔ اسے میں مختصر کر کے اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔

آمنہ بی بی نے بتایا کہ بائیس تاریخ کو صبح کے تقریباً گیارہ بجے کسی نے بہت زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس وقت وہ چولھے پر ہانڈی چڑھانے کے بعد کمروں کی صفائی کر رہی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی رضیہ کو آواز دی اور دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔

رضیہ نے بتایا کہ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، صفو ہانپتی ہوئی اندر گھسی اور دروازے کی کنڈی چڑھا کر اندر کی طرف بھاگی۔ وہ پیروں سے ننگی تھی اور جوتیاں ہاتھ میں پکڑ رکھی تھیں۔ ماں بیٹیاں اُسے بدحواس دیکھ کر گھبرا گئیں۔

آمنہ نے پوچھا۔ "صفو، بات کیا ہے؟ تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

"مجھے جلدی سے کہیں چھپا دیں۔" صفو نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "میں نے دروازے کھڑکیاں بند کر دیں۔ وہ... وہ یونس مجھے قتل کر دینا چاہتا ہے۔ وہ چھری لینے گیا تھا۔ میں... میں بھاگ کر ادھر آگئی۔ مجھے بچا لیں... مجھے بچا لیں۔ وہ... وہ مجھے مار ڈالے گا۔" اس نے کونے میں پڑے ہوئے پلنگ کے نیچے گھسنے کی کوشش کی۔

آمنہ بی بی نے دیوار کے اوپر سے گلی میں دیکھا، مگر یونس کہیں نظر نہیں آیا۔ اس نے اندر جا کر صفو کو تسلی دی اور کہا۔ "گھبراؤ نہیں، گلی میں کوئی نہیں ہے۔ تم اطمینان سے بیٹھو۔ ہمارے گھر میں کوئی نہیں داخل ہو سکتا۔ اگر کسی نے ایسی کوشش کی تو میں بندوق نکال لوں گی۔"

اس نے صفو کی تسلی کے لیے اپنے شوہر کی شاٹ گن نکال کر قریب رکھ لی اور پوچھا۔ "بات کیا ہوئی ہے؟"

صفو کی کچھ ہمت بندھی۔ اس نے سوچا، اگر یونس کو پتا چل جاتا کہ وہ کہاں گئی ہے تو وہ اتنی دیر میں وہاں پہنچ چکا ہوتا۔ اس نے پانی کا ایک گلاس پیا اور قدرے سنبھل کر بیٹھ گئی۔

رضیہ نے کہا۔ "تمھارا شوہر تو آج ہی گھر واپس آیا ہے، آتے ہی کیا بات ہو گئی؟"

"کسی نے اس کے کان بھر دیے ہیں۔" صفو نے جواب دیا۔ "اور میرا خیال ہے کہ یہ بدری کی حرکت ہے۔ وہ یونس کو اسٹیشن پر لینے گیا ہوا تھا۔ اس نے مجھ پر گندے الزام لگائے ہیں۔ اُسے ڈر ہو گا کہ میں یونس سے اس کی شکایت نہ کر دوں۔"

"یہ بدری تو ہے ہی ذلیل آدمی۔" آمنہ بی بی نے کہا۔

فیل کی بیٹی بشیراں بتا رہی تھی کہ ایک روز بدری اس کا ...ک کر کھڑا ہو گیا تھا۔"

"میرے ساتھ بھی اس نے یہی حرکت کی تھی۔" صفو نے ...یں کھوہ پر پانی بھرنے جا رہی تھی کہ یہ اچانک میرے ...یں آ گیا اور میرے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ میں نے ...ہنے، تجھے شرم نہیں آتی پرائی عورتوں کو چھیڑتے ہوئے؟ ...تہ چھوڑ دے، نہیں تو میں کھپ پا کے سارا پنڈ اکٹھا ...گی۔ ڈھیٹ بن کے بولا۔ "نواز علی مجھ سے زیادہ اچھا ...ہے۔"

صفو کے منہ سے یہ بات نکل تو گئی لیکن وہ فوراً ہی اپنی ...پریشان نظر آنے لگی۔ نواز علی گاؤں کے پرائمری اسکول ...د تھا اور صفو کے پڑوس میں رہتا تھا۔ آمنہ بی بی نے مجھے ...نواز علی کا غلام حیدر کے گھر آنا جانا تھا اور وہ ان کے ...موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا۔ جن میں زیادہ تر لکھنے ...کے کام ہوتے تھے۔

رضیہ نے بتایا کہ صفو اس وقت تو نواز علی کی بات گول ...مگر بعد میں ساری بات بتا دی۔

اس نے بتایا کہ شروع میں اس کے دل میں کوئی ایسا ویسا ...یں تھا لیکن شوہر کی عدم موجودگی اور منہ زور جوانی کی موجودگی ...سے نواز علی کی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس کے قرب ...سے سکون ملتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تعلق گہرا ہوتا چلا گیا اور ...تی کی حدوں کو چھونے لگا۔

صفو کا جی چاہتا کہ نواز ہر وقت اس کے پاس بیٹھا رہے ...یں یہ بات ممکن نہیں تھی۔ ایک روز نواز نے کنوئیں پر ...کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ شروع میں صفو نے انکار کر دیا۔ ...تنہائی میں کنوئیں پر جانا اس کے خیال میں ایک ناممکن ...ت تھی لیکن لمبی لمبی تنہا راتوں میں بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے ...یہ بات ممکن معلوم ہونے لگی۔

...اس کا کمرا الگ تھلگ تھا۔ بچے کوئی نہیں تھا۔ دات کے ...کو اس کی غیر حاضری کا پتا نہیں چل سکتا تھا۔ پھر کنواں ...ں نہیں تھا۔ پچھلی طرف ایک چھوٹی سی گلی تھی جس کے ...بت شروع ہو جاتے تھے۔

...نے رات کو کئی بار گلی میں جھانکا۔ گلی ہمیشہ سنسان رہی ...تی۔

بالآخر اس نے نواز سے کنوئیں پر ملنے کا وعدہ کر لیا۔ ...ت وہ بہت ڈر رہی تھی لیکن کچھ نہیں ہوا۔ وہ کنوئیں پر ...نواز کو اپنا منتظر پایا۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ خیریت سے واپس آ گئی۔ نہ گھر والوں کو پتا چلا اور نہ باہر والوں کو۔

جھجک دور ہو گئی۔ خوف جاتا رہا۔ وہ ہفتے میں ایک آدھ بار کنوئیں پر جاتی اور نواز سے مل کر واپس آ جاتی۔

ایک روز فتح محمد پٹواری نے اسے دیکھ لیا۔ نواز جلدی سے کھیتوں میں گھس گیا۔ فتح محمد نے اس کی جھلک ضرور دیکھی لیکن اسے پہچان نہ سکا۔ اس نے اس بارے میں کوئی تجسس نہ کیا اور صفو کو سمجھا بجھا کر گھر بھیج دیا۔

صفو اپنے وعدے پر قائم رہی اور دوبارہ کنوئیں پر نہیں گئی لیکن اسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ بدری نے فتح محمد پٹواری کی باتیں سن لی تھیں۔

اگر اسے یہ بات پہلے معلوم ہو جاتی تو وہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچ لیتی لیکن جب یونس نے اس سے اچانک سوال کیا تو اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس نے اسے یہ بتانے کی کوشش کی کہ بدری نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اس کے راز کو راز رکھنے کی قیمت طلب کی تھی لیکن اس نے بدری کو جھڑک دیا تھا، دھتکار دیا تھا اور بدری نے اس بات کا بدلا لیا تھا۔

صفو یہ ساری باتیں اپنے شوہر کو بتانا چاہتی تھی مگر اس کی زبان نے ساتھ نہ دیا۔ وہ گنگ ہو گئی تھی۔ اس کی خاموشی سے یونس کو یقین ہو گیا کہ بدری کی ایک ایک بات سچ تھی۔

صفو نے آمنہ بی بی کو بتایا کہ یونس نے اسے خاموش دیکھ کر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور چیخ کر بولا۔ "بتا کون ہے وہ تیرا یار... تو کس سے چھپ کر ملتی تھی۔ مجھے اس کا نام بتا... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ جلدی بتا... آج میں تیرا فیصلہ کر کے چھوڑوں گا۔ میں پردیس میں مشقت کرتا رہا اور تو یہاں یاریاں لگاتی رہی۔ بتا اس کا نام... پہلے میں تیرا پیٹ پھاڑوں گا، پھر جا کر اس کی شاہ رگ کاٹوں گا۔"

صفو چیخیں مارنے لگی۔ وہ سمجھ گئی کہ یونس اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

شور کی آواز سن کر سارا گھر اکٹھا ہو گیا اور صفو کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ یونس نے اچانک صفو کو چھوڑ دیا اور باورچی خانے کی طرف بھاگا۔ سب سمجھ گئے کہ وہ چھری لینے گیا ہے۔

صفو کی جیٹھانی نے اس موقع پر بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ اس نے جلدی سے صفو کو پچھلے دروازے سے باہر نکال دیا اور خود اسٹور کا دروازہ بند کر کے اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ یونس یہی سمجھا کہ اس کی بیوی اسٹور میں ہے۔ وہ چھری لہراتا ہوا واپس آیا اور اپنی بھابی کو ایک طرف ہٹا کر اسٹور میں گھس گیا۔

اس اثنا میں صفو فتح محمد پٹواری کے گھر پہنچ چکی تھی۔ سکینہ کا بھی یہی مقصد تھا۔ اگر یونس فوراً گلی میں نکل جاتا تو ضرور اپنی بیوی کو دوڑتے ہوئے دیکھ لیتا۔

یہ ساری تفصیل سننے کے بعد میں نے آمنہ بی بی سے پوچھا: "صفو کتنے روز آپ کے گھر رہی تھی؟"

رضیہ نے حساب لگا کر بتایا: "صفو تقریباً چار روز ہمارے گھر میں چھپی رہی تھی۔ ابا نے ہمیں تاکید کر دی تھی کہ کسی کو صفو کی یہاں موجودگی کا علم نہ ہو۔ جب کوئی ملنے والا آتا تھا تو صفو اسٹور میں یا پلنگ کے نیچے چھپ جاتی تھی۔ چوتھے روز ابا نے صفو کو کسی معتبر شخص کے حوالے کر دیا، جو اُسے لے کر راتوں رات گاؤں سے نکل گیا۔"

"کیا آپ کو اس شخص کا نام معلوم نہیں ہے؟"

"اس بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے۔" آمنہ بی بی نے کہا: "اس کے ابا نے یہ بات ہمیں اس لیے نہیں بتائی کہ ہمارے منہ سے کبھی کوئی بات نہ نکل جائے۔"

میں نے پوچھا: "جو باتیں آپ نے مجھے بتائی ہیں کیا وہ آپ کے شوہر کو معلوم ہیں؟"

"سب کی سب نہیں معلوم۔" اس نے جواب دیا۔ "مثلاً یہ نواز علی والی بات ہم نے ان کو نہیں بتائی۔ آپ بھی اس بات کا ذکر نہ کریں۔ اگر یونس کو یہ بات معلوم ہو گئی تو وہ نواز کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں اس کے ابا کی موجودگی میں یہ ساری باتیں آپ کو نہیں بتا سکتی تھی۔"

"آپ نے صفو کو اس کی ماں کے حوالے کیوں نہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی ماں بیوہ اور غریب عورت ہے۔ وہ بیٹی کی حفاظت نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ صفو ماں کے پاس جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔"

میں نے آمنہ بی بی سے اجازت لی اور وہاں سے نکل کر نمبردار کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

صورت حال نیا رخ اختیار کر گئی تھی۔ اب دیکھنے والی بات یہ تھی کہ فتح محمد نے صفو کو کس کے سپرد کیا تھا اور اس نے لڑکی کو کہاں پہنچایا تھا؟ اور اگر یونس ہی صفو کا قاتل تھا تو اسے اس انتظام کا کیسے علم ہوا تھا؟

ان باتوں کا جواب جاننے کے لیے فتح محمد سے ملاقات بہت ضروری تھی لیکن اس کی واپسی تک ہمارا وہاں رُکنا بہت مشکل تھا۔ تھانے میں اور بھی بہت سے کام تھے۔

میں نے نمبردار سے کہا: "چودھری صاحب، فتح محمد سے تو ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ تحصیل ہیڈکوارٹر گیا ہوا ہے۔ آپ اسے میرا پیغام دے دیں کہ وہ کل تھانے میں آ کر مجھ سے مل لے۔"

"بہت بہتر جناب، آپ کا پیغام پہنچ جائے گا۔" نمبردار نے کہا۔ پھر ذرا رازدارانہ لہجے میں بولا: "یہ بدری بڑی منتیں کر رہا ہے۔ اس غریب کو تھانے لے جا کر کیا کریں گے! میری ضمانت پر چھوڑ دیں۔ آپ جب حکم کریں گے یہ تھانے حاضر ہو جائے گا۔"

میں نے بدری کو گھورتے ہوئے کہا: "چودھری صاحب، اسے اتنا سیدھا نہ سمجھیں۔ آپ نے کل بھی تو اس کو ہمارا پیغام دیا تھا۔ اگر یہ تھانے حاضر ہو جاتا تو ہمیں ادھر آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"حضور، اب غلطی نہیں کروں گا۔" بدری نے ہتھکڑی والے ہاتھ جوڑے۔ "آپ کا حکم ہوگا تو روزانہ تھانے میں حاضری دیا کروں گا۔ گاؤں میں میری بڑی عزت ہے۔ مجھے ہتھکڑی نہ لے جائیں۔"

"بلے او ئے مُنڈے لاٹ دیا پُترا!" حوالدار نے کہا۔ "اگر تو عزت دار ہے تو پھر ان چودھریوں کا کیا بنے گا!"

میں نے کہا: "اگر تو عزت دار ہوتا تو برقع پہن کر بھاگنے کی کوشش نہ کرتا اور ابھی تو ہم نے تیرے ساتھ بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔"

"باتوں کے لیے میں ہر وقت حاضر ہوں جناب!" اس نے کہا: "لیکن یہ ہتھکڑی ...؟"

"سچ بولنا شروع کر دو گے تو ہتھکڑی اتر جائے گی۔" میں نے کہا: "میں تمہارے بارے میں نئی کہانیاں سن کر آیا ہوں۔"

بیٹھک سے نکل کر ہم تانگے میں جا بیٹھے۔

سپاہی نے سفید برقع اور گرگابیاں دکھاتے ہوئے پوچھا: "جناب، ان چیزوں کا کیا کریں؟"

"ان کو ساتھ ہی رکھو۔"

ہم تانگے میں بیٹھ کر تھانے روانہ ہو گئے۔

جب میں فتح محمد پٹواری کے گھر میں بیٹھا آمنہ بی بی اور اس کی بیٹی کی باتیں سن رہا تھا تو میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ میں ماسٹر نواز علی سے ضرور ملوں گا لیکن نمبردار کے گھر پہنچ کر یہ بات میرے ذہن سے بالکل محو ہو گئی اور تھانے آ کر بھی یاد نہ آئی۔

☐

شام کے وقت میں نے یونس کو اپنے پاس بلایا۔ بہت اُداس اور بُجھا بُجھا سا لگ رہا تھا۔

"ملک صاحب، آپ نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔" اس نے کہا: "مجھے اپنی بیوی کے جنازے میں بھی شامل ہونے کی اجازت نہیں دی۔"

"تاکہ اس کا جنازہ دیکھ کر تمہارا دل ٹھنڈا ہوتا؟"

"ملک صاحب، میں نے اس کو قتل نہیں کیا۔"

"میں آج تمہارے گاؤں تفتیش کرنے گیا تھا۔ مجھے بہت کچھ معلوم ہو چکی ہے۔ میں نے بدری کو بھی گرفتار کر لیا ہے۔ تمہارا صفو سے کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟"

"جناب، میں اس بات کا جواب دے چکا ہوں۔"

"پھر جواب دو۔" میں اس کے سر پر جا ٹھہرا۔ "اگر جواب غلط ہوا تو اب میں تمہارا کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔"

"ہم... میرا خیال ہے کہ اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔"

میں نے اس کی گردن پر ہاتھ جمایا۔ "فائدہ تو تمہیں اس وقت معلوم ہوگا جب تمہاری گردن میں پھانسی کا پھندا پڑے گا۔ جواب دو... کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟"

گرفتاری کے بعد یہ پہلا ہاتھ تھا، جو اسے پڑا تھا۔

"بج... جناب، مجھے صفو کے بارے میں اچھی خبریں نہیں ملی تھیں۔" اس نے جواب دیا۔ "اس نے کسی سے دوستی لگالی تھی۔"

"یہ بُری خبر تمہیں کس نے دی تھی؟"

"یہ بات مجھے بدر دین نے بتائی تھی۔"

"یعنی بدر دین موچی، عرف بدری بدمعاش نے؟"

"وہ... میرا پرانا دوست ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ میری بیوی کے متعلق اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ لوگ اُسے بدمعاش کہتے ہیں، اس میں کچھ برائیاں بھی ہیں لیکن اس نے میرے ساتھ کبھی برائی نہیں کی۔"

"اسی لیے تم نے اس کی بات پر یقین کر لیا اور اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔"

"یہ جھوٹ ہے... میں نے صفو کو قتل نہیں کیا۔"

"تو کیا تمہارے باپ نے اُسے قتل کیا ہے؟"

وہ کچھ نہیں بولا۔

میں نے کہا: "اب میں تمہارے پرانے دوست کی باتیں سنواتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔"

میں اسے پوچھ گچھ کے کمرے میں لے گیا اور ایک کونے میں بٹھا کر سامنے فولڈنگ پارٹیشن رکھوا دی۔

پھر میں نے بدری کو کمرے میں بلایا اور دو خوفناک قسم کے حوالدار اس کے دائیں بائیں کھڑے کر دیے۔

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کمرے کا سیٹ اپ دیکھ کر گھبرا گیا۔ "ملک صاحب! سوں رب دی، میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا، میں نے آپ کو سچ سچ بتا دیا ہے اور جو پوچھیں گے، وہ بھی بتا دوں گا۔"

"بچو! تیری شرافت کو تو میں ابھی نچوڑتا ہوں۔ میں تجھ سے کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ سچ بولنا اور جلدی بولنا، اگر جھوٹ بولا، یا جواب دینے میں دیر کی تو پھر تیری فریاد سننے والا کوئی نہیں ہوگا۔"

"میں سچ بولوں گا جناب۔"

"اور اسی میں تیری بہتری بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "گامی کمہار نے مجھے بتایا تھا کہ صفو تجھ سے چھپ کر ملا کرتی تھی۔"

"یہ... اس نے کہا ہے۔ میں... میں اس کھوتے کے پُتر کا سر کچی ہانڈی کی طرح توڑ دوں گا۔"

ابھی اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ دائیں طرف والے حوالدار نے اسے ایک کرارا تھپڑ رسید کیا۔

"سچ بولو اور فالتو بات مت کرو۔" حوالدار نے کہا۔

میں نے پوچھا: "کیا یہ بات تو نے گامی کو بتائی تھی؟"

اس نے قدرے تامل کیا لیکن حوالدار کا ہاتھ بلند ہوتے دیکھ کر جلدی سے بولا: "جی، یہ بات میں نے ہی کہی تھی لیکن..."

"لیکن تم نے یونس سے یہ کہا تھا کہ صفو کا کسی سے یارانہ تھا۔ کہا تھا نا؟"

"ج... جی کہا تھا۔"

"اس آدمی کا نام کیا ہے؟"

"م... میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا۔" بعد میں پتا چلا کہ اس کی نواز علی سے دوستی تھی اس لیے وہ اس کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔

میں نے حوالدار کو اشارہ کیا، اس کے ساتھ ہی کمرے میں تھپڑ اور ہائے کی آواز گونجی۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے اس آدمی کو دیکھا تک نہیں تھا جس کا تمہارے خیال میں صفو سے یارانہ تھا۔ تم نے محض اندازہ لگایا تھا۔ یہ سچ ہے نا؟"

"آہو جی، سچ ہے۔"

"تم نے اندازے کی بات تو اپنے یار کو بتا دی لیکن اصل بات نہیں بتائی۔ ایسا کیوں کیا تم نے؟"

"ک... کون سی اصل بات جی؟"

"اپنے یارانے کی بات۔"

"وہ تو... وہ تو میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میرا صفو سے

کوئی یارانہ نہیں تھا۔"

میں نے آگے بڑھ کر اسے ٹھوکر رسید کی، پھر کہا: "تم نے یونس سے یہ کہتے ہوئے اس کی بیوی پر تہمت لگائی تھی کہ اس کے دکھ تمھارے دکھ اور اس کی خوشی تمھاری خوشی ہے لیکن ایک کمار بچے کے سامنے اس کی بیوی کی عزت اچھالی اور یہ کہا کہ اس کا تمھارے ساتھ یارانہ ہے۔"

"مجھ سے غلطی ہوگئی جناب۔ مجھے معاف کر دیں۔"

پارٹیشن کے پیچھے بیٹھا ہوا یونس سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ بدری کے ٹکڑے کر دیتا۔

میں نے بدری کو ایک اور ٹھوکر لگائی اور پوچھا: "اوئے بدری بدمعاش، جب تو نے کھیتوں میں صفو کا راستہ روکا تھا اور اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کی تھی، اس وقت کیا ہوا تھا؟"

"جناب، میں نے تو صفو کا راستہ نہیں روکا تھا۔"

میں نے حوالداروں کو اشارہ کیا۔ ایک نے دائیں طرف سے اور دوسرے نے بائیں طرف سے تھپڑ مارا۔

بدری زور سے چلایا: "ہائے میں مر گیا۔"

"یہ خیال دل سے نکال دے کہ صفو مر چکی ہے اور ہم تیرے بیان کو چیک نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا: "صفو نے اپنی ایک معتبر سہیلی کو یہ ساری باتیں بتا دی تھیں۔ میں اس سے مل کر آیا ہوں۔ اگر تو سچ نہیں بولے گا تو تو تھپڑوں سے ہی مرے گا۔ جھوٹ بولتا جا اور تھپڑ کھاتا جا۔"

"جناب، میری توبہ، میں اب جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

"تو پھر میرے سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دے۔ جب تو نے کھیتوں میں صفو کا راستہ روکا تھا تو کیا ہوا تھا؟"

"صفو نے مجھے جھڑک دیا تھا، گالیاں نکالی تھیں اور برا بھلا کہا تھا۔"

"تم نے جواب میں کیا کہا تھا؟ اسے کس بات سے ڈرایا تھا؟"

اس نے دائیں بائیں کھڑے حوالداروں کی طرف دیکھا، پھر بولا: "میں... میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ اگر وہ نواز علی سے مل سکتی ہے تو مجھ سے کیوں نہیں مل سکتی ہے۔"

میرے دل میں سوال پیدا ہوا کہ اس نے نواز علی کا نام کیسے لیا تھا کیونکہ اسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ صفو کس سے ملتی رہی تھی۔

میں نے کہا: "ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تمھیں اس آدمی کا علم نہیں تھا جس سے صفو ملتی تھی۔ اب تم کسی نواز علی کا نام لے رہے ہو۔ پوری بات بتاؤ۔"

"جناب، فتح محمد پٹواری والے واقعے کے بعد میں نے صفو کے گھر کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ میں نے دیکھا کہ ماسٹر نواز علی کا صفو کے گھر بہت آنا جانا تھا۔ اس لیے میں نے اندازہ لگایا کہ صفو کا اسی سے یارانہ ہوگا۔"

یونس، جو پارٹیشن کے پیچھے بیٹھا یہ ساری باتیں سن رہا تھا، اچانک بے قابو ہوگیا۔ اس نے اس سپاہی کو جو اس کی نگرانی پر کھڑا تھا، ایک طرف دھکا دیا اور گالیاں نکالتا ہوا بدری پر چڑھ دوڑا۔ وہ چیختا جاتا تھا اور لاتوں اور گھونسوں سے بدری کو مارتا جاتا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا: "بدری، حرامزادے، کمینے کتے، تم نے میرا گھر برباد کر دیا ہے۔ میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میری بیوی تمھاری وجہ سے مری ہے۔ تم اس کی موت کے ذمے دار ہو... میں تمھارا خون پی جاؤں گا۔"

بدری اس اچانک افتاد سے بالکل بوکھلا گیا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگا۔

حوالدار نے یونس کو کھینچ کر الگ کر دیا۔

"اب کیا کہتے ہو محمد یونس؟" میں نے کہا: "یہی وہ تمھارا لنگوٹیا یار ہے جس کے بارے میں تم کہتے تھے کہ اس نے تمھارے ساتھ کبھی برائی نہیں کی؟"

"م م... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اندر سے اتنا کمینہ شخص ہے۔" یونس نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا۔

"اوئے، بدمعاش، بدمعاش ہی ہوتا ہے جو شخص تمھارے پڑوسی کی عزت اچھال سکتا ہے، وہ تمھاری بھی اچھال سکتا ہے۔ اگر اسے اچھائی کا مطلب معلوم ہوتا تو یہ سب کے لیے اچھا ہوتا۔ بات صرف اتنی ہے کہ تمھارے ساتھ اس کا رویہ اچھا تھا۔ اس لیے تمھیں اس کی برائی نظر نہیں آتی تھی۔ اب یہ جان کر کہ اس نے تمھاری عزت پر بھی ہاتھ ڈالا تھا تمھیں اس کی ساری برائیاں نظر آنے لگی ہیں۔"

"تھانیدار صاحب، میں اس سے اپنی ذلت کا بدلہ ضرور لوں گا۔" اس نے بدری کی طرف دیکھ کر منہ پر ہاتھ پھیرا: "موچی کی اولاد، اگر میں نے تیری کھال کے جوتے نہ بنائے تو میرا نام بگاڑ دینا۔ تو بڑا بدمعاش بنا پھرتا ہے، میں تیری ساری کی ساری بدمعاشی نکال دوں گا۔"

میں نے بدری کو حوالات میں بھیج دیا اور یونس سے کہا: "برخوردار، اب ہمیں تم سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ تم نے اپنی بیوی کو کیوں اور کس طرح قتل کیا۔ ان دونوں

سوالوں کا جواب ہمیں مل چکا ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم شرافت سے اقرارِ جرم کر لو۔"

"تھانیدار صاحب، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے صفو کو قتل نہیں کیا۔" اس نے کہا: "میں... بالکل بے گناہ ہوں۔"

"ملک صاحب، یہ اس طرح نہیں مانے گا۔" حوالدار نے کہا: "اس پر تھوڑی سی محنت کرنی پڑے گی۔"

ابھی ایک بات واضح نہیں تھی۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ فتح محمد پٹواری نے صفو کو کس شخص کے سپرد کیا تھا۔ اس نے اسے کہاں پہنچایا تھا اور یونس اس تک کیسے پہنچا تھا۔

میں نے یونس سے کہا: "میں تمھیں ایک رات کی مہلت دے سکتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو اور ساری بات سچ سچ بتا دو۔ یہ فوری اشتعال کا کیس ہے۔ مجھے امید ہے کہ عدالت تمھیں موت کی سزا نہیں دے گی۔"

وہ رو رو کر قسمیں کھانے لگا کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل نہیں کیا تھا اور یہ کہ بائیس تاریخ کے بعد اس نے صفو کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔

"محمد یونس، تو نے اپنی بیوی کو قتل کی دھمکی دی تھی یا نہیں؟"

"وہ تو جی، میں نے اسے ڈرانے کے لیے دھمکی دی تھی۔"

"اگر تو نے صرف ڈرانے کے لیے دھمکی دی ہوتی تو آج صفو زندہ ہوتی۔" میں نے کہا: "جب اس نے تیرے پوچھنے پر اپنے یار کا نام نہیں بتایا تو کیا تو چھری لینے کے لیے باورچی خانے میں نہیں گیا تھا؟"

"اس وقت میں بہت... غصے میں تھا۔"

"تمھیں کس بات کا غصہ تھا؟"

"وہ تو جناب آپ کو معلوم ہو چکا ہے۔"

"میں تمھارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔"

"بدری کی باتوں نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔"

"کیا صفو کے غائب ہو جانے کے بعد تمھارا دماغ زیادہ خراب نہیں ہوگیا تھا؟ کیا تم نے صفو کے بھاگ جانے سے یہ نتیجہ نہیں نکالا تھا کہ بدری کا الزام سچا تھا؟"

"وہ تو ٹھیک ہے جی، لیکن میں قسم کھاتا ہوں کہ اس کے بعد میں نے صفو کو نہیں دیکھا۔"

میں نے اسے ایک رات کی مہلت دیتے ہوئے حوالات میں بند کر دیا اور احتیاطاً الگ حوالات میں بند کیا ورنہ اس کا بدری کے ساتھ ضرور جھگڑا ہو جاتا۔

اگلی صبح ایک ادھیڑ عمر شخص مجھ سے ملنے کے لیے تھانے آیا۔ اس نے سفید شلوار قمیص کے اوپر واسکٹ پہن رکھی تھی اور سر پر پگڑی تھی۔ اس نے میرے کمرے میں قدم رکھتے ہی بڑے دوستانہ لہجے میں کہا: "ملک صاحب، السلام علیکم..."

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک خوش حال اور خوش گفتار شخص تھا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور اسے کرسی پیش کی۔

"بندے کو فتح محمد کہتے ہیں۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا: "فتح محمد پٹواری آف ٹاہلیاں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کل آپ میرے غریب خانے پر رونق افروز ہوئے تھے۔"

"آپ کے گاؤں کی ایک لڑکی قتل ہوگئی ہے۔" میں نے کہا: "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اس لڑکی کو چار روز اپنے گھر میں چھپائے رکھا تھا۔"

"غلط۔" اس نے میری بات کاٹی: "میں نے اسے پناہ دی تھی، چھپایا نہیں تھا۔ بات جاری رکھیں..."

"چھپانا اور پناہ دینا ایک ہی بات ہے..."

"میں آپ سے پھر اختلاف کروں گا۔" اس نے دوبارہ میری بات کاٹی: "آپ قانون کی باریکیاں سمجھتے ہیں۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ میرا نکتہ آسانی سے سمجھ جائیں گے۔ جب ہم چھپانے کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو چھپانے میں چھپانے والے کا اپنا مقصد شامل تھا۔ یعنی زید نے اپنے کسی جائز یا ناجائز مقصد کے لیے بکر کی کوئی چیز چھپا لی لیکن جب ہم پناہ دینے کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس کو پناہ دی گئی ہے اس کو کوئی خطرہ تھا۔ جان کا یا مال کا خطرہ... اور پناہ دینے والے کا اپنا کوئی مقصد شامل نہیں تھا۔ جی، بات جاری رکھیں۔"

"ماشاءاللہ... کافی باریک سوچ ہے آپ کی۔" میں نے کہا: "آپ کے ساتھ بہت سنبھل کر بات کرنی پڑے گی۔ بہرحال، میری معلومات کے مطابق صفو نامی عورت چار دن اور تین راتیں آپ کے گھر میں رہی۔ بیشتر طور پر آپ نے پچیس تاریخ کو اسے اپنے گھر سے رخصت کر دیا اور اسی رات وہ قتل ہوگئی۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے اسے کس شخص کے سپرد کیا تھا؟"

"قتل کی بات ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔" اس نے کہا: "میرا خیال ہے کہ اس نے خودکشی کی ہوگی۔ وہ بہت مایوس تھی اور خودکشی کی باتیں کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس کا شوہر کسی نہ کسی روز اسے ضرور قتل کر دے گا۔ اس لیے وہ دہشت میں زندگی گزارنے

کے بجائے خودکشی کو بہتر سمجھتی تھی۔ یہ آپ نے بجا کہا ہے کہ اس نے بائیس تاریخ کو ہمارے گھر میں پناہ لی تھی۔ نادان لڑکی کو میں نے سمجھایا بھی تھا کہ وہ اپنے خاوند کی امانت میں خیانت نہ کرے۔ میں نے ایک رات اُسے ڈانٹا بھی تھا اور اس نے میرے ساتھ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ دوبارہ ایسی حرکت نہیں کرے گی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ باز نہیں آئی۔ کسی نے اسے دیکھ لیا تھا اور اس کے خاوند کو خبر کر دی تھی۔"

"آپ سے وعدہ کرنے کے بعد وہ دوبارہ کنوئیں پر نہیں گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن جس رات آپ نے اسے ڈانٹا تھا۔ اس رات بدری نے آپ کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ قریب ہی موجود تھا اور چھپ کر آپ کی باتیں سن رہا تھا۔ یونس کے پاس اسی نے چغلی کی تھی۔"

اس نے آنکھیں پھیلائیں، بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کافی تفتیش کر چکے ہیں۔ جب اس لڑکی نے میرے گھر میں پناہ لی تو میں نے اسے بہت سمجھایا اور اسے خاوند کے گھر بھیجنے کی کوشش کی۔ میں چاہتا تھا کہ چار آدمیوں کو بیچ میں ڈال کر میاں بیوی میں صلح کرا دی جائے لیکن صفو مطمئن نہیں تھی۔ وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ یونس اسے زندہ نہیں چھوڑے گا اور اس کا خدشہ ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔ میرے پڑوس میں ایک شخص منشی رجب علی نام کا رہتا ہے۔ آڑھت کا کاروبار کرتا ہے، بھروشے کا آدمی ہے۔ میرے ساتھ اس کی اچھی بات چیت ہے۔ میں نے اسے اعتماد میں لے کر صفو کا مسئلہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ صفو کو اس کے خاوند کے حوالے کرنا ٹھیک نہیں۔ وہ موقع ملتے ہی اس کے ٹکڑے کر دے گا مگر ہم زیادہ دنوں تک لڑکی گھر میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ بات چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی تھی۔ منشی رجب علی کا سرگودھا میں بھی ٹھکانا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ صفو کو فی الحال سرگودھا لے جائے۔ وہ راضی ہو گیا۔ میں نے صفو سے بات کی۔ اس نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پچیس تاریخ کو ہم نے صفو کو سرگودھا بھجوانے کا انتظام کیا۔ میل ٹرین ساڑھے نو بجے قصبے سے روانہ ہوتی ہے۔ ہم نے نہایت رازداری کے ساتھ صفو کو رات کے ساڑھے آٹھ بجے تانگے میں سوار کرایا۔ منشی رجب علی کی بیٹی صابرہ اور اس کے بارہ سالہ بیٹے امجد کو اس کے ساتھ کر دیا۔ تانگے والا بھروسے کا آدمی تھا۔ اسے ہم نے کوئی بات نہیں بتائی۔ وہ انھیں منشی کے گھر کی عورتیں ہی سمجھا ہوگا۔ بہرحال، ہم انھیں روانہ کرنے کے بعد مطمئن ہو گئے۔ ہم یہی سمجھتے رہے کہ صفو سرگودھا پہنچ گئی ہوگی لیکن دو روز بعد جب آپ

تفتیش کرنے ہمارے گاؤں پہنچے اور صفو کی خبر مشہور ہوئی تو ہم پریشان ہو گئے۔ میں منشی رجب علی کو ساتھ لے کر فوراً سرگودھا پہنچا۔ وہاں منشی کی بیٹی صابرہ نے ہمیں بتایا کہ صفو اسٹیشن تک ان کے ساتھ تھی لیکن جب ٹرین آئی تو وہ اِدھر اُدھر ہو گئی اور ٹرین میں سوار نہیں ہوئی۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ٹرین وہاں ایک آدھ منٹ سے زیادہ نہیں رکتی۔ جب ٹرین چلی تو صابرہ نے کھڑکی سے سر نکال کر باہر دیکھا۔ اس کا خیال ہے کہ اس نے صفو کو پلیٹ فارم پر کسی مرد کے ساتھ کھڑے باتیں کرتے دیکھا تھا۔"

میں نے حیرانی سے کہا۔ "فتح محمد صاحب! آپ نے اتنی اہم بات ہمیں بتائی کیوں نہیں؟"

"ملک صاحب! کمال ہے!" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "بات تو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"یہ تو ہم نے اپنی کوشش سے آپ کو بات بتانے پر مجبور کیا ہے۔ آپ کو یہ بات فوراً بتانی چاہیے تھی۔"

"اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ آپ صفو کو زندہ نہ کر سکتے۔ ویسے تاخیر دانستہ نہیں ہوئی۔ آپ دو دفعہ آئے اور دونوں دفعہ گاؤں سے باہر تھا۔ اگر کل آپ کا پیغام نہ بھی ملتا تو آج شام آپ کے دربار میں ضرور حاضر ہوتا۔"

بات اس کی معقول تھی۔ صفو زندہ نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے کہا۔ "میں منشی کی بیٹی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اگر آج ہی ملنا چاہتے ہیں تو سرگودھا چلے جائیں۔ میں اس کا پتا لے کر آیا ہوں۔" اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر مجھے دیا۔ "اگر جلدی نہ ہو تو دو دن ٹھہر جائیں۔ منشی نے بتایا تھا کہ صابرہ پرسوں واپس آ جائے گی۔"

میں نے دو دن ٹھہرنا ہی مناسب سمجھا۔

صابرہ بی بی نمایاں قد کاٹھ کی ایک مضبوط عورت تھی۔ میرے استفسار پر اس نے بھی وہی کہانی سنائی جو میں فتح محمد پٹواری کی زبانی سن چکا تھا۔

صفو ریلوے اسٹیشن تک اس کے ساتھ تھی۔ جب ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچی اور وہ جلدی سے زنانے ڈبے کی طرف بڑھی تو صفو اچانک غائب ہو گئی۔

میں نے کہا۔ "مجھے فتح محمد پٹواری کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ تم نے اسے کسی مرد کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا تھا۔"

"یہ کوئی پکی بات نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "جب

چل پڑی تو میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ جنگلے کے پاس ایک عورت اور مرد کھڑے نظر آئے۔ اندھیرے میں کیا پتا لگتا ہے جی۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ صفو تھی۔"

"اُدھر پلیٹ فارم پر تم نے گاؤں کا کوئی آدمی تو نہیں دیکھا؟"

"مجھے مردوں کو تاکنے کی عادت نہیں ہے جی۔"

"میرا مطلب ہے کہ چلتے پھرتے آدمی پر نظر پڑ جاتی ہے۔"

"نہیں جی، میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔"

"راستے میں تمھاری صفو سے کوئی بات چیت بھی ہوئی تھی؟"

"ابا نے منع کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ تانگے والے کے سامنے کوئی بات نہ کرنا۔ کہیں وہ پہچان نہ لے۔"

"راستے میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟" میں نے پوچھا۔ "تمھارے تانگے کے آگے پیچھے کوئی دوسرا تانگا یا سائیکل وغیرہ تو نہیں تھی؟"

"تانگا تو کوئی نہیں تھا۔ جب ہم گاؤں سے نکل کر تھوڑی دور پہنچے تو ایک سائیکل والا پیچھے نظر آیا۔ وہ بھی اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی گھنٹی آہستہ آہستہ بج رہی تھی۔ پہلے تو میں سمجھی وہ شرارت کر رہا ہے اکیلی عورت دیکھ کر گھنٹی بجا رہا ہے۔ تانگے والے نے مجھے بتایا کہ کچے راستے پر جھٹکے لگنے سے بج رہی تھی۔ جب ہم لوگ پکی سڑک پر پہنچے تو گھنٹی بجنی بند ہو گئی۔"

"کیا تم اس سائیکل والے کو پہچان سکتی ہو؟"

"لو جی، پھر وہی بات، میں پرائے مردوں کو نہیں دیکھتی۔ ویسے بھی اس نے منہ پر صافہ لپیٹا ہوا تھا۔"

اس اثنا میں ایک دس بارہ سالہ لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ میرے استفسار پر صابرہ نے بتایا کہ وہ اس کا بیٹا امجد ہے۔ وہ لڑکا بھی اس کے ساتھ سرگودھا گیا تھا۔

میں نے امجد سے پوچھا۔ "جب تم سرگودھا جانے کے لیے اسٹیشن پر پہنچے تھے تو تم نے وہاں اپنے گاؤں کے کسی آدمی کو دیکھا تھا؟"

"پنڈ کے تو کسی بندے کو نہیں دیکھا۔" اس نے جواب دیا۔ "صرف ماسٹر صاحب کو دیکھا تھا۔"

"کون سے ماسٹر صاحب؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"وہی جو ہمارے اسکول میں پڑھاتے ہیں۔"

"ماسٹر نواز علی؟"

"مجھے ان کا نام معلوم نہیں ہے۔"

منشی رجب علی نے کہا۔ "نواز علی ہی ہوگا۔"

ہم نے امجد کو ساتھ لیا اور ماسٹر نواز علی کے گھر پہنچ گئے۔

میرے ساتھ ایک اے ایس آئی اور ایک سپاہی تھا۔

دستک کے جواب میں جو شخص باہر آیا۔ وہ نواز علی ہی تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

میرے استفسار پر امجد نے بتایا کہ اس نے ماسٹر نواز علی ہی کو ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔

اس اثنا میں نواز علی باری باری ہم سب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ پچیس چھبیس سال کا خوش شکل نوجوان تھا۔

لڑکے کی تصدیق کے بعد میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: "نواز علی، میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی، فرمائیں۔" اس نے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کوئی بیٹھنے کی جگہ نہیں ہو گی؟"

"میں ذرا جلدی میں ہوں جی۔" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "چوہدری صاحب کے بچوں کو پڑھانے کے لیے جانا ہے۔"

"پچیس تاریخ کو رات کے نو بجے تم ریلوے اسٹیشن کیا کرنے گئے تھے؟ کیا کوئی مہمان آنے والا تھا؟"

"کسی کو غلط فہمی ہوئی ہے جی۔" اس نے جواب دیا۔ "میں تو عرصے سے ادھر نہیں گیا۔"

"یہ تمہارا شاگرد ہے۔" میں نے کہا۔ "پچیس تاریخ کو یہ اپنی نانی کے ساتھ گھر جا رہا تھا۔ اس روز اس نے تمہیں ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔"

"واہ جناب! آپ نے اس کی بات پر یقین کر لیا۔" اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا سب سے نکما شاگرد ہے۔ یہ تو گھوڑے اور گدھے میں بھی تمیز نہیں کر سکتا۔"

"اوئے، کیوں جھوٹ بولا تم نے؟"

"ماسٹر صاحب، میں نے آپ کو سلام بھی کیا تھا۔" امجد نے کہا۔ "آپ اس وقت جنگلے کی پچھلی طرف کھڑے تھے۔ آپ کے پاس سائیکل بھی تھی۔"

"اوئے، میں نے تیرے سلام کا جواب دیا تھا؟"

"جواب تو نہیں دیا تھا آپ نے۔"

"تو پھر تم کیسے کہتے ہو کہ وہ میں ہی تھا۔"

ماسٹر نواز علی نے بات تو بڑی ہوشیاری کی کی تھی مگر وہ یہ بات کہہ کر پھنس گیا۔ اس کے سوال سے یہ بات ظاہر ہو رہی تھی کہ اس نے دانستہ امجد کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا تاکہ بعد میں اس بات کو اپنی عدم موجودگی کا جواز بنا سکے۔ میں نے سوچا اسے یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ لڑکے کے سلام کا جواب نہیں دیا گیا تھا۔ اگر لڑکے نے کسی کو غلطی سے بھی سلام کر لیا تھا تو اس شخص کو اخلاقاً جواب ضرور دینا چاہیے تھا بلکہ وضاحت بھی کر دینی چاہیے تھی کہ وہ اس کا استاد نہیں تھا۔ نواز علی چونکہ خود کو اجنبی ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے دانستہ سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔

واضح طور پر صابرہ نے جس شخص کو سائیکل پر تانگے کے پیچھے آتے دیکھا تھا۔ وہ نواز علی ہی تھا کیونکہ امجد نے بھی سائیکل کا ذکر کیا تھا۔ مجھے صابرہ کی یہ بات یاد آ رہی تھی کہ تانگے کے پیچھے آنے والے سائیکل کی گھنٹی جھٹکے لگنے سے مسلسل بج رہی تھی۔

"ملک صاحب، اس وقت میں ذرا جلدی میں ہوں۔" اس نے کہا۔ "ورنہ آپ کی خدمت ضرور کرتا۔"

میں نے قدرے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "نواز علی، اپنی سائیکل باہر لے آؤ۔"

"جی، سائیکل؟"

"ہاں، میں نے سائیکل ہی کہا ہے۔"

وہ اندر گیا اور سائیکل باہر لے آیا۔ میں نے وہ سائیکل سپاہی کے حوالے کی اور کہا کہ وہ اسے تیز چلاتے ہوئے گلی کے کونے تک لے جائے اور پھر واپس لے آئے۔

سپاہی نے حکم کی تعمیل کی۔

سائیکل کے ہینڈل پر گول سی گھنٹی لگی ہوئی تھی۔ بجانے کے لیے اس کے لیور کو انگوٹھے سے دبایا جاتا تھا۔ گھنٹی کا اسپرنگ کمزور تھا اور وہ جھٹکے لگنے سے خود بہ خود بج رہی تھی۔

مجھے یقین ہو گیا کہ تانگے کا پیچھا کرنے والا نواز ہی تھا۔ گھر کے افراد، جو عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھے، دروازے میں پریشان کھڑے تھے۔ میں نے نواز سے کہا کہ میں اس کا مفلر بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔

میں نے کہا۔ "مجھے گھر کی تلاشی لینے پر مجبور نہ کرو۔"

وہ مفلر لینے کے لیے اندر جانے لگا تو مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ بھاگ ہی نہ جائے۔ لہٰذا میں نے اسے روک لیا اور کہا۔ "تم اندر نہیں جا سکتے۔ کسی سے کہہ کر مفلر یہیں پر منگوا لو۔"

اس نے دروازے میں کھڑی ایک عورت سے کہہ کر مفلر باہر منگوا لیا۔ اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

میں نے اسے ساتھ لیا اور منشی رجب علی کے گھر پہنچ گیا۔

صابرہ بی بی نے مفلر دیکھ کر کہا کہ وہ ویسا ہی تھا جیسا ان کے پیچھے آنے والے سائیکل سوار نے منہ پر لپیٹ رکھا تھا۔

پھر میں نے اس کے سامنے گلی میں سائیکل چلوائی۔ اس نے سائیکل کی گھنٹی بھی پہچان لی۔

ماسٹر نواز علی نے کہا۔ "تھانیدار صاحب، میں اس ساری کارروائی کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب ہم تمہیں تھانے میں چل کر سمجھائیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم اس وقت زیرِ حراست ہو۔"

"زیرِ حراست! مم... میں نے کیا جرم کیا ہے؟"

"اپنا جرم تم خود بتاؤ گے۔"

اس نے پہلے اپنے تعلقات کا حوالہ دیا، پھر رشوت پیش کی، پھر منت سماجت کرنے لگا۔

اس زمانے میں جب میں کسی مجرم کو دیکھتا تھا تو فوراً پہچان لیتا تھا۔ میں یہ تو سمجھ چکا تھا کہ نواز علی نے جرم ضرور کیا ہے لیکن جرم کے بارے میں ذہن واضح نہیں تھا۔ شاید میرا دل یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا کہ اس نے اپنی محبوبہ کو قتل کر دیا تھا۔

تھانے پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔ "نواز علی، مجھے ساری حقیقت معلوم ہو چکی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کسی تکلیف میں پڑے بغیر اقرارِ جرم کر لو۔"

"تھانیدار صاحب، میں ایک شریف اسکول ماسٹر ہوں۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "سارا گاؤں میری شرافت کی گواہی دے سکتا ہے۔"

"ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں ایک رات سوچنے کے لیے دیتا ہوں۔ اور ہاں، میں ایک کھوجی کا انتظام بھی کر رہا ہوں، جو ریلوے اسٹیشن سے دریا کے بالائی حصے کی طرف جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اسے تمہارا اور صفو کا کھرا تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی بلکہ سائیکل کا کھرا بھی مل جائے گا۔"

یہ بات کہتے وقت میں اس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے دیکھا یہ بات سن کر اس کی آنکھوں میں خوف سا اتر آیا تھا۔ ویسے حقیقت یہ تھی کہ میرا کھوجی کی خدمات حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اگلی صبح جب میں نے اسے پوچھ گچھ کے لیے بلایا تو اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ رات کو ڈیوٹی والوں نے بتایا کہ اس نے گزشتہ روز سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ اسے ہلکا سا بخار بھی تھا۔ حوالات کی ایک رات نے اس کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ آدمی واقعی شریف اور کمزور تھا۔

میں نے اسے تسلی دی، اپنے سامنے کھانا کھلایا اور ایک سپاہی کے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ جب وہ دوائی لے کر واپس آیا تو اس کا خوف کچھ کم ہو چکا تھا۔

اس اثنا میں اس کے کچھ دوست اور رشتے دار بھی تھانے پہنچ گئے لیکن میں نے انھیں ملاقات کی اجازت نہیں دی۔ زیرِ تفتیش ملزموں کو ملاقاتیوں سے اس لیے دور رکھنا پڑتا ہے کہ انھیں باہر کی خبریں نہ معلوم ہو جائیں۔ اس سے تفتیش کا کام متاثر ہوتا ہے۔

میں نے ماسٹر نواز علی کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور دوستانہ لہجے میں کہا: "نواز علی، جو کچھ ہو چکا ہے اسے ہم بدل نہیں سکتے لیکن اس کے اثرات کو کم کر سکتے ہیں، بشرطیکہ تم تعاون کرو۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

میں نے پوچھا: "کیا تم صفو سے محبت کرتے تھے؟"

"وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "اُسے میری ضرورت تھی۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں ہر وقت اس کے پاس بیٹھا رہوں۔"

"تمہیں اس کی ضرورت کیوں نہیں تھی؟"

"اس لیے... کہ اوّل تو وہ... شادی شدہ تھی اور دوسری بات یہ ہے کہ... میری منگنی ہو چکی ہے اور... اور اکتوبر میں میری شادی ہونے والی ہے۔"

اچانک اس نے رونا شروع کر دیا۔

میں نے پوچھا: "روتے کیوں ہو؟"

وہ روتے ہوئے بولا: "اب... میری شادی نہیں ہو سکے گی اور... اور کلثوم میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گی۔"

"کلثوم کون ہے؟"

"مم... میری منگیتر ہے۔ میرے ساتھ بہت محبت کرتی ہے۔"

"تم بھی اس سے محبت کرتے ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کرتا ہوں۔ کلثوم بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ... میرے بغیر..."

"زندہ نہیں رہ سکے گی۔" میں نے اس کی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن گھبراؤ نہیں، ہم اس کے زندہ رہنے کا سامان کریں گے۔ کیا تم نے یہ بات صفو کو بتائی تھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ بولا: "نہیں، میں... اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔"

"اب ہم دوبارہ صفو کی بات کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صفو نے اپنی ایک معتبر سہیلی کو تمہارے ساتھ اپنے معاشقے کا سارا حال بتا دیا تھا۔ یہ بتاؤ، کنوئیں پر ملاقات کی تجویز کس نے پیش کی تھی؟"

"یہ بھی صفو کی ہی خواہش تھی۔ وہ... وہ مجھ سے تنہائی میں ملنا چاہتی تھی۔"

"خواہشوں کی بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ کنوئیں پر ملاقات کی تجویز کس نے پیش کی تھی؟"

"تت... تجویز تو میری ہی تھی، لیکن..."

"اس کے باوجود تم یہ کہتے ہو کہ تمھیں صفو کی ضرورت نہیں تھی؟"

"سر، تھوڑا بہت لگاؤ تو ہو ہی جاتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "شوہر کی طویل غیر حاضری کے باعث صفو بہت زیادہ تنہائی محسوس کرنے لگی تھی۔ اسی وجہ سے اس نے مجھ میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔"

میں نے پوچھا۔ "تمھیں یہ کیسے پتا چلا کہ صفو ریلوے اسٹیشن جا رہی ہے؟"

"روانگی سے تھوڑی دیر پہلے مجھے صفو کا ایک رقعہ ملا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ تانگے پر اسٹیشن جا رہی ہے اور یہ کہ میں اسے اسٹیشن پر ملوں۔ رقعہ میرا ایک شاگرد لایا تھا۔ میں سائیکل پر تانگے کے پیچھے روانہ ہو گیا۔"

"اسٹیشن پر تمھاری اس سے کیا بات چیت ہوئی تھی؟"

"اس نے کہا تھا کہ اس کا شوہر بہت غصے میں ہے اور ہم دونوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ لہٰذا مجھے گاؤں چھوڑ کر کہیں چلے جانا چاہیے۔ اسے اپنے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی ضرور یونس کے ہتھے چڑھ جائے گی۔"

یہ سن کر میرے ذہن میں قتل کا محرک واضح ہو گیا۔ جب تک صفو زندہ تھی، نواز علی کی اپنی جان خطرے میں تھی۔ وہی اس کا نام اپنے شوہر کو بتا سکتی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "دریا پر کیا ہوا تھا؟"

نواز علی نے اچانک میرے پیر پکڑ لیے اور روتے ہوئے بولا۔ "تھانیدار صاحب، مم... میں بالکل بے گناہ ہوں، صفو زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ میں نے... اسے بچانے کی بہت کوشش کی تھی مگر اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی... میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔"

میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر سیدھا کیا اور اس کے منہ پر دو تھپڑ مارے۔ وہ رونا بھول گیا اور خوف سے آنکھیں پھیلا کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"صفو نے تمھیں اپنا سمجھتے ہوئے مدد کے لیے بلایا تھا۔" میں نے اس کے گریبان کو بل دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن چونکہ تمھیں اس کی ضرورت نہیں تھی اس لیے تم نے اسے دریا پر لے جا کر قتل کر دیا۔ تمھیں ڈر تھا کہ وہ تمھارا... یعنی اپنے آشنا کا نام یونس کو بتا دے گی اور یونس تمھیں قتل کر دے گا۔ لہٰذا تم نے اپنے جرم کی واحد گواہ کو قتل کر دیا۔"

وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس میں مزاحمت کی ہمت نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اقرارِ جرم کر لیا۔

میں نے یونس اور بدری کو بھی کمرے میں بلا لیا اور یونس سے کہا۔ "یہ ہے تمھاری بیوی کا قاتل لیکن سچ پوچھو تو اصل قاتل تم ہو۔ اگر تم ان دونوں کو قتل کی دھمکی نہ دیتے تو یہ واردات رونما نہ ہوتی۔ اس نے تمھارا کام آسان کر دیا ہے۔"

بدری نے کہا۔ "جناب، اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"تم دونوں چھٹی کرو۔"

"جناب، مجھے تو آپ نے مار مار کے اُلّو بنا دیا ہے۔" بدری نے کہا۔ "میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں بے قصور ہوں۔"

حوالدار نے کہا۔ "اوئے، چمار کی اولاد، دوست کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والا بے قصور نہیں ہوتا۔"

ان دونوں کو ضابطے کی کارروائی کے بعد رخصت کر دیا گیا۔ نواز علی کو میں نے قتلِ عمد کے الزام میں بند کر کے پرچہ کاٹ دیا۔

تفصیلی پوچھ گچھ کے دوران اس نے بتایا کہ وہ صفو کی موت کو خودکشی کا رنگ دینا چاہتا تھا۔ دریا کے کنارے اس نے موقع پاتے ہی دوپٹے سے صفو کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ گلا گھونٹنے کے بعد وہ دوپٹے کی گرہ کھول دے گا اور صفو کے بے جان جسم کو دریا میں پھینک دے گا لیکن جب اس نے دوپٹے کو گو نگا گلا گھونٹنا شروع کیا تو صفو مزاحمت کرنے لگی۔ دونوں کشمکش کرتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچ گئے اور صفو پانی میں گر گئی۔ نواز علی نے اسے پکڑنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور یہی چیز اس کے خلاف ثبوت بن گئی۔

حقِ وراثت

وراثت کا جھگڑا جس میں ایک فریق کا خون سفید ہو گیا تھا



منظر خاصا بھیانک تھا۔

لڑکی کی لاش شہتیر سے لٹک رہی تھی۔ لاش کے نیچے ٹین ...ئی اور بیٹی کے پاس ایک کرسی اوندھی پڑی تھی یعنی خودکشی ...ر مکمل تھا۔ جس رسی سے پھندا لگایا گیا تھا وہ مویشیوں کے ...یں باندھنے والی رسی تھی۔ گھر والوں نے پولیس کی تفتیش کے ...سے لاش نہیں اُتاری تھی، البتہ لڑکی کے چہرے پر کپڑا ... دیا تھا۔

میں پیٹی پر چڑھ گیا اور لڑکی کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر اس کا جائزہ لیا۔ اگرچہ اس وقت اس کا چہرہ بہت بھیانک منظر پیش کر رہا تھا مگر بادی النظر میں وہ ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ اس کی عمر تیس سال سے کچھ کم ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بدن پر ریشمی جوڑا تھا اور پیروں سے ننگی تھی۔ بال سیاہ اور گھنے تھے جن میں ریشمی پراندہ گندھا ہوا تھا۔

میں نے اے ایس آئی کی مدد سے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کر لیا اور متوفیہ کے ورثا سے کہا کہ وہ لاش اُتار کر چارپائی پر رکھ دیں تاکہ اسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوایا جا سکے۔

وہ سردیوں کے دن تھے اور اُس وقت رات کے دس بجے تھے۔ ہمیں تقریباً نصف گھنٹا قبل وقوعے کی اطلاع ملی تھی۔ معائنے کے دوران میں نے کم از کم دو چیزوں کی کمی محسوس کی۔ لیکن ان کا ذکر میں آئندہ چل کر کروں گا۔

جس حویلی میں یہ واقعہ پیش آیا تھا وہ دو زمین دار بھائیوں کی ملکیت تھی۔ متوفیہ کے بارے میں پتا چلا کہ وہ ان زمیندار بھائیوں کی چھوٹی بہن تھی اور اُس کا نام زرینہ تھا۔

جب میں ابتدائی تفتیش مکمل کر چکا تو ایک دراز قد شخص جس کی عمر پینتیس اور چالیس سال کے درمیان تھی میرے پاس آیا اور کہا "ملک صاحب، میں آپ سے دو منٹ کے لیے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے اُس کا جائزہ لیا۔ اُس نے کمبل کی بُکل مار رکھی تھی اور چہرے مُہرے سے کھاتا پیتا آدمی نظر آتا تھا۔ میں اُس کے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اُس کمرے میں انگیٹھی جل رہی تھی اور خاصا گرم ہو رہا تھا۔

"میرا نام چودھری عابد علی ہے۔" شخص مذکور نے کہا۔ "زرینہ میری چھوٹی بہن تھی۔"

میں نے سر ہلایا اور اُس کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ اُس نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر میری طرف بڑھائے اور بولا۔ "آپ کو اس سردی میں بڑی زحمت کرنی پڑی ہے۔ یہ تھوڑا سا نذرانہ رکھ لیں اور میری ایک درخواست قبول کر لیں۔"

میں نے پیسوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا درخواست ہے تمھاری؟"

"ہم عزت دار لوگ ہیں۔ اس واقعے سے ہماری بہت بدنامی ہو رہی ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ صبح تک زرینہ کا کفن دفن ہو جائے۔"

"پہلے پوسٹ مارٹم ہو گا۔"

"یہ غضب نہ کریں جی۔ اس سے ہماری اور زیادہ بدنامی ہو گی۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ پوسٹ مارٹم ہونے سے ہماری بہن تو واپس نہیں آجائے گی۔"

"چودھری، ہم سرکار کے ملازم ہیں۔ ہمیں قانونی کارروائی پوری کرنی پڑے گی۔"

"لڑکی پاگل تھی۔" چودھری عابد نے کہا۔ "تین سال سے اُدھر پاگل خانے میں تھی۔ اشرف چار دن پہلے اسے گھر لے کر آیا تھا۔ آج اس نے خودکشی کر لی۔"

"خودکشی کا کیا ثبوت ہے؟"

"لو جی، آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی ثبوت پوچھتے ہیں؟"

"چودھری، یہ کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نے اسے قتل کرنے کے بعد ادھر لٹکا دیا ہو، زہر دے دیا ہو یا گلا گھونٹ کر مار دیا ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے جی۔ لڑکی نے خود ہی اپنی جان لی ہے۔"

"یہی معلوم کرنے کے لیے تو پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے کہ بندے نے خود اپنی جان لی ہے یا کسی نے اُسے قتل کیا ہے۔"

"یہ عزت کا معاملہ ہے جی۔ آپ جتنی رقم کہیں، ہم دینے کو تیار ہیں۔ آپ پوسٹ مارٹم کے لیے ضد نہ کریں۔"

"لڑکی نے خودکشی کیوں کی ہے؟"

"جناب، بتایا تو ہے کہ پاگل تھی۔"

"چودھری، ایک بات تو بتا۔ کبھی کسی گھوڑے، گدھے یا بکری نے بھی خودکشی کی ہے؟"

"لو جی، کبھی جانوروں نے بھی خودکشی کی ہے!"

"ہوں . . . مجھے معلوم تھا کہ تم یہی جواب دو گے۔ ذرا غور سے میری بات سنو۔ جب آدمی پاگل ہو جاتا ہے تو وہ جانوروں کی طرح ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہ خودکشی نہیں کر سکتا۔ خودکشی ہمیشہ ہوش و حواس رکھنے والا کرتا ہے۔"

"اللہ بہتر جانتے جی۔ زرینہ اتنی زیادہ بھی پاگل نہیں تھی۔ کچھ ٹھیک ہو گئی تھی۔"

"پاگل کیوں ہوئی تھی؟"

"سب مقدر کے کھیل ہیں جی۔ پاگل بھی اللہ کے بندے ہی ہوتے ہیں۔"

"پیدائشی پاگل تھی یا بعد میں پاگل ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا، پھر اُسے تامل کرتے دیکھ کر کہا۔ "ذرا سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ میں ابھی دوسرے لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کروں گا۔"

"پیدائشی پاگل نہیں تھی۔ بعد میں ہوئی تھی۔"

"جو بعد میں پاگل ہوتا ہے، وہ کسی وجہ سے ہوتا ہے۔ کسی صدمے کی وجہ سے یا حادثے کی وجہ سے۔"

"کوئی ایسی بات تو نہیں تھی۔ ماں کے فوت ہونے کے بعد بڑی پریشان رہتی تھی۔ یہی صدمہ تھا اُسے۔" قدرے توقف کے بعد اُس نے کہا۔ "تو پھر جناب، کتنی رقم پیش کروں؟"

"یہ نہیں ہو سکتا چودھری۔" میں نے کہا۔ "پوسٹ مارٹم ضرور ہو گا۔"

اُسی لمحے ایک نوجوان، جو غالباً دروازے کی اوٹ میں کھڑا تھا، جھومتا جھامتا اندر آیا اور قدرے تلخی سے بولا۔ "تھانیدار صاحب! ہم زرینہ کا پوسٹ مارٹم نہیں ہونے دیں گے۔ یہ عزت اور غیرت کا معاملہ ہے۔"

اُس نے سفید دھوتی اور کُرتے کے اوپر واسکٹ پہن رکھی تھی اور گلے میں سُرخ شال تھی، جس کے دونوں سِرے اُس نے ہاتھوں میں پکڑ رکھے تھے۔

"یہ . . . میرا چھوٹا بھائی چودھری اشرف ہے۔" چودھری عابد نے تعارف کرایا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا تمھاری بہن نے تمھارے سامنے خودکشی کی تھی؟"

"میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔"

چودھری عابد نے کہا۔ "سامنے خودکشی کرتی تو ہم اُسے روک نہ دیتے۔"

"ہو سکتا ہے کہ یہ قتل کا کیس ہو۔" میں نے کہا۔

چودھری اشرف بولا۔ "جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ ہم نہیں چاہتے کہ پولیس تفتیش سے ہماری اور زیادہ بدنامی ہو۔"

"واہ . . . جوان، یہ غیرت کی بات نہیں کی تُو نے۔ غیرت مند لوگوں کا اگر کتا بھی کوئی مار دے تو وہ بدلہ لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھتے۔"

"زرینہ نے خودکشی کی ہے۔" چودھری اشرف نے کہا۔ "قتل وتل کسی نے نہیں کیا۔ اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ ہم نے آپ سے عرض کر دیا ہے کہ اس کا پوسٹ مارٹم نہیں ہو گا۔ آپ جتنی رقم کہیں ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "زرینہ کا شوہر کہاں ہے؟"

مجھے یوں لگا جیسے اشرف یہ سوال سُن کر پریشان سا ہو گیا۔ "زرینہ شادی شدہ نہیں تھی۔" اُس نے جواب دیا۔ تاہم اُس کے لہجے میں تذبذب پایا جاتا تھا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کیس کی کئی باتیں وضاحت طلب تھیں۔ بلکہ شک میں ڈالنے والی تھیں۔ میں نے کہا۔ "چودھری، اگر اس معاملے میں کوئی گھنڈی ہے تو خود ہی بتا دو۔ یہ زیادہ سے زیادہ میں کوشش کروں گا کہ لاش سرسری معائنے کے بعد آپ کے حوالے کروا دوں۔"

اشرف نے کچھ کہنا شروع کیا، مگر بڑے بھائی نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "گھنڈی کوئی نہیں ہے جی۔ سارا معاملہ آپ کے سامنے ہے اور . . . سرسری معائنے کی بھی کیا ضرورت ہے؟"

"ہمیں اوپر بھی جواب دینا پڑتا ہے۔"

چودھری عابد میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب، آپ کوئی رپورٹ ہی درج نہ کریں۔ آپ کی مہربانی ہو گی۔"

"یہ ذرا مشکل بات ہے۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "میرا کوئی اپنا ماتحت اوپر اطلاع پہنچا سکتا ہے اور ویسے بھی بات سارے محلے میں پھیل چکی ہے۔"

وہ سمجھا کہ میں اُس کی باتوں میں آ گیا ہوں، بولا۔ "حضور، ہماری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ ہی کوئی مناسب راستہ نکال لیں۔"

"سوچنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات میں آپ کو پہلے ہی بتا دیتا ہوں۔ اگر بعد میں کوئی ایسی ویسی بات سامنے آئی تو لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے قبر سے بھی نکالا جا سکتا ہے۔"

"کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے جی۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔"

"میں تمھاری بات مان لیتا ہوں۔ مگر لاش ایک دفعہ مردہ خانے بہرحال جائے گی۔"

دونوں بھائی ایک طرف ہو کر مشورہ کرنے لگے۔ بالآخر انھوں نے میری بات مان لی۔ میں نے لاش مُردہ خانے بھجوا دی اور احتیاطاً اُس کمرے کو سیل کر دیا جس میں لڑکی نے مبینہ طور پر خودکشی کی تھی۔

جب ہم واپس جانے کے لیے باہر نکلے تو اے ایس آئی نے کہا۔ "محلے والوں کا خیال ہے کہ لڑکی نے خودکشی نہیں کی۔"

"یعنی اُسے قتل کیا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

میں نے یہی سوال چودھری سے کیا تو وہ بات گول کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ "کل تو تم عزت اور غیرت کی بات کر رہے تھے۔"

اُس نے چالاکی سے کہا۔ "قانون کے سامنے کھل کر بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے اس کا ردِعمل جاننے کے لیے کہا۔ "میں اپنے کیس کی کو پاگل خانے بھجوانے کا سوچ رہا ہوں۔ اگر انھوں نے تعاون نہ کیا تو یہ کیس اعلیٰ سطح تک جائے گا۔"

اُس نے آنکھیں گھما کر سوچا، پھر بولا۔ "آپ کیوں زحمت کرتے ہیں۔ ہم خود اس کام سے فارغ ہو جائیں۔ اُس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسی حرکت کرنے والا بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔" قدرے توقف کے بعد اُس نے مزید کہا۔ "اب آپ سے کیا چھپانا . . . ہم نے دو آدمی لاہور بھیجنے کے لیے تیار کر لیے ہیں۔ وہ ایک آدھ گھنٹے میں روانہ ہو جائیں گے۔ آپ اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اگر آپ نے مجرم کو پکڑ بھی لیا تو ثبوت کہاں سے لائیں گے۔ وہ عدالت میں جا کر چھوٹ جائے

"قتل کا نام تو کسی نے نہیں لیا، پر سب یہی کہتے ہیں کہ زرینہ خودکشی کرنے والی لڑکی نہیں تھی۔"

میں نے اُس سے تفصیل پوچھی تو اُس نے چودھری عابد کے چند پڑوسیوں کے نام لیے۔ جس وقت میں اندر تفتیش کر رہا تھا اُس وقت وہ باہر گلی میں پڑوسیوں سے گپ شپ کر رہا تھا۔ چونکہ الزام خاصا سنگین تھا، اس لیے میں نے ایک آدھ پڑوسی سے بات کر لینا مناسب سمجھا۔

اُس پڑوسی کا نام رانا ایوب تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک قوی الجثہ شخص تھا۔ اُس نے خشخشی سی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور باتوں سے خوش اخلاق معلوم ہوتا تھا تاہم میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے دل میں چودھری برادران کے لیے خاصی رنجش تھی۔

میرے سوالات کے جواب دیتے ہوئے اُس نے کہا کہ دونوں بھائیوں نے تقریباً تین سال قبل زرینہ کو مینٹل اسپتال لاہور میں داخل کرا دیا تھا۔ اور محلّے میں یہ مشہور کرا دیا تھا کہ لڑکی پاگل ہو گئی ہے۔ اب وہ تین روز قبل واپس آئی تھی اور تین روز سے گھر میں جھگڑا چل رہا تھا۔"

میں نے پوچھا "اگر لڑکی پاگل نہیں تھی تو بھائیوں نے اسے پاگل خانے میں کیوں داخل کرایا؟"

"سارا چکر جائداد کا ہے۔" رانا ایوب نے جواب دیا۔

میں نے پیسوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا "کیا دوست ہے تمھاری؟"

"ہم عزت دار لوگ ہیں۔ اس واقعے سے ہماری بہت بدنامی ہو رہی ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں صبح تک زرینہ کا کفن دفن ہو جائے۔"

"پہلے پوسٹ مارٹم ہو گا۔"

"یہ غضب نہ کریں جی! اس سے ہماری اور زیادہ بدنامی ہو گی۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ پوسٹ مارٹم ہونے سے ہماری بہن تو واپس نہیں آ جائے گی۔"

"چودھری! ہم سرکار کے ملازم ہیں۔ ہمیں قانونی کارروائی پوری کرنی پڑے گی۔"

"لڑکی پاگل تھی۔" چودھری عابد نے کہا۔ "تین سال سے پاگل خانے میں تھی۔ اشرف چار دن پہلے اسے گھر لے کر آیا تھا۔ آج اس نے خودکشی کر لی۔"

"خودکشی کا کیا ثبوت ہے؟"

"لو جی، آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی کوئی شخص اُسے لینے گیا تھا یا وہ خود ہی واپس آ گئی تھی؟"

"یہ پتا نہیں چلا۔ بھائیوں میں سے تو کوئی نہیں گیا تھا۔ کوئی ماما، چچا گیا ہو تو کہہ نہیں سکتے۔ ان تین دنوں میں انھوں نے لڑکی کو نہ تو باہر نکلنے دیا اور نہ کسی سے ملنے دیا۔ میری بیٹی حمیدہ اس سے ملنے گئی تھی مگر اشرف کی بیوی نے اُسے دروازے سے ہی واپس کر دیا۔ کہنے لگی کہ زرینہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ادھر پچھلی طرف کھوکھر صاحب رہتے ہیں۔ اُن کی بیوی بھی زرینہ سے ملنے گئی تھی، گھر والوں نے اُس کو بھی نہیں ملنے دیا۔"

میں نے پوچھا "آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ زرینہ کے واپس آنے کے بعد سے گھر میں جھگڑا چل رہا تھا۔"

"ہمارا گھر ساتھ ملا ہوا ہے جی۔ اُدھر کوئی ذرا اونچی آواز میں بات کرے تو اِدھر آواز پہنچ جاتی ہے۔"

"جھگڑا کس بات پر ہوتا تھا؟"

"جھگڑنے کی آوازیں ضرور سنائی دیتی تھیں پر ہم نے اُدھر کبھی کان نہیں لگائے۔ میری گھر والی بتا رہی تھی کہ جھگڑا اُدھر جائداد کا ہی تھا۔"

رانا ایوب معقول آدمی تھا اور اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ یا تو زرینہ نے ان جھگڑوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی یا اُسے قتل کیا گیا تھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر پوسٹ مارٹم کروانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے سرکاری ڈاکٹر کو پیغام بھیج دیا کہ وہ صبح تک پوسٹ مارٹم کر لے، تاکہ لاش ورثاء کے حوالے کر دی جائے۔

*

اگلی صبح میں تھانے پہنچا تو دیکھا کہ چودھری برادران بڑی بے چینی سے باہر ٹہل رہے تھے۔ اُن کے ہمراہ نصف درجن افراد اور بھی تھے۔ دونوں بھائی مجھے دیکھ کر بسرعت میری طرف لپکے۔ چھوٹا بھائی اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا "تھانے دار صاحب! آپ نے ہم سے کچھ وعدہ کیا اور اُدھر کچھ پیغام بھیج دیا۔ آپ نے سراسر دھوکا کیا ہے۔ . ."

میں نے سخت نظروں سے اُسے گھورا "کس وعدے اور کس پیغام کی بات کر رہے ہو؟"

"وہ ڈاکٹر اُدھر چھریاں چاقو تیز کر رہا ہے۔ اگر اُس نے ہماری مرحومہ بہن کے جسم کو ہاتھ لگایا تو ہم . . . تھانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں. . ."

ابھی اُس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں نے اُس کو گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا "اوئے، کتنی اینٹیں بجا چکے ہو اس سے پہلے؟"

بڑا بھائی جلدی سے بیچ میں آ گیا "ملک صاحب، درگزر کرو، درگزر کرو۔ جوان خون ہے . . . جلدی جوش میں آ جاتا ہے۔"

"اوئے، تم مجھ سے زیادہ قانون جانتے ہو؟" میں نے مزید کہا "کل تم لوگوں نے مجھے چکر دینے کی کوشش کی اور اصل بات نہیں بتائی۔"

"کون سی اصل بات؟ ملک صاحب!" چودھری عابد نے پوچھا "ہم نے تو آپ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔"

"سب کچھ بتا دیا تھا مگر جائداد کی بات نہیں بتائی۔ یہ نہیں بتایا کہ تین روز سے تمھارا اپنی بہن سے جھگڑا ہو رہا تھا۔"

"ج . . . جی، جائداد! جائداد کی کیا بات ہے؟"

میں دونوں کو اندر لے گیا اور ہیڈ کلرک کے کمرے میں بٹھانے کے بعد کہا "تم دونوں اِدھر بیٹھو، میں فارغ ہو کر تم سے بات کرتا ہوں۔"

چودھری اشرف اکڑنے لگا۔ بولا "آپ کس قانون کے تحت ہمیں بٹھا رہے ہیں؟"

چودھری عابد بولا "اتنی دیر میں تو ڈاکٹر اپنا کام کر ڈالے گا۔ ہمیں میت اٹھوانے کی اجازت دے دیں۔ کفن دفن کا کام کرنے کے بعد ہم خود ہی آپ کے پاس حاضر ہو جائیں گے۔"

میں اُنھیں رُکنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اندر جا کر میں نے ایک حوالدار کو بلایا اور کہا "ہیڈ کلرک کے کمرے میں دو چودھری بیٹھے ہیں اُنھیں کوئی نہ روکے۔ اگر وہ جانا چاہیں تو بے شک چلے جائیں۔ لیکن اُنھیں میرے پاس نہ آنے دیا جائے۔ میں بہت مصروف ہوں۔"

اس کے بعد میں نے ایک آدمی کو اس پیغام کے ساتھ مردہ خانے بھیج دیا کہ متوفیہ کے پوسٹ مارٹم میں کوئی تاخیر نہ کی جائے۔ تھوڑی دیر بعد بڑا بھائی چلا گیا اور چھوٹا بھائی تھانے میں شور مچاتا رہا، مگر کسی نے اسے مجھ تک نہیں پہنچنے دیا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ موصول ہو گئی۔ اس رپورٹ سے ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ لڑکی چار ماہ کی حاملہ تھی۔

میں نے باہر سے پتا کیا تو معلوم ہوا کہ چھوٹا چودھری بھی واپس چلا گیا تھا۔ غالباً اُسے اس انکشاف کی بھنک مل گئی تھی۔

میں نے دو آدمی ساتھ لیے اور اُس کی حویلی پہنچ گیا۔ بیٹھک میں تعزیت کرنے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ چودھری عابد نے مجھے دیکھا تو جلدی سے اٹھ کر میرے پاس آیا اور مجھے ایک الگ کمرے میں لے گیا۔ واضح طور پر وہ ڈر رہا تھا کہ میں سب کے سامنے وہ بات نہ کہہ دوں جسے وہ چھپانا چاہتے تھے۔

"چودھری! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ موصول ہو گئی ہے۔" میں نے کہا "لڑکی چار ماہ کی حاملہ تھی۔"

اُس نے سر جھکا لیا۔ بولا "میں اشرف کی زبانی یہ بات سن چکا ہوں۔"

"کیا لڑکی شادی شدہ تھی؟"

"نہیں۔" اُس نے نفی میں سر ہلایا "شاید یہ گڑبڑ اُدھر پاگل خانے میں ہوئی تھی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جوان لڑکی کو لوگ کس طرح بھوکی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ آپ اِس بات کا کہیں ذکر نہ کریں۔ مرنے والے کی برائی نہیں کرنی چاہیے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم نے اسی بدنامی سے بچنے کے لیے لڑکی کو قتل کیا ہے۔"

"ہمیں اس بات کا علم نہیں تھا۔ یہ بات آپ کے آدمی کی زبانی ہمیں معلوم ہوئی ہے۔" قدرے توقف کے بعد اُس نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ زرینہ نے اسی وجہ سے خودکشی کی ہے۔"

بظاہر یہ بات وزن رکھتی تھی، مگر بادی النظر میں بے حقیقت اور کھوکھلی تھی۔ اگر لڑکی نے اپنی ذلت چھپانے کے لیے خودکشی کی تھی تو یہ کام پردیس میں زیادہ موزوں تھا۔

اب دیکھنے والی بات یہ تھی کہ لڑکی کی اس حالت کا ذمے دار کون تھا اور اُس کے غیرت مند بھائی اس ضمن میں کیا کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میں نے یہی سوال چودھری سے کیا تو وہ بات گول کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے کہا "کل تو تم عزت اور غیرت کی بات کر رہے تھے۔"

اُس نے چالاکی سے کہا "قانون کے سامنے کھل کر بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے اس کا ردِعمل جاننے کے لیے کہا "میں اپنے کسی افسر کو پاگل خانے بھجوانے کا سوچ رہا ہوں۔ اگر انھوں نے تعاون نہ کیا تو یہ کیس اعلیٰ سطح تک جائے گا۔"

اُس نے آنکھیں گھما کر سوچا، پھر بولا "آپ کیوں زحمت کرتے ہیں۔ ہم خود اس کام سے فارغ ہو جائیں، اُس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسی حرکت کرنے والا بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔" قدرے توقف کے بعد اُس نے مزید کہا "اب آپ سے کیا چھپانا . . . ہم نے دو آدمی لاہور بھیجنے کے لیے تیار بھی کر لیے ہیں۔ وہ ایک آدھ گھنٹے میں روانہ ہو جائیں گے۔ آپ اِس معاملے میں کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اگر آپ نے مجرم کو پکڑ بھی لیا تو ثبوت کہاں سے لائیں گے؟ وہ عدالت میں جا کر چھوٹ جائے

گا اور نقصان پھر بھی ہمارا ہی ہوگا۔ اس بات کا اخباروں میں چرچا ہوگا اور ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

اُن کی ساری گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم اس معاملے میں مزید کوئی کارروائی نہ کریں۔ میں نے کہا "میں تمہیں قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

"میں اسی لیے آپ کو اپنا پروگرام نہیں بتا رہا تھا۔"

معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے خاصی چھان بین کی ضرورت تھی۔ چودھری نے جو کچھ مجھے بتایا تھا اُس سے میں مطمئن نہیں تھا۔

میں نے اُن لوگوں سے ملنا شروع کیا جو چودھری کے اندرونی حالات کے بارے میں جانتے تھے۔ ان میں اُن کے ملنے جلنے والے اور رشتے دار شامل تھے۔ اس پوچھ گچھ سے رفتہ رفتہ بات کھلتی چلی گئی۔ بعض اندرونی باتیں زرینہ کی ہمراز سہیلیوں سے معلوم ہوئیں۔

ان باتوں کی تفصیل میں واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

*

جہاں تعلیم کی کمی یا جہالت ہو وہاں لڑکیوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ لیکن زرینہ کا باپ چودھری ظہور علی بیٹی کو بہت چاہتا تھا۔ وہ بہت ہی لاڈ کرتا تھا۔ لاڈو اُس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بول موت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ذہین تھی۔ اُس کی ذہانت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے چودھری نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اُسے اعلیٰ تعلیم دلائے گا۔ لیکن موت نے اُسے یہ خواہش پوری ہی نہ کرنے دی۔

باپ کی موت کے وقت زرینہ فرسٹ ایئر میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ وہ اپنے تانگے پر کالج جاتی تھی اور اُسی پر واپس آتی تھی۔ ... سال کوچوان کا نام اللہ رکھا تھا اور وہ چودھریوں کا پرانا ... نوکر تھا۔

جب ... چودھری برادران نے اللہ رکھے کو اپنے پاس بلایا تو بڑے بھائی نے کہا "اللہ رکھے! ہم نے بڑی غلط قسم کی ... سنی ہیں۔"

اللہ رکھے نے گھبرا کر پوچھا "کون سی باتیں جناب؟"

چودھری اشرف نے قدرے دھیمی آواز میں کہا "ہم نے سنا ہے ... زرینہ بی بی لڑکوں سے ملتی ملاتی ہے۔"

... اللہ رکھے کو چاند کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ چودھریوں کا موروثی ملازم تھا اور یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ کوئی ملازم چودھریوں کی کسی عورت کا ذکر اپنی زبان پر نہیں لا

سکتا تھا لیکن آج چودھری برادران خود اپنی چھوٹی بہن کا ذکر اُس کے سامنے کر رہے تھے اور ذکر بھی اچھا نہیں تھا۔

"چودھری صاحب! میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں دیکھی جی" اللہ رکھے نے عاجزی سے کہا "بی بی سیدھی مدرسے جاتی ہے اور چھٹی پر سیدھی گھر آجاتی ہے۔"

"آج سے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا" چودھری اشرف نے تحکمانہ لہجے میں کہا "اگر زرینہ بی بی کسی مرد سے بات کرتی نظر آئے تو فوراً ہمیں خبر کر دینا۔"

اللہ رکھا تذبذب کرتے ہوئے بولا "جناب! میں آپ کا چاکر... کمی کمین... آپ کی جوتیوں کا غلام... میں بی بی کے بارے میں کیسے زبان کھول سکتا ہوں؟"

"او نے! یہ ہمارا حکم ہے۔ اگر زبان نہیں کھولو گے تو زبان کاٹ دیں گے" چودھری نے جیب سے کچھ پیسے نکال کر اُسے دیے اور کہا "یہ لے... یہ پیسے رکھ لے۔ اپنے تجھ پر کہ کوئی مرد لڑکا اشتو نہ ڈالے جائے... اور دیکھ۔ اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ زرینہ کی ماں سے بھی نہیں۔"

اللہ رکھے نے ڈرتے ڈرتے پیسے رکھ لیے۔ اُسے معلوم تھا کہ بڑے چودھری صاحب کی وفات کے بعد چودھرانی زرینہ کا بہت خیال رکھتی تھی اور بھائیوں کو اس کے خلاف کوئی بات نہیں کرنے دیتی تھی۔

"ہم نے ایک اور آدمی کو بھی زرینہ بی بی کی نگرانی پر لگا دیا ہے" چودھری نے مزید کہا "اگر تم نے کوئی بات چھپائی تو تمہاری خیر نہیں ہوگی۔"

غالباً یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا اور مقصد اس کا یہ تھا کہ اللہ رکھا ڈر کی وجہ سے کوئی بات نہ چھپائے۔

زرینہ جس کالج میں پڑھتی تھی وہ گرلز کالج تھا تاہم دفتر کے اسٹاف اور تدریسی عملے میں کچھ مرد بھی تھے۔

قبل ازیں اللہ رکھا زرینہ کو کالج کے سامنے اُتار کر فوراً واپس چلا جاتا تھا لیکن چودھری کی ہدایت کے بعد وہ زرینہ کو اُتارنے کے بعد تھوڑی دور گھوڑے کے لیے رُک جاتا اور اُس وقت تک وہاں منتظر رہتا جب تک زرینہ گیٹ میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔

چند روز کے بعد اُس نے دیکھا کہ ایک خوش شکل نوجوان جو پہلے سے گیٹ کے پاس کھڑا تھا، زرینہ کی طرف بڑھا اور کچھ بات کرنے کے بعد ایک کاغذ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سیدھا سادہ اللہ رکھا یہ دیکھ کر چونکا۔ اُس نے دل میں سوچا کہ چودھریوں کا شک بے جا نہ تھا۔

واپس پہنچ کر اُس نے ڈرتے ڈرتے چودھری عابد کو یہ بات بتا دی۔

چودھری تو یہ بات سننے کے لیے تیار ہی بیٹھا تھا۔ اُس نے چھوٹے بھائی اور ماں کو بھی بلا لیا۔ اور اللہ رکھے سے کہا کہ وہ دوبارہ ساری بات بتائے۔

"چودھری صاحب! آپ خود ہی بتا دیں" اللہ رکھے نے ہاتھ جوڑ دیے "جاہل اَن پڑھ آدمی ہوں میرے منہ سے کوئی غلط سلط بات نہ نکل جائے۔"

"او نے کم عقلا! یہ بیان کا معاملہ ہے اور دیکھ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ تو نے دیکھا ہے وہ ٹھیک ٹھیک بتا دے۔"

"چودھرانی جی! میں آپ کا جدی پشتی نوکر ہوں۔ بی بی زرینہ پر کوئی الزام نہیں لگا رہا۔ جو میں نے دیکھا وہ بتا رہا ہوں۔"

"یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟" چودھرانی نے غصے سے کہا "اب یہ کمی کمین ہماری بہو بیٹیوں پر الزام لگائیں گے۔ ساجد! تم نے اس کی زبان کیوں نہ کھینچ لی؟"

"ماں! اس غریب کی زبان کھینچنے سے کچھ نہیں ہوگا" چودھری اشرف نے کہا "یہ ہمارا وفادار ہے۔ اسے ہماری عزت کا خیال نہ ہوتا تو یہ اپنی زبان بند رکھتا اور دنیا کی باتیں چلنے دیتا۔ اب اس کی بات سن لیں پھر کوئی فیصلہ کریں۔ اللہ رکھے! پوری بات بتاؤ۔"

اللہ رکھا ڈرتے ڈرتے بولا "آج میں بی بی جی کو کالج چھوڑ کر جانے لگا تو میں نے ایک جوان کو اُن کی طرف جاتے دیکھا۔ میں بھی کھڑا رہا، یہ ویسی بات ہے اس لیے میں رُک گیا۔ جوان نے بی بی جی سے کوئی بات کی اور ایک کاغذ اُن کے ہاتھ میں دے کر چلا گیا۔"

چودھرانی نے حیرت اور غصے سے اللہ رکھے کی بات سنی پھر بولی "اللہ رکھیا۔ اگر یہ بات جھوٹی نکلی تو میں تیری چمڑی اُدھیڑ کر رکھوا دوں گی۔ آنے دے میری لاڈو کو۔"

چودھری عابد نے اللہ رکھے کو باہر بھیج دیا اور ماں سے بولا "ماں جی! غصہ کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اللہ رکھے نے جو کچھ بتایا ہے ہم اس کے بارے میں پہلے بھی سن چکے ہیں۔ پہلے ہمیں یقین نہیں آیا تھا مگر اب بات سچی معلوم ہوتی ہے۔ اللہ رکھا ہمارا پرانا ملازم ہے۔ یہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"کالج میں تو یہی ہوتا ہے" چودھری اشرف نے کہا "آج ... کو کوئی اور کل کوئی اور لکھے گا۔ اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے ... زرینہ کالج نہیں جائے گی۔"

دوپہر کے وقت جب زرینہ گھر پہنچی تو دونوں بھائیوں نے یہ فیصلہ سنا دیا۔

"کیوں؟" زرینہ نے تیز لہجے میں پوچھا "میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ مجھے کالج جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"ٹانگیں توڑ دوں گا۔ اگر گھر سے باہر قدم نکالا" اشرف نے کہا "ہمیں تیری رقعے بازی کا سارا حال معلوم ہو گیا ہے۔"

"رقعے بازی!" زرینہ چونک کر بولی "کس رقعے بازی کی بات کر رہے ہو؟"

"ذرا دیکھو تو اس کی دیدہ دلیری۔ آج صبح کالج کے گیٹ پر تم کس نوجوان سے باتیں کر رہی تھیں؟"

"میں؟ باتیں کر رہی تھی؟"

"ہمیں اُلّو بنانے کی کوشش نہیں کرو۔ اُس لڑکے نے تمہیں ایک رقعہ بھی دیا تھا۔"

لمحہ بھر کے لیے زرینہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا جیسے اُس کی چوری پکڑی گئی ہو "وہ... وہ تو دفتر میں کام کرنے والے کسی کلرک کا بھائی تھا... اور... اور چونکہ مردوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی اس لیے اُس نے کہا تھا کہ میں... اُس کے بھائی کو رقعہ پہنچا دوں..."

ماں نے پریشانی سے پوچھا "تو نے ایک غیر مرد کے ہاتھ سے رقعہ لے کر دوسرے غیر مرد کو پہنچایا؟"

"پہلے تو میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکی کہ کیا معاملہ ہے" زرینہ نے کہا "اُس کے بھائی کے بچے کو چوٹ لگ گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اُس کا رقعہ اندر پہنچا دوں۔ میں نے اندر جا کر اُس کو رقعہ دے دیا۔"

"یہ جھوٹ بولتی ہے" اشرف نے کہا "اتنی ساری لڑکیوں میں صرف زرینہ ہی رہ گئی تھی رقعہ پہنچانے والی؟"

"جھوٹ تم بول رہے ہو۔ بہن پر الزام لگاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

"زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کل سے کالج نہیں جاؤ گی۔"

"ابا جی نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ابا جی کے لاڈ نے ہی تمہیں زیادہ خراب کیا ہے" بڑے بھائی نے کہا "اب تم ہماری ذمے داری ہو۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو لوگ ہمیں لعن طعن کریں گے۔"

"کیوں ہوگی اونچ نیچ؟" زرینہ نے چیخ کر کہا "میں جاہل گنوار ہوں؟ یا... یا کوئی بازاری عورت ہوں؟"

"چپ ہو جا" چھوٹے بھائی نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا "نہیں تو سیدھا کر دوں گا۔ ہمارے لیے ایک ہی نوشکا فی ہے۔"

"یہ ۔ ۔ ۔ کسی نے میرے ساتھ دشمنی کی ہے، میرے خلاف سازش کی ہے۔ مجھے جان بوجھ کر بدنام کیا ہے۔ میں بھی سوچ رہی تھی کہ اس لڑکے نے سب کو چھوڑ کر مجھی کو کیوں رقعہ دیا ہے۔ میں کل اُس کے بھائی کو پکڑوں گی۔ ماں، یہ کسی نے میری چغلی لگائی ہے؟"

ماں اللہ رکھے کا نام لینے لگی تو اشرف جلدی سے بولا "کوئی ضرورت نہیں کسی کا نام لینے کی، اگر یہ بات جھوٹ ہوتی تو پھر تم چغلی لگانے والے کو پکڑتے۔ یہ رُقعہ وصول کرنے کا اقرار کر چکی ہے۔"

"اگر تمھارے اندر غیرت ہے تو میرے ساتھ چلو، اُس کلرک کے بھائی کو پکڑو جس نے مجھے رقعہ دیا تھا، میرے سامنے اُس سے پوچھو کر کیا بات ہے؟ اُس نے مجھے کیوں رُقعہ دیا تھا؟ کیا لکھا تھا اُس میں؟"

"گند کو دبا ہی رہنے دو۔"

"تم نہیں پوچھو گے تو میں اپنی پرنسپل سے بات کروں گی۔ گند تمھارے دل میں ہے۔ میرا دل بالکل صاف ہے۔" زرینہ پر دم بہ دم ہسٹریائی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ "میں پاگل نہیں ہوں، جاہل نہیں ہوں۔ ۔ ۔ ماں تم بتاتیں کیوں نہیں کہ کس نے میری چغلی کی ہے؟"

"یہ کام اللہ رکھے کا ہے۔" ماں نے جواب دیا۔

یہ سُن کر زرینہ کا غصہ فزوں تر ہو گیا۔ اُس نے ایک ملازم کو بھیج کر اللہ رکھے کو بلایا اور اُس پر چڑھ دوڑی: "ذلیل، کمینے کُتّے ۔ ۔ ۔ تو نے اپنے مالکوں پر ہی بھونکنا شروع کر دیا ہے ۔ ۔ ۔ بے غیرت، مجھ پر تہمت لگانے سے پہلے مجھ سے بات تو کر لیتا ۔ ۔ ۔"

اللہ رکھا سر جھکائے چپ کھڑا رہا۔ وہ بولتا بھی کیا۔ چودھری برادران نے اُسے منہ بند رکھنے کی تاکید کر رکھی تھی۔ زرینہ نے اُسے چپ دیکھ کر دو چار تھپڑ اُس کے منہ پر مارے۔ "حرام خور، چپ کیوں کھڑا ہے، بولتا کیوں نہیں؟"

اشرف نے بہن کا بازو پکڑ کر ایک طرف کیا اور اللہ رکھے کو واپس بھیجنے کے بعد بولا "بہت تماشا ہو گیا۔ اب اپنا منہ بند کر لے ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

زرینہ نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور چیخ کر بولی۔ "جب تک ماں زندہ ہے، مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔ میں دیکھوں گی کہ کون مجھے کالج جانے سے روک سکتا ہے۔"

لیکن اُس کا سارا زور بولنے تک محدود رہا۔ بھائی زور آور تھے۔ ماں بھی اُن کے سامنے بولنے سے گریز کرتی تھی۔ رہا سہا احترام بھی جاتا رہا۔ بھائیوں نے زرینہ کی تمام کاپیاں کتابیں بوری میں ڈال کر غائب کروا دیں اور اس کے احتجاج کے باوجود اُسے کالج نہیں جانے دیا۔

زرینہ کئی روز تک اسی غم میں روتی رہی۔ اُس نے کھانا پینا اور اچھے کپڑے پہننا چھوڑ دیا۔ بال بکھیرے دیوانوں کی طرح حویلی میں بے چین پھرتی رہتی۔ اگر کوئی ملنے آتا تو اُسے رو رو کر بھائیوں کی زیادتیوں کے بارے میں بتاتی۔ بالآخر اُس کی بھابیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ بے چاری کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ پاگل ہو گئی ہے۔ ہر وقت اُلٹی سیدھی باتیں کرتی رہتی ہے۔ پھر بھائیوں نے بھی یہی کہنا شروع کر دیا اور زرینہ کے باہر جانے پر پابندی لگا دی۔ اگر ایک ذہین و فطین لڑکی کو گھر میں قید کر دیا جائے اور اُس کی ترقی کے راستے بند کر دیے جائیں تو وہ سچ مچ پاگلوں جیسی ہو جاتی ہے اور پاگلوں جیسی نظر آنے لگتی ہے۔ زرینہ کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد بھائیوں نے برادری کے ایک معمولی پڑھے لکھے نوجوان سے زرینہ کا رشتہ طے کر دیا۔ اس رشتے کی پہلی شرط یہ تھی کہ زرینہ کو جائداد میں سے حصہ نہیں ملے گا۔ نوجوان نے یہ شرط قبول کر لی۔ جب زرینہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو اُس نے چیخ چیخ کر پورا گھر سر پر اُٹھا لیا۔ اُسے نہ مذکورہ رشتہ منظور تھا اور نہ وہ جائداد سے دست بردار ہونے کے لیے تیار تھی۔ اُس کے اس احتجاج سے صرف اتنا فائدہ ہوا کہ لڑکے والوں نے رشتے سے انکار کر دیا۔

ایک روز بڑے بھائی نے زرینہ کو بیٹھک میں بُلا کر کہا، "زرینہ! مجھے تمھاری بہت فکر ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ گھریلو جھگڑوں کی وجہ سے تمھاری زندگی برباد ہو رہی ہے اور تمھاری شادی کی عمر بھی نکلی جا رہی ہے۔ اگر تم میرے ساتھ تعاون کرنے کا وعدہ کرو تو میں سب ٹھیک کر لوں گا۔"

زرینہ نے دُکھی لہجے میں کہا، "آج آپ کو اپنی پاگل بہن کیسے یاد آ گئی؟"

"میں تمھارا دشمن نہیں ہوں۔ مجھے تمھارا بہت خیال ہے لیکن تم کسی کی بات سنتی ہی نہیں۔ اُدھر وہ اشرف بھی اپنی ضد پر اَڑا ہوا ہے۔ اس طرح کیسے کام بنے گا؟"

"میں کون سی بات نہیں سنتی؟"

"اپنے آپ کو بنا سنوار کر رکھا کرو اور ملنے جلنے والوں سے سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔"

"اچھا! آپ میرے اوپر ظلم کرتے رہیں اور میں مُنہ سے آواز بھی نہ نکالوں؟"

"دراصل اشرف کو تم سے ضد ہو گئی ہے۔ وہ تمھیں جائداد

سے حصہ نہیں دینا چاہتا۔ اگر تم جائداد سے دستبرداری لکھ دو تو میں تمھیں دوبارہ کالج میں داخل کرا دیتا ہوں۔"

"میں لکھ دوں گی۔" زرینہ تعلیم جاری رکھنے کی بات سن کر خوش ہو گئی۔ "آپ جو کہیں گے، میں وہی لکھ دوں گی۔ لیکن پہلے میں اپنی تعلیم مکمل کروں گی۔ اُس کے بعد میں جائداد سے دستبرداری لکھ دوں گی۔"

بھائی نے پوچھا، "پہلے لکھنے میں کیا حرج ہے؟"

"مجھے آپ پر بھروسا نہیں رہا۔" زرینہ نے صاف جواب دیا۔ "آپ مجھ پر بہت ظلم کر چکے ہیں۔"

چودھری عابد نے چھوٹے بھائی سے مشورہ کیا اور زرینہ کو کالج جانے کی اجازت دے دی۔ دونوں کی نیت اچھی نہیں تھی۔ اُن کی نظر فقط جائداد پر تھی۔

زرینہ کا ایک سال ضائع ہو چکا تھا تاہم اُس نے اُس نقصان کو بھلا دیا اور کالج میں داخلہ لے کر پھر سے محنت شروع کر دی۔

باہر کی فضا میں قدم رکھنے کے بعد اُس نے غیر شعوری طور پر کسی سہارے کی تلاش شروع کر دی۔ اُس کی یہ خواہش بالکل فطری تھی کیوں کہ اُس کے بھائی، جنھیں قدرت نے اُس کا سہارا بنایا تھا، وہی اُس کے دشمن بن چکے تھے۔ لے دے کے ایک ماں تھی جو بیٹوں سے دب کر رہتی تھی۔ زرینہ خود بھی کمزور تھی۔ بھائیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

اس غیر شعوری خواہش کے نتیجے میں زرینہ اپنی ایک کلاس فیلو کے بھائی کی طرف مائل ہونا شروع ہو گئی جو ایک سلجھا ہوا نوجوان تھا اور بی اے فائنل میں پڑھتا تھا۔ اُس کا نام ساجد تھا۔ اُس کی بہن کا نام صادقہ تھا۔

شروع میں زرینہ، صادقہ کے توسط سے ساجد سے بات چیت کرتی تھی، پھر رفتہ رفتہ دونوں قریب آ گئے اور درمیانی واسطے کی ضرورت نہ رہی۔ دونوں کی ملاقاتیں ہمیشہ صادقہ کے گھر پر ہی ہوتی تھیں۔ ساجد چونکہ فائنل ایئر میں پڑھتا تھا، اس لیے وہ بہن کو پڑھائی میں مدد بھی دیتا تھا اور یہ لڑکیوں کے ساتھ مل بیٹھنے کا ایک معقول بہانہ تھا۔

صادقہ دونوں کو گاہے گاہے تنہائی بھی فراہم کر دیا کرتی تھی۔ جب بے تکلفی بڑھی تو زرینہ نے ساجد کو اپنے بھائیوں کی زیادتیوں کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔

ساجد نے اُسے حوصلہ دیا اور کہا کہ ضرورت پڑنے پر وہ پورا پورا ساتھ دے گا اور زرینہ اُس کی باتوں سے بڑی ہمت محسوس کرنے لگی۔

جب اُس کے سالانہ امتحان کے دن قریب آئے تو ایک روز بڑے بھائی نے کہا، "زرینہ! ہم نے اپنے وعدے کے مطابق تمھیں تعلیم حاصل کرنے کی پوری اجازت دے دی ہے۔ اب تم اپنے وعدے کے مطابق کاغذ پر دستخط کر دو۔"

زرینہ نے کہا، "میں نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد دستخط کرنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"اس کی فکر نہیں کرو۔ تمھاری تعلیم کا ذمے دار میں ہوں۔ تعلیم تمھاری چلتی رہے گی۔ میں چار آدمیوں کے سامنے تمھیں زبان دینے کے لیے تیار ہوں۔"

زرینہ کچھ نرم پڑ گئی۔ اُس نے کہا کہ وہ ماں سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرے گی۔ اُسے یہ بھی ڈر تھا کہ اُس کے انکار کی وجہ سے بھائی کہیں اُسے دوبارہ گھر میں نہ بٹھا دیں۔

دو روز کے بعد اُس نے ساجد سے اس معاملے میں مشورہ کیا۔ ساجد نے پوری بات سننے کے بعد کہا، "میں تمھیں دستخط کرنے کا مشورہ کبھی نہیں دوں گا۔ میرے خیال میں تمھاری یہ تعلیم صرف اسی وجہ سے چل رہی ہے کہ ابھی تم نے جائداد سے دستبرداری اختیار نہیں کی لیکن جیسے ہی تم نے اسٹامپ پیپر پر دستخط کیے تمھاری حیثیت ختم ہو جائے گی۔ جائداد کی تفصیل کیا ہے؟"

"تقریباً دس مربع زمین ہے، اس کے علاوہ حویلی اور مال مویشی بھی ہیں۔"

"دس مربع زمین میں کم از کم دو مربع زمین تمھارے حصے میں آئے گی۔ تمھیں اپنا حصہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

"چھوڑنا تو میں بھی نہیں چاہتی، لیکن بھائیوں کے سامنے بے بس ہوں۔ میرے پاس کوئی طاقت، کوئی حیلہ وسیلہ نہیں ہے۔ اگر میں نے دستخط کرنے سے انکار کیا تو کوئی عجب نہیں کہ وہ مجھے دوبارہ گھر میں بند کر دیں۔"

"انکار مت کرو، بس کسی طرح ٹالتی رہو۔ اس بات پر جم جاؤ کہ تم نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد دستخط کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور دیکھو دستخط بالکل نہ کرنا۔ میں تمھارے بھائیوں کی فطرت کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اِدھر تم نے اسٹامپ پیپر پر دستخط کیے، اُدھر اُنھوں نے تمھیں کالج سے اٹھانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ سوچ لیا۔"

جس وقت دونوں کمرے میں باتیں کر رہے تھے، اُس وقت تاجاں نامی ایک عورت گھر میں داخل ہوئی۔ بوڑھی تاجاں گھر گھر پھرنے والی ایک چغل خور عورت تھی۔ لوگ اُس کی خصلت کو جاننے کے باوجود اُسے خوش آمدید کہتے تھے کیونکہ وہ بڑی چٹخارے دار باتیں کرتی تھی۔ اُسے یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ

کون کس کو ناپسند کرتا ہے اور کس کو پسند کرتا ہے۔ وہ شاطر عورت جس گھر میں جاتی۔ اُس گھر والوں کے دوستوں کی اچھائیاں اور دشمنوں کی چغلیاں کرنے بیٹھ جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ اُس کی باتیں مزے لے کر سنتے تھے اور بعض تو اُس کا انتظار کرتے تھے۔

اُس وقت صادقہ اور اُس کی ماں کچن میں تھی۔ صادقہ زرینہ کے لیے چائے بنا رہی تھی اور اُس کی ماں کھانے پکانے کے کام میں مصروف تھی۔

تاجاں نے ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز سنی تو بے آواز چلتی ہوئی آگے بڑھی اور دروازے میں رُک کر اندر جھانکا۔ جب اُس نے دیکھا کہ چودھری حامد کی بہن ساجد سے باتیں کر رہی ہے تو اُس نے آنکھیں مٹکائیں اور فوراً ہی واپس چل دی لیکن ساجد نے اُسے دیکھ لیا اور جلدی سے اُٹھ کر اُس کے پیچھے لپکا۔

"ماسی تاجاں، خیر تو ہے؟" اُس نے پوچھا "کیسے آنا ہوا؟"

"خیر ہے پُتر، خیر ہے۔" ماسی تاجاں نے کہا "میں ادھر سے گزر رہی تھی، سوچا تیری ماں کو سلام کرتی چلوں کئی دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جیراں کو ملنے گئی تھی۔ بے چاری کی کڑی کی منگنی ٹوٹ گئی ہے۔" نذیراں عرف جیراں سے ساجد کی ماں کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ "بے چاری اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ جیراں تو کیوں فکر کرتی ہے۔ میں تیری کڑی کے لیے رشتہ ڈھونڈھ کے لاؤں گی۔"

ساجد دلچسپی لیتے ہوئے بولا "ماسی جیراں کی لڑکی تو کافی خوب صورت ہے اُس کی منگنی کیسے ٹوٹ گئی؟"

"منڈے کو نوکری مل گئی ہے۔ اُس کا دماغ ذرا اُچا ہو گیا ہے۔" ماسی تاجاں نے کہا۔ پھر ہولے سے بولی "تیرے لیے بات کروں؟"

ساجد نے مذاق کے رنگ میں پوچھا "لڑکی سے یا لڑکی کی ماں سے؟"

"چل، شریر نہ ہووے تے!" ماسی تاجاں نے ساجد کو دھپ لگائی۔ پھر ہولے سے پوچھا "یہ چودھریوں کی کڑی تیرے کول پڑھنے آئی ہے؟"

"وہ . . . صادقہ کی سہیلی ہے۔" ساجد نے محتاط لہجے میں جواب دیا "دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتی ہیں۔ میں کبھی کبھی ان کی مدد کر دیتا ہوں۔"

اتنے میں صادقہ چائے بنا کر لے آئی اور ماسی تاجاں کچن کی طرف چلی گئی۔

*

اُس روز زرینہ گھر پہنچی تو اُسے پتا چلا کہ ماسی تاجاں اُن کے گھر سے ہو کر جا چکی تھی تاہم اُسے اس بات پر حیرت ہوئی کہ اُس کے بھائیوں نے ساجد کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اُسے صادقہ کے گھر جانے سے منع کیا تھا۔

اس کے چند روز کے بعد اطلاع ملی کہ ساجد دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا ہے۔ اُس کے کپڑے ایک پیڑ کے نیچے رکھے تھے جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ وہ نہانے کے لیے دریا میں اُترا تھا لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ اکیلا دریا پر کیوں گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کبھی اس طرح دریا پر نہانے نہیں گیا تھا۔ یہ بات صرف زرینہ ہی جانتی تھی کہ ساجد کے ساتھ کیا سانحہ پیش آیا تھا اور اُسے کس نے ہلاک کیا تھا۔ لیکن وہ بدنامی کے ڈر سے کوئی بات مُنہ سے نہ نکال سکی۔

اس سانحے کے چند ہفتوں کے بعد چودھری حامد اسٹیمپ پیپر تیار کر کے لے آیا اور زرینہ سے اُس پر دستخط کرنے کو کہا۔ زرینہ کو ساجد کی موت کا سخت دُکھ تھا۔ وہ اپنے بھائیوں کو اُس کا قاتل سمجھتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اُسے ایک ہمدرد ملا تھا لیکن اُس کے سنگ دل بھائیوں نے اُسے موت کے مُنہ میں دھکیل دیا تھا۔

"میں اس کاغذ پر دستخط نہیں کروں گی۔" اُس نے صاف انکار کر دیا۔

"تم دستخط کرنے کا وعدہ کر چکی ہو۔" بڑے بھائی نے اُسے یاد دلایا۔

"ابھی میری تعلیم مکمل نہیں ہوئی۔"

چھوٹے بھائی نے کہا "اگر ضد کرو گی تو تعلیم کبھی مکمل نہیں ہو گی۔ یہ ہماری مہربانی ہے کہ ہم نے تمھیں پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ دستخط کر دو۔"

"آپ لوگ یہ زمین مجھ سے چھیننا چاہتے ہیں؟" زرینہ نے جاننا چاہا "کیا اس پر میرا حق نہیں ہے؟ کیا باپ کی وراثت میں لڑکیوں کا حصہ نہیں ہوتا؟"

"لڑکیوں کو پرائے گھر جانا ہوتا ہے لیکن جدی پشتی جائداد پرائے گھر نہیں جا سکتی۔"

"میں جاہل نہیں ہوں مجھے بھی قانون آتا ہے۔ لڑکیوں کو اُن کے حقّے سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ کسی قانون میں نہیں لکھا کہ اگر لڑکیوں کو پرائے گھر جانا ہو تو اُس کا حق مار لو۔"

"زیادہ بڑبڑ نہیں کرو۔ ہم کتابوں کے قانون کو نہیں مانتے ہیں۔"

"اللہ کے قانون کو بھی نہیں مانتے؟" زرینہ نے تڑپ کر پوچھا "کیا اللہ نے بیٹیوں کا حصّہ نہیں رکھا؟ کیا بیٹیوں کو

پیسے کی ضرورت نہیں ہوتی؟ آپ کیوں نہیں اپنا حصّہ میرے ...دیتے؟"

چھوٹے بھائی نے زرینہ کے بال پکڑ لیے "بہت ہو گئیں ...دستخط کرتی ہے یا نہیں؟"

ماں نے کہا "بیٹی، ضد نہ کرو، دستخط کر دو۔ یہ لوگ تیری ...نہیں چھوڑیں گے۔"

"لاؤ، کاغذ مجھے دو۔" زرینہ نے کہا۔

چھوٹے بھائی نے بال چھوڑ دیے اور اسٹیمپ پیپر زرینہ ...ف بڑھایا۔ زرینہ نے اُس کے ہاتھ سے اسٹیمپ پیپر لیا ...جانک اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

اشرف نے بے اختیار اُس کے مُنہ پر تھپڑ مار دیا۔

"مارو اور مارو۔" زرینہ چیخ پڑی "ٹکڑے کر دو لیکن ...اپنا حصّہ تمھارے حوالے نہیں کروں گی۔ تم قاتل ہو، خونی ہو، ...کے عذاب سے ڈرو۔ یہ سب کچھ یہیں رہ جائے گا۔ قبر میں ...ت اعمال جائیں گے۔"

اشرف کا غصّہ فزوں تر ہو گیا۔ وہ تھپڑوں اور لاتوں سے ...ینہ کی پٹائی کرنے لگا۔ ماں چیخنے لگی۔ بڑے بھائی نے اشرف ...ایک طرف ہٹا دیا اور کہا "ہم سے بڑی غلطی ہوئی۔ اس کو ...ائی کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔"

"میں نے تو آپ کو پہلے ہی منع کیا تھا۔" اشرف نے کہا "دس ...قتیں کیا پڑھ گئی ہے، دماغ آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ ہمیں قانون ...ھاتی ہے۔ اُونہہ . . ."

بڑے بھائی نے کہا "کل سے تم کالج نہیں جاؤ گی بلکہ گھر ...ے باہر بھی نہیں نکلو گی۔"

دونوں بھائی باہر نکل گئے اور کمرے میں ماں بیٹی کی سسکیاں ...بھرنے لگیں۔

*

اس دفعہ زرینہ پر جو پابندی لگائی گئی وہ پہلے سے زیادہ ...ت تھی۔ بھائیوں نے اپنی بیویوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ زرینہ ...ے خوب کام لیں اور اُس کے ساتھ کوئی نرمی نہ برتیں۔ اب احتجاج ...نا بے کار تھا کیونکہ بھائی پوری طرح دشمنی پر اُتر آئے تھے۔

کچھ عرصے کے بعد بھابیوں نے زرینہ کو ساجد کے طعنے دینا ...روع کر دیے۔ اُس پر بے راہ روی کے الزامات عائد کرنے لگیں۔ ...ن کے طعنوں کے مطابق زرینہ بُری اور آوارہ لڑکی تھی۔ لڑکوں ...ے یاریاں لگانے کے لیے کالج جاتی تھی۔ اُس کی وجہ سے خاندان ...ناک کٹ گئی تھی۔ زرینہ اگر ان باتوں کا جواب دیتی تو بھابیوں کے ...اب کا نشانہ بنتی۔

زرینہ کی ماں ان باتوں کی وجہ سے سخت پریشان تھی۔ اُس نے دو تین جگھوں پر بیٹی کے رشتے کے بات چلائی۔ مگر اُس کی بہوؤں نے ہر دفعہ لڑکے والوں کو بدظن کر دیا۔ انھوں نے برادری میں یہ مشہور کر دیا تھا کہ لڑکی آوارہ، بدچلن اور نیم پاگل ہے۔

ان باتوں نے زرینہ کو واقعی نیم پاگل بنا دیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اُجڑی اُجڑی سی حالت میں رہنے لگی۔ ماں کے سوا کوئی اُس کو تسلی دینے والا نہیں تھا۔ ماں کے دل پر ان باتوں کا بہت صدمہ تھا لیکن اُس کا کوئی بس نہیں چلتا تھا۔ بالآخر شوہر کی وفات کے چار سال بعد اُس کا بھی انتقال ہو گیا۔

ماں کی وفات کے بعد زرینہ بالکل بے سہارا ہو گئی۔ بھابیوں نے اُسے پہلے سے زیادہ دُکھ دینے شروع کر دیے۔ وہ ہر وقت طعنوں سے اُس کا سینہ چھلنی کرتی رہتیں۔ زرینہ زیادہ تر خاموش رہتی لیکن جب اُس کی قوتِ برداشت جواب دے جاتی تو پھر پھٹ پڑتی اور چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اُٹھا لیتی۔ پھر نہ تو وہ کسی دھمکی سے گھبراتی اور نہ ہی مار سے ڈرتی۔ جس انسان کی بات سننے والا کوئی نہ ہو اُس کی ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی بات نہیں سناتا فقط اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔

ایک شام بڑے بھائی نے زرینہ سے کہا "اگر تم ان حرکتوں سے باز نہیں آؤ گی تو میں تمھیں پاگل خانے میں جمع کرا دوں گا۔"

"کروا دو . . ." زرینہ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "آج ہی کروا دو۔ اگر میں پاگل ہوں تو یہ بھی یاد رکھو کہ تم لوگوں نے مجھے پاگل کیا ہے۔ وہ پاگل خانہ اس عذاب خانے سے بہرحال اچھا ہو گا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ میں یہاں خوش ہوں تو سُن لو . . . کہ میں یہاں بالکل خوش نہیں ہوں۔ تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے اُس کی سزا تمھیں ضرور ملے گی۔"

"زرینہ، ہم تیرے دشمن نہیں ہیں۔"

"دشمن تم لوگوں سے اچھے ہوتے ہیں۔ اُن کا انسان مقابلہ تو کر سکتا ہے، اُن سے بچنے کی کوئی تدبیر تو کر سکتا ہے۔"

"تمھاری اس فضول بک بک سے سب لوگ پریشان ہیں کیا تم اپنی زبان کو لگام نہیں دے سکتیں؟"

"یہ فضول بک بک نہیں، ایک مظلوم لڑکی کی فریاد ہے۔ تم لوگ مجھ پر جو ظلم کر رہے ہو وہ ایک روز ضرور رنگ لائے گا۔"

"اگر تم میرے ساتھ تعاون کرتیں تو یہاں تک نوبت نہ پہنچتی اور اب تک تمھاری تعلیم بھی مکمل ہو چکی ہوتی۔ تمھارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اُس میں تمھاری زبان درازی کا زیادہ قصور ہے۔ اگر تم اس زبان درازی سے باز نہیں آؤ گی تو اپنا اور زیادہ

نقصان کرو گی۔"

"میں زبان دراز ہوں؟ فضول بک بک کرتی ہوں؟" زرینہ پھٹ پڑی۔ "تم اور تمھاری بیویاں تو بڑی خوش گفتار اور پارسا ہیں۔ مجھے پاگل اور آوارہ کس نے مشہور کیا ہے؟ میری شادی میں کس نے روڑے اٹکائے ہیں؟ صبح و شام کون طعنوں سے میرا سینہ چھلنی کرتا ہے؟ میرے حصے کی جائداد پر کس کی نظریں لگی ہوئی ہیں؟ میرے احتجاج کو فضول بک بک کہتے ہو۔ مجھے پاگل خانے میں جمع کروانے کی دھمکیاں دیتے ہو۔ میں انسان ہوں، مال مویشی نہیں ہوں۔ میں اپنے دکھ کس کو بتاؤں؟ تم بھائی ہو کر میرے دشمن بنے ہوئے ہو۔ اپنی بیویوں کو میرے پیچھے لگا رکھا ہے۔ میری داد فریاد تمھیں سنائی نہیں دیتی۔ مجھے بتاؤ، میں کس کے سامنے جا کر روؤں؟ کس سے انصاف چاہوں؟ مجھے قیدیوں کی طرح اس گھر میں بند کر رکھا ہے، نہ باہر جا سکتی ہوں، نہ کسی سے مل سکتی ہوں، کسی گھر آئے مہمان کے پاس بیٹھتی ہوں تو تمھاری بیویاں کام کے بہانے اٹھا دیتی ہیں۔ پھر مہمانوں کے کانوں میں پھونکیں مارتی ہیں کہ یہ پاگل ہے، اس کے سامنے کوئی بات نہ کریں۔ ابھی تو میں ٹھیک ہوں لیکن اگر میرے ساتھ یہی ہوتا رہا تو میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں گی۔"

"اشرف ٹھیک کہتا ہے۔ تمھارے ساتھ تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ تم کسی کی بات سنتی ہی نہیں ہو۔"

"میری بات تو جیسے سب ہی سنتے ہیں۔"

"ہمارا اب اس کے ساتھ گزارہ نہیں ہو سکتا۔" عابد کی بیوی ولایت بیگم نے کہا۔ "یہ اس گھر میں رہے گی یا میں رہوں گی۔"

"نہیں گزارہ ہوتا تو چلی جاؤ یہاں سے۔" زرینہ نے کہا۔ "اپنے باپ سے کہو کر تمھیں بنگلا بنا دے۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے۔ یہاں سے مجھے کوئی نہیں نکال سکتا۔"

"دیکھا۔۔۔ کیسی زبان چلتی ہے اس چڑیل کی۔ اسی وجہ سے کوئی اس کا رشتہ قبول نہیں کرتا۔ اچھی ہوتی تو اب تک اس کا گھر آباد ہو چکا ہوتا۔"

"جہاں بھائیوں کی نظریں جائداد پر لگی ہوں، وہاں بہنوں کی شادیاں نہیں ہوا کرتیں۔"

نند اور بھاوج میں تلخ جملوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ خود غرض بھائی نے اپنی بیوی کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور بہن سے کہا۔ "میں تمھیں آخری موقع دے رہا ہوں۔ اس لیے غور سے میری بات سنو۔ میں نے تمھارے لیے ایک بہت اچھا رشتہ دیکھا ہے۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے اور کھاتے پیتے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سال فصل کی کٹائی کے بعد تمھاری شادی ہو جائے۔" اس نے قدرے توقف کیا پھر بولا۔ "لیکن شادی سے پہلے تمھیں کچھ کاغذ پر دستخط کرنے پڑیں گے۔"

"اور اگر میں دستخط نہ کروں۔۔۔ تو؟"

"دیکھو زرینہ، جائداد ہمارے قبضے میں ہے اور قبضے میں ہی رہے گی۔ میں دستخط صرف اس لیے کروانا چاہتا ہوں کہ بعد میں ہماری اولاد کے درمیان کوئی پھوٹ نہ پڑے۔"

"پھوٹ تو ضرور پڑے گی۔ اب تو میں ہرگز بھی کسی کاغذ پر دستخط نہیں کروں گی۔ تم لوگوں نے میری زندگی تباہ کر دی ہے۔ میں ظالموں اور غاصبوں کو اپنا حصہ کبھی نہیں دوں گی۔ کسی یتیم خانے کے نام کر دوں گی مگر تمھیں نہیں دوں گی۔"

چودھری عابد سمجھ گیا کہ اب بات نہیں بنے گی۔ اس نے بھائی سے مشورہ کیا اور زرینہ کو زبردستی پاگل خانے میں داخل کروا دیا۔

*

یہ تیس سوا تین سال پرانی بات تھی۔ واقف کار لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ چودھری برادران نے بہن کو پاگل خانے میں داخل کروانے سے پہلے کئی روز تک ایک کوٹھری میں بند رکھا تھا اور اس کا حلیہ ایسا بنا دیا تھا کہ واقعی پاگل لگتی تھی۔

یہ تمام واقعات جو آپ اوپر پڑھ چکے ہیں، یہ تقریباً پچیس تیس افراد سے پوچھ گچھ کے بعد میرے علم میں آئے۔ اس دوران میں نے ایک اے ایس آئی کو لاہور روانہ کر دیا تھا تاکہ وہ مینٹل اسپتال سے زرینہ کے بارے میں پوچھ گچھ کر آئے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ موقع کے معائنے کے دوران مجھے دو چیزوں کی کمی محسوس ہوئی تھی۔

پہلی کمی میں نے یہ دیکھی کہ جس شہتیر میں رسی بندھی ہوئی تھی وہ خاصا اونچا تھا۔ میں نے پیٹی کی پیمائش کی۔ اس کے پاس پڑی ہوئی کرسی کی اونچائی ناپی، متوفیہ کے قد اور بازوؤں کی پہنچ کی پیمائش کی اور دیکھا کہ تقریباً ایک فٹ کا فرق رہ جاتا تھا یعنی اگر لڑکی پیٹی کے اوپر رکھی ہوئی کرسی پر کھڑی ہو کر اپنے ہاتھ بلند کرتی تو ہاتھوں کی انگلیوں اور شہتیر کے درمیان ایک فٹ کا فاصلہ رہ جاتا۔ کرسی اور پیٹی کے علاوہ کمرے میں کوئی اور ایسی چیز نہیں تھی جسے فاصلہ کم کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا۔

دوسری کمی میں نے یہ دیکھی کہ کمرے میں کوئی زنانہ جوتا یا سینڈل نہیں تھی۔ وہ سردیوں کا موسم تھا اور ٹھنڈے فرش پر ننگے پیر چلنا خاصا تکلیف دہ امر تھا۔

بعد کی تفتیش کے دوران کئی اور باتیں سامنے آئیں۔ چودھری عابد نے اپنے ابتدائی بیان میں کہا تھا کہ اس کا بھائی اشرف بہن کو پاگل خانے سے گھر لایا تھا مگر یہ بات سچی نہیں تھی۔ لوگوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا تھا کہ اشرف ان دنوں علاقے سے باہر نہیں گیا تھا۔

کم از کم دو افراد نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ انھوں نے رات کے تو ساڑھے نو بجے ایک نارنجی رنگ کی کار حویلی کے سامنے رکتے دیکھی تھی اور زرینہ اس کار سے اتری تھی۔ اس نے عمدہ قسم کا ریشمی لباس پہن رکھا تھا اور ایک سرخ رنگ کی شال پہن رکھی تھی۔ کار چلانے والا کوئی ڈرائیور معلوم ہوتا تھا۔ زرینہ کے ساتھ ایک سوٹ کیس بھی تھا جسے ڈرائیور نے حویلی تک پہنچایا تھا۔ اگر یہ بیان سچا تھا تو پھر یہ ماننا لازمی معلوم ہوتا تھا کہ زرینہ پاگل خانے سے نہیں آئی تھی۔

یہ بیان جن دو افراد نے دیا تھا وہ اتنے معتبر نہیں تھے لیکن ان کے بیان پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ موت کے وقت بھی زرینہ اچھے لباس میں ملبوس تھی اور اس کے بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے اور ان میں ریشمی پراندہ گندھا ہوا تھا۔

ان واقعاتی شواہد کی بنا پر مجھے یقین ہو گیا کہ زرینہ کو قتل کیا گیا تھا۔ اس نے خودکشی نہیں کی تھی تاہم میں نے چودھری برادران کو گرفتار کرنے میں جلدی نہیں کی۔

*

جس اے ایس آئی کو میں نے لاہور بھیجا تھا وہ پانچ روز کے بعد واپس آیا۔ اس کے ساتھ تین یا چار افراد اور بھی تھے، جو لاہور سے آئے تھے۔

"ملک صاحب، یہ افتخار لودھی ہیں۔" اے ایس آئی نے ایک شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا وہ شخص سرخ و سفید رنگت والا ایک قوی الجثہ شخص تھا۔ اس کا قد درمیانہ، آنکھیں شربتی رنگ کی اور بال بھورے تھے۔ عمر پینتیس اور چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ اس کی آنکھیں سرد اور ٹھہری ہوئی تھیں۔ دوسری نمایاں چیز اس کا ٹھوس اور کسرتی بدن تھا۔ وہ ایسا شخص تھا جو دوسروں کو متاثر کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ بہت چپ چپ سا تھا۔ جب اے ایس آئی نے اس کا مزید تعارف کرایا تو اس کی غیر معمولی خاموشی کا سبب بھی واضح ہو گیا۔

"یہ متوفیہ زرینہ بیگم کے شوہر ہیں۔" اے ایس آئی نے مزید کہا۔

"مجھے دیر اس لیے ہو گئی کہ لودھی صاحب کاروبار کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے۔"

"بیٹھیں۔" میں نے افتخار لودھی سے ہاتھ ملانے کے بعد کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "زرینہ بیگم کی شادی کی خبر میرے لیے حیرت کا باعث ہے۔ یہاں کوئی بھی اس شادی کے بارے میں نہیں جانتا۔"

"ہم نے بڑے عجیب و غریب حالات میں شادی کی تھی۔" لودھی نے بوجھل لہجے سے کہا۔ پھر پوچھا۔ "کیا میری بیوی کے قاتل گرفتار کر لیے گئے ہیں؟"

"قاتل؟" میں نے دانستہ حیرت کا اظہار کیا۔ "ہمیں تو یہ بتایا گیا ہے کہ زرینہ نے خودکشی کی ہے۔"

"کیا آپ نے اس بات پر یقین کر لیا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر یقین کر لیتے تو مزید تفتیش نہ کرتے۔ آپ کی بیوی یہاں کس کے ساتھ آئی تھی؟"

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ملک صاحب! میں کاروباری آدمی ہوں اور بہت مصروف رہتا ہوں۔ زرینہ کافی عرصے سے بھائیوں سے ملنے کو کہہ رہی تھی لیکن میں ٹالتا چلا آ رہا تھا۔ کچھ تو کاروباری مصروفیات تھیں اور۔۔۔ ایک یہ بات بھی تھی کہ مجھے خود پسند اور حریص لوگ پسند نہیں ہیں۔ چند ہفتے قبل جب میں نے کراچی جانے کا پروگرام بتایا تو زرینہ نے پوچھا کہ وہ میری عدم موجودگی میں چند روز کے لیے بھائیوں سے ملنے چلی جائے۔ میں نے اجازت دے دی اور ڈرائیور سے کہا کہ اسے چھوڑ آئے حالانکہ میرا دل نہیں مانتا تھا۔" اس نے گہرا سانس لیا۔ "کاش میں اسے اجازت نہ دیتا۔ میرا دو سالہ بیٹا صبح و شام اپنی دادی سے پوچھتا ہے کہ اس کی امی کب واپس آئے گی۔"

"اگر بیٹے کی عمر دو سال تھی تو یقیناً آپ کی شادی تقریباً تین سال قبل ہوئی تھی۔ لودھی صاحب، آپ نے کہا کہ آپ کی زرینہ سے شادی عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی۔ کیا آپ اس کی تفصیل بتانا پسند کریں گے؟"

میرا سوال سن کر وہ خیالوں میں گم ہو گیا۔ ایک طویل توقف کے بعد اس نے کہا کہ عرصہ دس سال قبل اس کی شادی اپنے رشتے داروں میں ہوئی تھی۔ اس کی بیوی نہایت حسین اور پڑھی لکھی تھی۔ اس شادی پر وہ بہت خوش تھا اور خود کو دنیا کے خوش قسمت انسانوں میں سمجھتا تھا لیکن جب حسین بیوی سے واسطہ پڑا تو وہ ساری خوش قسمتی بھول گیا۔ اس کی بیوی نہایت جھگڑنے والی اور تیز مزاج تھی۔ اس نے تین سالوں میں لودھی کی زندگی عذاب بنا دی اور بالآخر دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔

اس سانحے کی وجہ سے لودھی کو حسین لڑکیوں سے نفرت ہو گئی۔ بیوی سے علیحدگی کے بعد اس نے فیصلہ کیا وہ اول تو شادی ہی نہیں کرے گا اور اگر کرے گا تو کسی غریب اور قبول صورت لڑکی سے۔

تین سال قبل اسے ایک دوست کے ہمراہ اتفاقاً مینٹل اسپتال جانا پڑا۔ وہاں اس کے دوست کا کوئی عزیز برغرض علاج داخل تھا۔

اسپتال کے اندرونی حصے سے کسی عورت کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لودھی نے ایک ڈاکٹر سے ان چیخوں کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بے پروائی سے کہا۔ "یہ چیخیں یہاں کے معمولات کا حصہ ہیں۔ اگر ہم ان چیخوں کی طرف دھیان دینے لگیں تو خود بھی پاگل ہو جائیں!"

ڈاکٹر تو بات ختم کر کے ایک طرف چلا گیا مگر لودھی سے نہ رہا گیا۔ وہ اسپتال کے اندر چلا گیا۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ دو مرد اٹینڈنٹ ایک نوجوان لڑکی کو کھینچ کر ایک طرف لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

لڑکی کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ بُری طرح چیخ رہی تھی۔ کش مکش کر رہی تھی، مردوں کی منتیں کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی: "میں پاگل نہیں ہوں . . . میں پاگل نہیں ہوں۔ خدا کے لیے مجھے بجلی کا جھٹکا نہیں لگاؤ۔ میں تمھیں خدا اور رسولؐ کا واسطہ دیتی ہوں . . . تمھارے پیروں کو ہاتھ لگاتی ہوں، میں پاگل نہیں ہوں۔ مجھے بجلی کا جھٹکا نہیں لگاؤ۔"

لیکن وہ دونوں مرد، لڑکی کی چیخ و پکار سے بے نیاز اُسے یوں کھینچ رہے تھے جس طرح کوئی قصائی، بکری کو قربان گاہ کی طرف لے جاتا ہے۔

جس ہال کی طرف لڑکی کو کھینچ کر لے جایا جا رہا تھا اُس کے فرش پر متعدد مرد اور عورتیں اوندھے پڑے تھے۔ کسی کے مُنہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور کسی کے ہاتھوں پیروں میں رعشہ طاری تھا۔

لودھی نے لڑکی کو کھینچنے والے مردوں سے پوچھا: "اس لڑکی کو کہاں لے جا رہے ہو؟"

"بجلی کا جھٹکا لگوانے۔" ایک مرد نے جواب دیا۔

"یہ تو کہہ رہی ہے کہ یہ پاگل نہیں ہے۔"

"یہاں سب یہی کہتے ہیں۔"

"ذرا چھوڑ دو اسے۔"

مردوں نے لڑکی کے بازو چھوڑ دیے۔ لڑکی دوڑ کر لودھی کے پیروں میں گر گئی۔ "خدا کے واسطے میری مدد کریں۔ مجھے ان قصائیوں سے بچائیں۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ آپ میرا امتحان لے کر دیکھ لیں۔ میرے بھائیوں نے جائداد کے لالچ میں مجھے یہاں داخل کرا دیا ہے۔ کوئی میری فریاد نہیں سنتا۔ آپ سمجھ دار آدمی لگتے ہیں، مجھے ان ظالموں کے چنگل سے بچا لیں۔"

لودھی نے کہا: "بھئی، یہ تو سمجھ داری کی باتیں کر رہی ہے۔"

ایک آدمی طنزیہ انداز میں بولا: "جناب، آپ کو پاگلوں کا تجربہ نہیں ہے۔ کبھی کبھی یہ لوگ دانشوروں کی طرح باتیں کرنے لگتے ہیں لیکن یہ وقتی بات ہوتی ہے۔"

لودھی نے ہال میں پڑے ہوئے مریضوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "ان کو کیا ہوا ہے؟"

"ان کو بجلی کے جھٹکے لگائے گئے ہیں۔"

لڑکی ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی: "مجھے بچا لیں صاحب، مجھے بچا لیں۔ میں پاگل نہیں ہوں۔"

لودھی لڑکی کو اسپتال کے انچارج کے پاس لے گیا اور کہا۔ "ڈاکٹر، یہ لڑکی پاگل نہیں ہے۔ اسے یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟"

"آپ اس لڑکی کے کیا لگتے ہیں؟" ڈاکٹر نے جاننا چاہا۔

لودھی نے اپنا تعارف کرایا۔ اُس کا باپ ایک معروف اور کاروباری آدمی تھا۔ وہ اس تعارف سے متاثر ہوا اور لڑکی کی فائل منگوا کر دیکھی۔

"لودھی صاحب، اس لڑکی کا نام زرینہ ہے اور اسے اس کے ورثا نے پاگل قرار دیتے ہوئے یہاں داخل کرایا ہے۔"

"میں پاگل نہیں ہوں۔" زرینہ نے کہا۔ "میرے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں اور بھائی ساری جائداد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"لو جی، اس کے پاگل ہونے کا ثبوت مل گیا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ کہتی ہے کہ اس کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں اور ہمارے ریکارڈ کے مطابق اس کا باپ اسے خود یہاں داخل کروا کے گیا ہے۔"

"یہ . . . جھوٹ ہے . . ." زرینہ زور سے بولی۔

"صبر . . . صبر . . ." لودھی نے زرینہ سے کہا۔ "زور سے نہ بولو ورنہ ڈاکٹر صاحب کہیں گے کہ یہ تمھارے پاگل پن کا دوسرا ثبوت ہے۔"

زرینہ چپ ہو گئی۔ پھر ہولے سے بولی: "صرف ایک بات کہنا چاہتی ہوں، اُس کے بعد نہیں بولوں گی۔ آپ اپنے ذرائع سے میرے ابا جی کے بارے میں تحقیق کروا لیں۔ اگر وہ زندہ ثابت ہوں تو پھر بے شک میں پاگل ہوں۔ اگر یہ ثابت ہو کہ وہ مر چکے ہیں تو پھر مجھے رہا کر دیں۔"

ڈاکٹر نے آنکھیں پھیلا کر زرینہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی دلیل سے خاصا متاثر ہوا تھا۔ "یہ بات چیک کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔" اُس نے کہا۔

لودھی نے کہا: "ڈاکٹر! اگر آپ اجازت دیں تو میں زرینہ کو اپنے گھر لے جاؤں۔ اس دوران میں آپ اس کے باپ کے بارے میں معلوم کروا لیں۔"

"میرے اختیارات بہت محدود ہیں اور میں اتنا بڑا قدم محض اپنی مرضی سے نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے لیے سرجن نیاز احمد سے خصوصی اجازت طلب کرنی ہوگی۔" ڈاکٹر نے لودھی کو جواب دیا۔

"سرجن نیاز میرے چچا زاد بھائی ہیں۔" لودھی نے انکشاف کیا۔ "آپ اُن سے میرے بارے میں دریافت کر سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے فوری طور پر سرجن نیاز احمد کو فون کیا اور انھیں زرینہ والے کیس کی نوعیت سے آگاہ کیا۔ سرجن نیاز نے لودھی کے کردار ہونے کی تصدیق کی اور اس بات پر رضامند بھی ہو گئے کہ اگر لڑکی اُن کے ساتھ جانے پر تیار ہو جائے تو انھیں کوئی اعتراض نہیں۔

پھر اُس نے زرینہ سے پوچھا: "کیا تم لودھی صاحب کے ساتھ جانے پر تیار ہو؟"

"میں تیار ہوں۔" زرینہ نے کہا۔ "میری ایک درخواست اور ہے۔ میرے بھائیوں کو اس بارے میں کچھ نہ بتایا جائے ورنہ وہ میرے خلاف کوئی اور تدبیر کریں گے۔"

ڈاکٹر نے زرینہ کو لودھی کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی اور ایک آدمی کو زرینہ کے باپ کے بارے میں اس تاکید کے ساتھ معلوم کرنے کے لیے روانہ کر دیا کہ چودھری عابد اور اشرف کو اس تفتیش کا علم نہ ہو۔

زرینہ کو لودھی کے گھر میں بڑا سکون محسوس ہوا۔ جب اُسے علم ہوا کہ لودھی نے اپنی بیوی سے اُس کی زبان درازی کی وجہ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ تو اُسے اپنی زبان کی تیزی کا احساس ہوا اور اس نے فیصلہ کیا کہ آیندہ وہ بہت کم بولے گی۔ اُس نے خوش اخلاقی کو اپنا شعار بنایا اور ہر وقت لودھی کی بوڑھی ماں کی خدمت میں حاضر رہنے لگی۔

دو مہینے کے بعد لودھی نے ماں کے حکم پر زرینہ سے شادی کر لی۔ زرینہ چونکہ ایک ہولناک تجربے سے نکل کر آئی تھی اس لیے اُس کے اندر زبردست تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ اُس نے اپنی خوش اخلاقی اور خدمت سے پورے سسرال کا دل جیت لیا۔ شوہر کو وقتاً فوقتاً اپنے بھائیوں کی زیادتیوں کا حال سناتی رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لودھی کو اُس کا بھائیوں سے ملنا پسند نہیں تھا لیکن بھائی کیسے بھی ہوں یاد ضرور آتے ہیں۔ زرینہ اپنوں کی محبت سے مجبور ہو کر گھر آئی مگر پھر واپس نہ جا سکی۔

لودھی نے بات ختم کی تو میں نے پوچھا: "کیا آپ کی بیوی جائداد میں سے حصہ لینے یہاں آئی تھی؟"

"ملک صاحب، ہمیں جائداد کی ضرورت نہیں تھی۔ زرینہ کو بھی جائداد کا لالچ نہیں تھا لیکن وہ اپنا حصہ چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ بھائیوں نے جائداد کی وجہ سے اُس پر ظلم کیا تھا اس لیے وہ اپنا حصہ وصول کر کے رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے بھائیوں کے ساتھ جائداد کی بات ضرور کی ہوگی۔"

میں نے لودھی کا تحریری بیان لے کر اُسے رخصت کر دیا۔ اُس نے اپنی بیوی کی قبر کے بارے میں پوچھا اور دوبارہ آنے کا کہہ کر رخصت ہو گیا۔

*

میں نے نصف درجن آدمی ساتھ لیے اور چودھری برادران کی گرفتاری کے لیے اُن کی حویلی پہنچ گیا مگر دونوں بھائی گھر پر موجود نہیں تھے۔ یا تو انھیں اتفاقاً لودھی کی آمد کا علم ہو گیا تھا اور یا وہ اتفاقاً کہیں چلے گئے تھے۔ میں نے عورتوں کو ایک طرف کر کے پوری حویلی کی تلاشی لی اور ملازموں سے پوچھ گچھ کی۔ پتا چلا کہ دونوں بھائی دوپہر کے وقت کہیں گئے تھے اور یہ کہہ گئے تھے کہ وہ مغرب کی نماز کے بعد واپس آئیں گے۔

حویلی میں عورتوں اور بچوں کے علاوہ چودھری عابد کا نوجوان سالا بھی تھا۔ وہ لمبے قد کا خوش اخلاق نوجوان تھا اور ہمارے ساتھ ہر طرح کا تعاون کر رہا تھا۔

میرے استفسار پر اُس نے اپنا نام جمال دین بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے بہنوئی چودھری عابد علی کی زمین پر نگرانی وغیرہ کے فرائض انجام دیتا ہے۔

میں نے پوچھا: "کیا دونوں بھائیوں نے زمین کا بٹوارا کر لیا ہے؟"

"ہاں جناب یہ تو بڑی پرانی بات ہو چکی ہے۔"

"کتنی پرانی؟"

"زرینہ بی بی کے لاہور جانے کے بعد ہی دونوں نے زمین آدھی آدھی کر لی تھی۔" اُس نے جواب دیا۔ پھر ہولے سے اضافہ کیا۔ "زرینہ بی بی کے ادھر آنے کے بعد دونوں بھائیوں میں کچھ تُند ماری ہو گئی تھی۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بتانا چاہتا تھا۔ "اچھا! بات کیا ہوئی تھی؟"

وہ قدرے تامل کرتے ہوئے بولا: "جناب میرا نام نہ آئے۔ چودھری اشرف آدمی ذرا اُوکھا قسم کا ہے۔"

"فکر نہیں کرو۔" میں اُسے ایک طرف لے گیا۔

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ہولے سے بولا۔ "زرینہ بی بی نے آتے ہی اپنا حصہ مانگ لیا تھا اور قانونی کارروائی کی دھمکی بھی دی تھی۔ اُس نے لاہور میں کسی کھاتے پیتے آدمی سے شادی کر لی تھی اور بڑے رُعب داب سے بات کرتی تھی۔ چودھری عابد آدمی سمجھ دار ہے۔ اُس نے کہا کہ مقدمے بازی میں سب کا نقصان ہوگا، اس لیے زرینہ بی بی کا حصہ دے دیا جائے لیکن اشرف علی راضی نہ ہوا۔ اس بات پر دونوں بھائیوں میں جھگڑا بھی ہوا۔"

اُس کی بات کچھ معقول معلوم ہوئی تھی۔ چھوٹا بھائی لفنگے

کا خناسا یہ تھا اگر چوہدری عابد بہن کو حصہ دینے پر تیار ہو گیا تھا تو پھر اُس کی پوزیشن صاف تھی۔

میں نے جمال دین سے کہا "میں تمہاری بہن سے دو چار باتیں پوچھنا چاہتا ہوں، اُسے بیٹھک میں بُلاؤ۔"

اُس نے بیٹھک کا دروازہ کھلوایا اور اپنی بہن، یعنی چوہدری عابد کی بیوی ولایت بیگم کو بُلا لایا۔

ولایت بیگم نے بھورے رنگ کی شال اوڑھ رکھی تھی اور قدرے بھاری جسم کی عورت تھی۔

میں نے کہا "مجھے پتا چلا ہے کہ تمہاری نند، باپ کی جائداد میں سے اپنا حصہ لینے یہاں آئی تھی مگر تمہارا خاوند اور دیور اُس کا حصہ دینے پر تیار نہیں تھے۔"

"ناں جی، میرے خاوند کی بات نہ کریں۔ وہ تو بڑا شریف اور سیدھا آدمی ہے۔ اُس نے ایک دفعہ بھی زرینہ کا حصہ دینے سے انکار نہیں کیا تھا۔ ہر دفعہ میرا دیور ہی اڑنگا لگاتا تھا۔ اس دفعہ تو دونوں بھائیوں کی لڑائی ہو گئی تھی۔ میرا خاوند زرینہ کو حصہ دینا چاہتا تھا مگر اشرف نہیں مانتا تھا۔ اس پر دونوں میں ہر روز جھگڑا ہوتا تھا۔"

میں نے پوچھا "آخری دن کیا ہوا تھا؟"

"ہمیں کیا پتا۔ ہم تو اپنے کمرے میں سو گئے تھے۔" ولایت بیگم نے جواب دیا "میرا مطلب ہے کہ میں اپنے بچوں کو لے کر سو گئی تھی، چوہدری رات کو دیر سے گھر آیا تھا۔"

"کتنے بجے آیا تھا؟"

"میں نے گھڑی تو نہیں دیکھی، پر یہی کوئی نو ساڑھے نو بجے آیا ہوگا۔"

"اُس وقت تمہارا دیور کہاں تھا؟"

ولایت بیگم نے سوالیہ نظروں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ بتاؤں کہ نہ بتاؤں؟

"سوچتی کیا ہے؟" جمال دین نے کہا "جو کچھ تجھے معلوم ہے وہ بتا دے۔ تھانیدار صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ ہمارا نام بیچ میں نہیں آنے گا۔"

ولایت بیگم دھیمی آواز میں بولی "ہم اُٹھ بجے بستر پر لیٹ گئے تھے۔ اُس وقت زرینہ کے کمرے سے کچھ گھٹی گھٹی سی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید میرا دیور اور دیورانی زرینہ کو . . . سمجھا رہے تھے۔"

"گھٹی گھٹی آوازوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کوئی آواز روک کر کھانسنے کی کوشش کر رہا ہو۔"

میں نے اُسے اشارہ دیتے ہوئے کہا "یا جیسے کسی کا مُنہ دبا دیا گیا ہو اور وہ سانس لینے کی کوشش کر رہا ہو؟"

"جی ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"تم نے یہ بات اپنے خاوند کو بتائی تھی؟"

"بتائی تو تھی . . . پر . . ." اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ظاہر ہے، تمہارا خاوند اپنے بھائی کے خلاف کیسے بول سکتا تھا۔" میں نے کہا "بہر حال، تم نے بڑا اچھا کیا کہ یہ سب کچھ بتا دیا۔ اب ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔"

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اُس کا بیان لکھا اور اُس پر اُس کا انگوٹھا لگوا لیا۔ اُس کے بھائی نے بطور گواہ کے دستخط کر دیے۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ بند دروازے کی دوسری جانب کوئی موجود تھا اور ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ اشرف کی بیوی ہی ہو سکتی تھی۔

یہ کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے دو سپاہیوں کو حویلی کے باہر متعین کر دیا اور باقی سپاہیوں کے ہمراہ واپس روانہ ہوا۔ تب ہی گلی کے کونے پر دو گھڑ سوار نمودار ہوئے۔

اے ایس آئی اُس طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ چوہدری عابد اور اُس کا بھائی لگتا ہے۔"

اُس کے اشارے کے ساتھ ہی ایک گھڑ سوار واپس مڑا اور ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دوسرے گھڑ سوار نے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور تذبذب کے عالم میں ہماری طرف دیکھنے لگا۔

اُس وقت شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا اور دور سے آدمی کو پہچاننا خاصا مشکل تھا۔ ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ گھڑ سوار چوہدری عابد تھا۔ ہمارے قریب پہنچ کر وہ گھوڑے سے اُتر آیا۔

میں نے پوچھا "تمہارا ساتھی کون تھا؟"

"ایک دوست تھا۔" اُس نے جواب دیا "اُس کا یہیں تک ساتھ تھا۔"

مجھے شک گزرا کہ دوسرا گھڑ سوار اُس کا بھائی اشرف تھا لیکن کوئی یقینی ثبوت نہ ہونے کی بنا پر میں نے اپنے شک کا اظہار نہیں کیا اور چوہدری عابد سے کہا کہ اُسے ہمارے ساتھ تھانے میں جانا ہوگا۔

"بات کیا ہے جناب؟" اُس نے جاننا چاہا "آپ مجھے تھانے کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟"

"ہمیں تمہاری متوفیہ بہن کے بارے میں کچھ نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ ہم اُن کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں۔"

"حویلی میں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔" اُس نے تجویز پیش کی "آپ نے ہمیں کبھی خاطر خدمت کا موقع ہی نہیں دیا۔"

"خاطر پھر سہی۔ ہم دو گھنٹے سے حویلی میں بیٹھے تھے۔"

اُس نے زیادہ اصرار نہیں کیا اور حویلی میں اطلاع دے کر ہمارے ساتھ تھانے پہنچ گیا۔

میں اُسے الگ کمرے میں لے گیا اور کہا "چوہدری، تم عزت دار آدمی ہو، میں تمہارے ساتھ کوئی سختی نہیں کرنا چاہتا لیکن اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم کتنا سچ بولتے ہو۔"

"ملک صاحب، میں مجرم نہیں ہوں اور یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ میں عزت دار آدمی ہوں، عزت دار بھی ہوں اور بڑے بڑے لوگوں سے کچھ تعلقات بھی ہیں۔ میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔"

"پہلے تو میں تمہارے پرانے جوابات کا پوسٹ مارٹم کروں گا، بعد میں کوئی نیا سوال کروں گا۔ تم نے تین سوا تین سال پہلے اپنی بہن کو پاگل خانے میں داخل کرایا تھا۔ کیا وہ اُس وقت واقعی پاگل تھی؟"

"پاگل نہ ہوتی تو ہم اُسے . . ."

میں نے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ "چوہدری، میں لحاظ بالکل نہیں کروں گا، سچ بولو۔"

"میں . . . سچ بول رہا ہوں، زرینہ واقعی پاگل تھی۔"

"جب تم اُسے پاگل خانے میں داخل کرانے گئے تھے تو تمہارے ساتھ تمہارا باپ بھی تھا؟"

"بب . . . باپ!" وہ تھوڑا سا فکر مند ہوا "ہمارے والد کو فوت ہوئے سات آٹھ سال گزر چکے ہیں۔"

"پاگل خانے کے ریکارڈ کے مطابق زرینہ کے ساتھ اُس کا باپ بھی تھا۔ وہ بڈھا کون تھا جسے تم اپنا باپ بنا کر ساتھ لے گئے تھے؟"

"وہ . . . وہ میرا سسر تھا۔ پاگل خانے والوں نے غلطی سے اُسے میرا باپ سمجھ لیا ہوگا۔"

"پاگل خانے میں سب پاگل نہیں ہوتے چوہدری۔ تمہاری معصوم بہن پاگل نہیں تھی، تم دونوں بھائی پاگل ہو گئے تھے۔ تھوڑی سی جائداد نے تم دونوں کو پاگل کر دیا تھا۔ یہ بتاؤ کہ زرینہ کتنا عرصہ پاگل خانے میں رہی تھی؟"

"یہی . . . کوئی تین سال۔"

میں نے ایک زوردار تھپڑ اُس کے مُنہ پر مارا۔ "سچ بولو۔ جھوٹ بولنے کا وقت گزر چکا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ زرینہ پر پاگل خانے میں مجرمانہ حملہ کیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ حاملہ ہوئی اور اُس نے بدنامی کے خوف سے خودکشی کر لی۔ تمہیں اپنی بہن پر بہتان لگاتے ہوئے شرم نہ آئی۔"

"مم . . . میں نے اندازہ لگایا تھا۔"

میں نے ایک اور تھپڑ رسید کیا۔ اُس کی پگڑی کھل کر گلے میں آ گئی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اُس کی پگڑی کے دونوں لڑ پکڑ لیے اور کہا "کیا زرینہ نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اُس نے ایک خاندانی آدمی سے شادی کر لی ہے اور باعزت زندگی گزار رہی ہے؟" ساتھ ہی میں نے دایاں ہاتھ بلند کیا "سچ بولنا ورنہ آج میں تمہارا لحاظ نہیں کروں گا۔ تم لوگوں نے جائداد کی ہوس میں اپنی بہن کو قتل بھی کیا اور ساتھ اُس بچے کو بھی جو اُس کے پیٹ میں پرورش پا رہا تھا، سچ بولو۔"

اُس نے جواب دینے میں تامل کیا۔

"زرینہ کا شوہر افتخار لودھی آج ہی یہاں پہنچا ہے۔ وہ ایک بااثر اور دولت مند خاندان کا فرد ہے۔" میں نے مزید کہا "وہ تم دونوں بھائیوں کی تلاش میں ہے۔"

اُس کے چہرے پر خوف سا اُتر آیا۔ بولا "زرینہ نے اپنی شادی کے بارے میں بتایا تھا۔ لل . . . لیکن ہمارے ہاں اس قسم کی شادی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے ہم نے یہ بات چھپائی تھی۔"

میں نے اُس کی پسلیوں میں گھونسا مارا "تمہاری برادری میں بہنوں کے حصے کی جائداد کو غصب کر لینا اچھا سمجھا جاتا ہے، بہنوں کی تعلیم میں رخنہ ڈالنا اچھا سمجھا جاتا ہے، جائداد کی وجہ سے بہنوں کو گھر میں بٹھائے رکھنا اچھا سمجھا جاتا ہے، اچھی بھلی بہنوں کو پاگل خانے میں داخل کرا دینا اچھا سمجھا جاتا ہے، تم اپنی بہن کو کوڑا سمجھ کر باہر پھینک آئے تھے۔ وہ شادی نہ کرتی تو کیا کرتی، کوٹھے پر بیٹھ کر تمہاری عزت نیلام کرتی؟"

"ملک صاحب، ہمیں اپنی غلطیوں کا احساس ہے۔"

"یہ غلطیاں نہیں جرائم ہیں، جرائم۔" میں نے کہا "زرینہ کو قتل کس نے کیا ہے، تم نے یا اشرف نے؟"

"مم . . . میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اُس نے خودکشی . . ."

"تم یہ بھی بتا چکے ہو کہ وہ پاگل تھی اور تین سال سے پاگل خانے میں بند تھی۔" میں نے ایک اور گھونسا مارا "سچ بولو، جھوٹ کا وقت گزر چکا ہے۔ ویسے تو تم دونوں بھائی اُس کی موت کے ذمہ دار ہو لیکن قاتل دونوں میں سے کوئی ایک ہے۔ سچ بول دو، ورنہ میں دونوں کو قتل کے الزام میں دھر لوں گا۔ مجھے صرف اتفاقی شہادتیں بلکہ شخصی شہادت بھی مل چکی ہے۔"

"ملک صاحب، میں خدا کو گواہ رکھ کر کہتا ہوں کہ میرے ہاتھ صاف ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے جائداد کی وجہ سے زرینہ پر زیادتی کی تھی، لیکن میں نے اُسے قتل نہیں کیا۔ میں یہ بات سوچ

بھی نہیں سکتا تھا۔"

"اشرف کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"م م . . . میں اُس وقت گھر میں نہیں تھا۔"

"تمہاری بیوی تو گھر میں تھی، اُس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

اُس نے آنکھیں گھمائیں اور بولنے کے لیے منہ کھولا۔ میں نے اُسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ "جھوٹ مت بولنا، میں تمہاری بیوی اور سالے کا تحریری بیان حاصل کر چکا ہوں۔"

"جی! انھوں نے آپ کو کیا بتلایا ہے؟"

"سوال مت کرو، جواب دو۔"

اُس نے تامل کرتے ہوئے کہا۔ "م م . . . میری بیوی کا خیال ہے کہ اُس نے زرینہ کے کمرے سے عجیب و غریب آوازیں سُنی تھیں۔"

وہ سیدھے راستے کی طرف آگیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "اُس نے اور کیا بتایا تھا؟"

"اُس کا خیال ہے کہ زرینہ کو اشرف نے قتل کیا ہے۔ اشرف اور اُس کی بیوی صابر ہونے۔"

"تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

"جی، وہ . . . بھائی کا معاملہ تھا۔"

میں نے ایک اُلٹا ہاتھ اُس کے منہ پر جمایا۔ "بہن کا معاملہ نہیں تھا؟ اُس کا دو سالہ بچہ روزانہ اپنی ماں کے بارے میں پوچھتا ہے، اُسے کون اس بات کا جواب دے گا؟ کون اُس کی ماں کو واپس لائے گا؟"

وہ بالکل ڈھیلا پڑ گیا۔ "اشرف کی بعض عادتیں مجھے بھی پسند نہیں ہیں جب اُسے غصّہ آتا ہے تو اُس پر جنون طاری ہو جاتا ہے۔"

میں نے اُس کا تحریری بیان لیا اور جانے کی اجازت دے دی۔ وہ جاتے جاتے رکا اور پوچھا۔ "افتخار لودھی کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "اور دیکھو اشرف کو ابھی کچھ نہ بتانا۔"

وہ سر ہلاتا ہوا رخصت ہو گیا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت غصّے میں تھا اور غالباً بھائی پر غصّہ نکالنا چاہتا تھا۔

*

اگلی صبح مجھے پہلی خبر یہ ملی کہ اشرف نے اپنے بڑے بھائی کو قتل اور اس کی بیوی کو زخمی کر دیا تھا۔ یہ واقعہ رات کے دو ڈھائی بجے پیش آیا تھا۔ شور سُن کر محلّے کے لوگ جمع ہو گئے تھے جنھوں نے اشرف کو پکڑ کر خون آلود خنجر سمیت تھانے پہنچا دیا تھا اور اب وہ حوالات میں بند تھا۔

میں فوراً جائے وقوعہ پر پہنچا۔ ضابطے کی کارروائی مکمل کی گواہوں کے بیانات قلم بند کیے اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے بعد واپس تھانے پہنچ گیا۔

اشرف ساری رات کا جاگا ہوا تھا اور نہایت شکستہ حالت میں تھا۔ میں نے اُسے اپنے کمرے میں بُلا کر کہا۔ "بہن کو قتل کرنے کے بعد تمہارا دماغ ٹھکانے پر نہیں آیا تھا؟"

وہ دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اگر میں نے بہن کو قتل کیا ہوتا تو بھائی کو کبھی قتل نہ کرتا۔"

"اوئے، اس بات کا مطلب کیا ہے؟"

"مطلب یہ ہے جی، کہ اگر میں نے زرینہ کو قتل کیا ہوتا تو بھائی اور اُس کے بھائی جمال دین کے الزام پر چُپ رہتا اور اُن کو بھی چُپ رکھنے کی کوشش کرتا۔ مجھے غصّہ اس بات پر آیا کہ اُن لوگوں نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا۔"

"جھوٹا الزام؟"

"یہ ساری سازش اُس کتّے جمال دین کی ہے۔ وہ میرے ہاتھ سے بچ گیا . . . لیکن جائے گا کہاں۔ اگر میری ایک دن کے لیے بھی ضمانت ہو گئی تو میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا پھر خود ہی آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔"

چودھری عابد کے قتل کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ جب وہ گھر پہنچا تو اُس وقت اشرف کا اپنی بھابی اور اُس کے بھائی جمال دین سے جھگڑا ہو رہا تھا۔ چودھری عابد بھی اس جھگڑے میں شریک ہو گیا اور اپنی بیوی اور سالے کی طرف داری کرنے لگا۔ بات لمبی ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ آدھی سے زیادہ رات گزر گئی۔ پھر جمال دین کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی جس سے اشرف کو طیش آ گیا۔ وہ اندر سے خنجر نکال لایا اور جمال دین پر حملہ آور ہوا۔ ولایت بیگم دونوں کے بیچ میں آ گئی اور زخمی ہو گئی۔

چودھری عابد بیوی کو زخمی ہوتے دیکھ کر بھائی پر چڑھ دوڑا اور بولا۔ "بہن کو قتل کرنے کے بعد اب میری بیوی کو بھی قتل کرنا چاہتے ہو؟"

یہ سُن کر اشرف بالکل آپے سے باہر ہو گیا اور خنجر کے پے در پے وار کر کے بھائی کو ڈھیر کر دیا۔

جمال دین نے باہر نکل کر شور مچا دیا۔ لوگ گھروں سے نکل آئے اور اشرف کو قابو کر کے تھانے پہنچا دیا۔

میں نے اشرف سے کہا۔ "تمھارے بھائی نے گزشتہ رات یہ بیان دیا تھا کہ زرینہ کی موت کے وقت وہ حویلی میں موجود نہیں تھا۔ تم کہتے ہو کہ تم نے زرینہ کو قتل نہیں کیا۔ تو پھر اُس کو کس نے قتل کیا؟"

"قتل کس نے کرنا تھا، اُس نے خودکشی کی تھی۔"

"خودکشی والی بات غلط ثابت ہو چکی ہے۔ اس بات کو غلط ...ت کرنے کے لیے ایک ہی دلیل کافی ہے۔ زرینہ کا قد پانچ ...ے دو انچ تھا۔ اگر وہ پیٹی پر رکھی ہوئی کرسی پر پنجوں کے بل کھڑی ...کر ہاتھ بلند کرتی تو چھت کا شہتیر اُس کی پہنچ سے ایک فٹ ...ر ہوتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شہتیر پر رسّی نہیں باندھ سکتی ...ی۔ اس کے علاوہ ہمیں کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جو فاصلہ ...کرنے یا رسّی شہتیر کے اوپر سے گزارنے میں مددگار ثابت ہو سکتی۔"

"قد تو میرا بھی اتنا زیادہ نہیں ہے۔ صرف پانچ فٹ سات ...نچ ہے۔"

"قاتل کے قد کی کمی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا۔ "...و سکتا ہے کہ تم نے رسّی کو شہتیر کے اوپر سے گزارنے کے لیے ...ئی چھڑی استعمال کی ہو، جسے بعد میں باہر پھینک دیا ہو۔"

وہ چند لمحے سر جھکائے کھڑا رہا پھر اچانک اُس نے ...سا ایسی بات کہی جو غیر معمولی طور پر معقول تھی۔ اُس نے کہا۔ "...تھانے دار صاحب! اگر میں نے چھڑی استعمال کی ہوتی تو مجھے ...ی بہن کے قد کی کمی کا خاص طور پر احساس ہوتا اور میں آپ کو ...دھوکا دینے کے لیے چھڑی کمرے میں ہی ڈال دیتا۔ اگر زرینہ کو ...ل کیا گیا ہے تو یہ کسی ایسے شخص کا کام ہے جس کا اپنا قد لمبا ہے۔ ...ہ اپنے قد کی لمبائی کی وجہ سے زرینہ کے چھوٹے قد کا خیال ...نہیں رہا۔"

اُس کی بات نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"ملک صاحب، اگر میں نے اپنی بہن کو قتل کیا ہوتا تو کم از کم ...ہو وقت ضرور اقبالِ جرم کر لیتا۔" اُس نے مزید کہا۔ "مجھے وہ دفعہ تو ...ھانسی پر نہیں لٹکایا جا سکتا۔"

میں نے کہا۔ "جس وقت تمہاری بہن کو قتل کیا گیا، اُس وقت ...گھر میں موجود تھے، کیا تم نے کوئی آواز نہیں سُنی؟"

"ہم جلدی سو گئے تھے۔"

"جلدی سو گئے تھے! لیکن تمہاری بھابی کا کہنا ہے کہ تم ...ینہ کے کمرے میں تھے اور اُدھر سے کچھ مشکوک آوازیں بھی ...ہی تھیں۔"

"یہ ساری آگ اُسی کی لگائی ہوئی ہے جی۔ اس عورت نے ...ہمارا گھر برباد کر دیا ہے۔ اس کام میں اس کا بھائی بھی شامل ہے۔ اُس ...ت میری زرینہ سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی بلکہ . . . جب ہم ...تر پر لیٹے تھے تو اُس وقت زرینہ بھابی کے کمرے میں تھی اور ...ں جمال دین بھی موجود تھا۔"

میرے ذہن میں شک سا پیدا ہوا۔ "کیا تمہیں پورا یقین ہے

کہ اس وقت جمال دین گھر میں ہی تھا؟"

"بالکل جناب، یہ شخص تو سارا دن ہماری حویلی میں گھسا رہتا ہے۔ اس نے ہماری زمینیں پٹے پر لے رکھی ہیں۔ ہماری دو مربعے زمین ویران پڑی تھی، جمال دین نے محنت کر کے اس زمین کو بھی قابلِ کاشت بنا لیا ہے۔ بھائی اس دو مربعے زمین کا اُس سے کوئی حصّہ نہیں لیتا تھا۔"

"جمال دین نے تو بتایا تھا کہ تم نے زمین کا بٹوارا کر لیا تھا؟"

"بکواس کرتا ہے جی، ہماری زمین اکٹھی ہے۔"

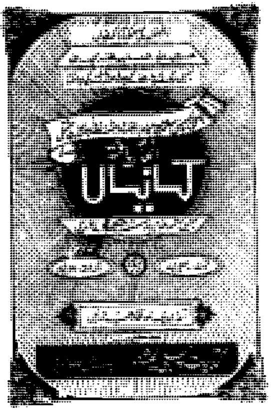
"کیا یہ سچ ہے کہ تمہارا بھائی زرینہ کو حصّہ دینے پر تیار ہو گیا تھا؟"

"تیار تو میں بھی ہو گیا تھا لیکن . . . زیادہ مخالفت میری بھابی ہی کر رہی تھی کیونکہ زرینہ کو حصّہ دینے سے اُس کے بھائی کا زیادہ نقصان ہوتا۔"

"کیا مطلب؟"

"زرینہ کے حصّے میں تقریباً دو مربعے آتے۔ ہم نے سوچا کہ اگر زرینہ کو حصّہ دینا ضروری ہو گیا تو وہ دو مربعے دے دیں گے جو جمال دین کے استعمال میں تھے۔ ان دو مربعوں سے ہمیں ویسے بھی کچھ نہیں مل رہا تھا۔"

یہ بات سُن کر میں چونکا۔ میں نے پوچھا۔ "جمال دین کا



قد کتنا ہے؟"

"چھ فٹ سے دو تین انچ زیادہ ہی ہوگا۔" اُس نے جواب دیا۔ پھر چونک کر بولا۔ "یقیناً یہی بات ہے۔ یہ سارا کیا دھرا جمال دین کا ہے۔ . . ."

*

جمال دین بڑی مشکل سے ہاتھ آیا تھا۔ ہم نے پورے پانچ روز تک اُس کی تلاش میں چھاپے مارے۔ تب کہیں جا کر وہ ہمارے ہاتھ آیا۔

مَیں اُسے پوچھ گچھ والے کمرے میں لے گیا اور دوستانہ انداز میں پوچھا۔ "جمال دین، تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"میں جی، چودھری اشرف کے ڈر سے چھپ گیا تھا۔ اُس نے مجھے قتل کی دھمکی دی تھی۔"

"اشرف تو پانچ روز سے حوالات میں بند ہے۔"

اُس نے میرے دوستانہ انداز کا غلط مطلب لیا۔ ہنس کر بولا۔ "ملک صاحب، آپ تو رات کو گھر جا کر سو جاتے ہیں۔ آپ کے کارندے حوالاتیوں سے رشوت لے کر اُنھیں دو چار گھنٹے کی چھٹی بھی دے دیتے ہیں۔ حوالاتی رات کے ایک بجے باہر نکلا، اِدھر اُدھر گھوما پھرا اور دو بجے پھر حوالات میں واپس . . ."

ابھی اُس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ مَیں نے اُس کے مُنہ پہ اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ وہ بلبلا اٹھا۔

"مَیں مر گیا . . . مَیں مر گیا . . . ہائے ہائے، ملک صاحب، یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"ہم پہ الزام لگا رہے ہو؟" مَیں نے دوبارہ ہاتھ اٹھا لیا۔

"میری توبہ جی۔ میرے بڑوں کی بھی توبہ . . . مَیں آئندہ ایسی بات مُنہ سے نہیں نکالوں گا۔"

مَیں نے اُسے گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ "زرینہ کو کس نے قتل کیا تھا؟"

"چ . . . چودھری اشرف نے جی . . ."

"تمھیں کیسے پتا چلا؟"

"مم . . . میری بہن نے بتایا تھا۔"

"تمھاری بہن کو کیسے پتا چلا؟"

"آپ اُس کا بیان سن چکے ہیں۔"

"جمال دین! تم پہ اور تمھاری بہن پہ بہت بُرا وقت آ گیا ہے۔ ولایت بیگم حوالات کی ایک رات بھی برداشت نہیں کر سکے گی۔ کیا ارادہ ہے تمھارا، اُس کو بھی یہاں لے آئیں یا تم ہی سب کچھ بتا دو گے؟"

"سرکار، مَیں آپ کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "ولایت بیگم کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اُس کو تھانے نہ بلوائیں۔"

"زرینہ کا بھی ایک چھوٹا سا بچہ ہے۔ اگر ولایت بیگم کو تھانے سے دُور رکھنا چاہتے ہو تو سچ بولنا شروع کر دو۔"

"مَیں بے گناہ ہوں جی۔" اُس نے رونا شروع کر دیا۔ "بے قصور ہوں . . . مجھ پہ رحم کرو جی۔"

مَیں نے اُسے حوالات میں بھجوا دیا۔ وہ قتل کا ملزم تھا اور قتل کے ملزم اتنی آسانی سے اقبالِ جرم نہیں کیا کرتے۔

*

شام کے وقت مَیں نے ولایت بیگم کو تھانے بلوا لیا۔ وہ پڑوس کی دو عورتوں کو ساتھ لائی تھی۔

"تم لوگ واپس جاؤ۔" مَیں نے ولایت بیگم کو سنانے کے لیے کہا۔ "یہ ابھی اِدھر ہی رہے گی۔"

"ولایت بیگم گھبرا گئی۔ "کیوں جی؟ مَیں اِدھر کیوں رہوں گی؟"

"قاتل اور مجرم تھانے میں ہی رہا کرتے ہیں۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر اپنی ساتھی عورتوں کی طرف لپکی۔ "مَیں تو اِدھر نہیں رہوں گی۔ مجھے اپنے ساتھ ہی لے چلو۔ یہ لوگ مجھے دھوکے سے یہاں لے آئے ہیں، کہہ رہے تھے کہ جمال دین نے بلایا ہے، اُس کی بات سن کر واپس چلی جانا۔"

مَیں نے ایک حوالدار کو اشارہ کیا جو اُس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ پھر ولایت بیگم سے کہا۔ "بی بی! یہ تھانہ ہے۔ یہاں نہ کوئی اپنی مرضی سے آتا ہے اور نہ اپنی مرضی سے جاتا ہے۔ ہمیں سختی پر مجبور نہ کرو۔"

اُس نے رونا پیٹنا شروع کر دیا اور وہیں پہ بیٹھ گئی۔ حوالدار نے اُسے بازو سے پکڑا اور کھینچ کر اندر بٹھا دیا۔ وہ اور زیادہ زور زور سے شور مچانے لگی۔

مَیں نے حوالدار سے کہا۔ "تم اِدھر ہی کھڑے رہو۔ جب یہ تھک جائے تو مجھے بُلا لینا۔" پھر ولایت بیگم سے کہا۔ "بی بی! رونے پیٹنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم لوگ ایسی آوازوں کے عادی ہوتے ہیں۔"

وہ خاموش نہیں ہوئی۔ مَیں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد حوالدار نے آ کر بتایا۔ "ولایت بی بی چُپ ہو گئی ہے اور کہتی ہے کہ اُسے جلدی فارغ کر دیں۔ اُس کے بچے پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

مَیں نے جواب دیا کہ ابھی اُس کو انتظار کرنے دو۔ مَیں تقریباً ایک گھنٹے تک بعض ضروری کاموں میں مصروف رہا۔ پھر اُٹھ کر اُس کمرے میں گیا جس میں ولایت بیگم موجود تھی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے فرش پہ بیٹھی تھی۔

مَیں نے کہا۔ "ولایت بیگم، اُمید ہے کہ اب تمھیں میری بات سمجھنے میں آسانی ہوگی۔"

وہ کھڑی ہو گئی۔ بولی۔ "مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہے جلدی پوچھ لیں۔ میرے بچے پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

مَیں نے کہا۔ "اس کا انحصار تمھارے جواب پر ہے۔ اگر سچ بولو گی تو بات جلدی ختم ہو جائے گی۔ جھوٹ بولو گی تو رات اِدھر ہی گزرے گی۔"

"میرا تو سب کچھ ہی اُجڑ گیا ہے۔ خاوند قتل ہو گیا۔ بھائی کو آپ نے بند کر رکھا ہے۔ بچے دیواروں کی سختیاں برداشت کر رہے ہوں گے۔"

مَیں نے کہا۔ "تمھارے بھائی نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ ہم تمھیں گواہ بنا کر چھوڑ بھی سکتے ہیں اور شریکِ جرم بنا کر حوالات میں بھی بند کر سکتے ہیں۔ اس لیے سچ بولنا۔"

اُس کا مُنہ کُھل گیا اور آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ بولی۔ "پپ . . . پتا نہیں آپ کیا باتیں کر رہے ہیں۔"

"زرینہ کو کس نے قتل کیا تھا؟" مَیں نے پوچھا۔ "تم نے یا جمال دین نے؟"

"اُس نے . . . اُس نے تو خودکشی کی تھی۔"

"اُسے چھت پر کس نے لٹکایا تھا؟ شہتیر پہ رسّی کس نے باندھی تھی؟"

"یہ . . . یہ سب کچھ اُس نے خود ہی کیا ہوگا۔"

"نہیں، وہ شہتیر پہ رسّی نہیں باندھ سکتی تھی۔ اُس کا قد چھوٹا تھا۔ کرسی پر کھڑا ہونے کے باوجود اُس کا ہاتھ شہتیر تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ہم نے ساری پیمائش کر لی ہے۔"

"یہ . . . یہ بات آپ اشرف سے پوچھیں۔"

"اُس سے ہم ساری باتیں پوچھ چکے ہیں۔ جمال دین سے بھی سب کچھ پوچھ لیا ہے۔ اُس نے زرینہ کو قتل کرنے کا اقرار کر لیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُس نے تمھارے اُکسانے پہ زرینہ کو قتل کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دونوں میں سے ایک کو پھانسی اور دوسرے کو عمر قید ہو جائے گی۔"

وہ خوف سے کانپنے لگی۔ "میرے بچوں کا کیا ہوگا؟"

مَیں نے چالاکی سے کہا۔ "تمھارا بھائی اپنی سزا کم کروانے کے لیے سارا الزام تمھارے سر تھوپنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن مجھے تمھارے ساتھ ہمدردی ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ تم کسی طرح بچ جاؤ۔ خاوند تمھارا قتل ہو گیا ہے۔ بچے تمھارے چھوٹے ہیں۔ اگر تمھیں بھی سزا ہو گئی تو بچے برباد ہو جائیں گے۔ در در بھیک مانگتے پھریں گے۔ اس لیے صحیح صحیح ساری بات بتا دو۔ مَیں تمھارے لیے کوئی راستہ نکالتا ہوں۔"

وہ دوبارہ فرش پہ بیٹھ گئی۔ ایک طویل توقف کے بعد اُس نے بتایا کہ زرینہ کو قتل کرنے کا سارا منصوبہ جمال دین نے بنایا تھا۔ اُس رات زرینہ جلدی سو گئی تھی۔ جمال دین دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا، زرینہ کے گلے میں رسّی کا پھندا ڈالا۔ ایک ہاتھ سے پھندے کو سخت کیے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کا مُنہ دبا دیا۔ تھوڑی دیر کے اندر زرینہ کا جسم ڈھیلا پڑ گیا یا تو وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور یا اُس نے دم توڑ دیا تھا۔ جمال دین جلدی سے ساتھ والے کمرے میں گھس گیا۔ پیٹی کے اوپر کرسی رکھ کر شہتیر کے ساتھ رسّی باندھی اور زرینہ کے بے حرکت جسم کو رسّی سے لٹکا کر کرسی پیٹی کے قریب اوندھی کر کے ڈال دی۔

جب ولایت بیگم نے بات ختم کی تو مَیں نے پوچھا۔ "تم نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا جمال دین نے بتایا تھا؟"

"تھوڑا سا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور تھوڑا سا جمال دین نے بتایا تھا۔"

مَیں نے جمال دین کو حوالات سے بلوایا اور ولایت بیگم کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "تمھاری بہن نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ پوچھ لو اس سے . . . سامنے بیٹھی ہے۔"

جمال دین آنکھیں پھاڑ کر بہن کو گھورنے لگا۔ "تُو نے سب کچھ بتا دیا ہے؟"

ولایت بیگم نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولی۔ "مَیں تیرے گناہ میں شامل نہیں تھی۔ تھانیدار صاحب کو یہ بات بتا دے۔ میرے بچے اُدھر رو رہے ہوں گے۔ پتا نہیں بے چارے کس حال میں ہوں گے۔"

جمال دین کے کندھے یُوں ڈھیلے پڑ گئے جیسے وہ برسوں کا بیمار ہو۔

مَیں سوچنے لگا کہ اگر چودھری برادران اپنی بہن کو جائداد کے حق سے محروم نہ کرتے تو اُن پہ یہ تباہی نازل نہ ہوتی۔ دو بہن بھائی قتل ہو گئے۔ سالا اور ایک بھائی پھانسی پہ چڑھ گئے۔ جائداد وہیں کی وہیں رہ گئی۔





پاداشِ جرم

چوھدری منصب علی کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ اس کے نوجوان بیٹے نیاز علی کو کسی نے سوتے میں قتل کر دیا تھا۔ میں صبح کے سات بجے موقعِ واردات پر پہنچا اور ضابطے کی کارروائی شروع کر دی۔ موقع پر موجود حوالدار نے مجھے بتایا کہ وہ واردات کی اطلاع ملتے ہی موقعِ واردات پر پہنچ گیا تھا اور اس نے کسی چیز کو اِدھر اُدھر نہیں کیا۔

مقتول اپنے بستر پر خون میں لت پت ہو رہا تھا بستر برآمدے میں بچھا تھا۔ مارچ کا مہینہ ہونے کے باعث موسم زیادہ گرم نہیں تھا۔ برآمدے کے سامنے سرکنڈوں کی بھاری چِکیں پڑی ہوئی تھیں۔ برآمدے میں ایک دوسری چارپائی بھی موجود تھی اور اس پر بستر بھی بچھا ہوا تھا۔ پائنتی کی طرف ایک کھیس تہ کیا ہوا رکھا تھا اور چادر پر شکنیں نہیں تھیں۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس پر کوئی نہیں سویا۔

مقتول کے جسم پر تیز دھار آلے کے ایک درجن نشانات تھے۔ گویا قاتل نے قتل کے پختہ ارادے سے وار کیے تھے۔ اتنے زیادہ وار کئی باتوں کی نشان دہی کرتے تھے۔ اوّل یہ کہ قتل کے پیچھے سخت نفرت کار فرما تھی۔ دوم، مقتول نے قاتل کو پہچان لیا تھا اور قاتل گھبراہٹ میں وار پہ وار کرتا چلا گیا یعنی مقتول کا بچ جانا قاتل کے حق میں موت کا پیغام ثابت ہو سکتا تھا۔ سوم، یہ کہ قاتل بزدل اور کمزور تھا چند وار کرنے کے بعد اسے اپنے دشمن کی موت کا یقین نہیں آیا تھا۔

خون کے دھبّے چارپائی کے نیچے بھی نظر آ رہے تھے۔

دو باتیں خاص طور پر قابلِ توجہ تھیں۔ گھر کے دیگر افراد قریبی کمروں میں سوئے ہوئے تھے۔ انھوں نے مقتول کی چیخیں کیوں نہیں سنیں؟ اور دوسری بات یہ تھی کہ مقتول خاصا صحت مند شخص تھا۔ اس نے مزاحمت کیوں نہیں کی؟ اگر وہ مزاحمت کرتا تو اس کی لاش کم از کم چارپائی پر پڑی ہوئی نہ پائی جاتی۔ حملہ آور غالباً دو تھے۔ ایک نے مقتول کو دبائے رکھا اور دوسرا وار کرتا رہا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ قاتل نے پہلا وار دل پر کیا ہو اور وہی کاری ثابت ہوا۔

تاہم سب سے پہلے یہ اندازہ لگانا تھا کہ قاتل باہر سے آیا تھا یا گھر کا آدمی تھا۔

میں نے لاش پر چادر ڈال دی اور مقتول کے باپ چوہدری منصب علی سے پوچھا۔ "قتل کے بارے میں سب سے پہلے کس کو پتا چلا تھا؟"

"میری بیوی صابرہ بی بی کو۔" اس نے جواب دیا۔ "سب سے پہلے وہی اٹھتی ہے۔ لاش دیکھ کر اس نے چیخیں ماریں تو سارے گھر کی آنکھ کھل گئی۔ میں نے اسی وقت دو آدمی تھانے دوڑائے اور لاش کو چادر سے ڈھک دیا۔"

چوہدری کی عمر پینسٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ اونچے قد کاٹھ کا صحت مند آدمی تھا۔ لیکن اس وقت اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور جوان بیٹے کی موت کے باعث نڈھال ہو رہا تھا۔ جو آدمی اس نے تھانے دوڑائے تھے ان میں ایک اس کا چھوٹا بیٹا صفدر علی اور دوسرا ایک مزارع تھا، جس کا نام گامو تھا۔ دونوں تقریباً چھ بجے تھانے پہنچے تھے۔

میں نے چوہدری سے پوچھا۔ "آپ نے باہر کے دروازے چیک کیے تھے؟"

اس سوال کا جواب اس کے بیٹے صفدر علی نے دیا۔ "صحن کے دروازے کی کنڈی کھلی ہوئی تھی۔"

صفدر علی تیئس چوبیس سال کا ایک خوش شکل نوجوان تھا۔

میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ قاتل باہر سے آیا تھا۔"

"ملک صاحب، قاتل باہر ہی سے آیا کرتے ہیں۔"
...نے کہا۔ اس کی آواز میں غصّہ بھی تھا اور غم بھی۔

"یہ تو تفتیش کے بعد ہی پتا چلے گا۔" میں نے کہا۔ "آپ ...کس پر ہے؟"

"ہماری کسی سے دشمنی نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "...پر شک ظاہر کروں؟"

"مجھے تو یہ کسی چور کی کارروائی لگتی ہے۔" صفدر علی نے ...پ کسی کھوجی کو بلوا کر کھُرا نکلوائیں۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ میں سے کسی نے شور کی آواز ...تی؟"

چوہدری نے کہا۔ "نہیں بالکل کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ حالانکہ میں بڑی کچی نیند سوتا ہوں۔"

"اس چارپائی پر کون سوتا ہے؟" میں نے مقتول کے ساتھ والی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔

میرا یہ سوال سن کر چوہدری چونکا۔ واضح طور پر اس کے حواس پوری طرح ٹھکانے پر نہیں تھے۔ وہ اپنی بیوی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "یہاں تو نیاز علی کی دوہٹی زرینہ سوتی ہے۔ او ئے، وہ خیریت سے تو ہے نا؟"

"زرینہ کا تو ہمیں خیال ہی نہیں آیا۔" صابراں بی بی نے تیوری چڑھائی۔ "اس نے ہمیں کچھ بتایا ہی نہیں۔ صفدر پتّر! اس اوتری کا پتا تو کر۔"



صفدر کے چہرے پر بھی اچانک خفت نظر آنے لگا تھا "یہ تو اندر کا ہی معاملہ لگتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ساتھ والی چارپائی پر سونے والے بندے کو کچھ پتا ہی نہ چلے۔ میں پھر جائے سے خود پتا کرتا ہوں۔"

"جوان، ٹھہر جاؤ ذرا۔" میں نے اُسے روکا۔ "تھانیدار بننے کی کوشش نہ کرو ورنہ معاملہ خراب ہو جائے گا۔ مجھے بات سمجھ لینے دو۔ کیا زرینہ اس چارپائی پر سوئی ہوئی تھی؟"

"ہاں جی، روز ہی اِدھر سوتی ہے۔" صابرہ بی بی نے جواب دیا۔ "صدمے کی وجہ سے مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا اور اُس نے بھی کچھ نہیں بتایا۔"

میں صابرہ بی بی کو بیٹھک میں لے گیا اور کہا۔ "ذرا تسلی سے ساری بات بتائیں۔ جب آپ نے بیٹے کی لاش دیکھی تو کیا اُس وقت بہو اپنے بستر پر موجود تھی؟"

صابرہ بی بی نے قدرے سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "میں مر جاواں، اس کا بستر تو خالی تھا۔ اگر وہ پہلے اُٹھ گئی تھی تو اُس نے ہمیں کچھ بتایا کیوں نہیں؟"

"کیا آپ کی بہو کا اپنے شوہر سے کوئی جھگڑا ہوا تھا؟"

"ہاں جی، کئی دنوں سے جھگڑا چل رہا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "جھگڑے کی وجہ کیا تھی؟"

"وجہ کیا ہونی تھی جی، چھوٹے لوگوں کو منہ لگا کر غلطی کی۔"

اُس نے جواب دیا۔ "زیادہ غلطی میرے خاوند کی ہے۔ میں نے اُس کو منع بھی کیا تھا کہ وٹے سٹے کی شادی نہ کرے، لیکن وہ نہیں مانا۔"

اُس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اُس کے بڑے بیٹے، یعنی نیاز علی کی شادی میں بعض وجوہ کی بنا پر دیر ہو گئی تھی اور زیادہ عمر ہونے کی وجہ سے مناسب رشتہ نہیں مل رہا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے سے ایک کم حیثیت خاندان میں وٹے سٹے کی شادی کر دی۔ اس کم حیثیت خاندان کے سربراہ کا نام صوفی عبیداللہ تھا۔ یہ شخص بقول صابرہ بی بی کے بہت چھوٹا زمیندار تھا۔ منصب علی نے اپنی بیٹی کو صوفی کے بیٹے رفیق سے بیاہ دیا اور اُس کی بیٹی زرینہ کو اپنی بہو بنا لیا۔

"فیکے نے میری بیٹی کی زندگی عذاب بنا رکھی ہے۔" صابرہ بی بی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "ایک تو اُن کے گھر میں تنگی ہے، دوسرے عشرت کی ساس بہت فضول عورت ہے۔ ہر وقت بیٹے کے کان بھرتی رہتی ہے اور بیٹا بھی ماں کا ایسا لاڈلا ہے کہ بیوی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ ذرا سی بات پر بیوی کو ڈانٹنا شروع کر دیتا ہے۔"

اس کی یہ بات قابلِ یقین نہیں لگتی تھی۔ ایک تو وہ لوگ اونچی حیثیت کے مالک تھے اور دوسرے رفیق کی بہن اُن کے گھر میں تھی، وہ اُسے یعنی زرینہ کو زیادہ تنگ کر سکتے تھے۔

میں نے پوچھا۔ "آپ لوگ رفیق کی بہن زرینہ سے کیسا سلوک کرتے ہیں؟ کیا اپنی بیٹی پر ہونے والی زیادتی کا بدلہ نہیں لیتے؟"

"ہم اعلیٰ ذات کے خاندانی لوگ ہیں۔" اُس نے فخریہ کہا۔ "میرا بیٹا زرینہ کو پھولوں کی طرح رکھتا تھا لیکن وہ ذرا ذرا سی بات پر اُس سے لڑنا شروع کر دیتی تھی۔ دو روز پہلے بھی دونوں میں جھگڑا ہوا تھا۔ زرینہ میکے جانے کی ضد کر رہی تھی لیکن نیاز علی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ گھر میں سَو مجبوریاں ہوتی ہیں۔ انسان شادی اس لیے تو نہیں کرتا کہ بیوی ہر وقت میکے میں ہی بیٹھی رہے۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ نیاز علی کو زرینہ نے قتل کیا ہے؟"

"یہ پتا کرنا تو آپ کا کام ہے۔ ایسی عورتوں کا کیا بھروسا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے اپنے کسی . . . یار سے یہ کام کروایا ہو۔"

اُس عورت نے بلاتامل اپنی بہو پر الزام لگا دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "آپ اُس کے کتنے یاروں کو جانتی ہیں؟"

"یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے۔"

"آپ وہ بات بتائیں جو آپ کو معلوم ہو۔ اگر آپ کو اپنی بہو زرینہ پر شک ہے تو اس شک کی کوئی وجہ بتائیں۔"

"شک ہم نے ظاہر کر دیا ہے۔ وجہ آپ معلوم کریں۔ اُس کو دو چار دن تھانے میں رکھیں، سب کچھ اُگل دے گی۔"

میں نے ضروری باتیں نوٹ کر کے اُسے باہر بھیج دیا اور چوہدری کو اندر بلا کر کہا۔ "چوہدری صاحب، آپ نے کہا تھا کہ قاتل باہر ہی سے آیا کرتے ہیں، مگر آپ کی بیوی کا خیال ہے کہ قاتل اندر کا کوئی آدمی ہے۔ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

"ملک صاحب، میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا۔" اُس نے کہا۔ "سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ میں ابھی زرینہ سے بات کر رہا تھا مگر وہ کوئی جواب ہی نہیں دے رہی، بس روئے چلی جا رہی ہے۔ میری بیٹی کو بھی اُسی پر شک ہے۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا ہے کہ وہ زرینہ سے اُگلوانے کی کوشش کرے . . ."

میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ کام آپ کے بس کا نہیں۔ تفتیش کرنا ہمارا کام ہے۔ اپنی بہو کو یہاں بُلا لیں۔"

اُس نے برآمدے میں جا کر اپنی بیوی کو آواز دی اور کہا کہ زرینہ کو بیٹھک میں بھیج دے۔

چند ساعت کے بعد صابرہ بی بی زرینہ کو لیے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئی۔ اُس نے زرینہ کا بازو پکڑ رکھا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ زرینہ کی مرضی کے خلاف اُسے کھینچ کر لا رہی ہے۔ دوسری طرف سے ایک نوجوان لڑکی نے زرینہ کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ بھاری جسم اور موٹے نقوش والی ایک بدمزاج سی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی تنگ پیشانی تھی اور تیوری چڑھی ہوئی تھی۔

اُس کے مقابلے میں زرینہ ایک حسین اور دُبلی پتلی لڑکی تھی۔ اُس کی رنگت سرخ و سپید اور عمر اٹھارہ اُنیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اُس کے گھنے سیاہ بال کھلے ہوئے تھے اور چہرے کے دونوں جانب لٹک رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔

"تھانے دار صاحب، اس کے رونے دھونے پر نہ جائیں۔" صابرہ بی بی نے کہا۔ "یہ مکر کر رہی ہے۔ اس کو ذرا دبکا شبکا لگائیں، ایک منٹ میں سب کچھ اُگل دے گی۔"

"بی بی، آپ مجھے طریقے نہ سمجھائیں۔ مجھے سارے طریقے آتے ہیں۔ مجھے اپنے طریقے سے کام کرنے دیں اور اس کو چھوڑ دیں۔ یہ کہیں نہیں جا سکتی۔"

دونوں عورتوں نے لڑکی کو چھوڑ دیا۔ وہ وہیں دری پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

میں نے چوہدری سے کہا۔ "فی الحال اسے کسی الگ کمرے میں بٹھا دیں اور گھر میں سب کو یہ بات بتا دیں کہ کوئی شخص اس کے ساتھ سوال جواب نہ کرے۔"

"یہ اچھی زبردستی ہے۔" صابرہ بی بی نے غصے سے کہا۔ "ہمارا پُتر قتل ہو گیا ہے اور ہم سوال جواب بھی نہ کریں۔"

"قانون یہی کہتا ہے چوہدرانی!" میں نے کہا۔ "مجرم کی تفتیش کرنا پولیس کا کام ہے۔ اگر آپ کو کچھ معلوم ہے تو آپ مجھے بتائیں۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

چوہدری نے میری ہدایت کے مطابق زرینہ کو الگ کمرے میں بٹھا دیا۔

میں نے دوبارہ سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔ "چوہدری صاحب! آپ نے اپنی بیوی کی باتیں سن لی ہیں، اب آپ اپنی بات کریں۔ کیا آپ کو بھی اپنی بہو پر شک ہے؟"

"شک والی بات تو ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بندہ قتل ہو جائے اور ساتھ والے بستر پر سونے والے کو خبر تک نہ ہو۔ جاگنے کے بعد بھی پتا نہ چلے۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ زرینہ گزشتہ رات برآمدے میں سوئی تھی؟"

"ہر روز ہی برآمدے میں سوتی ہے۔"

"روزانہ کی بات نہیں کریں۔ کل رات کی بات بتائیں؟"

"میں نے تو نہیں دیکھا مگر سب کہتے ہیں کہ وہ گزشتہ رات برآمدے میں سوئی تھی۔"

"اس بات کو چھوڑیں، اسے میں چیک کر لوں گا۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ کی بہو کا اپنے شوہر سے کوئی تنازع چل رہا تھا؟"

"تنازع تو کوئی خاص نہیں تھا... دو چار روز پہلے دونوں میں کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ زرینہ میکے جانا چاہتی تھی۔ نیاز علی نے اسے اجازت بھی دے دی تھی لیکن شام کو زرینہ نے میکے جانے سے انکار کر دیا۔ اس پر نیاز علی کو بڑا غصہ آیا اور دونوں میں تو تکار ہو گئی۔"

"کیا آپ کے خیال میں اتنی سی بات پر کوئی عورت اپنے شوہر کو قتل کر سکتی ہے؟"

"ملک صاحب، اگر یہ بات آپ کسی اور موقع پر پوچھتے تو میں انکار میں جواب دیتا لیکن میرے بیٹے کی لاش باہر پڑی ہے۔ میں کیسے اپنی بہو کو بری قرار دے سکتا ہوں۔"

"چوہدری صاحب، بندے کے سو جن ہوں تو دو چار دشمن بھی ہوتے ہیں۔ آپ کسی اور دشمن کے بارے میں بھی سوچیں۔"

"میں ضرور سوچوں گا لیکن ایک بات اور میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ یہ شادی نیاز علی کی پسند سے ہوئی تھی۔ اس نے زرینہ کو کہیں دیکھ لیا تھا اور ضد کر کے شادی کی تھی۔ زرینہ، نیاز علی سے عمر میں آدھی کی ہے۔ یہ اس شادی پر راضی نہیں تھی۔ اس نے کہیں اور آنکھ لڑا رکھی تھی۔ نیاز علی نے زرینہ کے بھائی رفیق سے بات کی اور رفیق نے بہن کو سمجھا بجھا کر شادی کے لیے راضی کیا۔"

میں نے کہا۔ "اور رفیق اس لیے راضی ہو گیا تھا کہ آپ نے اسے اپنی بیٹی دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔"

"یہ بات بعد میں ہوئی تھی۔ اور یہ الگ معاملہ ہے۔ زرینہ نے اگر خود نیاز علی کو قتل نہیں کیا تو کسی سے کروایا ہے۔ آپ اس لڑکی کی شکل و صورت پر نہ جائیں۔ ایسی خوبصورت لڑکیاں اندر سے بہت خطرناک ہوتی ہیں۔ زرینہ نے میرے بیٹے کو کبھی اپنا خاوند تسلیم نہیں کیا تھا۔ یہ شروع سے موقع کی تاک میں تھی۔"

اُس کی اس بات میں خاصا وزن تھا۔ اب دیکھنے والی

بات یہ تھی کہ اس الزام میں کہاں تک حقیقت تھی اور وہ کون تھا جس سے زرینہ نے آنکھ لڑا رکھی تھی۔

میں نے پوچھا: "چوہدری صاحب! کیا آپ اس نوجوان کا نام بتا سکتے ہیں جس سے زرینہ نے آنکھ لڑا رکھی تھی؟"

"میں اپنے بیٹے سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔" اس نے کہا پھر صفدر علی کو اندر بلایا اور اس سے زرینہ کے مبینہ آشنا کا نام پوچھا۔

"وہ لوہاروں کا بیٹا چھیما نہیں ہے....." صفدر علی نے جواب دیا۔ "اس کے ساتھ تھا اس کا چکر۔"

"صحیح نام کیا ہے اس کا؟" میں نے پوچھا۔

"نام تو سلیم ہے مگر سب چھیما لوہار کہتے ہیں۔"

میں نے سلیم اور چھیمے لوہار کا پتا نوٹ کر لیا پھر پوچھا۔ "گھر میں اس وقت کتنے افراد ہیں؟"

"گھر میں اس وقت بچوں کے علاوہ چھ افراد ہیں۔" چوہدری نے جواب دیا۔ "چار سے تو آپ مل چکے ہیں۔ ان کے علاوہ میری ایک چھوٹی بہو اور بیٹی ہے۔ دو ملازم ان کے علاوہ ہیں۔"

"ملازموں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ہمارے ملازم ایسی جرأت نہیں کر سکتے۔"

"پھر بھی میں ملازموں سے بات کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے آپ چھوٹی بہو اور بیٹی کو بلائیں۔"

صفدر علی اندر جا کر دونوں کو بلا لایا۔

بیٹی وہی تھی جو تھوڑی دیر پہلے اپنی ماں کے ہمراہ زرینہ کو پکڑ کر بیٹھک میں لائی تھی۔ اس کا نام عشرت معلوم ہوا۔

میں نے پوچھا: "کیا تم رفیق کی بیوی ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہاں آئے ہوئے کتنے دن ہوئے ہیں؟"

"چار دن..."

میں نے پوچھا: "کیا تم راضی خوشی یہاں آئی ہو؟"

اس نے برا سا منہ بنا کر کہا: "کبھی کوئی عورت راضی خوشی بھی خاوند کا گھر چھوڑتی ہے؟"

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ زبان کی تیز اور قدرے احمق تھی۔ "یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے اس کی تائید کی پھر پوچھا۔ "تمہارا [illegible] کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟" [illegible] میری ساس [illegible] رفیق اس کے [illegible] چلتا ہے [illegible] ہوں، کوئی حیوان تو نہیں ہوں! اس نے [illegible] کچھ کرنا چاہیے

یا نہیں... انسان کو انصاف کی بات کرنا چاہیے۔ اس دن میں نے کھانے کے بعد اپنی ساس کو برتن دھونے کے لیے کہہ دیا۔ بس... اتنی سی بات پر رفیق نے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ کہنے لگا۔ میں ہوتی کون ہوں اس کی ماں کو کام کا کہنے والی۔ ماں بھی بک بک کرنے لگی۔ میں نے کہا۔ مجھ سے یہ اتنا بڑا ٹبّر نہیں سنبھالا جاتا۔ ماں کا بہت خیال ہے تو نوکر رکھ لو۔"

میں نے پوچھا: "گھر میں نوکر کوئی نہیں ہے؟"

"اونہہ... نوکر!" اس نے نخوت سے کہا۔ "ہانڈی کونڈی چاٹ کر گزارہ کرنے والے کیا خاک نوکر رکھیں گے۔ زمینوں کی ساری کمائی تو وہ جوئے میں ہار جاتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ رفیق جوا کھیلتا ہے؟"

"جوا بھی کھیلتا ہے اور کبھی کبھی نشہ بھی کرتا ہے۔ نیاز بھائی کی اس سے اسی پر دوستی ہوئی تھی۔"

وہ بے خیالی میں ایسی بات کہہ گئی تھی جو شاید ویسے نہ بتاتی۔ یعنی یہ کہ اس کا مقتول بھائی بھی جوا کھیلتا تھا۔

میں نے پوچھا: "کیا تمہارے جھگڑے کا اثر تمہاری بھرجائی پر بھی پڑتا تھا؟"

"نہیں جی، میرا بھائی بہت شریف آدمی تھا۔ وہ زرینہ کو بہت خوش رکھتا تھا۔ اب یہی دیکھ لیں، میں چار پانچ روز سے یہاں پڑی ہوں۔ اگر نیاز بھائی غیرت... میرا مطلب ہے کہ ایسا ویسا آدمی ہوتا تو اسی روز زرینہ کو نکال باہر کرتا۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

"وٹے سٹے کی شادی میں تو یہی ہوتا ہے جی۔"

"تمہارے خیال میں نیاز علی کے قتل میں کس کا ہاتھ ہے؟"

"زرینہ کا! اور کس کا؟" اس نے کھٹ سے جواب دیا۔ "اگر اس نے خود یہ حرکت نہیں کی تو کسی بدمعاش سے کروائی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی قتل ہو جائے اور ساتھ سوئی ہوئی عورت کو کچھ پتا ہی نہ چلے۔"

"کیا تمہیں پکا یقین ہے کہ زرینہ برآمدے میں سوئی تھی؟"

"لو جی، مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ سارا گھر جانتا ہے کہ زرینہ برآمدے میں سوتی ہے۔"

"لیکن اس کے بستر پر تو ایک شکن تک نہیں ہے۔ کھیس بھی تہ کیا ہوا رکھا ہے۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے۔ اس نے اپنا کام مکمل کر کے بستر ٹھیک کر دیا ہوگا اور خود کمرے میں چلی گئی ہوگی۔"

میں اس کی بھابی کی طرف متوجہ ہوا۔ کہنے کو وہ چھوٹی بھابی تھی لیکن عمر میں زرینہ سے پانچ چھ سال بڑی لگتی تھی۔ اس کا

نام صادقہ تھا۔ وہ کھلتے ہوئے رنگ کی ایک خوش شکل عورت تھی مگر زرینہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ وہ شور سن کر اٹھی تھی۔ اور اس سے زیادہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ عشرت کے سامنے کھل کر بات کرتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ بس میں نے عشرت کو واپس بھیج دیا۔ اور اس سے پوچھا کہ زرینہ گزشتہ رات کہاں سوئی تھی؟

"مجھے پکا پتا نہیں ہے جی۔" اس نے جواب دیا۔ "پرسوں میاں بیوی میں بہت جھگڑا ہوا تھا۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ زرینہ اندر کمرے میں سو گئی ہو۔"

"کیا پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے؟"

"ہاں جی، جس دن میاں بیوی میں ناراضگی ہوتی تھی اس رات زرینہ الگ سوتی تھی۔"

"جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟"

"بھائی نیاز زرینہ کو میکے بھیجنا چاہتا تھا مگر وہ جانے پر تیار نہیں تھی۔"

"کیا وہ خوشی سے بھیجنا چاہتا تھا یا ناراضگی سے؟"

"خوشی سے بھیجتا تو وہ فوراً چلی جاتی۔"

میرے استفسار پر اس نے جھگڑے کی کچھ تفصیل بتائی۔ یہ تفصیل میں آپ کو زرینہ کے بیان کے ساتھ ملا کے بتاؤں گا۔ تفصیل ایک ہی ہے لیکن بتانے والے دو ہیں۔

میں نے صادقہ سے پوچھا: "کیا نیاز علی زرینہ کو مارتا تھا؟"

اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا: "عورتیں تو ہوتی ہی مار کھانے کے لیے ہیں جی۔ مار تو مجھے بھی پڑتی ہے لیکن زرینہ کی قسمت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ جس روز میری نند اپنے خاوند سے ناراض ہو کر گھر آتی تھی اس روز زرینہ کی کم بختی آ جاتی تھی۔ ادھر عشرت منہ پھلائے گھر میں داخل ہوتی، ادھر بھائی نیاز نے جوتا اتارا۔ میرا نام [illegible] ان لوگوں میں [illegible]"

اس نے پہلے بھی بہت کچھ بتایا تھا مگر اس کہانی کا ان باتوں سے زیادہ تعلق نہیں ہے اس لیے انہیں چھوڑتا ہوں۔

صادقہ کو رخصت کرنے کے بعد میں نے زرینہ کو بیٹھک میں بلایا اور کہا: "زرینہ بی بی! اس کمرے میں میرے اور تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ وہ [illegible] اس لیے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔"

وہ سسکیاں لیتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اور سر جھکا کر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا چہرہ گھٹنے ہوئے بالوں نے چھپا رکھا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "مجھے معلوم ہے کہ پرسوں تمہارا اپنے خاوند سے جھگڑا ہوا تھا۔ یہ جھگڑا کس وجہ سے ہوا تھا؟"

اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "یہاں تو جی، روزانہ ہی جھگڑا ہوتا ہے۔ سارا قصور میرے بھائی کا ہے جس نے جانتے بوجھتے ہوئے مجھے اس جہنم میں ڈال دیا۔"

میرے سوالات کے جواب میں اس نے جو واقعہ بتایا وہ میں اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اس میں صادقہ کی بیان کردہ تفصیل بھی شامل ہے۔

زرینہ نے بتایا کہ اس کی نند عشرت ایک کام چور اور منہ پھٹ عورت تھی۔ زرینہ کا بھائی اس سے دب کر رہتا تھا اور اس سے کسی کام کے لیے نہیں کہتا تھا۔ اس کے باوجود عشرت جلتی کڑھتی رہتی تھی اور اپنی ساس یا اپنے خاوند سے لڑ جھگڑ کر میکے آ جاتی تھی۔ اس کے گھر میں قدم رکھتے ہی نیاز علی کے سر پر شیطان سوار ہو جاتا اور وہ اسے یعنی زرینہ کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتا۔

زرینہ اپنے گھر جا کر بھائی کی منت سماجت کرتی اور اسے مجبور کرتی کہ جا کر اپنی بیوی کو منا کر لائے۔

چار روز پہلے عشرت شوہر سے لڑتی ہوئی گھر آئی اور یہ اعلان کر دیا کہ اب وہ اپنے سسرال نہیں جائے گی۔

نیاز علی شام کو گھر آیا۔ بہن کی باتیں سنیں اور حسبِ عادت اپنی بیوی پر برسنا شروع ہو گیا۔

"اپنے اس بے غیرت بھائی سے کہو کہ فوراً یہاں آئے اور میری بہن سے معافی مانگے۔ مجھے یہ روز روز کا تماشا اچھا نہیں لگتا۔"

زرینہ اسی وقت اپنے گھر گئی اور دو گھنٹے تک اپنے بھائی کو سمجھاتی رہی لیکن وہ جھکنے پر تیار نہیں ہوا۔

"میں اس عورت سے تنگ آ چکا ہوں۔" اس نے کہا۔ "یہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی، کسی کی عزت نہیں کرتی۔ ہر وقت شہزادیوں کی طرح پلنگ پر بیٹھی رہتی ہے۔ نہ ماں کی عزت کرتی ہے نہ میری عزت کرتی ہے۔ میں کب تک اسے منا کر لاتا رہوں گا۔ اب میں نہیں جاؤں گا۔ وہ خود آنا چاہے تو دروازہ کھلا ہے۔"

ماں نے بھی بیٹے کی تائید کی۔ "یہ ہماری زندگی کا تجربہ ہے کہ

یہ لڑکی ہر دوسرے روز ہمارے سروں میں خاک ڈال کر گھر سے نکل جاتی ہے۔ پہلے ہی روز سختی کرنا چاہیے تھی۔"

زرینہ نے پوچھا: "سیر! کیا بنے گا؟"

"اگر تو نباہ کر سکتی ہے تو واپس چلی جا... ورنہ ادھر ہی بیٹھ۔ ہم بھوکے ننگے نہیں ہیں۔"

زرینہ ایک رات گھر میں رہ کر واپس چلی گئی اور سسرال والوں کو اپنے بھائی کا جواب بتا دیا۔

ساس نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا: "تیرا بھائی اتنی اونچی ناک والا کب سے ہو گیا؟"

زرینہ کچھ نہیں بولی۔

"بولتی کیوں نہیں؟" ساس نے غصّے سے کہا: "اگر وہ نہیں آیا تو تو کیا لینے آئی ہے یہاں؟"

"ماں جی! میں اپنے بھائی کی حرکتوں کی ذمے دار نہیں ہوں۔ یہ میرا گھر ہے، میری عزت ہے۔ مجھے اور کہاں جانا ہے؟"

"سن رہے ہو اس کی بکواس؟" صابرہ بی بی نے بیٹے سے کہا: "یہ اپنے بھائی کو پٹی پڑھا کر آئی ہے۔ اس سے کہہ دو کہ جب تک فیکا یہاں آکر معافی نہیں مانگے گا، اس وقت تک یہ اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔"

"ماں جی! میں قسم کھاتی ہوں، میں نے اپنے بھائی کو کوئی پٹی نہیں پڑھائی۔ وہ تو ہر دفعہ ہی بھائی کو منا کر لے جاتا تھا۔ اب وہ نہیں آتا تو میں کیا کروں؟"

یہ سنتے ہی نیاز علی نے زرینہ کے منہ پر تھپڑ مارا اور بالوں سے پکڑ کر دروازے کی طرف گھسیٹا: "زبان چلاتی ہے میری ماں کے سامنے، نکل جا ہمارے گھر سے۔"

زرینہ نے بتایا کہ وہ نیاز علی کے پیروں میں گر پڑی اور اس کی منت سماجت کرنے لگی کہ اسے گھر سے نہ نکالے۔ اس پر نیاز علی نے اسے دو لاتیں رسید کیں اور دوبارہ گھر سے نکلنے کا حکم دیا۔

"مجھے جان سے مار ڈالو، میرے ٹکڑے کر دو لیکن میں اس گھر سے نہیں نکلوں گی، جان دے دوں گی پر گھر سے نہیں نکلوں گی۔"

نیاز علی نے اسے بالوں سے پکڑا اور کھینچتا ہوا باہر گلی میں لے گیا: "اس گھر میں تمھارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔" اس نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

زرینہ نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اب وہ میکے نہیں جائے گی۔ اسی دروازے پر جان دے دے گی۔ اس نے بتایا کہ وہ ڈھائی تین گھنٹے تک دروازے پر بیٹھی روتی رہی۔ بالآخر محلے والوں نے اس کے سسر کو سمجھایا اور وہ اسے اندر لے گیا۔

اس روز نیاز علی نے اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کی اور رات کو دیر سے گھر آیا۔

زرینہ نے مجھے بتایا کہ اگلی صبح نیاز علی کا رویہ اچانک اچھا ہو گیا۔ ناشتے کے بعد وہ اسے الگ کمرے میں لے گیا اور کہا: "زرینہ، ماں جی مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جب تک عشرت اپنے گھر نہیں چلی جاتی اس وقت تک تم یہاں نہیں رہ سکتیں۔"

"میرا کوئی قصور بھی تو ہو؟"

"تمھارا قصور یہ ہے کہ تم فیکے کی بہن ہو۔ اگر ہماری بہن اس کے گھر میں خوش نہیں رہ سکتی تو اس کی بہن ہمارے گھر میں کیسے خوش رہ سکتی ہے۔ تم ایسا کرو کہ کچھ روز کے لیے میکے چلی جاؤ۔"

"اگر آپ مجھے راضی خوشی بھیجتے ہیں تو میں چلی جاؤں..."

"میں خود تمھیں چھوڑ کر آؤں گا۔" نیاز علی نے کہا: "ماں جی کو بھی تو راضی رکھنا ہے۔ چار چھ روز کے بعد میں تمھیں لے آؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

ہر چند کہ زرینہ کو نیاز علی کی باتوں میں فریب ... ہو رہا تھا۔ تاہم وہ میکے جانے پر آمادہ ہو گئی۔ اس نے اپنے خدشات کو ذہن سے جھٹک دیا اور یہی توقع رکھی کہ اس کے شوہر کا یہ رویہ اصلی ثابت ہوگا۔

"میں تمھیں رات کے کھانے کے بعد تمھارے میکے چھوڑ آؤں گا۔" نیاز علی نے مزید کہا: "اپنی چیزیں تیار رکھنا۔"

زرینہ کو یہ بات بہت عجیب لگی۔ اس نے پوچھا: "رات کے کھانے کے بعد کیوں؟ اس وقت تو بہت اندھیرا ہو جاتا ہے۔"

نیاز علی تامل کرتے ہوئے بولا: "میں گھر والوں سے بات پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر ماں جی کو یہ پتا چلا کہ میں خود تمھیں چھوڑنے گیا تھا تو وہ ناراض ہوں گی۔ اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ میں پہلے نکل جاؤں گا اور پرائمری اسکول کے پاس رک کر تمھارا انتظار کروں گا۔"

پرائمری اسکول ان کے گھر سے تقریباً دو سو قدم کے فاصلے پر تھا۔

زرینہ کو یہ سب کچھ عجیب لگ رہا تھا مگر وہ شوہر کی خوشنودی کی خاطر راضی ہو گئی۔

زرینہ نے بتایا کہ دوپہر کے قریب حشمت بی بی نامی ایک عورت اس کی ساس سے ملنے آئی اور تقریباً ایک گھنٹا

ساتھ باتیں کرتی رہی۔ حشمت بی بی کے شوہر کا نام شیر خان وہ خاصا بدنام شخص تھا۔ وہ کئی غیر قانونی کام کرتا تھا۔ لیس میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ نہ ہی کبھی اسے کیا گیا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ پولیس کے لیے مخبری کرتا اس کی مدد سے کئی مشکل کیس حل ہوئے تھے۔ اس کے چھوٹے موٹے غیر قانونی کاموں کو نظر انداز کرنا پڑتا اس کے غیر قانونی کاموں میں جوئے کا کاروبار بھی تھا اور ہی اس کی آمدنی کا اصل ذریعہ تھا۔

بہر حال، یہاں اس کی بیوی حشمت بی بی کا ذکر ہو رہا تھا۔ بی بی بھی خاصی ہوشیار اور شاطر عورت تھی۔ صابرہ بی بی سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ بظاہر خیر خیریت زرینہ کے کمرے میں چلی گئی۔ زرینہ اس وقت اپنے کمرے لی تھی۔

حشمت بی بی نے رسمی کلمات کے بعد کہا: "میں تمھیں ایک ضروری بات بتانے آئی ہوں لیکن پہلے وعدہ کرو کہ ر نہیں کرو گی۔"

زرینہ نے وعدہ کر لیا۔

حشمت بی بی نے کہا: "آج رات تمھارا خاوند کسی بہانے باہر لے جانا چاہے گا۔"

زرینہ نے حیرانی سے پوچھا: "تمھیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

"یہ مت پوچھو۔" حشمت بی بی نے کہا: "میں تمھیں صرف نے آئی ہوں کہ آج رات گھر سے باہر قدم نہ نکالنا، جان دینا پر گھر سے باہر قدم نہ نکالنا۔ اگر تم گھر سے نکلیں تو پھر گھر واپس نہیں آسکو گی۔"

زرینہ گھبرا کر بولی: "ماسی! بات کیا ہے؟"

"عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔" حشمت بی بی ہا اور کمرے سے نکل گئی۔

زرینہ کے جی میں سارا دن ہول اٹھتے رہے۔ رات کے نے کے بعد جب سب لوگ سونے کی تیاری کرنے لگے ز علی نے زرینہ سے کہا: "میں پرائمری اسکول کی طرف جا ں تم میرے جانے کے دس منٹ بعد وہاں پہنچ جانا۔"

زرینہ خوف کی وجہ سے انکار نہ کر سکی۔ نیاز علی نے پچھلا زہ کھولا اور دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ زرینہ دیکھ رہی تھی کی حرکات و سکنات پر اسرار تھیں۔ پتا نہیں وہ کس ے سے اسے پرائمری اسکول میں بلا رہا تھا۔ شاید اس کی صاف نہیں تھی اور وہ اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ حشمت بی بی وں سے بھی یہی نتیجہ نکلتا تھا۔

نیاز علی کے جانے کے بعد زرینہ نے دروازہ بھیڑ دیا اور جان بچانے کی کوئی تدبیر سوچنے لگی لیکن اس کی سوچ ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ دو تین مرتبہ اپنی ساس اور نند کے کمرے تک گئی اور واپس آگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس کو اپنی پریشانی بتائے۔ چوتھی مرتبہ وہ اس ارادے سے ساس کے کمرے کی طرف گئی کہ اپنی پریشانی کا اظہار کیے بغیر واپس نہیں آئے گی لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر اس کی ہمت ایک بار پھر جواب دے گئی۔ اسے معلوم تھا کہ نیاز علی اس وعدہ خلافی پر طوفان کھڑا کر دے گا۔

ساس کے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا بھڑا ہوا تھا اور اندر سے ساس سسر کی باتوں کی آواز آرہی تھی۔ زرینہ متذبذب انداز میں دروازے کے قریب کھڑی تھی کہ اس نے اپنے سسر کو یہ کہتے سنا: "اب تو جوڑوں میں درد رہنے لگا ہے۔ اولاد سے تو اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کبھی پیر ہی دبا دیں۔"

"بہو کو آواز دے کر بلا لو۔" صابرہ بی بی نے کہا: "نیاز علی تو کہیں نکل گیا ہوگا۔"

زرینہ نے یہ موقع غنیمت جانا اور جلدی سے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ "ابا جی، لائیں میں آپ کے پیر دبا دیتی ہوں۔" اس نے کہا اور چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کر سسر کے پیر دبانے لگی۔ "میں ادھر سے گزر رہی تھی تو آپ کی آواز میرے کان میں پڑ گئی۔"

ساس نے ناک سکوڑ کر کہا: "پہلے تو تیرے کان میں کبھی ہماری آواز نہیں پڑی۔"

چودھری بہو کی حمایت کرتے ہوئے بولا: "ہر وقت ٹوکا نہ مارا کر، کبھی کسی کی اچھائی بھی دیکھ لیا کر۔"

زرینہ تقریباً ایک گھنٹے تک سسر کے پیر دباتی رہی۔ جب کمرے سے نکلی تو اس نے دیکھا کہ نیاز علی برآمدے میں اپنی چارپائی پر لیٹا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ زرینہ کو دیکھ کر وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا اور سرسراتی آواز میں پوچھا: "تو گئی نہیں؟"

یہ سوال سنتے ہی زرینہ سمجھ گئی کہ پرائمری اسکول میں کوئی اور شخص اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اگر نیاز علی وہاں انتظار کر رہا ہوتا تو یہ سوال کبھی نہ کرتا۔

"میں گئی تھی۔" زرینہ نے جھوٹ بولا: "وہاں آپ ہی نہیں آئے، اس لیے میں واپس آگئی۔"

"اچھا!" نیاز علی آنکھیں گھما کر سوچنے لگا: "وہاں کوئی اور بھی نہیں تھا؟"

"مجھے کسی اور سے کیا واسطہ۔" زرینہ نے قدرے ہمت

سے کہا: "آپ نظر نہیں آئے تو میں واپس آگئی۔"

"ادھر اباجی کے کمرے میں کیا کر رہی تھی؟"

"اباجی کے پیر دبا رہی تھی۔"

نیاز علی دوبارہ بستر پر لیٹ گیا: "تم نے اباجی کو تو نہیں بتا دیا؟"

"آپ کی اجازت کے بغیر کیسے بتا سکتی ہوں۔" زرینہ نے کہا، پھر قدرے توقف کے بعد بولی: "میرا میکے جانے کو جی نہیں کرتا لیکن اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو میں صبح چلی جاؤں گی۔ رات کو جانا اچھا نہیں لگتا۔"

"زیادہ بک بک نہ کر۔ جو میں کہوں گا وہی کرنا پڑے گا۔ جا، جا کے سو جا۔"

رات خیریت سے گزر گئی۔

اگلی رات یعنی واردات والی رات نیاز علی نے زرینہ کو میکے جانے کے لیے نہیں کہا، تاہم زرینہ ڈری ہوئی تھی۔ نہ جانے کس وقت نیاز علی اسے روانہ ہونے کا حکم دے دے۔ لہٰذا رات کے کھانے کے بعد اس نے بیرونی دروازے بند کیے اور اندر جا کر ساس کے پیر دبانے لگی۔ نیاز علی نے ایک دفعہ کمرے میں نظر ڈالی اور خاموشی سے واپس چلا گیا۔ وہ ماں سے بہت ڈرتا تھا۔

چوہدری جو بیٹھک میں اپنے کسی دوست سے باتیں کر رہا تھا، تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اندر آیا اور بولا: "آج باہر کا دروازہ کسی نے بند نہیں کیا؟"

"میں خود بند کر کے آئی تھی۔" زرینہ نے کہا: "اس کے بعد نہ کوئی باہر گیا ہے اور نہ کوئی اندر آیا ہے۔"

"اچھی طرح دیکھ بھال کر دروازے بند کرنے چاہئیں۔" ساس نے تنبیہ کی: "اب سونے سے پہلے ایک بار پھر دیکھ لینا۔"

زرینہ کو پورا یقین تھا کہ اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی تھی۔ لیکن اس کا سسر بھی غلط نہیں ہو سکتا تھا۔

تقریباً ساڑھے دس بجے وہ اپنی ساس کے کمرے سے نکلی۔ اس وقت سارا گھر سو چکا تھا۔ نیاز علی بھی سو رہا تھا۔ زرینہ کچھ دیر اپنی چارپائی پر بیٹھی سوچتی رہی۔ گزشتہ دو روز سے اس کے شوہر کا رویہ عجیب سا تھا۔ پھر اسے حشمت بی بی کی بات یاد آئی کہ اگر وہ گھر سے نکلی تو زندگی بھر واپس نہیں آسکے گی۔ پتا نہیں، اس کا شوہر کیا منصوبہ بنا رہا تھا؟ اس کے دل میں یہ خیال بار بار آتا تھا کہ نیاز علی اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اچانک اسے نیاز علی سے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور اندر جا کر سو گئی۔

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا: "زرینہ! ... نے بتایا ہے اس سے تمھاری یہ پوزیشن اور زیادہ ... ہوگئی ہے۔ جیسا کہ تم نے کہا، تمھیں یقین ہوگیا تھا ... تمھیں ٹھکانے لگانا چاہتا ہے۔ اس صورتِ حال کے ... میں یہ سوچ سکتا ہوں کہ تم نے اپنی حفاظت کے خیال سے ... نیاز علی کو قتل کر دیا تھا یا کروا دیا تھا۔"

"تھانیدار صاحب! میں نے ساری بات سچ سچ ... کو بتا دی ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ مجھے مجرم سمجھتے ... بڑی خوشی سے گرفتار کر لیں۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا: "سلیم کو ... جانتی ..."

"جی اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ لوگ اس کا نام لے لے کر بدنام کرتے رہتے ہیں، لیکن یہ سب جھوٹ ہے۔ میرا سلیم ... کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ ہمارا پڑوسی ہے اور شریف لڑکا ..."

"شادی کے بعد اس سے تمھاری ملاقات ہوئی تھی؟"

"کبھی نہیں، شادی سے پہلے بھی کبھی ملاقات نہیں ہوئی ... اس کے ماں باپ نے میرا رشتہ مانگا تھا۔ چونکہ لڑکا پڑھا لکھا اور شریف ہے، اس لیے میرا باپ راضی تھا لیکن ماں نہیں مانتی تھی۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

"کیا تمھیں سلیم پسند تھا؟"

"ماں باپ کی پسند میری پسند ہے۔ مجھے پھر ... بننے کا شوق نہیں ہے۔"

وہ لڑکی مضبوط ارادے کی مالک معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اس ساری تفتیش سے اندازہ لگایا کہ نیاز علی کے قتل کا محرک انھی واقعات کے اندر کہیں پوشیدہ ہے۔

گھر کے افراد کے بیانات سننے کے بعد میں نے ملازم سے بھی پوچھ گچھ کی۔ وہ مسکین اور کمزور افراد تھے۔ اور ارتکاب قتل کے قابل نہیں لگتے تھے۔ وہ اپنی کھولی میں سوئے ہوئے تھے اور قتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

ضابطے کی تفتیش مکمل کرنے کے بعد میں نے خون آلود بستر اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔

زرینہ اور صادق کے بیانات سے ایک یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ نیاز علی اور رفیق جوا کھیلتے تھے۔ زرینہ کے بیانات میں شمشیر خان اور اس کی بیوی حشمت بی بی کا ذکر آیا ... شمشیر خان جوئے کا اڈا چلاتا تھا۔ اس اعتبار سے نیاز علی، رفیق اور شمشیر خان میں جوا قدرِ مشترک تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ شمشیر یا اس کی بیوی کا اس معاملے سے کیا تعلق تھا۔

تھانے پہنچ کر میں نے ایک حوالدار سے کہا کہ وہ شمشیر کو تھانے بلالائے۔ پھر خود رفیق سے ملنے کے لیے روانہ ہوگیا۔

رفیق عرف فیکے کی عمر خلافِ توقع تیس اور پینتیس سال کے درمیان تھی۔ وہ گندمی رنگت والا عام سا آدمی تھا۔ اس کے نقوش میں کوئی کشش نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ عشرت جیسی لڑکی کے لیے ایسا ہی نوجوان موزوں تھا۔

وہ چوہدری منصب علی کے گھر گیا ہوا تھا اور میری آمد سے تھوڑی دیر پہلے واپس پہنچا تھا۔ اس نے مجھے بیٹھک میں بٹھایا اور لسی پانی کا پوچھا۔

"لسی پانی پھر سہی۔" میں نے کہا: "میں تم سے چند باتیں کرنے آیا ہوں۔ نیاز علی کے قتل کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟"

"جناب! میں کیا بتا سکتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں تو اس کی بہن سے شادی کر کے پچھتا رہا ہوں۔"

"اچھا! اس پچھتاوے کی وجہ کیا ہے؟"

اس نے عشرت کی بدزبانی اور کام چوری کی لمبی چوڑی تفصیل بتانے کے بعد کہا: "جناب! انسان شادی اس لیے کرتا ہے کہ اسے کچھ سکون ملے گا لیکن میری بیوی نے ہمارا اپنا سکون بھی چھین لیا ہے۔ کسی چھوٹے بڑے کی عزت نہیں کرتی۔ انسان کو کھڑے کھڑے بے عزت کر دیتی ہے۔ ہر وقت اپنے باپ کی دولت کی کہانیاں سناتی رہتی ہے۔ کام کو بالکل ہاتھ نہیں لگاتی۔ میری ماں کو نوکرانی سمجھتی ہے، اس پر حکم چلاتی ہے۔ اگر میری بہن زرینہ کا معاملہ بیچ میں نہ ہوتا تو میں اسے کب کا طلاق دے چکا ہوتا۔"

میں نے پرخیال لہجے میں کہا: "اب تو بہن کا معاملہ بیچ میں سے نکل گیا ہے۔"

"لیکن یہ اچھا نہیں ہوا۔"

"تم گزشتہ رات کہاں تھے؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اسے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ میں اس پر شک کر رہا ہوں۔ "میں اپنے گھر میں تھا۔"

میں نے کہا: "تمھیں یہ بات یقیناً معلوم ہوگی کہ نیاز علی تمھاری بہن پر ظلم کرتا تھا۔ تم نے اسے اس حرکت سے باز رکھنے کے لیے کیا کارروائی کی تھی؟"

"جناب! میاں بیوی کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب لڑکے والے اونچی حیثیت کے ہوں تو انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ عشرت کی وجہ سے زرینہ نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ ہم نے اسے کئی بار یہ کہا تھا کہ وہ گھر میں بیٹھ جائے، مگر وہ نہیں مانتی تھی۔ کہتی تھی کہ اب اس کا جینا مرنا اسی گھر میں ہوگا۔ اور جہاں تک نیاز علی کا تعلق تھا تو وہ اس معاملے میں کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔"

باتوں کے دوران میں نے اس کے ہاتھوں کا معائنہ کیا۔ مگر اس کے ہاتھوں میں زخم یا خراش کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیا۔

میں نے پوچھا: "یہ شادی کس طرح ہوئی تھی؟"

اس نے مختصر سی تفصیل بتائی۔ بعد میں مجھے بعض دوسرے لوگوں کی زبانی اس ضمن میں مزید باتیں معلوم ہوئیں۔ میں یہ ساری تفصیل یکجا کر کے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

• • •

مقتول نیاز علی ایک اوباش آدمی تھا۔ شراب اور جوا اس کے روزمرہ کے مشاغل میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے اندر بہت سی برائیاں تھیں۔ شمشیر خان کا اڈا اس کا خاص ٹھکانا تھا۔ اس کی ان برائیوں کی وجہ سے کوئی شخص اسے رشتہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ خود اسے بھی شادی کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

رفیق عرف فیکا بھی شمشیر خان کے اڈے پر جاتا تھا مگر وہ ذرا محتاط تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار اُدھر جاتا تھا۔ جوا بھی کھیلتا تھا مگر تھوڑے پیسے لگاتا تھا۔ تاہم بدنام وہ بھی تھا۔ اس کو بھی کوئی اپنی لڑکی نہیں دیتا تھا۔

یہاں پر میں نیاز علی کی بہن عشرت کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ جس طرح غریب کے گھر میں حسین لڑکی مسئلہ بن جاتی ہے، اسی طرح امیر کے گھر میں بدصورت لڑکی مشکل کا باعث ہوتی ہے۔ دولت مند خاندان کی بدصورت لڑکی کو اس کے معیار کا رشتہ ملنا بہت مشکل ہوتا ہے اور جہاں تک عشرت کا تعلق تھا وہ صورت کے علاوہ سیرت سے بھی مار کھا گئی تھی۔ اس کی بدمزاجی اور ... کی وجہ سے کوئی اچھا خاندان اس کا رشتہ قبول کرنے پر تیار نہیں تھا۔

چوہدری منصب علی بیٹی کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ کیونکہ اس کی شادی کی عمر نکلی جا رہی تھی۔ چوہدری اکثر اپنے بیٹوں سے کہتا رہتا تھا کہ اس کے لیے کوئی مناسب رشتہ تلاش کریں۔

نیاز علی اپنے حال میں مست رہنے والا آدمی تھا۔ اس نے کبھی بہن کی پروا نہیں کی تھی لیکن ایک روز اس نے فیکے

کی بہن زرینہ کو دیکھ لیا اور پہلی ہی نظر میں اس پر لٹو ہو گیا پہلے اس نے لڑکی کو اپنے طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ یہاں پر لمبی تفصیل ہے مگر میں اسے طوالت کے خیال سے چھوڑتا ہوں۔ اس اثنا میں اسے پتا چلا کہ زرینہ فیکے کی بہن ہے۔ اور فیکے کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔

اگر وہ براہِ راست زرینہ کا رشتہ مانگتا تو شاید اسے کامیابی نہ ہوتی۔ اس لیے اس نے فیکے کی کمزوری پکڑی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی طرح فیکے کی شہرت بھی اچھی نہیں ہے اور کوئی اسے رشتہ نہیں دیتا۔

ایک شام نیاز علی، فیکے کو ایک طرف لے گیا اور کہا۔ "یار فیکے، میں تمہارے ساتھ ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔"

فیکے نے اس روز جوئے میں کچھ رقم جیتی تھی اور بڑی ترنگ میں تھا۔ "کیا بات ہے، چوہدری نیاز علی؟" اس نے کہا۔ "کوئی پیسوں ویسوں کی ضرورت تو نہیں؟"

"پیسے اللہ کے فضل سے بہت ہیں۔" نیاز علی نے کہا۔ "میں تمہاری شادی کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

شادی کی بات سن کر فیکا خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ "چوہدری تمہیں میری شادی کا خیال کیسے آ گیا؟"

"بات یہ ہے کہ میری ایک چھوٹی بہن ہے۔" نیاز علی نے کہا۔ "بعض گھریلو مسئلوں کی وجہ سے اس کی وقت پر شادی نہیں ہو سکی۔ میرا مطلب ہے کہ اس کی عمر تھوڑی سی زیادہ ہو گئی ہے۔ میں تمہیں کافی عرصے سے جانتا ہوں۔ تم سمجھ دار اور شریف آدمی ہو۔"

"اچھی طرح سوچ لو، میں جوا کھیلتا ہوں۔" فیکے نے کہا۔ "اور تمہارے گھر والوں کو یہ بات پسند نہیں آئے گی۔"

"او یار، جوا تو میں بھی کھیلتا ہوں۔ اس میں کوئی ایسی بُرائی بھی نہیں ہے اور گھر والوں کو یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی لیکن ایک بات سن لو۔ پہلے اپنے گھر والوں سے بات کر لو۔ یہ نہ ہو کہ وہ میری ماں کی بے عزتی کر دیں۔"

نیاز علی سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تم صحیح کہتے ہو۔ گھر والوں کو راضی کرنا ذرا مشکل ہو گا۔ اصل میں ابا جی میری اور عشرت کی وٹے سٹے کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ایک خاندان بھی دیکھ لیا ہے۔ جہاں میرا بھی رشتہ ہو جائے گا اور عشرت کا بھی لیکن مجھے وہ لڑکی پسند نہیں ہے۔" پھر اس نے چالاکی سے اضافہ کیا۔ "اگر تمہاری کوئی بہن ہوتی تو بات آسانی سے بن جاتی۔"

فیکے نے قدرے تامل کرتے ہوئے کہا۔ "بہن تو ہے، مگر اس کی عمر کم ہے۔"

"شادی کے قابل تو ہے نا؟"

"شادی کے قابل تو ہے... مگر تم سے آدھی عمر کی ہو گی۔"

"عمر کی فکر نہیں کرو۔ ہم کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ وہ ہمارے گھر میں عیش کرے گی، عیش۔" قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "بہن تو میری بھی زیادہ عمر کی نہیں ہے۔ تم سے کم از کم دس سال چھوٹی ہو گی۔"

"اچھا... میں گھر میں بات کروں گا۔"

"صرف بات کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ تمہیں اپنی بات منوانی پڑے گی۔ ذرا زور لگانا پڑے گا۔"

یہ بات چیت دو تین ہفتے تک چلتی رہی اور بالآخر دونوں نے اپنے اپنے والدین کو وٹے سٹے کی اس شادی پر راضی کر لیا۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ چوہدری منصب علی تو پہلے ہی روز راضی ہو گیا تھا بلکہ وہ خوش ہوا تھا کہ اس کے سر سے بوجھ اترا۔ اصل کوشش فیکے کو کرنا پڑی تھی۔ اس کے ماں باپ بڑی مشکل سے اور بہت ساری یقین دہانیوں کے بعد راضی ہوئے تھے۔

نیاز علی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ زرینہ کے نام جائداد لگا دے گا۔ اور اسے ہر طرح خوش رکھے گا لیکن وہ چند ماہ سے زیادہ اس وعدے کو نہ نباہ سکا۔

•••

فیکے کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔ "کیا نیاز علی شادی کے بعد بھی جوا کھیلتا تھا؟"

"جوا بھی کھیلتا تھا اور نشہ بھی کرتا تھا لیکن میں نے شادی کے بعد اس برائی کو آہستہ آہستہ چھوڑ دیا ہے۔"

"نیاز علی کے گھر والے کہتے ہیں کہ قتل تمہاری بہن نے کیا ہے۔"

"زرینہ ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے خاوند کو بہت اونچا درجہ دیتی تھی۔ حالانکہ نیاز علی اس پر بہت ظلم کرتا تھا لیکن وہ اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کرتی تھی۔"

"سنا ہے کہ شادی سے پہلے اس کا سلیم لوہار سے دوستانہ تھا..."

اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی لیکن وہ اپنے جوش پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب، میری بہن پاک دامن لڑکی ہے۔ وہ ایسی باتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ چھیما لوہار ہمارا پڑوسی ہے اور ہمارے ساتھ اس کے اچھے تعلقات ہیں

[...]س جماعتیں پڑھا ہوا ہے اور شریف لڑکا ہے۔ اس کا [...] رشتے کے سلسلے میں ہمارے ہاں آئی تھی مگر بات آگے [...]یں بڑھی تھی۔ ہمیں بعد میں بہت افسوس ہوا تھا۔"

"لوگوں کا خیال ہے کہ تم نے اپنا مطلب نکالنے کے [...]ے زرینہ کی نیاز علی سے شادی کروائی تھی۔" میں نے اس کا [...]عمل دیکھنے کے لیے کہا مگر وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے تھوڑا [...]قف کیا، پھر پوچھا۔ "چھیمے لوہار کی شادی ہو گئی ہے؟"

"ابھی نہیں۔"

"اس کا تم لوگوں سے میل جول تو ہو گا؟"

"ہماری اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"وہ زرینہ پر ہونے والی زیادتیوں کا سن کر افسوس تو [...]ور کرتا ہو گا؟"

اس نے جواب دینے کے لیے تھوڑا سا تامل کیا، پھر بولا۔ [...]ہاری... آپس میں اتنی بے تکلفی نہیں ہے۔"

"جس روز عشرت ناراض ہو کر اپنے گھر گئی تھی۔ اس کے [...]سرے روز نیاز علی نے زرینہ کو دھکے دے کر گھر سے نکال [...]یا تھا۔ تم نے اس سلسلے میں کیا کارروائی کی تھی؟"

"ہمیں اس بات کا علم بعد میں ہوا تھا۔"

"پرسوں رات کو نیاز علی، زرینہ کو یہاں پہنچانے کا ارادہ [...]ہتا تھا، تمہیں ایسی کوئی اطلاع ملی تھی؟"

اس نے انکار میں جواب دیا۔ میں نے اس سے سلیم لوہار کا [...]پتا پوچھا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

•••

سلیم لوہار چھبیس ستائیس سال کا ایک خوش شکل اور [...]ضبوط نوجوان تھا۔ وہ اپنے باپ کی دکان پر کام کرتا تھا جہاں [...]ہے کی بالٹیاں، کڑاہیاں، حمام، انگیٹھیاں، چھریاں اور چمٹے [...]غیرہ فروخت ہوتے تھے۔ دکان کے پچھلے حصے میں چھوٹا [...]کارخانہ بھی تھا جہاں دو تین کاریگر یہ سامان تیار کرتے تھے۔

سلیم سے رسمی بات چیت کے دوران میں نے دیکھا کہ [...]س کے بائیں ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ پٹی دیکھ کر میرے [...]ل میں شک پیدا ہوا۔ میں نے سوچا کہ اسے زرینہ پر ہونے [...]الے ظلم کا حال معلوم تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے ہمدردی اور [...]حبت سے مغلوب ہو کر زرینہ کے ظالم شوہر کو قتل کر دیا ہو۔ [...]وئی عجب نہیں تھا کہ اس کام میں اسے زرینہ کا تعاون بھی [...]اصل رہا ہو۔ اس ضمن میں چوہدری کے گھر کے بیرونی دروازے کا [...]ھلا پایا جانا بھی قابلِ غور تھا۔ زرینہ کا کہنا تھا کہ اس نے دروازہ [...]ند کیا تھا جب کہ چوہدری کو دروازہ کھلا ہوا ملا تھا۔ پھر

تین واقعات والے روز زرینہ کا برآمدے میں نہ سونا بھی باعثِ شک تھا۔

مجھے دیکھ کر سلیم کا باپ، جو پچھلے حصے میں کام کر رہا تھا، دکان میں پہنچ گیا۔ اس کی کمر قدرے جھکی ہوئی تھی۔ غالباً وہ بھٹی کے سامنے سے اٹھ کر آیا تھا۔

میں نے سلیم سے کہا۔ "میں تم سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"سو بسم اللہ جناب، ضرور پوچھیں۔" اس نے بظاہر خوش دلی سے کہا، مگر اس کے چہرے پر فکرمندی صاف نظر آ رہی تھی۔

اس کا باپ بھی پریشان نظر آنے لگا، بولا۔ "کیا بات ہے جناب، کیا اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

"ہم ایک کیس کی تفتیش کر رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس سلسلے میں کچھ معلومات کرنی ہیں۔"

"جناب، میرا پتر کسی ایسی ویسی مجلس میں نہیں بیٹھتا۔"

میرے ساتھ جو حوالدار تھا اس نے کہا۔ "چاچا جی، انکوائری تو کرنا ہی پڑتی ہے۔"

میرا ارادہ تو یہی تھا کہ میں سلیم سے دکان پر ہی چند باتیں پوچھ کر واپس چلا جاؤں گا لیکن اس کی گھبراہٹ اور ہاتھ پر بندھی ہوئی پٹی دیکھ کر میں اسے تھانے لے گیا۔

جس اے ایس آئی کو میں نے شمشیر خان کو بلانے بھیجا تھا، وہ خالی واپس آ گیا تھا۔ شمشیر خان اسے نہیں ملا تھا، اس کی بیوی نے کہا تھا کہ وہ قصبے سے باہر گیا ہوا ہے۔

سلیم لوہار کو میں نے باہر بٹھا دیا تھا اور ہنگامی نوعیت کے کام نمٹانے میں لگ گیا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد جب فرصت ملی۔ تو میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اس عرصے میں وہ خاصا نروس ہو چکا تھا۔

میں نے اسے اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا اور پوچھا۔ "جھوٹ تو نہیں بولو گے؟"

"نہیں جناب... انشاء اللہ سچ بولوں گا۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "فیکے کی بہن زرینہ کو جانتے ہو؟"

وہ ذرا سا جھجکا، پھر بولا۔ "جانتا ہوں، جی۔"

"تم اس کو پسند کرتے ہو؟"

"جناب، اس کی تو شادی ہو چکی ہے۔"

"شادی سے پہلے پسند کرتے تھے۔"

اس نے تامل کرتے ہوئے جواب دیا۔ "تھوڑا بہت

پسند کرتا تھا جی۔"

"زرینہ بھی تمھیں پسند کرتی تھی؟"

اس نے جواب دینے میں تھوڑی دیر لگائی۔ میں نے سختی سے کہا: "کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔ زرینہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں اس کی پوری کہانی سن کر آرہا ہوں۔"

"ہاں جی۔۔۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ بھی پسند کرتی تھی۔"

"ملاقاتیں کہاں ہوتی تھیں؟"

"وہ کبھی کبھی ہمارے گھر آجاتی تھی۔"

"آج کل کہاں ہوتی ہیں ملاقاتیں؟"

"آج کل جی؟"

"بات لمبی کرنے کی کوشش نہیں کر۔ سیدھا جواب دے۔ زرینہ تجھے کہاں ملتی ہے؟"

"گھر۔۔۔ کبھی کبھی ہمارے گھر آجاتی ہے۔"

"چار روز پہلے بھی آئی تھی؟"

"ہاں جی۔۔۔ آئی تھی۔"

"کیا بات چیت ہوئی تھی؟"

"میری ماں سے باتیں کرتی رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ نیاز اس پر بہت ظلم کرتا ہے۔"

"تمھارے ہاتھ کو کیا ہوا ہے؟"

"لوہے کی چادر سے کٹ گیا تھا۔"

میں نے اس کی پٹی کھلوا کر زخم کا معائنہ کیا۔ انگوٹھے کے نچلے حصے میں، ہتھیلی پر تقریباً دو انچ لمبا زخم موجود تھا، جو واضح طور پر کسی تیز دھار آلے کا زخم تھا۔

"یہ لوہے کی چادر کا زخم نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ زخم تمھیں کب آیا تھا اور کس کے سامنے آیا تھا؟"

میں نے دیکھا، وہ ان سوالات سے گھبرا گیا تھا۔ "یہ کوئی پانچ روز پہلے کی بات ہے جی۔ میں کارخانے کی چیزیں ٹھیک کر رہا تھا کہ ایک چادر میرے ہاتھ سے پھسل گئی۔ اس وقت دکان میں اور کوئی نہیں تھا۔ یہ سچ [illegible] کی بات ہے۔"

"پٹی کس ڈاکٹر سے کروائی تھی؟"

"[illegible]۔۔۔ میں نے خود ہی پٹی باندھ لی تھی۔"

[illegible]

"مجھے معاف کردیں جی۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر [illegible] میری

ایک شخص سے لڑائی ہوگئی تھی۔"

"جیسے ابھی تم کرسی پر بیٹھے ہوئے ہو، میں تمھیں چھت سے بھی لٹکا سکتا ہوں۔ لڑائی کس سے ہوئی تھی؟"

اس نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑے اور بولا: "چوہدری بہار سے جی۔ اس نے چاقو نکال لیا تھا۔"

"جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟"

"میں نے اسے صرف اتنا کہا کہ وہ اپنی بیوی کو نہ مارا کرے۔ اس پر اس نے مجھے گالیاں دینا شروع کردیں اور چاقو نکال لیا۔"

"اور تم نے اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے اسے قتل کردیا۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ قتل تم نے زرینہ کے تعاون سے کیا ہے یا اپنی مرضی سے؟"

وہ قسمیں کھانے لگا کہ اسے قتل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں نے اسے سوچنے کا موقع دینے کے لیے حوالات میں بند کردیا اور دو آدمیوں کے ہمراہ خانہ تلاشی کے لیے اس کے گھر پہنچ گیا۔ مگر وہاں سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ ہم نے دکان کی تلاشی لی اور وہاں کام کرنے والوں سے پوچھ گچھ کی۔ وہاں سے بھی کوئی قابلِ اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی۔

••

اگلے روز میں نے شمشیر خان کے دروازے پر دستک دی۔ اس وقت صبح کے سات بجے تھے اور مجھے یقین تھا کہ شمشیر خان گھر پر ہی ہوگا۔ دروازہ اس کی بیوی حشمت بی بی نے کھولا اور میرے استفسار پر بتایا کہ شمشیر خان تین روز سے لاہور گیا ہوا ہے۔

تین روز کا مطلب یہ تھا کہ واردات والی رات وہ بستی میں موجود نہیں تھا۔

میں نے کہا: "حشمت بی بی، میں تم سے دو چار باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ دروازے پر کھڑے کھڑے پوچھ لوں یا اندر بٹھاؤ گی؟"

"تھانیدار صاحب، میں اتنی بھی بے مروت نہیں ہوں۔ ایک منٹ ٹھہریں، میں بیٹھک کا دروازہ کھولتی ہوں۔" اس نے بیٹھک کا دروازہ کھول کر مجھے اندر بٹھایا اور پوچھا: "لسی پیش کی جائے؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ پھر اصل بات کی طرف آتے ہوئے پوچھا: "تین روز پہلے تم چوہدری نصیب علی کے گھر گئی تھیں؟"

"میں ادھر سے گزر رہی تھی تو یونہی خیال آیا کہ سلام کرتی چلوں۔"

میں نے پوچھا: "زرینہ سے کیا بات ہوئی تھی؟"

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اندر کی طرف رخ کرکے اپنی بیٹی کو آواز دی اور لسی لانے کے لیے کہا، پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔ "ملک صاحب، میرا آدمی پولیس کے لیے مخبری کرتا ہے اور انعام واکرام بھی پاتا ہے، مگر میں نے یہ کام کبھی نہیں کیا۔"

"کام کی بات بتاؤ گی تو تمھیں بھی انعام مل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے تو یہ بتاؤ کہ زرینہ کو تم نے کیا بتایا تھا؟"

"اس نے آپ کو کیا بتایا ہے؟"

"جو تم نے اسے بتانے سے منع کیا تھا۔"

"آج کل کسی کا بھلا نہیں کرنا چاہیے۔" اس نے بُرا سا منہ بنایا۔ "میں نے اس کے ساتھ مہربانی کی تھی۔ اس نے اُلٹا میرا نام لگا دیا۔ میں نے اسے صرف یہ کہا تھا کہ اپنے آدمی کا گھر نہ چھوڑے۔ بس اتنی سی بات تھی۔"

"حشمت بی بی، کھل کر بات کرو۔ اس طرح بات نہیں بنے گی۔ جو کچھ تم نے زرینہ کو بتایا تھا، اس کا نیاز علی کے قتل سے گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اتنی سی بات نہیں تھی۔ میں تمھیں پوچھ گچھ کے لیے تھانے بھی لے جا سکتا ہوں۔"

اس اثنا میں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی لسی کا گلاس لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے مجھے سلام کیا اور گلاس میز پر رکھ کر واپس چلی گئی۔

"ملک صاحب، میں ایک شرط پر آپ کو اصل بات بتا سکتی ہوں۔" حشمت بی بی نے کہا۔ "اور وہ شرط یہ ہے کہ آپ میرے آدمی سے اس بات کا ذکر نہیں کریں گے اور نہ ہی اسے اس معاملے میں گھسیٹنے بیٹھ جائیں گے۔"

"ہم خواہ مخواہ کسی کو نہیں گھسیٹتے۔ اگر تیرے آدمی نے کوئی جرم نہیں کیا تو ہم اسے کچھ نہیں کہیں گے۔ ہاں یہ وعدہ میں کرسکتا ہوں کہ تمھاری کسی بات کا ذکر تمھارے آدمی سے نہیں کروں گا۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولی: "آپ لسی پئیں، میں ابھی آئی۔"

میں نے لسی کے چند گھونٹ بھرے اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ [illegible] فرنیچر سے آراستہ ایک صاف ستھرا کمرا تھا جس میں کوئی قالین بچھا ہوا تھا اور نہ ہی قیمتی پردے آویزاں تھے۔

حشمت بی بی دو تین ساعت کے بعد واپس آگئی۔ وہ مضبوط قد و قامت کی خاصی ہمت والی عورت تھی، میری موجودگی اس کے لیے ذرا فکرمندی کا باعث نہیں تھی۔

"ملک صاحب، مجھے جو کچھ معلوم ہے وہ میں آپ کو بتانے کے لیے تیار ہوں لیکن پہلے انعام کی بات کریں۔"

"کچھ پتا تو چلے کہ بات کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمھاری معلومات ہمارے کسی کام کی نہ ہوں۔"

"معلومات آپ کے بہت کام کی ہیں۔ یہ میں آپ کو پہلے بتا دیتی ہوں۔" اس نے دھڑلے سے کہا۔ "آپ لوگ دوسروں کی جیبیں خالی کرتے ہیں، آج میں آپ کی جیب خالی کروں گی۔ پہلے میرا انعام نکال کر یہاں رکھ دیں۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے پوچھا: "اگر تمھاری معلومات ہمارے کام کی نہ ہوئیں تو؟"

"تو پیسے اٹھا کر جیب میں رکھ لینا اور لسی پی کر اللہ بیلی ہو جانا۔"

میں نے کچھ پیسے نکال کر میز پر رکھ دیے۔ اس نے کہا کہ تھوڑے ہیں۔ میں نے ایک نوٹ اور نکال کر رکھ دیا تب اس نے بات شروع کی۔

"یہ چار پانچ روز پہلے کی بات ہے۔ شمشیر خان اسی بیٹھک میں بیٹھا دو آدمیوں سے باتیں کر رہا تھا اور یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شمشیر خان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے شریف لوگ نہیں ہوتے۔ یہ جن دو آدمیوں کا میں نے ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک بالا کشمیری اور دوسرا حنیف ٹنڈا تھا۔۔۔"

اقبال عرف بالا کشمیری اور حنیف ٹنڈا دونوں سزا یافتہ مجرم اور ہسٹری شیٹر تھے۔

حشمت بی بی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ وہ کسی کام سے دروازے کے قریب گئی تو ایک جملہ سن کر چونک پڑی۔

حنیف ٹنڈا کہہ رہا تھا: "سنا ہے کہ نیاز علی کے گھر والی بہت سوہنی ہے۔ [illegible]"

[illegible]

ہے اور نیاز علی کی بیوی فیکے کی بہن ہے۔"
"یعنی وٹے سٹے کا معاملہ ہے؟"
"ہاں، نیاز علی نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ اس کی بہن فیکے کے گھر میں خوش نہیں ہے۔ سسرال والے اس پر بہت زیادتی کرتے ہیں اور وہ اس زیادتی کا بدلہ اپنی گھر والی سے لینا چاہتا ہے۔ لیکن سنا ہے کہ وہ بڑی ڈھیٹ عورت ہے۔ نیاز علی اسے کئی دفعہ گھر سے نکال چکا ہے مگر وہ پھر واپس آجاتی ہے۔ اب اس نے جان چھڑانے کا یہ طریقہ نکالا ہے۔"

حنیف ٹنڈے نے کہا: "اوئے شمشیر خان! تم نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ہم اس کی جان چھڑوا دیتے۔" پھر وہ بالے سے مخاطب ہوا: "کیا خیال ہے بالے، یہ اپنے دلدار حسین سے بات کریں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس کے ساتھ گڈی کا سودا کر لیتے ہیں۔ وہ شریف آدمی ہے راضی ہو جائے گا۔"

"کیا تم چوہدری کی بیوی کو گھر میں بساؤ گے؟"

"اونہہ... مجھے بھینسیں پالنے کا شوق نہیں ہے۔"

حنیف ٹنڈے نے کہا: "دو چار مہینے اپنے پاس رکھ کر منڈی میں پہنچا دیں گے۔"

"بات کرنی ہے تو آج ہی کر لو۔" شمشیر خان نے کہا۔ "نیاز علی نے دلدار حسین سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ایک دو روز میں اپنی گھر والی کو اس کے حوالے کر دے گا۔"

حشمت بی بی نے بات ختم کرتے ہی میز پر رکھے ہوئے نوٹ کسی جواری کی طرح سمیٹ لیے۔ اس نے واقعی کارآمد معلومات فراہم کی تھیں۔

"حشمت بی بی! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے کہا: "نیاز علی اپنی گھر والی کو دلدار حسین کے سپرد کیوں کرنا چاہتا تھا؟"

"یہ بات دلدار حسین سے جاکر پوچھ لیں۔"

میں نے چند اور سوالات کیے اور رخصت ہو گیا۔

• •

دلدار حسین اگرچہ ایک کاروباری شخص تھا لیکن جوئے کا پرانا ماہر تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ تاش کے پتوں کے معاملے میں جادوگر ہے۔ تاش میں اس کو ہرانا بہت مشکل تھا۔ وہ بھی شمشیر خان کے اڈے پہ جاتا تھا۔

میں نے دو آدمی بھیج کر اسے تھانے بلا لیا اور اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا: "دلدار حسین! نیاز علی سے تمہاری آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

میرا پہلا سوال سنتے ہی وہ فکرمند دکھائی دینے لگا۔ بولا: "کوئی ایک آدھ ہفتہ ہوا ہو گا۔"

"تمہارا اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا تھا؟"

"معاملہ! آپ کس معاملے کی بات کر رہے ہیں؟"

"سنا ہے کہ نیاز علی کی بیوی بہت خوبصورت ہے۔"

"جج... جی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"تم بہت کچھ کہہ سکتے ہو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس لیے جلدی سے کہنا شروع کر دو۔" وہ متذبذب نظر آنے لگا۔ میں نے اس پر نفسیاتی دباؤ ڈالتے ہوئے کہا: "میں بالے کشمیری اور حنیف ٹنڈے کی کہانی سن چکا ہوں۔ اگر تم نے کچھ چھپانے کی کوشش کی تو بڑی مشکل میں پھنس جاؤ گے۔"

اس کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آنے لگی۔ بولا: "تھانیدار صاحب! جوئے میں اس قسم کی باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ یہ سب نیاز علی کی طرف سے ہوا تھا۔ وہ ضد میں آگیا تھا۔"

میں نے کہا: "ساری بات شروع سے بتاؤ۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ بالے کشمیری اور حنیف ٹنڈے نے جو کچھ بتایا تھا اس میں کتنا سچ ہے۔"

اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ سات آٹھ روز پہلے اس کی نیاز علی کے ساتھ تاش کی بازی لگ گئی۔ نیاز علی بھی تاش کا اچھا کھلاڑی تھا۔ شروع میں دو دو چار چار روپے کی شرطیں چلتی رہیں۔ اگرچہ کچھ بازیاں نیاز علی بھی جیت رہا تھا، تاہم دلدار حسین کا پلہ شروع سے بھاری تھا۔ اگر نیاز علی دو روپے جیتتا تھا تو وہ چار روپے جیت جاتا تھا۔ رات کے گیارہ بجے نیاز علی کی جیب خالی ہو گئی۔ وہ سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ دلدار اٹھنے لگا تو نیاز علی نے اس کا بازو پکڑ لیا اور بولا: "کہاں چل دیے ابھی اور بازی ہو گی۔"

دلدار حسین نے طنزیہ لہجے میں کہا: "جیب تو تمہاری خالی ہو چکی ہے۔ کیا کپڑے داؤ پر لگاؤ گے؟"

نیاز علی نے اپنی سونے کی انگوٹھی اتار کر سامنے رکھی۔ "دلدار حسین، ہاتھی مرا ہوا بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ اس انگوٹھی کا کیا دیتے ہو؟ یہ آدھے تولے کی انگوٹھی ہے۔"

"مجھے سونا خریدنے کا شوق نہیں ہے۔"

نیاز علی نے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے جواریوں کو انگوٹھی خریدنے کے لیے کہا۔ ایک جواری نے چالیس روپے میں انگوٹھی گروی رکھ لی۔ اس زمانے میں سونا سو روپے تولہ تھا یعنی اس

زمانے کے سو روپے آج کے تین ہزار روپے کے برابر تھے۔
نیاز علی نے چالیس روپے سامنے رکھ لیے اور غصّے کی وجہ سے بڑی بڑی بازیاں لگانے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آدھے پونے گھنٹے میں انگوٹھی کی رقم بھی ہار گیا۔
دلدار حسین نے رقم سمیٹ لی اور اٹھنے لگا۔ نیاز علی نے اسے پھر روک لیا اور ایک جواری سے کچھ روپے ادھار لے کر دوبارہ کھیلنے لگا۔ شروع میں وہ ایک دو ہاتھ جیت بھی گیا لیکن پھر ہارنا شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ ادھار لی ہوئی رقم بھی ہار گیا۔
"چوہدری، کل آنا۔" دلدار حسین کھڑا ہو گیا۔ "ایک رات کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"
نیاز علی پر سخت جھنجلاہٹ طاری تھی۔ اس نے کہا "ابھی کھیل ختم نہیں ہوا۔ میں اور کھیلوں گا۔"
"اب تو تمھیں کوئی قرضہ بھی نہیں دے گا۔" دلدار حسین نے کہا۔ "جاؤ گھر جا کر سو جاؤ۔"
نیاز علی نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ "ایسے نہیں جا سکتے تم۔ ایک بازی اور ہو گی۔ تین پتوں کی بازی اور نئی گڈی سے ہو گی۔ ایک ہی بازی ہو گی یا آر یا پار۔ اپنی جیبوں کا سارا مال نکال کر رکھ دو۔"
دلدار حسین نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا اور غصّے سے بولا۔ "اب کیا اپنی بیوی کو داؤ پر لگاؤ گے؟"
"ہاں، میں اپنی بیوی کو داؤ پر لگاؤں گا۔"
"مردوں والی زبان کر رہے ہو؟"
"ہاں، یہ مردوں والی زبان ہے۔ اگر میں ہار گیا تو اپنی بیوی تمھارے حوالے کر دوں گا۔ اگر جیت گیا تو تمھاری جیبوں کی ساری رقم میری ہو گی اور یہ بازی قسمت کی بازی ہو گی۔ پتوں کو نہ میں ہاتھ لگاؤں گا اور نہ تم ہاتھ لگاؤ گے۔ ایک تیسرا آدمی ہمیں تین تین پتے دے گا۔ جس کے پتے بڑے ہوں گے وہ جیت جائے گا۔"
دلدار حسین نے وہاں پر موجود لوگوں سے کہا۔ "او بھائیو! اس کو سمجھاؤ، یہ اپنی بیوی کو داؤ پر لگا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دماغ الٹ گیا ہے۔"
"تم کیوں فکر کرتے ہو؟" نیاز علی نے کہا۔ "بیوی میری ہے۔ میں اس سے ویسے بھی خوش نہیں ہوں۔ میں کہہ دوں گا کہ وہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔"
دلدار حسین نے کہا کہ وہ یہ بازی کھیلنے پر راضی نہیں تھا۔ اوّل تو اسے بیوی والا معاملہ پسند نہیں تھا اور دوم یہ کہ اس بازی میں کھلاڑی کے لیے اپنا کمال دکھانے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ سارا کھیل قسمت کا تھا تاہم نیاز علی کے اصرار پر اسے راضی ہونا پڑا تھا۔
چنانچہ ایک نئی گڈی منگوائی گئی اور اسے اچھی طرح پھینٹا گیا۔ پھر ایک شخص نے دونوں کے سامنے تین تین پتے رکھ دیے۔ دلدار حسین نے اپنے پتوں کے کنارے اٹھا کر دیکھا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس کے حصے میں دو دُگیاں اور ایک ستا آیا تھا۔ اسے اپنی ہار کا یقین ہو گیا۔
لیکن نیاز علی کے حصے میں ایک دُگی، ایک تگی اور ایک بیگم آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی بیوی بھی ہار گیا لیکن اسے کوئی افسوس نہیں ہوا۔ اس نے دلدار حسین سے کہا کہ وہ دو تین روز کے اندر اپنی بیوی اس کے حوالے کر دے گا۔
دلدار حسین نے اپنی جیبوں سے تمام رقم نکالی اور سب کے سامنے اس کی گنتی کی۔ اس کے پاس کل اٹھارہ سو روپے تھے۔ یہ یاد رہے کہ اس رقم کی قوتِ خرید آج کے کئی ہزار کے برابر تھی۔
دلدار حسین نے رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا "نیاز علی، میں تمھیں ایک ہفتے کی مہلت دے سکتا ہوں، ایک ہفتے کے اندر مجھے اٹھارہ سو روپے دے دو اور اپنی بیوی اپنے پاس رکھو۔"
"رقم کو بھول جاؤ۔" نیاز علی نے تیزی سے جواب دیا۔ "جس چیز کی بازی لگی ہے وہی ملے گی۔"
دلدار حسین نے بتایا کہ دو روز بعد بالا کشمیری اور حنیف ٹُنڈا اس کے پاس آئے اور اسے علیحدگی میں لے گئے۔
"دلدار حسین ہم تمھارے ساتھ ایک سودا کرنے آئے ہیں۔" حنیف ٹُنڈے نے کہا۔ "تمھارے فائدے کا سودا ہے۔"
"کس چیز کا سودا کرنے آئے ہو؟" دلدار حسین نے پوچھا۔
بالے کشمیری نے کہا۔ "سنا ہے کہ تم نے چوہدری نیاز علی کے منہ پر جوتا مار دیا ہے۔"
"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔"
"تم نے جوئے میں اس کی بیوی جیت لی ہے؟" بالے نے کہا۔ "وہ اپنی بیوی کب تمھارے حوالے کر رہا ہے؟"
"اس نے دو تین روز کا وعدہ کیا ہے۔"
حنیف ٹُنڈے نے پوچھا۔ "اس آفت کو سنبھال لو گے؟"
"میں تمھیں مرد دکھائی نہیں دیتا ہوں؟" دلدار حسین نے کہا۔ "تم چاہتے کیا ہو؟"

"سنا ہے کہ بازی اٹھارہ سو کی تھی۔ ہم تمھیں اُنتیس سو دینے کے لیے تیار ہیں۔ عورت ہمارے حوالے کر دو۔"
دلدار حسین نے کچھ دیر تک ٹُنڈے کی تجویز پر غور کیا، پھر بولا۔ "عورت نیاز علی کی ہے۔ اگر وہ راضی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ میں نے اٹھارہ سو کی بازی کھیلی تھی۔ میرے لیے اٹھارہ سو بھی بہت ہیں۔"
"ٹھیک ہے، ہم تمھیں رقم دینے کے لیے تیار ہیں۔ نیاز علی سے ہماری بات کروا دو۔"
دلدار حسین نے اپنا آدمی بھیج کر نیاز علی کو اپنے گھر بلوا لیا اور بالے کشمیری اور حنیف ٹُنڈے کے سامنے پوچھا کہ وہ اپنی بیوی کب حوالے کر رہا ہے؟
نیاز علی ان دو بدمعاشوں کو دیکھ کر قدرے مرعوب ہو گیا۔ پھر بھی قدرے ہمت کر کے بولا۔ "ان لوگوں کی موجودگی کا یہاں کیا مطلب ہے؟"
"استادگری کس بات پر کھا رہے ہو؟" حنیف ٹُنڈے نے کہا۔ "ہمیں بھی اپنا یار بیلی سمجھو۔"
بالے نے کہا۔ "ہم نے دلدار حسین سے ایک سودا کیا ہے۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ عورت کی اور اٹھارہ سو کی بازی لگی تھی۔ ہم نے اپنے یار سے کہا ہے کہ رقم ہم سے لے لے اور عورت ہمارے حوالے کر دے۔"
ٹُنڈے نے کہا۔ "یار چوہدری کو اس میں کیا اعتراض ہو گا۔ وہ تو بازی ہار ہی چکا ہے۔"
نیاز علی نے ہولے سے سر ہلایا، بولا۔ "بات تو تم صحیح کہتے ہو لیکن میں تم لوگوں سے کیوں بات کر دوں؟"
"ہم دلدار حسین کو سو روپے اوپر دینا چاہ رہے تھے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ سو روپے تم لے لینا۔"
نیاز علی نے پوچھا۔ "رقم لائے ہو؟"
بالے نے نوٹ نکال کر دکھائے۔
نیاز علی نے کہا۔ "دو سو روپے اوپر ہوں گے۔"
"ہمیں منظور ہے۔ جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس۔"
نیاز علی نے دلدار حسین سے کہا۔ "میں تمھیں سولہ سو روپے دوں گا۔ بولو کیا خیال ہے؟"
"یہ تو بے ایمانی ہوئی۔" دلدار حسین نے کہا۔ "میں ان لوگوں سے خود بھی بات کر سکتا تھا۔"
"دلدار حسین، یہ سارا کام ہی بے ایمانی کا ہے۔ ایماندار ایسے کام نہیں کیا کرتے۔"

دلدار حسین سولہ سو پر راضی ہو گیا۔ اسے یہ بھی مفت میں مل رہے تھے۔ وہ اس چکر سے الگ ہونا چاہتا تھا۔

نیاز علی کے مطالبے پر بالے نے ایک ہزار روپے نکال کر نیاز علی کے ہاتھ پر رکھے اور کہا: "باقی ہزار روپے مال وصول ہونے پر۔"

نیاز علی نے چار سو روپے اپنی جیب میں رکھے اور چھ سو روپے دلدار حسین کی طرف بڑھائے اور بالے سے کہا: "کل رات ساڑھے نو بجے پرائمری اسکول کے برآمدے میں انتظار کرنا۔ زرینہ وہاں پہنچ جائے گی۔ اسے کہنا کہ تمھیں میں نے بھیجا ہے۔ سواری کا انتظام کر کے آنا۔"

"تم ساتھ نہیں آؤ گے؟"

"میری کیا ضرورت ہے؟"

"اور میری باقی رقم؟" دلدار حسین نے پوچھا۔

"باقی رقم ہم پہنچا دیں گے۔" بالے نے کہا: "فکر کیوں کرتے ہو؟"

یہ سودا طے کرنے کے بعد نیاز علی رخصت ہو گیا۔

دلدار حسین نے مجھے بتایا کہ اس بات چیت کے دو روز بعد تک اسے بقیہ رقم نہیں ملی۔ پھر اس نے نیاز علی کے قتل کی خبر سنی تو خاموش ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔

●●

یہ معلومات حاصل ہونے کے بعد میں نے بالے کشمیری اور حنیف ٹنڈے کی گرفتاری کے لیے ایک چھاپا مار پارٹی ترتیب دی اور ایس پی علاقہ کو بھی اس امر کی اطلاع بھجوا دی۔

ایک ہفتے تک دونوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس اثنا میں میں نے سلیم لوہار کو ایک معتبر شخص کی ذاتی ضمانت پر رہا کر دیا۔ لیکن دلدار حسین کو حوالات میں بند رکھا۔

ایک روز مجھے ایک مخبر کے ذریعے اطلاع ملی کہ دونوں مفرور ملزموں نے قریبی گاؤں کے ایک زمیندار کے گھر میں پناہ لے رکھی ہے۔ میں نے اسی وقت اے ایس آئی اور ہوشیار قسم کے سپاہی کو بلا کر ساری صورت حال بتائی اور کہا: "تم دونوں غلے کے بیوپاریوں کے بھیس میں جاؤ اور کچھ سن گن لے کر آؤ۔"

"ہمیں کوئی کارروائی تو نہیں کرنا ہو گی؟"

"کارروائی کی کوئی ضرورت نہیں۔ فی الحال تم زمیندار کی حویلی دیکھ آؤ اور گاؤں کا نقشہ بھی بنا لاؤ۔ یہ بھی اندازہ لگانا کہ کارروائی کے لیے کتنے آدمیوں کی ضرورت ہو گی۔"

ان کو رخصت کرنے کے بعد میں نے کوئی درجن بھر آدمیوں کی ایک پارٹی تیار کی اور اے ایس آئی کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ وہ تقریباً شام کے چھ بجے واپس آیا اور گاؤں کا کچا سا نقشہ میرے سامنے رکھ دیا۔

"زمیندار کا نام جمال دین ہے۔" اس نے بتایا۔ "اچھا کھاتا پیتا زمیندار ہے اور پہلے بھی مجرموں کی پشت پناہی کرتا رہا ہے۔ دونوں ملزم اس کی حویلی میں چھپے ہوئے ہیں اور مسلح ہیں۔"

اگلے روز میں نے عدالت سے سرچ وارنٹ حاصل کیا اور چھاپا مار پارٹی کے آٹھ افراد کو سادہ لباس میں الگ الگ گاؤں روانہ کر دیا۔ ان میں سے کچھ بنجاروں کے بھیس میں تھے اور کچھ گھسیاروں کے بھیس میں۔ انھیں میں نے ہدایت کر دی تھی کہ وہ گاؤں کے ارد گرد باہر جانے والے راستوں پر چھپ کر بیٹھ جائیں اور آنے جانے والوں پر نظر رکھیں۔

اس کے بعد میں نے تین آدمیوں کو ساتھ لیا۔ ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر گاؤں پہنچ گئے۔ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں زیادہ تر مزارعین رہتے تھے۔ وہاں نہ کوئی اسکول تھا، نہ ڈاکخانہ اور نہ ہی ڈسپنسری وغیرہ۔

چودھری جمال دین کو ہماری آمد کی پہلے ہی خبر ہو گئی تھی۔ اس کے آدمی حویلی کے باہر ہی ہمارے منتظر تھے۔ انھوں نے ہمارے گھوڑے لے کر ایک طرف باندھ دیے اور ہمیں بیٹھک میں لے گئے۔ جہاں چودھری نے بڑی شان سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ پچپن چھپن سال کا طویل القامت اور بارعب شخص تھا۔ رسمی کلمات کے بعد اس نے ہماری آمد کا مقصد پوچھا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔

"چودھری، میں کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا۔" میں نے کھڑے کھڑے کہا: "ہم بالے کشمیری اور حنیف ٹنڈے کو لینے آئے ہیں۔ ان دونوں کو ہمارے حوالے کر دیں، باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

"ملک صاحب، تشریف تو رکھیں۔ آپ پہلی دفعہ ہمارے گاؤں آئے ہیں، ہمیں کچھ خدمت کا موقع تو دیں۔"

"چودھری صاحب، آپ ہماری خدمت کر کے خوش نہیں ہوں گے کیونکہ میں خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا۔"

وہ سنجیدہ ہو گیا، بولا: "جن ملزموں کا آپ نے نام لیا ہے ان کا مجھے کوئی علم نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

بیٹھک میں چند اور افراد بھی تھے۔ جن میں سے دو اس کے بیٹے تھے۔

میں نے کہا: "میں حویلی کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔"

"اتنی بڑی بات تو آج تک کسی نے نہیں کی۔" اس کا لہجہ سخت ہوگیا۔ "تلاشیاں تو کمی کمین لوگوں کے گھروں کی لی جاتی ہیں۔ ہم تو عزت دار لوگ ہیں۔"

"قانون سے لڑنے کی کوشش نہ کریں۔" میں نے کہا۔ "اس سے آپ کو نقصان ہوگا۔"

ایک نوجوان، جو چوہدری کے پیچھے کھڑا تھا اور پڑھا لکھا لگتا تھا، بولا۔ "تھانیدار صاحب، آپ نے قانون کی بات کی ہے تو ایک قانون کی بات میری بھی سن لیں۔ آپ عدالت کی اجازت کے بغیر میری حویلی کی تلاشی نہیں لے سکتے۔ عدالت کا حکم لے آئیں، ہم آپ کو تلاشی لینے سے منع نہیں کریں گے۔"

میں نے جیب سے سرچ وارنٹ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔

اس نے بہ غور سرچ وارنٹ کا معائنہ کیا، پھر بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ پوری تیاری کر کے آئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "قانون نافذ کرنے والوں کو خود بھی قانون کا احترام کرنا چاہیے۔"

"اچھا...!" چوہدری جمال دین نے کہا۔ "آپ ذرا صبر کریں۔ میں عورتوں کو ایک طرف کر دوں۔"

اس کے اندر جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ وہ عورتوں کو ایک طرف کرنے کے ساتھ ملزموں کو بھی ایک طرف کرے گا۔ میں نے اے ایس آئی کے کان میں کہا کہ وہ دو آدمیوں کو حویلی کی پچھلی طرف بھیج دے۔

اے ایس آئی بھی وہی بات سوچ رہا تھا جو میرے ذہن میں آئی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے دو منٹ بعد باہر سے فائر کی آواز سنائی دی۔

میں جلدی سے باہر نکلا تو دیکھا کہ اے ایس آئی نے ریوالور ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور ان دو آدمیوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا، جو گلی میں دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ وہ مطلوبہ ملزمان تھے۔

میں نے اپنا گھوڑا کھولا اور ان مفروران کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ ساتھ ہی اے ایس آئی کو آواز دی کہ وہ اپنا گھوڑا لے آئے اور دوسری طرف سے ملزموں کا راستہ روکے۔ گاؤں کا نقشہ پہلے سے ذہن میں محفوظ تھا۔

میں نے دو ہوائی فائر بھی کیے اور ملزموں کو رک جانے کا حکم دیا۔ ایک نے مڑ کر فائر کیا اور اپنے ساتھی کے ہمراہ ایک گلی سے ہوتے ہوئے ایک کھیت میں گھس گیا۔ میں نے کھیت کے قریب پہنچ کر گھوڑے کو روکا اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ وہ ایک کشادہ کھیت تھا جس میں چند

مونگفلی بنے ہوئے تھے۔ مگر ملزمان کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے ایک سپاہی کو جو میرے پیچھے آ رہا تھا، پتا کرنے کے لیے اندر دیا اور خود آگے بڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں گاؤں کے باہر پر تھا۔ آگے گندم کے لہلہاتے کھیت نظر آ رہے تھے۔

پیچھے سے فائرنگ کی چند اور آوازیں آئیں۔ میں واپس مڑنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آواز کی سمت نظر کی تو ملزمان ایک دیوار پھلانگ کر بھاگ رہے تھے۔ وہ بڑی پھرتی سے کھیتوں میں گھس گئے۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ملزموں کو للکارتے ہوئے دو ہوائی فائر کیے۔ جو آدمی مختلف جگہوں میں گاؤں کی نگرانی کر رہے تھے، وہ فائرنگ کی آواز سن کر ہوشیار ہو چکے تھے اور ملزموں کو روکنے کے لیے تیار تھے۔

یہ بلی چوہے کا کھیل بہت جلد ختم ہو گیا اور ہم نے دونوں ملزمان کو گرفتار کر لیا۔

جب ہم واپس روانہ ہوئے تو چوہدری جمال دین گھوڑے پر سوار وہاں پہنچا اور مجھے نوٹوں کی جھلک دکھانے لگا۔ میں نے کہا۔ "چوہدری جمال دین، میں نے تمھیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا۔ اب تم تھانے میں بات کرنا۔ جب ان کی کہانی سنو گے تو تمھارے یہ نوٹ جیب سے باہر نہیں آئیں گے۔"

وہ غصے سے واپس پلٹ گیا۔

•••

تھانے پہنچ کر میں نے دونوں کو الگ الگ بند کر دیا اور آرام کرنے گھر چلا گیا۔ جانے سے پہلے میں نے رات کی ڈیوٹی والوں کے لیے یہ پیغام چھوڑ دیا تھا کہ دونوں ملزمان کو سونے نہ دیا جائے اور ان سے الگ الگ پوچھ گچھ جاری رکھی جائے۔

اگلی صبح میں نے حنیف ٹنڈے کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی اور خاصا مضبوط جوان تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں کسی لڑائی میں کٹ گئی تھیں اور تب سے اس کا نام ٹنڈا پڑ گیا تھا۔ رات بھر جاگنے کے باوجود شست و کاہلی نہیں دیتا تھا۔

میں نے کہا۔ "کیوں بھئی ٹنڈے، کہانی خود ہی سناؤ گے یا میں اگلوانی پڑے گی؟"

اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ "جناب، آپ کے آدمی مجھے ساری رات کہانیاں سناتے رہے ہیں اور میں اپنی کہانی بالکل بھول گیا ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ ایک رات اور آرام کر لو۔" میں نے

ا "تمھارے ساتھ کل بات کریں گے۔"

"حضور، رحم کریں۔ ساری رات اُلو کی طرح جاگتا رہا ہوں۔ ایک رات اور جاگا تو میرا دماغ پلٹ جائے گا۔"

میں نے حوالدار کو بلا کر کہا۔ "اسے قد لمبا کرنے والی ورزش لگا دو اور بالے کشمیری کو لے آؤ۔"

حوالدار اسے دوسرے کمرے میں لے گیا اور اس کے ہاتھ چھت سے لٹکنے والے دو کڑوں میں ڈال کر اتنا اونچا کر دیا کہ اس کے پیر کی انگلیاں بہ مشکل فرش پر ٹکی تھیں۔ اس عرصے میں وہ دھاڑیں مارتا رہا، مگر حوالدار نے کوئی توجہ نہیں دی اور بالے کشمیری کو میرے پاس لے آیا۔

وہ لمبے قد اور گورے رنگ کا خوش شکل نوجوان تھا۔

میں نے پوچھا۔ "بالے، رات کیسی گزری؟"

"سرکار، مجھے تو آپ ایسے ہی پکڑ لائے ہیں۔ میں نے جرم سے توبہ کر لی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "نیاز علی کی گھر والی کا سودا کتنے پیسوں میں ہوا تھا؟"

"میں کچھ نہیں جانتا جی۔ میں بالکل بے گناہ ہوں۔"

"دلدار حسین بھی ہمارا مہمان ہے۔ اس کو بلاؤں؟"

"وہ جھوٹ بکتا ہے جی۔"

ابھی اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور پوچھا۔ "کیا جھوٹ بکتا ہے وہ؟"

تھپڑ سے اسے کوئی خاص اثر نہیں ہوا، بولا۔ "وہ ہم پر جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ ہمیں تو کچھ پتا ہی نہیں۔"

"کون سا جھوٹا الزام؟" میں نے ایک اور تھپڑ مارا۔

"سرکار، سودا اس نے خود کیا اور نام ہمارا لگا دیا۔"

"کس چیز کا سودا؟"

"عورت کا سودا۔"

"تمھیں کیسے پتا چلا کہ اس نے تم پر کسی عورت کے سودے کا الزام لگایا ہے؟"

"بس... سرکار آپ نے خود کہا ہے۔"

میں نے اس کے پیٹ میں گھونسا رسید کیا۔ "میں نے کب کہا ہے کہ تم پر دلدار حسین نے الزام لگایا ہے؟"

سوال جواب کا سلسلہ آدھے پونے گھنٹے تک جاری رہا۔ مگر وہ راستے پر نہیں آیا۔ میں نے اسے ٹنڈے کی جگہ پر بھجوا دیا۔ ورزش ٹنڈے کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ بھی بڑا سخت جان نکلا۔ میں شام تک وقفے وقفے سے پوچھ گچھ کرتا رہا اور اس عرصے میں دونوں کو وعدہ معاف گواہ بنانے کا لالچ دیتا رہا۔

رات کے دس بجے بالا اقبالی بیان دینے پر تیار ہو گیا۔

میں نے اسے اپنے پاس بلایا تو وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

اس نے میرے سوالات کے جواب میں اٹک اٹک کر جو کہانی سنائی، وہ میں اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

•••

بالے نے مجھے بتایا کہ نیاز علی کی بیوی کا قصہ سن کر ٹنڈا بہت خوش ہوا اور دلدار حسین سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ بالے نے کہا کہ اس نے حنیف ٹنڈے کو منع کیا اور کہا۔ "یار، ہمیں چوہدری کی بیوی کے معاملے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ کوئی اور ہی چکر نہ ہو جائے۔"

قارئین، یہ بات ذہن میں رکھیں کہ بالا بیان دیتے وقت اپنی پوزیشن بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

حنیف ٹنڈے نے کہا۔ "بات کرنے میں کیا حرج ہے؟ اگر چوہدری اپنی بیوی کو گھر سے نکالنے پر تلا ہوا ہے تو ہم کیوں نہ فائدہ اٹھائیں۔"

"کیا تم چوہدری کی بیوی کو گھر میں بساؤ گے؟"



"مجھے بھینسیں پالنے کا شوق نہیں ہے۔" ٹنڈے نے کہا: "دو چار مہینے کے بعد لڑکی کو منڈی میں پہنچا دیں گے۔"

آپس میں صلاح مشورے کرنے کے بعد دونوں دلدار حسین کے پاس پہنچے اور کہا کہ وہ چوہدری کی بیوی کا سودا کرنے آئے ہیں۔ دلدار حسین نے ان کی ساری بات سنی اور نیاز علی کو بُلا لایا۔

بالے نے بتایا کہ نیاز علی پہلے تو بات کرنے سے انکار کرتا رہا، پھر دو ہزار پر راضی ہو گیا۔ ٹنڈے نے ایک ہزار پیشگی دیے جس میں سے چار سو روپے چوہدری نے اپنی جیب میں ڈال لیے اور چھ سو روپے دلدار حسین کو دیے۔

دلدار حسین نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ رقم بالے نے دی تھی۔

رقم جیب میں رکھنے کے بعد نیاز علی نے ان سے کہا کہ وہ اگلے روز ساڑھے نو بجے اپنی بیوی کو پرائمری اسکول پہنچا دے گا، دونوں وہاں موجود رہیں اور سواری کا انتظام کر کے آئیں۔

دونوں اگلے روز نو بجے ہی پرائمری اسکول پہنچ کر انتظار کرنے لگے۔ وہ دو گھوڑے بھی ساتھ لائے تھے جنھیں انھوں نے اسکول کے تاریک صحن میں اُگے ہوئے پیڑ کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ وہ زرینہ کو راتوں رات چوہدری کے جمال دین کی حویلی میں پہنچا دیں گے۔

سوا نو بجے دلدار حسین بھی وہاں پہنچ گیا کیوں کہ اسے اپنی بقایا رقم وصول کرنا تھی لیکن بقول بالے حنیف ٹنڈے کی نیّت خراب ہو چکی تھی اور وہ مزید رقم دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

تینوں رات کے دس بجے تک انتظار کرتے رہے۔ مگر نیاز علی کی گھر والی نہیں آئی۔

اگلے روز شمشیر خان کے ڈیرے پر حنیف ٹنڈے نے نیاز علی کا گریبان پکڑ لیا اور اس کی گھر والی کے بارے میں پوچھا۔

"اتنے اوکھے کیوں ہوتے ہو؟" نیاز علی گریبان چھڑاتے ہوئے بولا: "میں نے اپنی گھر والی کو بھیجا تھا، وہ اُدھر سے چکر لگا کر واپس آ گئی۔ وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔"

"بکواس کرتی ہے وہ اور تم بھی۔" حنیف ٹنڈے نے کہا۔ "اگر آج عورت نہ ملی تو ہم تمھارا پیٹ پھاڑ دیں گے۔"

"ایسا کرو، آج تم اسے ہمارے گھر سے اٹھا کر لے جانا۔ میں پچھلا دروازہ کھلا رکھوں گا۔ ہم دونوں برآمدے میں سوتے ہیں۔ وہاں اور کوئی نہیں ہوتا۔ آدھی رات کے بعد آنا۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ مال بھی خرچ کریں اور اٹھا کر بھی لے کے جائیں۔"

"دیکھو، اگر سودا منظور نہ ہو تو رقم واپس لے لو۔"

"رقم اپنے پاس ہی رکھو۔ ہم آدھی رات کے بعد آئیں گے۔ اس دفعہ کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔"

جیساکہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں چوہدری منصب علی نے رات کے دس بجے اپنے مہمان کو رخصت کیا اور دیکھا کہ صحن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے دروازے کو کنڈی لگا دی اور اندر چلا گیا۔ یہ دروازہ نیاز علی نے کھولا تھا اور ساڑھے نو بجے بستر پر لیٹ گیا تھا۔ جب زرینہ ساس کے پیر دبانے کے بعد برآمدے میں آئی تو نیاز علی سو چکا تھا۔

اس رات کئی باتیں ایسی ہوئیں جو بہ ظاہر اتفاقیہ معلوم ہوتی ہیں، لیکن درحقیقت ان میں دستِ قدرت کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ چوہدری منصب علی کے مہمان کا آنا اور چوہدری کی کھلے ہوئے دروازے پر نظر پڑنا، زرینہ کا اپنی ساس کے پیر دبانا اور اس وقت واپس آنا جب نیاز علی سو چکا تھا۔ نیاز علی کا جلدی سو جانا بھی حیرت انگیز تھا۔ اگر وہ جاگ رہا ہوتا تو لازماً زرینہ کو برآمدے میں سونے پر مجبور کرتا۔ پھر زرینہ کا اپنے شوہر سے خوف کھانا اور اندر سونے کے لیے چلے جانا۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن میں نمایاں طور پر قدرت کا ہاتھ نظر آتا ہے۔

قدرت اس مظلوم عورت کو بچانا چاہتی تھی اور ظالم کو اس کے پھیلائے ہوئے پھندے کے ذریعے ہلاک کرنا چاہتی تھی۔

بالے نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا کہ وہ پروگرام کے مطابق آدھی رات کے بعد چوہدری کے دروازے پر پہنچے۔ حنیف ٹنڈے نے جب دروازہ بند دیکھا تو اس کا سر گھوم گیا۔ وہ دیوار پھاند کر اندر داخل ہوا اور دروازہ کھول دیا۔ پھر دونوں برآمدے میں پہنچے اور دیکھا کہ زرینہ کا بستر خالی ہے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ نیاز علی انھیں اُلّو بنا رہا ہے۔ بالے کے بیان کے مطابق ٹنڈے نے خنجر نکالا اور پے در پے وار کر کے نیاز علی کو ہلاک کر دیا۔

میں نے بالے کا یہ بیان نوٹ کیا اور اس پر اس کے دستخط کروا لیے۔ پھر ٹنڈے کو اپنے پاس بُلا لیا اور اسے بالے کے اقبالی بیان کی تفصیل سنائی۔

ٹنڈے کی حالت خاصی خراب ہو رہی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے بالے کو دو چار گالیاں دیں اور قتل کا سارا الزام اس کے سر پر ڈال دیا۔ اس نے بھی وہی تفصیل بتائی جو بالے بتا چکا تھا، تاہم قتل اور عورت کی خریداری کے سلسلے میں ساری ذمے داری بالے پر ڈال دی۔

میں نے اس کا بھی تحریری بیان لے لیا اور اگلے روز دونوں کی نشان دہی پر خنجر اور خون آلود کپڑے برآمد کر لیے۔ یہ کپڑے حنیف ٹنڈے کے تھے، جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ نیاز علی کو اسی نے قتل کیا تھا۔

دلدار حسین اگرچہ قتل میں ملوّث نہیں تھا، تاہم میں نے اسے بھی شاملِ تفتیش رکھا کیونکہ وہ ایک بے گناہ عورت کی خرید و فروخت میں ملوّث پایا گیا تھا۔

شام کے وقت میں تینوں ملزموں کو چوہدری منصب علی کے گھر لے گیا اور بالے سے کہا: "مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تم دونوں کس راستے سے گھر میں داخل ہوئے تھے اور نیاز علی کہاں سویا ہوا تھا؟"

یہ سوال میں نے چوہدری منصب اور دیگر اہلِ خانہ کے سامنے کیا تھا۔ اس سوال کا مقصد یہ تھا کہ میں اس کے بیان کو ڈبل چیک کرنا چاہتا تھا، نیز گھر والوں پر حقیقت کو آشکار کرنا چاہتا تھا۔

بالے نے تفصیل کے ساتھ واردات کا پورا احوال بیان کیا۔ یہ بھی بتایا کہ برآمدے میں کتنی چارپائیاں بچھی تھیں اور ان کی کیا پوزیشن تھی، کئی اور چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بتائیں۔

جب وہ سب کچھ بتا چکا تو چوہدری اور اس کے خاندان کی حالت قابلِ دید تھی۔

میں نے چوہدری سے کہا: "چوہدری صاحب، ان کو پہچانیں! یہ ہیں آپ کے بیٹے کے قاتل۔"

وہ قہر آلود نظروں سے بالے اور حنیف ٹنڈے کو دیکھ رہا تھا۔ دیگر اہلِ خانہ کی بھی عجیب حالت تھی۔

میں نے پوچھا: "کیا آپ یہ نہیں پوچھیں گے کہ انھوں نے کس وجہ سے نیاز علی کو قتل کیا تھا؟"

"ملک صاحب، ان کو یہاں سے لے جائیں اور پھانسی پر لٹکا دیں۔ مجھے ان کی شکلیں دیکھ کر وحشت ہو رہی ہے۔"

عورتیں ایک اندرونی دروازے میں کھڑی تھیں اور ان میں زرینہ کا چہرہ بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

میں نے کہا: "چوہدری صاحب، میرا کام صرف تفتیش کرنا ہے۔ سزا دینا عدالت کا کام ہے، لیکن میں آپ کو یہ ضرور بتاؤں گا کہ اس قتل کے پیچھے کہانی کیا ہے۔"

میں نے اسے تفصیل سے ساری بات بتائی کہ کس طرح نیاز علی اپنی بیوی کو جوئے میں ہارا تھا اور بعد میں اس کا سودا کرتے ہوئے چار سو روپے کمائے تھے اور پھر کس طرح اپنی بے گناہ بیوی کو ان بدمعاشوں کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

"یہ... یہ جھوٹ ہے۔" چوہدرانی نے کہا۔ "میرا بیٹا ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا: "چوہدرانی، کوئی عورت اپنے بیٹے کے متعلق ایسی بات نہیں سن سکتی، لیکن دنیا میں ظلم کرنے والے بھی ماؤں کے بیٹے ہی ہوتے ہیں۔ یہ دلدار حسین جواری ہے۔" میں نے دلدار حسین کی طرف اشارہ کیا۔ "نیاز علی نے اس کے ساتھ جوا کھیلا تھا۔ وہ اس کے پاس اپنی نقدی اور انگوٹھی ہارنے کے بعد بیوی کو بھی ہار گیا۔ یہ بات شمشیر خان کے اڈے پر جانے والا ہر شخص جانتا ہے۔"

چوہدری نے کہا: "ایسی حرکت تو کوئی بے غیرت ہی کر سکتا ہے۔"

"چوہدری صاحب، میں یہ بات نہیں کہنا چاہتا تھا لیکن آپ نے خود ہی کہہ دی ہے۔ میں آپ کے گھر کی پوری کہانی سن چکا ہوں۔ اس ساری تباہی کا سبب وٹے سٹے کی شادی ہے۔ آپ کی بیٹی اپنے خاوند سے لڑ جھگڑ کر گھر آ جاتی تھی اور آپ اس کی باتیں سن کر اپنی بہو پر ظلم کرتے تھے۔ آپ کا بیٹا زرینہ کو گھر میں نہیں رکھنا چاہتا تھا اور یہ بات آپ کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ قتل سے چند روز پہلے اس نے زرینہ کو مار کر گھر سے نکال دیا تھا۔ اگر یہ آپ کی بیٹی کی طرح خود سر ہوتی تو ایک منٹ بھی یہاں نہ رکتی لیکن یہ ڈھائی تین گھنٹے آپ کے دروازے پر بیٹھی روتی رہی۔ پھر محلے والوں کے کہنے پر آپ اسے اندر لے گئے۔ اگر آپ لوگ اس کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے تو کبھی ایسا ظلم نہ کرتے۔ انسان کو قدرت کی گرفت سے ڈرنا چاہیے۔"

ان سب نے خاموشی سے میری باتیں سنیں۔ بولنے کی کچھ گنجائش بھی نہیں تھی کیوں کہ وہ اپنی زیادتیوں کا حال بہ خوبی جانتے تھے۔

یہ کہانی میں نے اپنی ڈاکٹر بھانجی کے اصرار پر لکھی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وٹے سٹے کی شادیوں کی وجہ سے عورتوں پر بڑا ظلم ہوتا ہے اس لیے لوگوں کو اس بُرائی کے بارے میں بار بار بتانا چاہیے۔





سہارے سہارا



سردیوں کے دن تھے اور صبح سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

تھوڑی دیر پہلے ایک جگہ سے جھگڑے کی اطلاع ملی تھی اور میں نے ایک حوالدار کو تفتیش کرنے کے لیے بھیج دیا تھا۔

حوالدار تقریباً ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا اور بولا "جناب اُدھر تو کچھ اور ہی معاملہ ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا معاملہ ہے؟"

"آپ کو یاد ہو گا، چند روز پہلے شیخاں والے محلّے میں ایک بوڑھا آدمی فوت ہو گیا تھا۔ شیخ وزیر علی اس کا نام تھا۔"

شیخ وزیر علی کو میں معمولی سا جانتا تھا۔ خاصا بوڑھا آدمی تھا۔ اس کی عمر اسّی سال سے زیادہ تھی۔ وہ اپنے دروازے کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھا اُونگھتا رہتا تھا۔ ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھا اور اس کی کچھ زمینیں بھی تھیں۔

"وزیر علی کا ایک بیٹا اختر علی ہے۔" حوالدار بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ چالیس پینتالیس سال عمر ہو گی۔ کام واَم کچھ نہیں کرتا، یونہی پھرتا رہتا ہے۔ کبھی اِس کی دُکان پر، کبھی اُس کی دُکان پر اور کبھی کسی کی

بیٹھک میں بیٹھا گپ شپ کرتا رہتا ہے اس کا ایک عورت سے جھگڑا ہو رہا ہے۔ عورت کا نام حسینہ بیگم معلوم ہوا ہے اچھے ناک نقشے کی عورت ہے۔ عمر کوئی چالیس سال کے لگ بھگ ہو گی بس دو سال اِدھر یا دو سال اُدھر۔"

"تفصیل بعد میں سُنانا۔" میں نے کہا "یہ جھگڑا کیا ہے؟"

"جناب! تفصیل تقریباً ختم ہو گئی ہے۔" حوالدار تفصیل بتائے بغیر اصل بات بتانے پر آمادہ نہیں تھا۔ "حسینہ بیگم کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔ یہی کوئی آٹھ نو سال کی ہو گی۔ اس کا نام ملکہ معلوم ہوا ہے۔ اس ملکہ کی ماں حسینہ بیگم کا بیان ہے کہ وہ مرحوم وزیر علی کی بیوہ ہے اور یہ کہ مرحوم نے اپنا گھر اس کے نام لگا دیا تھا لیکن ... مرحوم کے بیٹے اختر علی کا کہنا ہے کہ حسینہ بیگم ان کی ملازمہ تھی اور اس کے اباجی نے اس پر ترس کھا کر اُسے گھر میں رہنے کی جگہ دی تھی۔ اور اب اباجی کی وفات کے بعد اُسے ملازمہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس لیے اُس نے حسینہ بیگم کو فارغ کر دیا ہے یعنی گھر سے نکال دیا ہے۔"

"یہ حسینہ بیگم کہاں کی رہنے والی ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اس کا گھر بار کہاں ہے؟"

"بے سہارا لگتی ہے کہتی ہے اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے گلی میں ایک ٹینچی ایک صندوق اور دو چار بستر ے بھی پڑے ہیں چولہا چوکا کوئی نہیں ہے اگر اُسے رات باہر رہنا پڑا تو وہ پالے میں ٹھٹھر کے مر جائے گی۔ میں نے اختر علی سے بہت کہا کہ بیچاری کو کسی کھولی میں رہنے کی جگہ دے دے مگر وہ نہیں مانا۔ کہتا ہے کہ وہ پہلے ہی بڑی مہلت دے چکا ہے۔"

"اور حسینہ بیگم کا کہنا ہے کہ وہ شیخ وزیر علی کی بیوہ ہے؟"

"کہتی تو یہی ہے پر کوئی ثبوت نہیں ہے اس کے پاس۔"

"محلّے والے کیا کہتے ہیں؟"

"کوئی کھل کر بات نہیں کرتا۔ اختر علی سے ڈرتے ہیں کہتے ہیں کہ وہ کیوں دوسروں کے معاملے میں ٹانگ اڑائیں۔ میں نے حسینہ بیگم سے بہت پوچھا کہ اگر اس کا کوئی چاچا، ماما یا بھانجا بھتیجا ہو تو اس کا پتا بتائے مگر وہ کہتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

"دے دے اس اختر علی کو کوئی دبکا شبکا مارنا تھا۔"

"آپ کے حکم کی دیر ہے جناب۔ دبکا تو میں ایسا لگاؤں گا کہ وہ ساری حیاتی یاد رکھے گا۔ آپ اجازت دیں تو میں چار بندے ساتھ لے جاؤں؟"

معاملہ چونکہ پیچیدہ تھا اس لیے میں نے خود موقع پر جانا مناسب سمجھا۔ اگر حسینہ بیگم کا بیان سچا تھا تو وہ اپنے مرحوم شوہر کے گھر میں رہنے کی حقدار تھی۔

میں حوالدار کے ہمراہ شیخ وزیر علی کے مکان پر پہنچ گیا ... وقت شام کے ساڑھے پانچ بجے تھے اور سُورج غروب ہو ... گلی سردی کی وجہ سے سنسان پڑی تھی۔ دروازے ... جیسا کہ حوالدار نے بتایا تھا ایک صندوق ایک چارپائی ... پڑے تھے۔ پہلی نظر میں مجھے کوئی انسان دکھائی نہیں دیا ... تھوڑی سی حرکت ہوئی اور مجھے دو سَر نظر آئے حسینہ بیگم ... بیٹی ملکہ رضائیوں میں دبکی بیٹھی تھیں۔

"بی بی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں جی ..." عورت روہانسی ہو رہی تھی ... قسمت ہی خراب ہے۔ جدھر جاؤ دھکّے ہی ملتے ہیں میں شیخ ... کی بیوہ ہوں مگر ان کے بیٹے نے مجھے نوکرانی کہہ کر گھر سے نکال ... ہے۔ یہ میری معصوم بچی ہے۔ ہمارا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے کہاں جائیں کس کا دروازہ کھٹکھٹائیں!"

میں نے دیکھا عورت خوش شکل اور سمجھدار تھی — اس کی بچی بھی خوب صورت تھی لیکن اس وقت سہمی ہوئی تھی۔

میں نے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے دوبارہ قدرے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور حسینہ بیگم سے پوچھا "کیا اندر کوئی نہیں ہے؟"

"اختر علی اندر ہی ہو گا۔" حسینہ بیگم نے جواب دیا۔ "تھوڑی دیر پہلے تو اندر ہی تھا۔ میں نے اُسے باہر جاتے نہیں دیکھا۔"

"کیا اس کے بیوی بچے نہیں ہیں؟"

"ابھی تک کنوارا ہے۔ آدارہ گردوں کو کون رشتہ دیتا ہے جب تک اس کی بہنیں یہاں تھیں اس نے مجھے کچھ نہیں کہا لیکن جب بہنیں باپ کا چالیسواں کرنے کے بعد اپنے گھروں کو چلی گئیں تو اس نے مجھ پر بُری نظر رکھنی شروع کر دی۔ دو تین دفعہ زبردستی کرنے کی کوشش بھی کی جب میں نے ماننے سے انکار کر دیا تو اس نے مجھے گھر سے نکال دیا۔"

حوالدار نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز لگائی "اختر علی! دروازہ کھولو نہیں تو ہم دروازہ توڑ دیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی دروازہ تھوڑا سا کھلا اور اختر علی نے اندر سے کہا "کیا بات ہے کیوں شور مچا رہے ہو؟ میں کوئی مجرم نہیں ہوں شریف آدمی ہوں۔ جو کچھ پوچھنا ہو پوچھو اور میری جان چھوڑ دو۔"

اس نے کمبل کی بُکل مار رکھی تھی اور صرف چہرہ نظر آتا تھا وہ بھی جزوی طور پر۔ میں نے دیکھا اس کی تیوری چڑھی ہوئی تھی اور چہرے پر کھردرا پن پایا جاتا تھا۔

"میاں دروازہ تو کھولو۔" حوالدار نے کہا۔ "دیکھتے نہیں تھانیدار صاحب خود چل کر تمہارے دروازے پر آئے ہیں۔"

اس نے تھوڑا سا اور دروازہ کھول دیا بولا۔ "اگر آپ اس عورت کی سفارش کرنے آئے ہیں تو میں آپ سے معافی چاہتا ہوں اباجی نے اسے ملازم رکھا تھا۔ اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اسے اباجی کی وفات کے دوسرے روز ہی کہہ دیا تھا کہ اپنا بندوبست کرے۔"

میں نے کہا۔ "جوان ہمیں اندر تو آنے دو — ہم یہاں سردی میں کھڑے ٹھٹھر رہے ہیں اور تم دروازہ روک کر کھڑے ہو۔"

اس نے لمحہ بھر تامّل کیا، پھر دروازہ کھول کر ایک طرف ہو گیا۔ بولا۔ "آپ اندر بے شک آجائیں مگر فائدہ کچھ نہیں ہو گا۔"

ہم نے کمرے میں قدم رکھا تو خاصی گرماہٹ محسوس ہوئی کیونکہ آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔

"میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔" میں نے اپنا تعارف کرایا۔ "میں اس علاقے کا تھانیدار ہوں معاملہ کیا ہے؟"

اس کے چہرے پر پائی جانے والی تلخی قدرے کم ہو گئی، بولا۔ "معاملہ کچھ بھی نہیں ہے جی۔ آج کل غریب آدمی کو تھوڑا سا سہلا دے دیں تو وہ سر پر ہی سوار ہو جاتا ہے۔ اباجی نے اس عورت کو اپنی خدمت کے لیے رکھا تھا۔ اب وہ فوت ہو گئے ہیں تو یہ گھر کی مالکن بننے کے خواب دیکھنے لگی ہے۔"

"اچھا! یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔" میں نے کہا اور نظر گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔ "خاصا مضبوط مکان ہے۔ اس میں کتنے کمرے ہیں؟"

"آپ کی دُعا سے چھ کمرے ہیں جی۔ اور تمام چھتیں لنٹل کی بنی ہوئی ہیں بس جی یہ اباجی کی ہمت تھی کہ انھوں نے اتنا مضبوط مکان بنوا لیا۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔"

میں اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اگلے کمرے میں چلا گیا اور جاتے ہوئے ہاتھ پیچھے کر کے حوالدار کو اشارہ کر دیا۔

دو تین کمرے دیکھنے کے بعد جب ہم واپس بیٹھک میں آئے تو حسینہ بیگم اپنی بیٹی اور سامان سمیت اندر پہنچ چکی تھی۔

اختر علی تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ "او ئے تمھیں کس ... نے اندر داخل ہونے کی اجازت دی ہے۔ اٹھاؤ یہ اپنا گودڑ اور باہر نکلو۔ لو جی حد ہو گئی۔ دروازہ کھلا دیکھا اور اندر گھس گئی ..."

وہ سامان اٹھا کر باہر پھینکنا چاہتا تھا مگر حوالدار اس کے رستے میں رکاوٹ بن گیا۔ "حوصلہ ... اختر علی حوصلہ۔ قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کرو۔"

اختر علی نے کمبل اُتار کر ایک طرف پھینکا اور غصے سے بولا۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ میں اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہوں۔"

میں نے دیکھا، وہ خاصے مضبوط جسم کا مالک تھا۔

"اوئے کیا نہیں ہو سکتا؟" حوالدار نے سخت لہجے میں کہا۔ "دھمکی کس کو دے رہے ہو؟"

"ملک صاحب! اس کو سمجھائیں۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے کوئی یتیم خانہ نہیں ہے۔"

"شور نہیں کرو۔" میں نے کہا۔ "ساری بات بتاؤ۔"

"کون سی بات؟ یہاں کوئی جھگڑا ہی نہیں ہے۔ میں اس مکان کا وارث ہوں۔ میں اس عورت کو ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

میں نے حسینہ بیگم سے پوچھا۔ "بی بی تم بتاؤ کیا بات ہے؟"

"اس کے باپ نے میرے ساتھ نکاح کیا تھا اور یہ مکان میرے نام لگایا تھا۔ مولوی اللہ بخش نے نکاح پڑھایا تھا آپ مولوی صاحب کو بلا کر پوچھ لیں۔"

"اختر علی! اس بات کا تمھارے پاس کیا جواب ہے؟"

"یہ جھوٹ بکتی ہے جی۔ میرے بوڑھے باپ کا دماغ نہیں چل گیا تھا کہ اسی سال کی عمر میں شادی کرتا۔"

"کوئی بات نہیں، مولوی اللہ بخش کو بُلا کر پوچھ لیتے ہیں۔ ابھی سچ جھوٹ کا پتا چل جائے گا۔"

"او جی! میں کسی مولوی کو نہیں جانتا۔"

حوالدار نے کہا۔ "جانتے نہیں تو جنوا لیں گے۔ مولوی صاحب کا اِدھر مسجد کے ساتھ ہی گھر ہے۔"

میں نے ایک سپاہی کو مولوی صاحب کی طرف بھیجا۔ وہ تھوڑی دیر بعد واپس آگیا اور بتایا کہ مولوی صاحب گھر پر نہیں ملے۔ وہ کہیں کام سے گئے ہوئے تھے اور کل تک ان کی واپسی متوقع تھی۔

اختر علی مستقل شور مچا رہا تھا اور حسینہ بیگم کو گھر سے نکالنے کے درپے ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "اختر علی! اس معاملے کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو اخلاقی پہلو ہے اور دوسرا قانونی پہلو ہے۔ اخلاقی پہلو یہ ہے کہ فی الوقت ان دونوں کے پاس کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ گلی میں رات گزارنا ممکن نہیں۔ تم انھیں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر یہاں رہنے کی اجازت دے سکتے ہو۔ تمھارے پاس کافی سے زیادہ جگہ ہے۔"

"او جی! جگہیں تو اور لوگوں کے پاس بھی بہت سی ہوں گی۔" اس نے ہاتھ جھٹکا۔ "اس گھر میں اس نے بہت دن گزار لیے ہیں اب

کوئی اور دروازہ دیکھے۔ کیا ثواب کمانے کے لیے میں اکیلا ہی رہ گیا ہوں؟"

"تو پھر مجھے قانونی پہلو سے بات کرنی پڑے گی۔ حسینہ بیگم کافی عرصے سے اس گھر میں رہ رہی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ تمھارے باپ نے اس کے ساتھ نکاح کر لیا تھا اور یہ مکان اس کے نام لگا دیا تھا۔ از رُوئے قانون جب تک اس کا یہ دعویٰ جھوٹا ثابت نہیں ہو جاتا تم اس کو اس کے گھر سے بے دخل نہیں کر سکتے۔"

"یہ... یہ کیسا قانون ہے جناب؟ ساری دُنیا جانتی ہے کہ میں شیخ وزیر علی کا بیٹا اور ان کی جائداد کا وارث ہوں۔"

"جائداد میں بیوی کا حق بھی ہوتا ہے، اور اگر یہ ثابت ہو گیا کہ حسینہ بیگم تمھارے باپ کی منکوحہ ہے اور تمھارے باپ نے یہ مکان اس کے نام ہبہ کر دیا تھا تو پھر یہ مکان تمھارے باپ کی متروکہ جائداد میں شمار نہیں ہو گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ایسے ہو سکتا ہے کہ تمھارا باپ اپنی زندگی میں اس مکان کا مالک و مختار تھا، اگر وہ اس مکان کو فروخت کر دیتا تو کیا پھر بھی تم اس کی وراثت کا دعویٰ کرتے؟"

"وہ دوسری بات ہے۔"

"ہبہ کرنا بھی ایسا ہی ہے جیسے فروخت کر دینا۔"

"اگر ایسی کوئی بات ہے تو یہ جا کر عدالت میں ثابت کرے، کوئی کاغذ دکھائے۔ یہ مکان میرا ہے اور اس پر قبضہ بھی میرا ہے۔"

"مقبضہ تم دو دن کا ہے۔ تم یہ بات تسلیم کر چکے ہو کہ یہ عورت اس مکان میں رہ رہی ہے۔"

وہ نرم پڑ گیا۔ مجھے ایک طرف لے جا کر بولا۔ "ملک صاحب آپ مجھے قانونی چکر میں نہ ڈالیں۔ لینے دینے کی بات کریں۔"

"اختر علی! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تم سے پیسے لے کر اس عورت اور اس کی معصوم بچی کو گلی میں پھینک دوں گا تو یہ تمھاری بھول ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے، اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو میں ایک رات اسے یہاں رہنے کی اجازت دے دیتا ہوں اس سے زیادہ نہیں۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور حوالدار کو بھیج کر پڑوس میں رہنے والے تین چار معززین کو بُلا لیا۔ انھوں نے میرے استفسار پر اس بات کا اقرار کیا کہ حسینہ بیگم اور اس کی بیٹی گزشتہ تین چار سال سے اس مکان میں رہ رہی تھیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ حسینہ بیگم مرحوم وزیر علی کی بیوہ ہونے کی دعویدار ہے اور اس بات کی بھی دعویدار ہے کہ مرحوم نے یہ مکان اس کے نام ہبہ کر دیا تھا۔

یہ بات سُن کر وہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

میں نے مزید کہا: "جب تک اس بات کا کوئی تصفیہ نہیں ہو جاتا، حسینہ بیگم اس مکان میں رہے گی۔ اختر علی اسے مکان سے بے دخل نہیں کر سکتا۔ آپ لوگوں کو میں نے اس لیے زحمت دی ہے کہ اس بیوہ عورت کا خیال رکھیں۔ یہ آپ کا دینی اور اخلاقی فرض ہے۔"

اس سارے عرصے میں حسینہ بیگم نظریں جھکائے چُپ بیٹھی رہی۔ اس کی بیٹی ملکہ خوف زدہ نظروں سے ایک ایک شخص کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے ان معززین کی موجودگی میں حسینہ بیگم کا سامان اس کمرے میں رکھوایا اور اختر علی کو محتاط رہنے کی تلقین کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

*

اگلے روز میں نے ایک اے ایس آئی کو حسینہ بیگم کے بارے میں حقائق اکٹھے کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ وہ وزیر علی کے گھر کی خبر بھی رکھے۔

وہ شام تک معاملے کی چھان بین میں مصروف رہا۔ شام کو اس نے جو رپورٹ دی وہ خاصی دلچسپ تھی۔

میں نے پوچھا: "اختر علی نے کوئی شرارت تو نہیں کی؟"

"میں اس سے ملا تھا۔" اے ایس آئی نے جواب دیا۔ "بہت شور مچا رہا تھا۔ حسینہ بیگم نے بتایا ہے کہ وہ اسے کچھ دے دلا کر معاملہ ختم کرنا چاہتا ہے، لیکن میں نے حسینہ بیگم سے کہہ دیا ہے کہ اب معاملہ پولیس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہم سے مشورہ کیے بغیر اختر علی کے ساتھ کوئی سمجھوتا نہ کرے۔"

اے ایس آئی نے جن لوگوں کے حوالے سے حسینہ بیگم کے بارے میں تفصیلات بتائی تھیں اُن میں سے بعض کو میں نے تھانے بُلا کر اور بعض سے خود مل کر بات چیت کی۔ اس کے علاوہ کچھ اور متعلقہ لوگوں سے بھی بات چیت کی۔ ان ملاقاتوں کے نتیجے میں جو واقعات سامنے آئے انھیں میں اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

*

اس قضیے کا آغاز چار سوا چار سال قبل ہوا تھا۔ حسینہ بیگم کے پہلے شوہر کا نام منظور تھا۔ وہ ایک اکھڑ مزاج اور آوارہ قسم کا شخص تھا۔ کوئی کام ٹِک کر نہیں کرتا تھا۔ کبھی کسی کا تانگا چلا لیا، کبھی نان کباب لگا لیے، کبھی چھابڑی لگا کر کوئی سودا بیچ لیا اور کبھی ریلوے اسٹیشن پر مزدوری کر لی۔ وہ جو کچھ کماتا تھا اس میں سے بیشتر رقم باہر ہی اُڑا دیتا تھا۔

حسینہ بیگم کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتا تھا۔ ایک تو اُسے خرچہ پورا نہیں دیتا تھا اور دوسرے مار پٹائی بھی کرتا تھا۔

حسینہ بیگم سے اس کے تین بچے تھے جن میں سے ایک بچہ بچپن میں فوت ہو گیا تھا اور ایک لڑکا گیارہ بارہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگ گیا تھا۔ اس کے بھاگنے کی وجہ باپ کی سختیاں اور تنگ دستی تھی۔ ملکہ بھی منظور کی بیٹی تھی۔

حسینہ بیگم سات آٹھ جماعتیں پڑھی ہوئی تھی اور سلیقہ مند عورت تھی۔ جب اس کے ملنے جُلنے والے منظور کا سلوک دیکھتے تو اُسے کہتے کہ وہ منظور کو چھوڑ کر کیوں نہیں چلی جاتی۔ وہ جواب دیتی: "کہاں جاؤں؟ ماں فوت ہو چکی ہے، باپ غریب ہے۔ بہن بھائی اپنی مصیبتوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ منظور بُرا بھلا جیسا بھی ہے کچھ نہ کچھ کما کر لے ہی آتا ہے۔"

حسینہ بیگم ان صابر شاکر عورتوں میں سے تھی جو تکلیفوں کو اپنا مقدر سمجھ کر حالات سے سمجھوتا کر لیتی ہیں۔

حسینہ نے بتایا کہ ایک روز منظور نے زیادتی کی انتہا کر دی۔ وہ رات کے گیارہ بجے گھر آیا اور اس سے پیسے مانگے۔

حسینہ نے پوچھا: "اس وقت پیسوں کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"ہے کوئی ضرورت۔" منظور نے سختی سے کہا۔ "جلدی سے پچاس روپے نکال دے۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

حسینہ کے پاس مشکل سے دس پندرہ روپے تھے جو اس نے راشن پانی کے لیے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا: "میرے پاس تو پچاس روپے نہیں ہیں۔"

"کہاں جاتی ہے میری کمائی؟" منظور نے آنکھیں نکالیں۔ "اتنا کچھ کما کر لاتا ہوں، کون سے یاروں کو کھلا دیتی ہو؟ جلدی سے نکال پچاس روپے، ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔"

"تجھے میری زبان پر اعتبار نہیں تو خود دیکھ لے۔ ہر چیز کھُلی پڑی ہے۔ اور یہ بُرے سلوک کی دھمکیاں نہ دیا کر مجھے۔ تُو نے میرے ساتھ اچھا سلوک کب کیا ہے جو میں تیرے بُرے سلوک سے ڈروں گی۔"

منظور نے اس کے مُنہ پر زور سے تھپّڑ ملا، بولا: "حرام زادی،



آگے سے زبان چلاتی ہے۔ مار مار کے شکل بگاڑ دوں گا۔ جلدی نکال پیسے۔ میں کوئی خیرات نہیں مانگ رہا۔ اپنی کمائی کے پیسے مانگ رہا ہوں۔"

حسینہ نے ٹین کے پرانے سے ڈبے سے پندرہ روپے نکال کر اس کے سامنے پھینکے۔" یہ سبزی دال کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ یہ بھی لے جا۔ کل کو گھر میں چولہا نہ جلا تو مجھ سے نہ کہنا۔"

"تجھ سے نہیں کہوں گا تو تیرے باپ سے کہوں گا۔ اور یہ کیا، یہ صرف پندرہ روپے ہیں، مجھے پچاس روپے چاہئیں... تو سے پچاس روپے۔ جلدی کر... عزت کا معاملہ ہے۔"

"جوئے کے لیے چاہئیں؟"

"ہاں جوئے کے لیے چاہئیں۔" منظور نے ہٹ دھرمی سے کہا۔" میں پچاس روپے ادھار لے کر ہار گیا ہوں۔ وہ لوگ میری جان کو آئے ہوئے ہیں۔"

"میرے پاس تو یہی کچھ تھا۔"

"میں تیری چالیں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ ایسا کر پڑوسیوں سے جا کر ادھار لے آ۔"

"اس وقت؟ رات کے گیارہ بجے؟"

"جہاں سے بھی کر... مجھے پیسے چاہئیں۔"

"تیرا تو دماغ الٹ گیا ہے۔ میں اس وقت کچھ نہیں کر سکتی۔ صابراں کی ماں کے پہلے ہی بیس روپے دینے ہیں۔"

منظور نے پندرہ روپے اٹھا کر جیب میں ڈال لیے اور سر کھجاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد بولا۔" تیرے پاس جو سونے کی بالیاں تھیں، وہ کہاں ہیں؟"

یہ سن کر حسینہ کا دل بیٹھ گیا۔ اس کے پاس جو تھوڑا بہت زیور تھا وہ پہلے ہی بک گیا تھا۔ صرف بالیوں کا جوڑا بچا تھا۔ یہ بالیاں وہ اپنے جہیز میں ساتھ لائی تھی۔

"بالیاں تو میں کبھی نہیں دوں گی۔" اس نے کہا۔" ان بالیوں پر تیرا کوئی حق نہیں ہے۔"

"حق کیوں نہیں ہے؟ میں تجھے اپنی کمائی کھلاتا ہوں۔ اگر تیری بالیاں میری عزت بچانے کے کام آ گئیں تو کوئی آفت نہیں آ جائے گی، اور بن جائیں گی..."

"کچھ بھی ہو، میں اپنی بالیاں نہیں دوں گی۔ بے شک جان سے مار دے..."

"تیرا باپ بھی دے گا بالیاں۔ تو کیا چیز ہے۔"

"نہیں... ہرگز نہیں..."

منظور نے اُسے لاتوں اور تھپڑوں سے مارنا شروع کر دیا۔ حسینہ نے چیخ و پکار شروع کر دی۔ اس کی بیٹی ملکہ بھی جاگ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔

رونے پیٹنے کی آوازیں سن کر پڑوسی اکٹھے ہو گئے۔ منظور او باش آدمی تھا اور کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اس نے پڑوسیوں کے سامنے کہا۔" آخری بار کہہ رہا ہوں۔ اگر تو نے پانچ منٹ کے اندر بالیاں میرے حوالے نہ کیں تو تجھے تین طلاق۔"

طلاق کا نام سن کر حسینہ گھبرا گئی اور جلدی جلدی بالیاں تلاش کرنے لگی۔ اتفاق کی بات کہ گھبراہٹ اور ہنگامے کی وجہ سے حسینہ وہ جگہ بھول گئی جہاں اس نے بالیاں چھپا کر رکھی ہوئی تھیں۔ اب اُسے بالیاں تلاش کرتے ہوئے دس منٹ گزر گئے تو ایک بوڑھے پڑوسی نے بڑے وثوق سے کہا۔" بی بی! اب بالیاں تلاش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ منظور نے طلاق کے لیے پانچ منٹ کی شرط لگائی تھی اور دس منٹ سے اوپر ہو چکے ہیں۔ تمہیں اب طلاق ہو چکی ہے۔ اب یہ تمہارا خاوند نہیں رہا۔ تم اس کے لیے حرام ہو گئی ہے۔"

دیگر افراد بھی بوڑھے کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

حسینہ رونے لگی، بولی۔" پتا نہیں، بالیاں کہاں چلی گئیں۔ میں نے کسی مسالے کے ڈبے میں رکھی تھیں۔"

ایک دوسرے پڑوسی نے کہا۔" اللہ کو یہی منظور تھا۔"

ایک ہمدرد قسم کے پڑوسی نے کہا۔" او بھئی! اتنی جلدی فیصلہ نہیں کرو۔ مولوی صاحب سے مشورہ کر لو۔"

ایک پڑھے لکھے شخص نے منظور سے پوچھا۔" میاں تمہاری کیا مرضی ہے؟"

منظور بڑے غصّے میں تھا، بولا۔" میں مردوں والی بات کرتا ہوں۔ جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ یہ عورت میرے گھر میں رہنے کے قابل ہی نہیں ہے۔"

ہمدرد پڑوسی نے کہا۔" پھر بھی مولوی صاحب سے فتویٰ لے لینا چاہیے۔ شرع کے معاملے میں کوئی شک شبہ نہیں رہنا چاہیے۔"

سب نے طے کیا کہ صبح کو یہ معاملہ مولوی صاحب کے سامنے رکھا جائے گا۔ حسینہ بیگم لوگوں کی منتیں کرتی رہی مگر کسی نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ سب یہی کہتے رہے کہ اب فیصلہ مولوی صاحب کے فتوے سے ہوگا۔

پڑوسیوں کے جانے کے بعد منظور اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگا اور دو منٹ کے بعد بالیاں اس کے ہاتھ لگ گئیں۔ اس نے بالیاں جیب میں ڈالیں اور گھر سے نکل گیا۔

حسینہ ساری رات روتی رہی۔

اگلی صبح چند پڑوسی مولوی اللہ بخش کو لے کر اس کے بوسیدہ

سے مکان میں پہنچ گئے۔

اس وقت منظور کا غصہ دُور ہو چکا تھا۔ اور وہ اپنی رات والی حرکت پر ندامت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مولوی صاحب کے استفسار پر کہا کہ رات کو وہ اپنے ہوش میں نہیں تھا اور نہ جانے غصے کی حالت میں کیا کچھ بکتا رہا۔

مولوی اللہ بخش نے پوچھا "کیا تم نشے میں تھے؟"

منظور نے نفی میں سر ہلایا "نشے میں نہیں تھا۔"

"کیا تم سُکر کی حالت میں تھے؟"

"سُکر!" منظور نے حیرانی سے کہا "سُکر کیا ہوتا ہے؟"

"سُکر ایسی حالت کو کہتے ہیں جس میں بندے کو یہ ہوش نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔"

"شاید... میں سُکر کی حالت میں ہی تھا۔" منظور نے اپنی غلطی کے بد نتائج سے بچنے کی کوشش کی۔

مولوی صاحب نے چالاکی سے پوچھا "بات کہاں سے شروع ہوئی تھی؟"

"مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔ میں نے اس سے پیسے مانگے تو اس نے پندرہ روپے نکال کر میرے مُنہ پر مارے۔ حالاں کہ مجھے پچاس روپے کی ضرورت تھی۔ میں نے کہا اگر پیسے نہیں ہیں تو اپنی بالیاں دے دو۔ میں انھیں کہیں گروی رکھ کر پیسوں کا بندوبست کروں گا مگر اس نے بالیاں دینے سے انکار کر دیا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہونا تھا۔ میں نے غصے سے کہا کہ پانچ منٹ کے اندر بالیاں میرے حوالے کر دو۔ ورنہ..."

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ تین طلاق۔" بوڑھے پڑوسی نے لقمہ دیا۔

"کیا یہ سچ ہے؟" مولوی صاحب نے پوچھا "تم نے یہی الفاظ استعمال کیے تھے؟"

"الفاظ تو یہی تھے مگر اس وقت میں سُکارا کی حالت میں تھا۔" منظور نے سُکارا کا سہارا لیا۔

مولوی صاحب نے ترس کھانے والے انداز میں سر ہلایا۔ "اسے سُکارا کی حالت نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ تم جو کچھ کہہ رہے تھے، اس کا مطلب بخوبی جانتے تھے۔" پھر انھوں نے حسینہ بیگم سے پوچھا "کیا تمھارے شوہر نے یہ کہا تھا کہ اگر تم نے پانچ منٹ کے اندر اُسے بالیاں نہ دیں تو تمھیں تین طلاق ہو جائیں گی؟"

حسینہ نے اثبات میں سر ہلایا، بولی "کہا تو تھا، مگر اس وقت یہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔"

مولوی صاحب نے اس کے جواز کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا "کیا تم نے پانچ منٹ کے اندر بالیاں اس کے حوالے کر دی تھیں؟"

"میں بالیاں کہیں رکھ کر بھول گئی تھی۔"

"یہ جھوٹ بولتی ہے۔" منظور نے حماقت میں اپنے خلاف بیان دیا۔ "اس کی بالیاں دینے کی مرضی نہیں تھی۔"

"فیصلہ ہو گیا۔" مولوی صاحب اٹھتے ہوئے بولے "حسینہ کو تمھیں تین طلاقیں ہو چکی ہیں۔ اب تم منظور کے لیے حرام ہو چکی ہو۔"

"مولوی صاحب! یہ لوگوں کے جانے کے بعد بالیاں نکال کر لے گیا تھا۔" حسینہ بیگم نے کہا "خدا کے لیے اتنی جلدی فیصلہ نہ کرو۔ میں برباد ہو جاؤں گی۔ میرے پاس کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔"

"اب تجھے میری قدر معلوم ہو گی۔" منظور نے غصے سے کہا۔ پھر مولوی صاحب سے بولا "مولوی صاحب! یہ عورت کسی رو رعایت کے لائق تو نہیں ہے پر مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ میں اس کے ساتھ دوبارہ نکاح پڑھوانے کے لیے تیار ہوں کوئی راستہ نکالیں۔"

"اب تم حلالہ کے بغیر اس سے نکاح نہیں کر سکتے۔"

"چلیں جی! حلالہ بھی کر لیں گے۔" منظور نے کہا "کیا کوئی صدقہ ذد قہ دینا پڑے گا؟"

"اس کی کسی اور شخص کے ساتھ شادی ہو گی۔ جب وہ شخص اسے طلاق دے دے گا تو پھر تم اس سے دوبارہ نکاح کر سکو گے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

بوڑھے پڑوسی نے کہا "میاں! شرع کے معاملے میں جرح نہیں کرنی چاہیے۔ یہ سب کچھ مُنہ کھولنے سے پہلے سوچنا تھا۔"

حسینہ بیگم نے پوچھا "مولوی صاحب! اب میرا کیا ہو گا؟ میں کہاں جاؤں گی؟"

مولوی صاحب جاتے جاتے دروازے میں رُکے، بولے "تم اب اس شخص کے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتیں شام کو میرے پاس آ جانا۔ میں تمھارے لیے کوئی راستہ نکالتا ہوں۔"

مولوی صاحب اور پڑوسیوں کے جانے کے بعد منظور نے کہا "مجھے مولوی صاحب کا فیصلہ منظور نہیں ہے۔ تین لفظ کیا مُنہ سے نکل گئے سارا کھیل ہی چوپٹ ہو گیا۔ جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ۔ ہم اب بھی میاں بیوی ہیں...!"

"نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔" حسینہ نے کہا "مولوی صاحب محلّے والوں کے سامنے فتویٰ دے چکے ہیں۔ اگر ہم میاں بیوی کی طرح رہے تو لوگ لعن طعن کریں گے۔ میں یہ گناہ نہیں کر سکتی۔"

"تو پھر وہ... کیا کہا تھا مولوی صاحب نے کہ... وہ حلوہ کہ حلاوہ کرنا پڑے گا۔"

حسینہ کچھ نہیں بولی! اسے تو اس بات کی اُمید ہی نہیں تھی کہ کوئی شخص اس کے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہو جائے گا۔

شام کو وہ مولوی صاحب کے گھر گئی۔ مولوی صاحب اسے شیخ صاحب کے پاس لے گئے کیوں کہ وزیر علی کو کسی خادمہ کی ضرورت تھی۔ وہ اکثر یہ شکایت کرتا رہتا تھا کہ اولاد اس کی پروا نہیں کرتی۔ اُن دنوں اس کی چھوٹی بیٹی بھی ساتھ رہتی تھی۔ بیٹا تو ویسے ہی آوارہ تھا، بیٹی بھی خیال نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے بچّوں کے معاملات میں اُلجھی رہتی تھی اس کا شوہر ائیر فورس میں کمیشنڈ آفیسر تھا اور ان دنوں پشاور میں ہوتا تھا۔

مولوی صاحب نے رسمی کلمات کے بعد کہا "شیخ صاحب! آپ کے لیے ایک خادمہ لایا ہوں۔ اس کا نام حسینہ بیگم ہے اور یہ اپنی بیٹی ملکہ ہے۔ بے سہارا عورت ہے۔ اِدھر کسی کونے میں پڑی رہے گی اور دن رات آپ کی خدمت کرے گی۔"

بوڑھا وزیر علی یہ سُن کر خوش ہوا۔ اسے بھی کسی ایسی ہی خادمہ کی ضرورت تھی جو ہر وقت گھر میں موجود رہے۔ اس نے دیکھا کہ عورت اچھی شکل کی تھی اور سلیقے والی بھی لگتی تھی۔

اس نے پوچھا "بی بی! تنخواہ کتنی لو گی؟"

"صاحب! مجھے تنخواہ نہیں کسی آسرے کی ضرورت ہے۔ دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کا ٹھکانا مل جائے تو بہت ہے۔"

"اچھا! تمھارا گھر بار کہاں ہے؟"

"اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے جی۔" مولوی اللہ بخش نے کہا "اس کے خاوند نے اسے طلاق دے دی ہے اب پچھتا رہا ہے۔ دوبارہ اس کو گھر میں بسانا چاہتا ہے۔"

"کیا غصّے میں طلاق دی تھی؟"

حسینہ بیگم نے طلاق کا سارا واقعہ سنا دیا۔

مولوی صاحب نے کہا "اب حلالہ کے بغیر یہ منظور کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتی۔ ویسے میں خیال رکھوں گا۔ شاید کوئی اللہ کا بندہ ایسا مل جائے۔"

وزیر علی یہ سُن کر سوچ میں پڑ گیا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے اپنی بیٹی ممتاز کو بُلایا، اسے حسینہ بیگم کا احوال بتایا اور کہا "آج سے یہ ہمارے گھر میں رہے گی اور گھر کے سارے کام کرے گی۔"

ممتاز نے حسینہ کو دیکھ کر تیوری چڑھائی، بولی "نہیں کام والی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ آپ نے خواہ مخواہ اسے رکھ لیا۔ کھانا میں خود پکا لیتی ہوں۔ صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے مائی رکھی ہوئی ہے۔ یہ کون سا کام کرے گی؟"

"مجھے معلوم تھا کہ تم یہی کہو گی۔" وزیر علی نے برہمی سے کہا "گھر کی صفائی بھی ہو جاتی ہے اور کھانا بھی پک جاتا ہے لیکن مجھے کوئی نہیں پوچھتا۔ اختر آوارہ گردی کرتا رہتا ہے تم اپنے بچّوں میں لگی رہتی ہو۔ میرا کام کوئی نہیں کرتا۔"

"آپ کو دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے، پانی میز پر رکھا رہتا ہے اور کیا چاہیے آپ کو؟"

"میں بڈھا اور ناکارہ جو ہو گیا ہوں۔" وزیر علی غصے میں آ گیا "مجھے دو وقت کی روٹی اور چار گلاس پانی کے سوا اور کیا چاہیے۔ اتنا تو دروازے پر پڑے ہوئے فقیر کو بھی مل جاتا ہے۔ اب اس بڈھے کی یہ اوقات رہ گئی ہے۔"

"بس ہو گئے شروع بولنا۔" ممتاز بھی غصے سے بولی "آپ کی یہ باتیں ہمیں اچھی نہیں لگتیں۔ یہ عورت یہاں رہے گی تو اس کو کھانا پینا اور کپڑا لتا بھی دینا پڑے گا۔ اور ساتھ یہ دم چھلا بھی ہے۔" اس نے ملکہ کی طرف اشارہ کیا۔ "ان کا خرچہ کون برداشت کرے گا؟"

"میں برداشت کروں گا، اور کون برداشت کرے گا۔ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ زمین کی آمدنی بھی ہے۔ پنشن بھی ملتی ہے۔ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے مجھے اولاد کا محتاج نہیں بنایا۔"

مولوی صاحب نے ممتاز سے کہا "بیٹی، بوڑھے باپ کے ساتھ اونچی آواز میں بات نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ ناراض ہوتا ہے۔"

"آپ رہنے دیں جی، آپ کو ہمارے معاملات کا علم نہیں ہے۔ ابا جی ہر شخص سے... ہماری برائیاں کرتے ہیں۔ ہم کیسے نہ اونچی آواز میں بولیں۔ اور آپ کو کیا ضرورت تھی اس عورت کو یہاں لانے کی۔ ابا جی تو یہی چاہتے ہیں کہ مرنے سے پہلے اپنی ساری جمع پونجی لوگوں میں بانٹ دیں۔"

"یہ... یہ میری محنت کا پیسہ ہے۔" وزیر علی کی آواز کانپنے لگی "میں... تم جیسے ناشکروں کے لیے کچھ چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ تم لوگ اس بڑھاپے میں میری مٹی پلید کر رہے ہو۔ نہ وقت پر کھانا ملتا ہے، نہ کوئی اور کام ہوتا ہے۔ ایک گلاس پانی کے لیے دس دفعہ آواز دینی پڑتی ہے۔ کھانا دے کر بھول جاتے ہو کہ بعد میں برتن بھی اٹھانے ہیں۔ دن بھر گندے برتنوں پر مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں۔ ایک رومال دھلوانا ہو تو سو منتیں کرنی پڑتی ہیں۔ بیمار ہو جاؤں تو کوئی پاس نہیں پھٹکتا۔ دوا پھینک کر چلے جاتے ہو۔ ہر وقت اسی فکر میں رہتے ہو کہ کب بڈھا مرے اور کب تم لوگوں کی جان چھوٹے..."

"ہاں یہی چاہتے ہیں ہم۔" ممتاز نے سختی سے جواب دیا۔ "سارے گھر کے لیے عذاب بنے ہوئے ہیں آپ۔ مر جائیں گے تو آپ کی مصیبتیں بھی ختم ہو جائیں گی اور ہماری بھی..."

"لاحول ولا..." مولوی صاحب نے بے اختیار کہا۔ "انا للہ... قیامت بہت قریب معلوم ہوتی ہے..."

"اونہہ..." ممتاز نے سر جھٹکا "آپ لوگ ذرا سی بات پر قیامت کو آوازیں دینے لگتے ہیں۔ اگر کبھی قیامت آئی تو آپ لوگوں کی وجہ سے آئے گی۔"

مولوی صاحب اس قیامت کی باتیں سن کر چلے گئے تو وزیر علی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "بی بی، تم آج سے کام شروع کر دو۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ یہاں میرے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ مجھے تمھاری ضرورت ہے۔ ان لوگوں کی بالکل پروا نہ کرو۔ سب کچھ میرا ہے۔ یہ گھر بھی میرا ہے اور اس کا سامان بھی میرا۔ اگر کسی نے میرے معاملات میں روک ٹوک کی تو میں پولیس کو بلا لوں گا۔ تمھاری رہائش ادھر کونے والے کمرے میں ہو گی۔"

حسینہ بیگم نے کہا "صاحب جی، میں آپ کے گھر میں جھگڑا نہیں ڈالنا چاہتی۔ اللہ میرا کہیں اور بندوبست کر دے گا۔"

"اللہ نے تمھارا یہی بندوبست کر دیا ہے اور میرا بھی۔ ان لوگوں کی فکر مت کرو۔ میں ان لوگوں سے نمٹنا خوب جانتا ہوں۔"

اس نے حسینہ بیگم کے لیے سونے والا کمرا کھول دیا اور اپنی نگرانی میں وہاں دو چارپائیاں اور بستر بھی رکھوا دیے۔

رات کو اختر علی گھر آیا تو ممتاز نے اسے بتا دیا کہ ابا جی نے ایک عورت اور اس کی بیٹی کو گھر میں ڈال لیا ہے۔

اختر علی نے دیکھا کہ گھر میں ہر شے صفائی اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ باورچی خانے میں گندے برتنوں کا ڈھیر بھی نہیں تھا۔ مگر وہ ان چیزوں کو نظر انداز کرتے ہوئے باپ کے کمرے میں پہنچا اور نہایت بے ہودگی سے کہا "ابا جی! میں نے سنا ہے کہ آپ نے کوئی عورت گھر میں ڈال لی ہے۔"

"کام کے لیے خادمہ رکھی ہے۔" وزیر علی نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے جواب دیا "بے سہارا عورت ہے۔ ادھر ہی رہے گی۔"

"آپ کو پوچھ تو لینا چاہیے تھا۔ پتا نہیں آپ نے کس آوارہ عورت کو رکھ لیا ہے۔"

"وہ آوارہ نہیں، شریف عورت ہے۔ اور تم خود کیا ہو؟ آدھی رات تک آوارگی کر کے گھر آ جاتے ہو۔"

"آپ تو ہمیشہ الٹی بات کرتے ہیں۔"

"شاباش بیٹا، شاباش! اگر میں الٹی باتیں کرنے والا ہوتا تو آج یہ گھر بار اور ساز و سامان یہاں نظر نہ آتا۔"

"پر اس عورت کو رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ گھر کے کام تو چل ہی رہے تھے۔ اب اسے روٹی کپڑے کے علاوہ تنخواہ بھی دینی پڑے گی۔"

"تم لوگوں کو ساری پریشانی پیسوں کی ہے۔ یہ ہے اصل بات۔ لیکن یہ میرے پیسے ہیں، میری محنت کی کمائی ہے۔ اگر مجھے اس بڑھاپے میں آرام نہ ملا تو لعنت ہے ایسے پیسے پر۔"

"آپ تو ہر وقت ایک ہی بات رٹتے رہتے ہیں۔ آخر آپ کو تکلیف کیا ہے؟ دو وقت کی روٹی آرام سے بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے۔ اور کیا چاہیے آپ کو؟"

"وہ بھی یہی کہتی ہے، تم بھی یہی کہتے ہو۔ جب تم اس عمر میں پہنچو گے تب تمھیں پتا چلے گا کہ ایک بوڑھے آدمی کے کتنے مسائل اور کتنے کام ہوتے ہیں۔ تمھیں تو کبھی یہ بھی توفیق نہیں ہوئی کہ دو گھڑی میرے پاس بیٹھ کر دکھ سکھ کی چار باتیں سن لو۔"

"آپ ساری عمر یہی رونا روتے رہیں گے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہر وقت یہاں بیٹھ کر آپ کی شکایتیں یا جوانی کے قصے سنتا رہوں۔ اگر آپ نے اس عورت کو اس لیے رکھا ہے کہ وہ آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کی کہانیاں سنتی رہے تو یہ بات ہمیں پسند نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اس کی چھٹی کر دیں۔"

وزیر علی ایک دم غصے میں آ گیا "زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمھاری چھٹی کیوں نہ کر دوں؟ نہ تم کوئی کام کرتے ہو، نہ میری خدمت کرتے ہو۔ پڑے مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہو اور صبح و شام اپنی بے ہودگیوں سے مجھے تکلیف پہنچاتے ہو۔ میں محلے کے دس آدمی اکٹھے کر کے تمھارے کرتوت ان کے سامنے رکھوں گا اور ان سے پوچھوں گا کہ ایسی ناخلف اولاد کو گھر سے نکال دینا چاہیے یا رکھنا چاہیے؟"

اختر علی یہ سن کر قدرے دب گیا۔ اسے سب سے زیادہ ڈر اس بات کا تھا کہ کہیں اس کا باپ اسے جائداد سے عاق کر کے گھر سے نہ نکال دے۔ وہ باپ کی موت کے انتظار میں تھا کہ کب بوڑھا باپ اللہ کو پیارا ہو اور کب اسے جائداد پر گلچھرے اڑانے کا موقع ملے۔

حسینہ بیگم نے چند روز کے اندر گھر کے سارے کام سنبھال لیے۔ اگرچہ وزیر علی کی اولاد اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی تھی مگر اس نے اس بات کی زیادہ پروا نہیں کی کیوں کہ وہ اپنے شوہر کے ہاتھوں اس سے بھی زیادہ تکلیفیں برداشت کر چکی تھی۔ وہاں اسے روٹی کپڑے کی کوئی تنگی نہیں تھی۔

چند ہفتوں کے بعد اختر علی اور ممتاز کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک ہو گیا کیوں کہ وہ اس کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔

حسینہ نے گھر کا ہر کام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ممتاز کو کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے دو بچوں کی دیکھ بھال بھی حسینہ ہی کرتی تھی۔

اختر علی گھر آتا تو اسے اپنا کمرا صاف ستھرا ملتا اور ایک اشارے پر گرم کھانا حاضر ملتا۔ کپڑے دھلے دھلائے اور استری کیے ہوئے مل جاتے۔

بالآخر دونوں بہن بھائی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کے ابا نے حسینہ کو ملازم رکھ کر کوئی غلط نہیں کیا تھا۔

*

شیخ وزیر علی کے چند پرانے دوست تھے جو کبھی کبھار اس سے ملنے آ جاتے تھے۔ ان دوستوں میں ایک بوڑھا ریٹائرڈ میاں علی نواز بھی تھا۔ اس کی وزیر علی سے پرانی بے تکلفی تھی اور ایک دوسرے کے ساتھ مذاق بھی چلتا تھا۔

وزیر علی اسے حسینہ بیگم کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا۔ میاں علی نواز یہ بھی سن چکا تھا کہ حسینہ کا سابق شوہر اسے دوبارہ اپنے نکاح میں لانا چاہتا تھا اور اس کے لیے حلالہ کی ضرورت تھی۔

ایک شام دونوں بوڑھے دوست بیٹھک میں بیٹھے جوانی کی یادیں تازہ کر رہے تھے کہ حسینہ بیگم ان کے لیے چائے بنا کر لائی۔ وہ سفید شلوار قمیص میں ملبوس تھی اور سر پر سفید ہی دوپٹا تھا۔ اس نے چائے کی ٹرے میز پر رکھی اور بولی "صاحب جی، کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے دیں۔"

"ابھی تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔"

"صاحب جی، کھانا بھی تیار ہے۔" حسینہ نے کہا "اگر میاں صاحب نے بھی کھانا ہو تو دو روٹیاں زیادہ پکا لوں..."

"ہاں، پکا لو پکا لو... میاں صاحب بھی کھانا کھائیں گے۔"

حسینہ کے جانے کے بعد علی نواز نے دھیمی آواز میں کہا "یار وزیر علی، تیرا تو بڑھاپا سنور گیا۔ ایسی خدمت گزار عورت تو کسی کسی کو ملتی ہے۔"

"یہ تو تم سچ کہتے ہو۔ جب سے یہ عورت آئی ہے میرے سارے مسئلے حل ہو گئے ہیں۔ وقت پر گرم کھانا... صاف کپڑے... کمرے میں صفائی... ذرا سی ٹھنڈ ہو جائے تو نہانے کے لیے گرم پانی رکھ دیتی ہے۔ طبیعت خراب ہو جائے تو فوراً ڈاکٹر کو بلا لاتی ہے... بڑی خدمت گزار عورت ہے۔"

"لیکن میں نے سنا ہے کہ مولوی صاحب اس کے لیے کوئی بر تلاش کر رہے ہیں۔ کوئی ملا حلالہ کا چکر ہے۔ وہ منظور بھی مولوی صاحب سے ملتا رہتا ہے..."

وزیر علی کو یہ بات ہمیشہ فکر مند رکھتی تھی۔ وہ سوچتا کہ اگر حسینہ چلی گئی تو پھر مشکلات کا دور شروع ہو جائے گا۔

"حسینہ اب دوسری شادی نہیں کرے گی..." اس نے کہا "وہ کئی بار یہ بات کہہ چکی ہے۔"

"وزیر علی، حسینہ حیادار عورت ہے۔ اپنے منہ سے کیسے دوسری شادی کی بات کرے گی۔ کسی دن تم منہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔"

"تمھارا مطلب کیا ہے علی نواز؟"

میاں علی نواز نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "اگر میں تمہاری جگہ پر ہوتا تو حسینہ سے نکاح پڑھوا لیتا۔"

وزیر علی چونک کر پیچھے ہٹا، جیسے علی نواز نے اسے سوئی چبھو دی ہو۔ "کیسی بات کر رہے ہو؟ اس بڑھاپے میں، میں شادی کروں گا! میری اولاد تو پہلے ہی موقع کی تلاش میں ہے۔ پھر حسینہ بیگم کی عمر دیکھو اور میری دیکھو۔ اور میں نے سُنا ہے کہ اس کا وہ منظور بھی اِدھر منڈلاتا رہتا ہے۔"

"اولاد کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ چپ چاپ نکاح پڑھوا لو۔ حسینہ تو تمہارے گھر میں ہی رہ رہی ہے اور منظور کی فکر نہیں کرو۔ اس سے میں بات کر لوں گا۔"

"اور حسینہ سے کون بات کرے گا؟"

"اس سے بھی بات ہو جائے گی۔"

وزیر علی کو یہ تجویز کچھ معقول سی معلوم ہوئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "میاں علی نواز! اصل مسئلہ تو حلالہ کا ہے۔ اگر شادی کے چار دِن بعد حسینہ یا منظور طلاق کے لیے اصرار کرنے لگے تو پھر کیا ہوگا؟"

میاں علی نواز ہولے ہولے سر ہلانے لگا۔ بولا۔ "یہ مسئلہ تو ہے۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ایک طویل توقف کے بعد اس نے وزیر علی کے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔ "حل ہو گیا مسئلہ۔ تم ایسا کرو کہ حق مہر میں یہ مکان حسینہ کے نام کر دو۔ اور شرط یہ رکھ دو کہ طلاق یا خلع کی صورت میں حسینہ مکان کی حقدار نہیں ہوگی۔"

"منظور اس بات پہ راضی ہو جائے گا؟"

"اس کے راضی یا نہ راضی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن پھر بھی ہم اس سے بات کر لیں گے۔ اگر اس نے اڑی تڑی کی تو پیسوں سے اس کا منہ بند کر دیں گے۔"

"دیکھ لو... آخری عمر میں کہیں مٹی خراب نہ ہو جائے۔"

"مٹی کیوں خراب ہوگی۔ سارا کام شرع کے مطابق کریں گے۔"

*

میاں علی نواز نے منظور اور مولوی اللہ بخش سے الگ الگ بات کر کے دونوں کو ہموار کر لیا۔ ابتدائی بات چیت کے دوران اس نے وزیر علی کا ذکر نہیں کیا۔ صرف یہ کہا کہ اس نے ایک عمر رسیدہ آدمی کو شادی پر راضی کیا ہے۔

ایک روز اس نے مولوی اللہ بخش اور منظور کو حتمی بات طے کرنے کے لیے اپنے گھر بلایا۔ شیخ وزیر علی پہلے سے وہاں موجود تھا۔ رسمی بات چیت کے بعد میاں علی نواز نے بیٹھک کے دروازے بند کر دیے اور اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "مولوی صاحب! میں نے جس شخص کا ذکر کیا تھا، وہ یہی میرے دوست شیخ صاحب ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ حسینہ بیگم ان کے گھر میں کام کر رہی ہے اور یہاں اُسے ہر طرح کی آسائش حاصل ہے۔"

یہ بات سُن کر مولوی اللہ بخش بھی حیران ہوئے اور منظور بھی حیران ہوا۔

مولوی اللہ بخش نے کہا۔ "شیخ صاحب! آپ اس عمر میں شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

وزیر علی خاموش رہا۔ میاں علی نواز نے کہا۔ "مولوی صاحب، آپ ماشاءاللہ فقہ کے عالم ہیں، یہ بتائیں کہ کیا شادی کے لیے عمر کی کوئی قید یا پابندی ہے؟"

"پابندی تو نہیں ہے۔"

"تو پھر اس بات کو چھوڑیں۔ اگلی بات کریں۔ میں نے شیخ صاحب کو بڑی مشکل سے اس نیک کام پر راضی کیا ہے۔"

منظور نے کہا۔ "شیخ صاحب کے بچے راضی ہو جائیں گے؟"

"ان سے یہ معاملہ خفیہ رکھا جائے گا۔" میاں علی نواز نے کہا۔ "حسینہ بیگم پہلے ہی شیخ صاحب کے گھر میں رہتی ہے۔ چار گواہوں کی موجودگی میں مولوی صاحب نکاح پڑھا دیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔"

منظور نے پوچھا۔ "اور وہ... کیا کہتے ہیں حلالہ؟"

"وہی تو ہے یہ۔" میاں علی نواز نے کہا۔ "لیکن اس میں طلاق کی شرط نہیں ہوتی۔ ایسی شرط رکھنا گناہ ہے۔ کیوں جی، مولوی صاحب! میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"ہرگز نہیں... ہرگز نہیں۔ یہ شیخ صاحب کی مرضی پر منحصر ہے کہ طلاق دیں یا نہ دیں۔"

منظور کا منہ لٹک گیا، بولا۔ "او جی! یہ تو پھر کوئی بات نہ ہوئی۔ میرا مقصد تو پورا نہ ہوا۔"

میاں علی نواز، منظور کو ایک طرف لے گیا اور آہستہ سے بولا۔ "او نے نادانوں جیسی بات نہ کر۔ دیکھتا نہیں، شیخ صاحب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ آج مرے یا پرسوں سوئم۔ میں نے تمہارے لیے شیخ صاحب سے ایک ہزار کی بات کی ہے۔"

ایک ہزار روپے اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ منظور نے خوش ہو کر پوچھا۔ "کیا واقعی؟"

"ہاں، پورے ایک ہزار روپے۔ اس کے علاوہ میں ایک اور تجویز ڈالنے والا ہوں۔"

"وہ کیا جی؟"

"شیخ صاحب کو اپنا مکان حسینہ بیگم کے نام لگانا پڑے گا۔ تُو خاموشی سے میری ہاں میں ہاں ملاتا رہ۔"

"ٹھیک ہے جی، میں آپ کا تابعدار ہوں۔"

دونوں واپس آ گئے۔

میاں علی نواز نے کہا۔ "شیخ صاحب، میری ایک تجویز ہے۔

حسینہ بیگم کا کچھ تحفظ ہونا چاہیے۔ آپ ایسا کریں کہ اپنا مکان اُس کے نام لگا دیں۔"

شیخ وزیر علی نے پروگرام کے مطابق تھوڑی سی ردوکد کے بعد یہ تجویز قبول کرلی "ٹھیک ہے، میں اپنا مکان حسینہ بیگم کے نام لگانے پر تیار ہوں لیکن اس کے ساتھ میری ایک شرط ہوگی۔ یہ مکان میری موت کے بعد ہی حسینہ بیگم کو مل سکے گا۔ خلع یا طلاق کی صورت میں حسینہ بیگم مکان کی حقدار نہیں ہوگی۔"

"کیوں بھئی منظور سے، بات تو معقول ہے۔" میاں علی نواز نے کہا۔ "اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ شیخ صاحب بیوی سے بھی جائیں اور مکان سے بھی۔"

"آپ سمجھدار ہیں جی، جو مناسب سمجھیں فیصلہ کر لیں۔" منظور نے کہا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ بوڑھا وزیر علی چل چلاؤ کی عمر میں تھا۔

"ایک بات اور ہے۔" وزیر علی نے کہا۔ "یہ مکان حق مہر کی صورت میں ہوگا۔"

منظور نے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

میاں علی نواز نے منظور سے کہا۔ "یہ معاملہ تو طے ہو گیا۔ اب حسینہ بیگم کو راضی کرنا تمھارا کام ہے۔ تم کل کسی وقت شیخ صاحب کے گھر چلے جاؤ اور حسینہ بیگم سے بات کرو۔"

وزیر علی نے اسے سمجھا دیا کہ وہ کس وقت ان کے گھر آئے اور کون سا دروازہ کھٹکھٹائے۔

*

حسینہ بیگم نے اپنے سابق شوہر کو دیکھ کر غصے سے منہ بنایا۔ "کیا لینے آئے ہو یہاں؟"

اُس وقت دن کے تین بجے تھے اور گھر کے تمام افراد سوئے ہوئے تھے۔

"میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔" منظور نے کہا۔ "مجھے مولوی صاحب نے بھیجا ہے۔"

"کیا بات کرنا چاہتے ہو؟ میرا اب تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں اس حال میں بہت خوش ہوں۔"

"تمھارے فائدے کی بات ہے۔ دو چار منٹ لگیں گے اجازت دو تو اندر آجاؤں۔"

حسینہ بیگم نے چند منٹ تذبذب کیا اور پھر اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ منظور نے مالکانہ نظروں سے مکان کا جائزہ لیا۔ حسینہ بیگم کے صاف ستھرے کمرے کو دیکھا۔ ابھی سوئی ہوئی بیٹی کو دیکھا اور دل میں سوچا کہ وہ عنقریب بڑے ٹھاٹ سے اس مکان میں رہے گا۔

"جلدی کہو جو کہنا ہے۔ کوئی جاگ گیا تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"وہ... شیخ صاحب کے ایک دوست ہیں، میاں علی نو[illegible] اُنھوں نے مولوی صاحب سے بات کی، مولوی صاحب نے میرے ساتھ بات کی اور اب میں تیرے پاس یہ بات کرنے آیا ہوں۔" منظور نے تمہید باندھی۔ "بات یہ ہے کہ میاں علی نواز نے تمھیں دیکھا اور بہت پسند کیا۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم نوکرانی کے بجائے شیخ صاحب کی گھروالی بن جاؤ۔"

"تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ کہاں شیخ صاحب اور کہاں میں! اگر شیخ صاحب نے یہ بات سُن لی تو وہ مجھے جوتے مار کے گھر سے نکال دیں گے۔"

منظور نے دھیمی آواز میں کہا۔ "شیخ صاحب سے بات ہو چکی ہے۔ میاں صاحب نے انھیں راضی کر لیا ہے۔"

"یہ وہی چکر تو نہیں جو مولوی صاحب نے بتایا تھا۔ [illegible] شیخ صاحب میرے ساتھ شادی کریں گے، پھر طلاق دیں گے، [illegible] مولوی صاحب تمھارے ساتھ میرا نکاح پڑھائیں گے [illegible] اسی طرح خوش ہوں۔ بہت جوتے کھا لیے تمھارے اُس وقت [illegible] بات اور تھی۔ اُس وقت میں بے سہارا تھی۔"

منظور نے چالاکی سے کہا۔ "طلاق کی بات کون رہا ہے۔ [illegible] تو تیرے بھلے کی بات کر رہا ہوں۔ میاں صاحب نے شیخ صاحب کو اس بات پر بھی راضی کر لیا ہے کہ وہ اپنا یہ مکان تمھارے نام کر دیں گے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"حد ہو گئی... تجھے یقین ہی نہیں آرہا۔ اب یہ بھی سُن لے کہ یہ ساری باتیں میرے سامنے ہوئی ہیں۔ شیخ صاحب نے خود مکان تمھارے نام کرنے کا وعدہ کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ شرط رکھی ہے کہ وہ تمھیں طلاق ولاق نہیں دیں گے۔ یہ مکان تمھیں اُن کی موت کے بعد ہیں ملے گا۔ اگر تم نے ان کی زندگی میں علیحدگی اختیار کر لی تو مکان نہیں ملے گا۔"

"اچھا! پھر تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟"

"یہ بھی تو سوچ کہ شیخ صاحب کی عمر ہی کتنی ہے۔ پتا نہیں کب اللہ کو پیارے ہو جائیں۔"

"تو پھر تمھیں کیا فائدہ ہوگا؟"

"تو پھر ہم دوبارہ نکاح کر لیں گے۔ یہ مکان ہوگا اور ہم ہوں گے اور عیش ہوگا۔"

"یہ بات اب اپنے دل سے نکال دے۔ میں اپنی مرضی سے فیصلہ کروں گی۔ میری مرضی ہوگی تو شادی کروں گی نہیں ہو گی تو نہیں کروں گی۔"

"چل یونہی سہی۔" منظور نے اس بات پر زیادہ زور نہیں دیا۔ [illegible]یخ صاحب کے ساتھ شادی پر تو راضی ہے نا؟"

"پتا نہیں، مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا۔ شیخ صاحب کی اولاد [illegible]ں بات پر قیامت کھڑی کر دے گی۔"

"یہ سارا معاملہ خفیہ ہوگا۔ چار گواہوں کی موجودگی میں نکاح ہو [illegible]ور بات باہر نہیں جائے گی۔ لکھت پڑھت پکے کاغذ پر ہوگی۔ تو فکر [illegible]ں کرتی ہے۔ نکاح ہو جائے تو پھر کوئی مائی کا لال کچھ نہیں کر سکتا۔"

حسینہ بیگم نے کہا کہ وہ سوچ کر جواب دے گی لیکن حقیقت [illegible]ں کہ وہ راضی ہو چکی تھی۔

تین ہفتے کے بعد مولوی اللہ بخش نے چار آدمیوں کی موجودگی [illegible]حسینہ بیگم اور شیخ وزیر علی کا نکاح پڑھا دیا۔ جن گواہوں نے نکاح نامے [illegible]تخط کیے تھے ان میں سے ایک کا نام محمد یٰسین تھا اور دوسرا میاں [illegible]واز تھا۔ محمد یٰسین ایک ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھا اور معتبر آدمی تھا۔

یہ تمام حالات مجھے مختلف لوگوں کی زبانی معلوم ہوئے۔ منظور [illegible]بارے میں پتا چلا کہ وہ شیخ وزیر علی کی وفات سے تین چار مہینے [illegible] سرگودھا چلا گیا تھا۔ شاید وہ شیخ وزیر علی کے مرنے کا انتظار کرتے [illegible]تے تھک گیا تھا۔

میں نے مولوی اللہ بخش، میاں علی نواز اور محمد یٰسین کو اختر علی [illegible] گھر میں جمع کیا اور علی نواز سے کہا کہ وہ اپنے مرحوم دوست کے [illegible]کو ساری صورتِ حال سمجھائے۔

میاں علی نواز نے نکاح نامہ اور اسٹیمپ پیپر اختر علی کے سامنے [illegible]دیا اور اسے سارے حالات بتانے کے بعد کہا۔ "یہ پکا کاغذ [illegible]رے سامنے ہے۔ نکاح نامہ بھی دیکھ لو۔ تمھارے باپ کو صرف [illegible] وجہ سے دوسری شادی کی ضرورت پیش آئی تھی کہ تم لوگ اُس [illegible] خدمت نہیں کرتے تھے۔"

اختر علی کبھی نکاح نامے کو اور کبھی اسٹیمپ پیپر کو دیکھتا۔ اُسے [illegible] بات پر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ جس عورت کو وہ چار سال تک [illegible] سمجھتا رہا تھا، وہ اس کی سوتیلی ماں تھی۔

"یہ... یہ سب کچھ غلط ہے جی۔" اختر علی نے ایک طویل [illegible] کے بعد کہا۔ "م... میں اس کو نہیں مانتا۔ ابا جی ایسی [illegible]ت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمیں پتا ہی نہ چلے [illegible] شادی ہو جائے۔ یہ مکان میرا ہے۔ میں... میں اس معاملے [illegible] کوئی بات سُننے کے لیے تیار نہیں۔"

"دیکھو اختر علی، اگر تیرے باپ نے چھپ کر شادی کی تو کوئی [illegible] نہیں کیا۔" میاں علی نواز نے کہا۔ "اسے کسی سے اجازت لینے [illegible] ضرورت نہیں تھی۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تمھیں اپنے باپ کی شادی کا علم تھا یا نہیں۔ نکاح [illegible] کے گواہ تمھارے سامنے موجود ہیں۔ مولوی صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔ [illegible]ک اور معتبر آدمی ہیں۔ نکاح انھوں نے پڑھایا تھا۔ حسینہ بیگم کا پہلا خاوند منظور بھی نکاح میں موجود تھا۔ تم کس کس کو جھٹلاؤ گے۔ [illegible] اسٹیمپ پیپر بھی تمھارے سامنے ہے۔ اس پر گواہوں کے دستخط اور [illegible] ہے۔ اس شادی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ [illegible] تمھارے باپ کی موت تک اس کے ساتھ رہی اور اب بھی اس [illegible] گھر میں موجود ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ سمجھداری سے کام لو۔"

میاں علی نواز بڑی عمدگی سے حسینہ بیگم کا کیس پیش کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ باقاعدہ تیاری کر کے آیا ہے۔ اختر علی نے کہا۔ "او چاچا جی! آپ کو اس معاملے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ میرا اور حسینہ بیگم کا معاملہ ہے۔ آپ کو میری حمایت کرنی چاہیے کیوں کہ آپ ابا جی کے پرانے دوست ہیں۔ اُلٹا آپ مخالف پارٹی کی حمایت کر رہے ہیں۔"

"او یہاں مخالف پارٹی کوئی نہیں ہے۔" علی نواز نے کہا۔ "تم میرے دوست کے بیٹے ہو اور حسینہ بیگم میرے دوست کی بیوہ ہے۔ بیوہ ہی نہیں ایک مظلوم اور بے سہارا عورت ہے۔ اس نے میرے باپ کی بہت خدمت کی ہے۔ اس کی ہی نہیں تمھاری بھی خدمت کی ہے۔ وزیر علی نے مجھے اس کا خیال رکھنے کی سخت تاکید کی تھی۔"

"ہم نے بھی ابا جی کی بہت خدمت کی ہے۔" اختر علی نے کہا۔ "آخری عمر میں ابا جی کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہے تھے۔ میں یہ کیس عدالت میں لے جاؤں گا۔ جو ہوگا سو دیکھا جائے گا۔"

"اوئے، پاگل نہ بن۔ عدالت میں جائے گا تو تیرے مرحوم باپ کی بدنامی ہوگی۔"

میں خاموشی سے یہ ساری بحث سُن رہا تھا۔ بیٹھک کے ایک کونے میں حسینہ بیگم اور اس کی بیٹی خاموش بیٹھی تھیں۔ وہ دیوانی کیس تھا اور ہمارے دائرۂ اختیار سے باہر تھا۔

میاں علی نواز نے مجھ سے کہا۔ "ملک صاحب، اس نادان کو سمجھائیں کہ عدالت میں جانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ چار پیشیوں میں حسینہ بیگم کے حق میں ڈگری ہو جائے گی۔"

"میاں صاحب، میں کوئی سوشل ورکر نہیں ہوں۔ جب تک حسینہ بیگم اس گھر کے اندر رہ رہی ہے، اس وقت تک ہم کوئی دخل نہیں دے سکتے لیکن اگر اختر علی نے اسے گھر سے نکالنے کی کوشش کی تو پھر یہ قابلِ دست اندازیِ پولیس کیس ہوگا۔"

میں نے دیکھا، میری بات سُن کر اختر علی کچھ مطمئن سا نظر آنے

لگا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد بولا" میاں صاحب! میرا آپ کے ساتھ کوئی تنازع نہیں ہے۔ آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ بینک صاحب نے فیصلہ سُنا دیا ہے۔ یہ عورت بے شک اس گھر میں رہے۔ اب میں اسے نہیں نکالوں گا۔ عدالت نکالے گی!" اس نے ہونٹ سے اضافہ کیا" میں اسے عدالتوں میں خوار کروں گا۔ یہ عدالت میں میرا مقابلہ نہیں کر سکے گی!"

یہ سُن کر میاں علی نواز نے برہمی سے کہا" اسے اکیلا نہ سمجھنا۔ میں اس کے ساتھ ہوں!"

بات ختم کرتے ہی اس نے کاغذات طے کر کے تھیلے میں رکھے اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

گواہ محمد یٰسین اور مولوی صاحب بھی اُٹھ گئے۔

اختر علی مجھے دروازے تک چھوڑنے گیا اور میری ہمدردیاں حاصل کرنے والی باتیں کرتا رہا اور آپ جانتے ہی ہوں گے کہ پولیس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے کس قسم کی باتیں کی جاتی ہیں۔

چند ہفتوں کے بعد مجھے پتا چلا کہ منظور واپس آ گیا تھا اور حسینہ بیگم سے ملا بھی تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ دونوں کے درمیان کیا بات چیت ہوئی تھی۔ آیا حسینہ بیگم اس کے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہوئی تھی یا نہیں۔ البتہ یہ سُننے میں آیا کہ اختر علی نے کوئی کیس داخل نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے حسینہ بیگم کو دوبارہ گھر سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ دونوں نے آپس میں کوئی سمجھوتا کر لیا تھا۔

لیکن ایک شخص کو یہ سمجھوتا پسند نہیں آیا۔

اپریل کے مہینے میں یہ اطلاع ملی کہ اختر علی کو نیند کی حالت میں کسی نے قتل کر دیا ہے۔ صبح جب میں ڈیوٹی پر پہنچا تو سب سے پہلے اس واردات کی رپورٹ ملی۔ میں چند آدمیوں کے ہمراہ فوراً جائے واردات پر پہنچ گیا۔

مکان کے باہر کافی لوگ جمع تھے۔

اختر علی کی لاش خون میں لت پت بستر پر پڑی تھی۔ اس کے جسم پر تیز دھار آلے سے تقریباً پانچ وار کیے گئے تھے۔ ان میں سے تین زخم سینے پر اور دو پیٹ پر آئے تھے۔ یہ میں آپ کو اپنے سرسری معائنے کی رپورٹ بتا رہا ہوں۔

ایک زخم عین دل کے اُوپر تھا۔ غالباً قاتل نے پہلا وار دل پر کیا تھا لیکن ایک وار سے مطمئن نہیں ہوا تھا اور مزید وار کرتا چلا گیا تھا۔

مقتول کے ہاتھوں پر خون لگا ہوا تھا مگر زخم کوئی نہیں تھا۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے مزاحمت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ قاتل نے اسے نیند کی حالت میں ہی ختم کر دیا تھا۔

موسم گرم ہو چکا تھا اور اختر علی صحن کی طرف والے [illegible] میں سوتا تھا۔

جائے واردات پر آلۂ قتل موجود نہیں تھا۔ قاتل اگر [illegible] سے آیا تھا تو یقیناً دیوار پھاند کر اندر داخل ہوا تھا۔

گھر کے اندر حسینہ بیگم اور اس کی بیٹی کے سوا [illegible] کوئی نہیں تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی بات آئی کہ وہ قتل جائیداد کی وجہ سے کیا گیا تھا اور ایسی صورت [illegible] حسینہ بیگم کی پوزیشن شبہے سے بالا نہیں تھی۔ وہ تنہا ہی [illegible] عورت تھی اور سوئے ہوئے آدمی پر بہ آسانی وار کر سکتی تھی۔

میں نے ایک اے ایس آئی کو واردات کا نقشہ [illegible] کرنے کے لیے کہا اور خود حسینہ بیگم کے کمرے میں پہنچ [illegible]۔ وہ محلے کی دو تین عورتوں کے درمیان سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کی دس سالہ بیٹی بھی وہاں موجود تھی۔

میں نے کہا" بی بی! میں تم سے اس واردات کے بارے میں چند سوالات کرنا چاہتا ہوں!"

اس نے اپنی بیٹی سے کرسی لانے کے لیے کہا۔ وہ اٹھی اور ایک کرسی لا کر دروازے کے پاس رکھ دی۔

"حسینہ بی بی! یہ واردات کیسے پیش آئی؟" میں نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

"مجھے تو جی کچھ پتا نہیں ہے!" اس نے جواب دیا" میں صبح اٹھی تو میں نے دیکھا کہ اختر علی خون میں لت پت پڑا ہے۔ لاش دیکھ کر میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ میں چیختی ہوئی باہر بھاگی۔ میری چیخیں سُن کر لوگ گھروں سے باہر نکل [illegible]۔"

"تم کتنے بجے اٹھی تھیں؟"

"میں روزانہ چھ پونے چھ بجے اٹھ جاتی ہوں!"

بعد میں دیگر گواہوں کے بیانات سے اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ دو تین پڑوسیوں نے بتایا کہ انھوں نے چھ بجے سے کچھ دیر پہلے چیخوں کی آواز سُنی تھی۔

میں نے پوچھا" اختر علی کتنے بجے اٹھتا تھا؟"

"اختر علی دیر سے اٹھتا تھا۔ کبھی سات اور کبھی آٹھ بجے"

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس نے صبح صبح اٹھ کر اختر علی کا خاتمہ کر دیا تھا اور پھر چیختی ہوئی گلی میں نکل گئی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھوں اور کپڑوں کا جائزہ لیا مگر کہیں پر کوئی خون کا دھبا دکھائی نہیں دیا۔

میں نے پوچھا" تم کس دروازے سے نکل کر گلی میں گئی تھیں؟"

اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ "میں صحن والے دروازے سے باہر گئی تھی۔" قدرے سوچ کر اس نے اضافہ کیا۔ "وہ دروازہ کھلا ہوا تھا حالانکہ رات کو میں نے خود دروازہ بند کیا تھا۔"

میں نے سوچا کیا یہ مجھے سمجھانا چاہ رہی ہے کہ قاتل دیوار پھاند کر اندر داخل ہوا تھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا!

"تم نے رات کو چیخنے یا لڑنے جھگڑنے کی آواز نہیں سنی؟"

"میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔ ہم ماں بیٹی دروازہ بند کر کے اس کمرے میں سوتے ہیں۔"

"اندر تمھیں گرمی نہیں لگتی؟"

"گرمی تو لگتی ہے جی، پر کیا کریں۔ عزت کا خیال بھی کرنا پڑتا ہے . . ."

یہ بات نادانستگی میں اُس کے مُنہ سے نکل گئی تھی۔ میں نے سوچا، کہیں یہ جائداد سے بڑھ کر عزت کا معاملہ تو نہیں تھا؟ یہ بات وہ پہلے بھی بتا چکی تھی کہ اختر علی اُس پر بُری نظر رکھتا تھا اور دو تین دفعہ دست درازی کی کوشش بھی کر چکا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا اختر علی نے تمھاری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا؟"

اُس نے تامّل کرتے ہوئے جواب دیا۔ "نیت تو اس کی اچھی نہیں تھی، پر اس کی ہمت نہیں پڑی۔ کیونکہ میاں علی نواز میری خیریت پوچھنے آتے رہتے تھے۔"

"میاں علی نواز تمھارا بہت خیال رکھتے ہیں!"

"ہاں جی، نیک آدمی ہیں۔"

"میں نے سنا ہے کہ تمھارا پہلا خاوند منظور بھی تم سے ملتا رہتا ہے۔ کیا وہ تم سے دوبارہ نکاح کرنا چاہتا ہے؟"

"وہ تو چاہتا ہے مگر میں نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟ میں نے تو سنا ہے کہ تم نے اس سے شادی کا وعدہ کر رکھا تھا۔ کیا تم دونوں میں یہی طے نہیں ہوا تھا کہ شیخ وزیر علی کی موت کے بعد دوبارہ شادی کر لو گے؟"

"نہیں جی، میں نے اُس سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ عورت سہارے کے لیے شادی کرتی ہے، مار کھانے کے لیے نہیں کرتی۔ اگر میرے پاس سہارا نہ ہوتا تو شاید میں اس کے ساتھ شادی کر لیتی۔"

"کون سا سہارا ہے تمھارے پاس؟" میں نے پوچھا۔ "سہارے کے بارے میں بھی بتاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ منظور کے ساتھ تمھاری کیا بات ہوئی تھی؟"

اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ جب منظور کو پتا چلا کہ شیخ وزیر علی فوت ہو گیا ہے تو وہ بہت خوش ہوا اور آکر اسے مبارک باد دی۔

حسینہ نے کہا کہ اُسے یہ سُن کر بہت غصہ آیا۔ اُس نے منظور سے کہا۔ "میں ایسی مبارک باد پر لعنت بھیجتی ہوں۔ مجھے شیخ صاحب کی موت کا بہت دُکھ ہوا ہے۔ انھوں نے مجھے بہت سکھ دیا تھا۔ کبھی اُف تک نہیں کہا تھا۔"

منظور نے مکّاری سے کہا۔ "ہاں یہ تو ہے۔ شیخ صاحب آدمی تو بہت اچھے تھے۔ ویسے مجھے بھی اُن کی موت پر دُکھ ہوا ہے۔ یہ بتا مکان تو تیرے قبضے میں ہے نا؟"

"میرے قبضے میں کچھ نہیں ہے۔ اختر علی نے مجھے نکال باہر کیا تھا۔" اس نے منظور کو ساری تفصیل بتائی۔ پھر بولی۔ "اللہ بھلا کرے میاں علی نواز کا، انھوں نے بھاگ دوڑ کر کے معاملہ سیدھا کر دیا۔ ورنہ کچھ بھی نہیں ہونا تھا۔"

"اچھا!" منظور نے گردن پھلائی۔ "تو نے مجھے کیوں نہیں اطلاع بھجوائی۔ اس علاقے کے سارے غنڈے بدمعاش اپنے یار بیلی ہیں۔ میں اختر علی کو ایک منٹ میں سیدھا کر دیتا۔ مکان کا کاغذ کہاں ہے؟"

"وہ میں نے میاں علی نواز کے پاس رکھوایا ہوا ہے۔"

"اب تو کوئی فکر نہ کر، میں آگیا ہوں۔ میں نے مولوی صاحب سے بات کر لی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ عدت پوری ہونے کے بعد نکاح ہو گا۔ اس کے بعد اختر علی کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

"میں اب شادی نہیں کروں گی۔ اپنے دل سے اُمید نکال دے۔"

"اوئے، کیا ہو گیا ہے تجھے؟ یاد نہیں تُو نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ شیخ صاحب سے تیری شادی کا سارا بندوبست میں نے ہی کیا تھا۔ یہ شادی تو تُو نے شرع کی شرط پوری کرنے کے لیے کی تھی۔"

"جھوٹ نہ بول۔ تو نے کچھ نہیں کیا تھا۔ تُو تو میری قیمت کھری کر کے لے گیا تھا۔ شیخ صاحب نے مجھے ساری کہانی سنا دی تھی۔ شیخ صاحب نے تجھے ہزار روپے نہیں دیے تھے؟"

"وہ تو انھوں نے اپنی خوشی سے دیے تھے۔"

"کس بات کی خوشی؟"

"چل چھوڑ ان باتوں کو، میں اب بڑا سُتھرا بندہ بن کر آیا ہوں۔ وہ پہلے والا منظور نہیں ہوں۔ میں اب تجھے پھولوں کی طرح سنبھال کر رکھوں گا۔"

"مجھے تیری باتوں کا اعتبار نہیں ہے۔"

"میں تیرے بچّوں کا باپ ہوں۔ میرے ساتھ شادی نہیں کرے گی تو کس کے ساتھ کرے گی۔ اکیلی عورت کچھ نہیں کر سکتی۔ اختر علی کو جب موقع ملا تجھے نکال باہر کرے گا۔ لیکن میرے ہوتے ہوئے یہ ایسی جراُت نہیں کر سکتا۔ اُس نے مُنہ پر ہاتھ پھیرا۔ شادی کے دوسرے دن اُسے اٹھا کر باہر نہ پھینکا تو میرا نام بھی منظور خان نہیں۔"

"ابھی تو جا۔ میں سوچوں گی۔" حسینہ نے جان چُھڑانے کے لیے کہا۔ منظور دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس چلا گیا۔

شام کو جب اختر علی گھر آیا تو حسینہ نے اُسے منظور کے بارے میں بتایا۔

"کیا کہتا تھا؟"

"مجھ سے دوبارہ شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے کہا میں سوچ کر جواب دوں گی۔ وہ آپ کے بارے میں بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا۔"

"میرا اس سے کیا واسطہ؟"

"کہہ رہا تھا۔ شادی کے دوسرے ہی روز اختر علی کو باہر پھینک دوں گا۔ یہ بھی کہتا تھا کہ علاقے کے سارے غنڈے بدمعاش اس کے دوست ہیں۔"

یہ سُن کر اختر علی کچھ فکر مند نظر آنے لگا اور غالباً حسینہ بیگم نے یہ بات اُسے ڈرانے کے لیے ہی کہی تھی اور واضح طور پر وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہی تھی۔

"تو پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" اختر علی نے پوچھا۔

"میں نے کیا فیصلہ کرنا ہے۔ عورت تو مرد کے سہارے کی محتاج ہوتی ہے۔ تمھارا کیا بھروسا تم مجھے دوبارہ دھکا دے سکتے ہو۔"

اختر علی اس وقت چُپ ہو گیا۔

رات کے کھانے کے بعد اس نے کہا۔ "حسینہ بی بی! میں نے تمھارے لیے ایک طریقہ سوچا ہے۔ اگر تم راضی ہو تو تمھیں زندگی بھر کا سہارا مل سکتا ہے۔"

"کیا سوچا ہے؟"

"اگر تم آیندہ شادی نہ کرنے کا وعدہ کرو تو میں اُدھر کے دو کمرے اور باورچی خانہ تمھارے حوالے کر دوں گا۔ بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دوں گا۔ اگر تم کہو گی تو اس حصّے کی تمھارے نام رجسٹری بھی کروا دوں گا۔ لیکن اس سے پہلے تمھیں اباجی کا نکاح نامہ اور اسٹیمپ پیپر میرے حوالے کرنا ہو گا۔"

حسینہ نے کہا۔ "صرف دو کمرے! تمھارے اباجی تو پورا مکان میرے نام لگا گئے تھے۔"

"یہ مکان تمھیں اتنی آسانی سے نہیں مل سکے گا۔ عدالتوں میں بندے کی عمر گل جاتی ہے۔ دیوانی کیس نسل در نسل چلا کرتے

ہی۔ تمھیں ان باتوں کا تجربہ نہیں ہے۔"

حسینہ بیگم عدالتوں کے چکّروں میں پڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کے لیے دو کمرے بہت تھے۔ پورا مکان دو کنال کے رقبے میں بنا ہوا تھا۔ دو کمرے کے ساتھ حسینہ بیگم کے حصے میں دس مرلے سے زیادہ زمین آجاتی۔

اسے تامّل کرتے دیکھ کر اختر علی نے کہا "میں تمھیں ضروری سامان بھی دے دوں گا۔ اس کے علاوہ تمھاری دو وقت کی روٹی بھی میرے ذمّے ہے۔ اس کے بدلے تم میرے گھر کا کام کاج کر دیا کرنا۔"

حسینہ بیگم نے سوچ کر جواب دینے کا وعدہ کیا اور دو روز کے بعد میاں علی نواز سے اس معاملے میں مشورہ کیا۔ میاں علی نواز نے اختر علی کی تجویز کو پسند نہیں کیا اور حسینہ بیگم سے کہا کہ وہ نہ تو اختر علی کے چکّر میں آئے اور نہ ہی منظور سے میل جول رکھے کیونکہ وہ لوگ اسے پھانسنا چاہتے ہیں۔

حسینہ بیگم میاں علی نواز کو اپنا محسن سمجھتی تھی اور اس کی باتوں پر عمل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

تین چار روز بعد منظور دوبارہ اس سے ملنے آیا اور پوچھا کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے۔

"میرا اختر علی سے معاملہ طے ہو گیا ہے۔" حسینہ بیگم نے جواب دیا۔ "اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس مکان کے دو کمرے میرے نام لگا دے گا اور بیچ میں دیوار کھینچ دے گا تاکہ میرا حصہ بالکل الگ ہو جائے۔"

"اور یہ تو پورا مکان تیرا ہے۔ تو دو کمروں پر راضی ہو گئی؟"

"میں نے کیا کرنا ہے پورا مکان۔ میرے لیے دو کمرے ہی بہت ہیں۔ میں کسی مقدمے بازی میں نہیں پڑنا چاہتی۔" منظور نے حسینہ بیگم کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں مانی۔

حسینہ بیگم کے اس بیان کی بعض باتیں وضاحت طلب تھیں مثلاً ایک یہ کہ جب میاں علی نواز نے اُسے اختر علی سے سمجھوتا کرنے سے منع کر دیا تھا تو پھر اس نے منظور سے کیوں یہ کہا کہ اس کا اختر علی سے سمجھوتا ہو گیا ہے۔

تاہم اس کے بیان سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ اختر علی کے قتل میں منظور کا ہاتھ تھا۔

میں [illegible]

اور دو [illegible]

تنگ سے مکان میں رہتا تھا۔ کمرے کا دروازہ ایسا تھا کہ اگر ذرا زور سے دھکا دے دیا جاتا تو وہ چوکھٹ سمیت باہر آ جاتا۔

ہمیں دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ بولا "کیسے آنا ہوا سرکار؟"

اس کی عمر چالیس پینتالیس سال کے درمیان تھی۔ جسم مضبوط نظر آتا تھا۔ رنگ سانولا اور بال چھوٹے تھے۔ چہرے پر اکھڑپن پایا جاتا تھا۔

میں نے اُسے ایک طرف کیا اور کمرے کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ وہ مختصر سا کمرا تھا اور اس میں زیادہ سامان نہیں تھا۔ ایک پرانے سے ٹرنک میں بوسیدہ کپڑوں کے چند جوڑے رکھے تھے۔ میں نے ایک ایک کپڑے کا جائزہ لیا مگر کسی پر خون کے دھبے دکھائی نہیں دیے۔ کچھ میلے کپڑے کھونٹی پر ٹنگے ہوئے تھے۔ ان پر بھی دھبا نہیں تھا۔ البتہ ایک قمیص کی جیب سے ایک کمانی دار چاقو برآمد ہو گیا۔ میں نے بڑی باریکی سے اس کا جائزہ لیا مگر وہ صاف تھا۔

"مسئلہ کیا ہے سرکار؟" منظور نے پوچھا "کچھ مجھے بھی تو پتا چلے۔"

"کمرے کو تالا لگاؤ۔" میں نے تلاشی مکمل کرنے کے بعد کہا۔ "مسئلہ تھانے میں چل کر بتائیں گے۔"

"مگر... جناب میں شریف آدمی ہوں۔"

"وہ تو تمھاری شکل سے ہی ظاہر ہے۔" حوالدار نے کہا۔ "زیادہ باتیں نہیں بناؤ اور دروازے کو تالا لگاؤ۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ ہم اُسے لے کر تھانے پہنچ گئے۔ ایک اے ایس آئی کو میں اختر علی کے پڑوسیوں سے پوچھ گچھ کے لیے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ ویسے منظور کا محرک خاصا واضح تھا۔ اُس کے خیال میں چونکہ حسینہ بیگم کو اختر علی کا سہارا مل گیا تھا اس لیے وہ شادی سے گریزاں تھی۔ لہٰذا اُسے سیدھے راستے پر لانے کے لیے اختر علی کا کانٹا نکالنا ضروری تھا۔ بہر حال یہ ایک تھیوری تھی جس کی تصدیق کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے منظور کو اپنے کمرے میں بلایا اور پوچھا "تم نے اختر علی کو قتل کیوں کیا؟"

"قق... قتل! اختر علی قتل ہو گیا ہے؟" اُس نے حیرانی سے کہا۔ اگر وہ اداکاری تھی تو عمدہ اداکاری تھی۔

میں نے کہا "حسینہ بیگم نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ سیدھی طرح سے اپنے جرم کا اقرار کر لو گے تو تکلیف سے بچ جاؤ گے۔"

وہ قسمیں کھانے لگا "مجھے تو کچھ پتا نہیں ہے جی۔ میں نے تو کئی روز سے اختر علی کی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

میں نے کہا "جب حسینہ بیگم نے شیخ وزیر علی سے شادی

کا فیصلہ کیا تھا تو تمھارے ساتھ کیا وعدہ کیا تھا؟"

"سرکار! جب مجھے غصہ آتا ہے تو میرا مغز اُلٹ جاتا ہے۔ مجھے کچھ ہوش نہیں رہتا۔ میں نے غصے میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایسا پہلے بھی کئی دفعہ ہو چکا تھا۔ میں بعد میں تو بہ تِلّا کر لیتا تھا اور گھر کی بات گھر میں رہ جاتی تھی لیکن اس روز ہمارے پڑوسی مولوی صاحب کو بلا لائے۔ مولوی صاحب نے فتوے کی ایسی ماری کہ بنا بنائے گھر کی جڑ کاٹ دی۔ میری بیوی مجھ پر حرام کر دی اور کہا کہ اب یہ کسی اور سے شادی کرے گی اور جب اُدھر سے طلاق ملی تو پھر میرے لیے حلال ہو گی۔ پھر یہ معاملہ شیخ صاحب تک پہنچا۔ حسینہ نے وعدہ کیا کہ وہ شیخ صاحب سے طلاق لے کر دوبارہ میرے ساتھ نکاح پڑھوا لے گی لیکن بعد میں مُکر گئی۔ میں نے اُسے دھمکی دی کہ میں ساری کہانی شیخ صاحب کی اولاد کو بتا دوں گا۔ اس پر وہ ڈر گئی اور وعدہ کیا کہ وہ چند روز کے اندر شیخ صاحب سے بات کرے گی۔ میں نے کہا "آج ہی بات کرو ورنہ میں سارے محلے میں اعلان کر دوں گا۔ یہ دھمکی میں نے صبح دی تھی۔ شام کو شیخ صاحب نے مجھے اپنے پاس بلایا اور ایک نئی بیخ لگا دی۔ اُس وقت میاں علی نواز بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ شیخ صاحب نے اپنا مکان حسینہ کے نام کرنے کا فیصلہ کیا ہے، لیکن شرط یہ ہو گی کہ حسینہ اُن سے طلاق نہیں مانگے گی۔ شیخ صاحب کی موت کے بعد مکان ہمارا ہو جائے گا۔ میاں صاحب نے مجھے یہ پٹی پڑھائی کہ شیخ صاحب بوڑھے آدمی ہیں کسی وقت بھی اللہ کو پیارے ہو سکتے ہیں۔ سرکار! میں اُن کی باتوں میں آ گیا۔ دل میں لالچ آ گیا۔ سوچا ایک دو سال کی تو بات ہے، پھر ہمیں اتنا بڑا مکان مل جائے گا۔"

میں نے کہا "تمھارا یہ مطلب ہے کہ مکان کا اسٹیمپ پیپر بعد میں تیار کیا گیا تھا؟"

"ہاں جی، یہ اشٹام شادی کے چار پانچ روز بعد لکھا گیا تھا اور میری ضد کی وجہ سے لکھا گیا تھا۔"

میں نے سوچا۔ گویا مجھے جو کچھ بتایا گیا تھا اُس میں بہت سا جھوٹ شامل تھا۔ اب میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میری معلومات کا بڑا ذریعہ میاں علی نواز تھا۔ دوسرا بڑا ذریعہ حسینہ بیگم تھی۔ علی نواز نے مجھے جو کچھ بتایا تھا حسینہ بیگم نے اس کی تصدیق کی تھی۔ سوال یہ تھا کہ اُس نے میاں علی نواز کی حمایت میں جھوٹ کیوں بولا تھا؟ یہ باتیں تصدیق طلب تھیں۔ اگر اسٹیمپ پیپر شادی کے پانچ روز بعد تیار کیا گیا تھا تو پھر منظور کا یہ بیان درست معلوم ہوتا تھا کہ حسینہ بیگم نے اُس سے دوبارہ شادی کا وعدہ کیا تھا۔ تاہم اس سے منظور کے محرک میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ بلکہ اس کا محرک پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتا تھا۔

میں نے پوچھا "تم نے اپنی بیوی کو طلاق کس وجہ سے دی تھی؟"

"میں نے اُس کے پاس پچاس روپے رکھوائے تھے۔ کسی کا قرضہ دینا تھا۔ میں نے دو دو چار چار روپے کر کے یہ پیسے اکٹھے کیے تھے۔ حسینہ نے یہ پیسے خورد بُرد کر دیے۔ بندہ پیسے لینے آیا تو اس نے کہا کہ پیسے خرچ ہو گئے ہیں۔ جناب! قرض خواہ دروازے پر کھڑا ذلیل کر رہا ہو اور بیوی آرام سے کہہ دے کہ پیسے خرچ ہو گئے ہیں تو غصہ کس کو نہیں آئے گا۔ پھر میں نے کہا کہ سونے کی بالیاں دے دو، میں کہیں گروی رکھ کے پیسے اُدھار پکڑ لیتا ہوں۔ وہ ٹال مٹول کرنے لگی۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ میں نے کہا۔ پانچ منٹ میں بالیاں نہ دیں تو طلاق۔ اُس نے پھر بھی پروا نہیں کی۔ شور ہنگامے کی وجہ سے پڑوسی بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ مولوی صاحب کو بلا لائے اور زبردستی طلاق کا ٹھپّا لگوا دیا۔ دراصل یہ لوگ ہمارے روز روز کے جھگڑوں سے تنگ تھے اور ہماری بربادی کے لیے موقع کی تلاش میں تھے۔"

میں نے پوچھا "تم نے صرف 'طلاق' کا لفظ بولا تھا یا 'تین طلاق' کہا تھا؟"

"صرف طلاق کہا تھا جی۔ اور وہ تو میں نے صرف ڈرانے کے لیے کہا تھا۔ اتنی خوبصورت اور سلیقہ شعار بیوی کو کون طلاق دیتا ہے۔"

"تو پھر روز روز جھگڑا کیوں ہوتا تھا؟"

"یہ تو جی غریبوں کی شامتِ اعمال ہے۔ بھوکے ننگے لوگ لڑنے جھگڑنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

"اب کیا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا "کیا تم نے حسینہ بیگم کے سامنے اختر علی کو دھمکی دی تھی؟"

"سرکار دھمکی تو کوئی نہیں دی۔ جب مجھے شیخ صاحب کی موت کے بارے میں پتا چلا تو میں واپس آیا اور حسینہ کو اس کا وعدہ یاد دلایا لیکن وہ پھر ٹال مٹول کرنے لگی کہنے لگی کہ میاں صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دے گی پھر دو تین روز کے بعد کہا کہ میاں صاحب نے منع کر دیا ہے۔ میں میاں صاحب سے ملا تو اُلٹا مجھے دھمکیاں دینے لگے۔ کہنے لگے کہ میرا اب حسینہ بیگم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے میں اُس سے دور رہوں۔ میں نے اُن سے اشٹام مانگا تو انھوں نے مجھے گالیاں دیں اور کہا کہ بھاگ جاؤ۔ اس اشٹام سے تمھارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ زیادہ ٹر ٹر کرو گے تو اندر کروا دوں گا۔ جناب میں غریب آدمی ہوں۔ میاں صاحب کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اس لیے چپ ہو گیا۔"

اُس کی باتیں سن کر ایک اور ہی نقشہ میرے ذہن میں ابھرنے لگا تھا۔ میاں علی نواز کی دلچسپی اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی گہری معلوم ہوتی تھی۔ اس حقیقت کے انکشاف کے بعد منظور کا محرک کچھ کمزور پڑ گیا تھا۔ اگر اس نے حسینہ بیگم یا مکان کے لیے اختر علی کو قتل کیا تھا تو وہ بہت بڑا احمق تھا کیونکہ یہ دونوں چیزیں اس کی دسترس سے باہر تھیں۔ حسینہ شادی سے انکار کر چکی تھی اور مکان کا کاغذ علی نواز کے قبضے میں تھا۔

میں نے ایک مخبر کو میاں علی نواز کے بارے میں سن گن لینے پر مامور کر دیا۔ وہ ہوشیار اور چلتا پُرزہ آدمی تھا۔ ہر ماحول اور محفل میں بڑی آسانی سے گھل مل جاتا تھا۔ اس کا نام مظہر خاں تھا۔

چند روز کے بعد اُس نے اطلاع دی کہ میاں علی نواز کی بیوی فوت ہو چکی تھی، تمام بچے شادی شدہ تھے اور زمین کی دیکھ بھال لڑکے کرتے تھے۔ میاں علی نواز ان دنوں فارغ البالی کی زندگی گزار رہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ خاصا رنگین مزاج آدمی تھا اور مجرے وغیرہ کرواتا رہتا تھا۔ حسینہ بیگم کا وہ خاص ہمدرد تھا۔ وزیر علی کی موت کے بعد وہ ہر ہفتے حسینہ کی خیریت پوچھنے جاتا تھا۔ جب اختر علی نے حسینہ کو گھر سے نکالا تو اُسی نے ایک آدمی کو تھانے بھیجا تھا اور یہ تاکید کر دی تھی کہ اس کا ذکر نہ آئے۔

یہ معلومات حاصل ہونے کے بعد میں نے ایک اے ایس آئی سے کہا کہ وہ میاں علی نواز کو بلا لائے اور حسینہ بیگم کا نکاح نامہ اور اسٹیمپ پیپر بھی ساتھ لیتا آئے۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میاں علی نواز تھانے میں حاضر ہوا۔ وہ خاصا بارعب اور جسیم شحیم آدمی تھا۔ اس نے بڑی بڑی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں جنھیں ہمیشہ خضاب لگا کر رکھتا تھا۔ اس وقت وہ سفید شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ بڑی سی سفید چادر کندھوں پر ڈال رکھی تھی اور ہاتھ میں ہاتھی دانت کے دستے والی چھڑی تھی۔ اُس کے ساتھ دو آدمی بھی تھے۔ ایک کے کندھے پر ہولسٹر لٹک رہا تھا۔

اکثر زمیندار اس قسم کے لوگوں کو شان بڑھانے کے لیے ساتھ رکھتے ہیں کیونکہ اکیلا آدمی عموماً ہجوم میں گم ہو جاتا ہے یعنی پتا نہیں چلتا کہ وہ بڑی شان والا ہے تاہم بعض زمینداروں کو محافظوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے کیونکہ انھوں نے دشمنیاں بہت پال رکھی ہوتی ہیں۔

میں نے میاں علی نواز کو کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور اس کے محافظوں کو یہ کہہ کر باہر بھیج دیا کہ بات پردے والی ہے۔

"جناب نے کیسے یاد فرمایا؟" علی نواز نے پوچھا۔

میں نے کہا "آپ کو پتا ہی ہو گا کہ ہم نے منظور کو اختر علی کے قتل کے جرم میں گرفتار کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں آپ سے کچھ باتیں پوچھنا تھیں۔"

"کیسی باتیں؟" اُس کے لہجے میں ناگواری پائی جاتی تھی جیسے کہہ رہا ہو کہ میرا اس معاملے سے کیا تعلق؟

"آپ وہ نکاح نامہ اور اسٹیمپ پیپر لائے ہیں؟"

"کون سا نکاح نامہ اور اسٹیمپ پیپر؟"

"حسینہ بیگم اور آپ کے دوست وزیر علی کا نکاح نامہ" میں نے جواب دیا "اس کے ساتھ مکان کا اسٹیمپ پیپر بھی تھا۔"

"یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں جس کی چیزیں ہیں اس سے پوچھیں جا کر۔"

"کیا بات ہے میاں صاحب؟ بڑے غصے میں معلوم ہوتے ہیں آپ؟" میں نے بھی ذرا تلخی سے کہا "غصہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ نکاح نامہ اور اسٹیمپ پیپر میں نے اس لیے آپ سے مانگا ہے کہ یہ دونوں چیزیں میں نے آپ ہی کی تحویل میں دیکھی تھیں۔ یہ دونوں کاغذ آپ لے کر آئے تھے اور اختر علی کو دکھا کر واپس لے گئے تھے۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ آپ مجھ سے یہ کاغذ نہیں مانگ سکتے۔"

"ہوں ں ں... گویا کاغذ آپ ہی کے پاس ہیں لیکن آپ دینے پر تیار نہیں ہیں۔"

"یہی سمجھ لیں۔"

"میاں صاحب، یہ بتائیں کہ اسٹیمپ پیپر نکاح کے کتنے روز بعد تیار کرایا گیا تھا؟"

اُس نے تھوڑی دیر تک میری بات پر غور کیا، پھر بولا "تقریباً پانچ چھ روز کے بعد۔"

"پہلے تو آپ نے کچھ اور بتایا تھا؟"

"یہی بتایا تھا، آپ نے ٹھیک سے سنا نہیں ہو گا۔"

"میاں صاحب، میں اتنا غبی انسان نہیں ہوں۔ آپ

نے کہا تھا، مکان کے بارے میں نکاح سے پہلے فیصلہ ہو گیا تھا اور اسٹیمپ پیپر پر نکاح فارم کے ساتھ ہی دستخط کیے گئے تھے۔"

"ملک صاحب! آج یہ باسی کڑھی میں اُبال کیوں اُٹھ رہا ہے۔ اگر میرے منہ سے ایسی کوئی بات نکل بھی گئی تھی تو کون سی آفت آگئی۔ مکان کی بات شادی سے پہلے طے ہو چکی تھی۔ اسٹیمپ پیپر چار چھ روز بعد میں تیار کروایا گیا تھا۔"

"منظور کا کہنا ہے کہ مکان کی بات بعد میں طے ہوئی تھی۔ جب اُس نے وزیر علی پر طلاق کے لیے زور ڈالا اور شادی کا راز فاش کرنے کی دھمکی دی تو اس نے مکان کا لالچ دے کر منظور کا منہ بند کر دیا۔"

"چھوڑیں جی، اس کمین کی میرے سامنے بات نہ کریں۔"

"مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وزیر علی نے حلالہ کی شرط پوری کرنے کے لیے حسینہ سے شادی کی تھی لیکن بعد میں اس نے اس لیے طلاق دینے سے انکار کر دیا کہ اس طرح مفت کی ملازمہ اس کے ہاتھ سے جاتی۔"

"جو اس دنیا سے گزر گیا اس کی بات کرنے کا کیا فائدہ!"

وہ ہر بات سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور میں آہستہ آہستہ اس کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔

"میاں صاحب، اس بات کو چھوڑیں کہ مکان کی بات پہلے ہوئی تھی یا بعد میں، لیکن منظور کو آپ ہی نے حسینہ بیگم سے بات کرنے پر آمادہ کیا تھا اور اُسے یہ سمجھایا تھا کہ وزیر علی کے مرنے کے بعد وہ دونوں مکان کے مالک بن جائیں گے۔ میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"ہاں، کہا تھا لیکن وہ عورت اب اس کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنے پر تیار نہیں ہے۔ میرا اس میں کیا قصور ہے؟"

"آپ کا قصور یہ ہے کہ جب منظور آپ کے پاس مدد کے لیے آیا تو آپ نے اُسے گالیاں دے کر بھگا دیا۔"

"میں کوئی کمیشن ایجنٹ نہیں ہوں جی۔"

"آپ نے حسینہ بیگم کا نکاح نامہ اور اسٹیمپ پیپر اپنی تحویل میں کیوں رکھا ہوا ہے؟"

"حسینہ بیگم نے یہ چیزیں حفاظت کے لیے میرے پاس رکھوائی ہوئی ہیں۔"

میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ حسینہ بیگم کے کمیشن ایجنٹ ہیں؟"

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "ملک صاحب، میں عزت دار آدمی ہوں۔"

میں نے اُس کی بات پر توجہ دینے کے بجائے ایک اے ایس آئی کو بلایا اور کہا۔ "دو آدمی ساتھ لے جاؤ اور حسینہ بیگم کو تانگے میں بٹھا کر یہاں لے آؤ۔ ایک آدمی مولوی اللہ بخش کی طرف بھیج دو۔ اُس سے کہنا کہ مولوی صاحب کو ساتھ ہی لیتا آئے۔"

میاں علی نواز آہستہ آہستہ کرسی پر بیٹھ گیا، بولا "حسینہ بیگم سے آپ کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ آپ کا کیا تعلق ہے حسینہ؟"

وہ حیرت انگیز طور پر نرم پڑ گیا، بولا "تعلق تو کوئی نہیں ہے... بس یونہی پوچھ رہا ہوں۔ وہ بیوہ عورت مجھ پر بہت بھروسا کرتی ہے۔"

"میاں صاحب، عورت سے تو آپ کو بہت ہمدردی ہے مگر اُس کے بچوں کے باپ کو آپ دھکے دیتے ہیں۔"

"ملک صاحب، میں اُس قاتل بدمعاش سے کیا ہمدردی کروں، کم بخت تو دو دفعہ حسینہ بیگم کا سودا کر چکا ہے۔"

لفظ 'دو دفعہ' سن کر میں چونکا۔ اور میں نے دیکھا کہ میاں علی نواز بھی یہ بات کہہ کر قدرے پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے یہ بات ذہن میں رکھ لی، مگر اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "ملک صاحب، آپ ایسا کریں کہ حسینہ بیگم سے گھر جا کر بات کر لیں۔ عورت کو تھانے بلانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

میں نے چالاکی سے کہا۔ "چلیں، آپ کی یہ بات میں مان لیتا ہوں۔" پھر میں نے اُس کو سنانے کے لیے ایک حوالدار کو بلا کر کہا۔ "تم... اے ایس آئی سے کہو کہ حسینہ بیگم کے گھر نہ جائے۔ میں کل کسی وقت خود چلا جاؤں گا۔"

بات کرتے وقت میں نے آنکھ سے اشارہ بھی کیا، مگر وہ سمجھا نہیں۔ اے ایس آئی ابھی تھانے میں ہی تھا۔ اُس نے اُسے حسینہ بیگم کے گھر جانے سے منع کر دیا، لیکن یہ غلطی فائدہ مند ہی ثابت ہوئی۔

میری چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ علی نواز کو رخصت کر کے میں گھر پہنچا اور ہاتھ منہ دھو کر کپڑے تبدیل کیے۔ اس سارے وقت میں یہ بات میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی کہ علی نواز حسینہ بیگم کے گھر ضرور جائے گا۔ غالباً وہ اُسے کچھ باتیں سمجھانا چاہتا تھا۔ سوچتے سوچتے میں نے اچانک فیصلہ کیا اور سادہ کپڑوں میں حسینہ بیگم کے گھر پہنچ گیا۔ ایک پڑوسن اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی جو میری آمد پر اُٹھ کر چلی گئی۔

رسمی کلمات کے بعد میں نے حسینہ بیگم سے کہا۔ "بی بی، میں

نے منظور کو قتل کے الزام میں بند کر رکھا ہے، لیکن اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ قاتل نہیں ہے۔"

"اچھا جی، اگر وہ قاتل نہیں ہے تو اُسے چھوڑ دیں۔"

"وہ تو چھوٹ ہی جائے گا لیکن تم یہ بتاؤ کہ قاتل کون ہے، یعنی تمھیں کس پر شبہ ہے؟"

"مجھے جو کچھ معلوم تھا، وہ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں۔"

"جو کچھ تم مجھے بتا چکی ہو اُس میں بہت سا جھوٹ ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا: "میں نے تمھیں تھانے بلانے کا فیصلہ کیا تھا، مگر میاں علی نواز کی سفارش پر نہیں بلایا تھا نہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے سوچ سمجھ کر بات کرنا۔"

اس کی بیٹی ملکہ بھی بیٹھک میں موجود تھی۔ دونوں میری بات سُن کر گھبرا گئیں۔

"حسینہ بی بی! تم نے بتایا تھا کہ منظور جوئے میں پیسے ہار گیا تھا اور گھر آ کر تم سے پچاس روپے مانگے تھے لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ منظور کو کسی کا قرضہ ادا کرنا تھا اور اپنے رکھوائے ہوئے پیسے تم سے مانگے تھے اور چونکہ وہ پیسے تم خرچ کر چکی تھیں اس لیے منظور کو غصہ آ گیا۔"

اس نے تامل کرتے ہوئے کہا: "اس نے جو پیسے رکھوائے تھے، وہ گھر کی ضروریات پر خرچ ہو گئے تھے۔"

اس نے اپنا پہلا جھوٹ تسلیم کر لیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی دیگر باتوں میں بھی جھوٹ شامل تھا۔

میں نے پوچھا: "کیا یہ سچ ہے کہ وزیر علی نے یہ مکان منظور کی دھمکی کے بعد تمھارے نام کیا تھا؟"

"دراصل جی منظور مجھے طلاق دلوانا چاہتا تھا لیکن شیخ صاحب طلاق نہیں دینا چاہتے تھے۔ جب منظور نے زیادہ ضد کی تو شیخ صاحب نے یہ مکان میرے نام کر دیا۔ اس کے بعد منظور خاموش ہو گیا۔"

"کیوں خاموش کیوں ہو گیا؟"

وہ میرے سوال کا مطلب نہیں سمجھ سکی، بولی: "اس نے سوچا کہ شیخ صاحب کے مرنے کے بعد اتنا بڑا مکان ہمارے ہاتھ لگ جائے گا۔ اس لیے خاموش ہو گیا۔"

"بی بی، تمھاری اس بات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُس وقت تم دونوں میں یہی طے تھا کہ شیخ صاحب کی موت کے بعد تم دوبارہ شادی کر لو گے۔ میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"ہم... میں نے اُس کے ساتھ کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔"

"میں جھوٹ سننے نہیں آیا۔" میں نے کہا: "اگر تم نے وعدہ نہ کیا ہوتا تو منظور کو مکان تمھارے نام لگنے کی کوئی خوشی نہ ہوتی۔ اور نہ وہ خاموش ہوتا۔ سچ بتاؤ کیا بات ہوئی تھی؟"

اس نے قدرے توقف کے بعد کہا: "وعدے سے کیا ہوتا ہے جی۔ اگر منگنی اور نکاح ٹوٹ سکتا ہے تو وعدہ بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ منظور نے مجھے طلاق دے دی تھی۔ اُس کا مجھ پر کوئی حق نہیں تھا۔"

"حسینہ بی بی، وعدہ تم نے اس لیے توڑا کہ تمھارے پاس ٹھکانا موجود ہے۔ اس بات کا تم خود بھی اقرار کر چکی ہو۔ لیکن یہ بات تمھیں یاد نہیں رہی کہ یہ ٹھکانا تمھیں منظور کی وجہ سے ملا ہے۔ اگر اُس نے وزیر علی پر دباؤ ڈال کر یہ مکان تمھارے نام نہ کروایا ہوتا تو اس وقت تم کسی کے دروازے پر پڑی ہوتیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جی، پر... "

"وعدہ توڑنے کی اس کے علاوہ بھی ایک وجہ ہے۔" میں نے کہا: "اور میں وہ وجہ جاننا چاہتا ہوں..."

"اور تو کوئی وجہ نہیں ہے جی۔"

"ہے... اپنے دماغ پر ذرا زور دو۔ تم نے اپنے کاغذات میاں علی نواز کے پاس کیوں رکھوائے ہوئے ہیں؟"

"وہ... شروع سے ہی ان کے پاس ہیں۔"

"وہ تمھیں ملنے کیوں آتا ہے۔ اُس کا اب تمھارے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

"تعلق تو کوئی نہیں ہے۔ یونہی خیریت پوچھنے آجاتے ہیں۔"

"جب منظور نے تمھیں دوبارہ نکاح پڑھوانے کے لیے کہا تو تم نے جواب دیا تھا کہ تم میاں صاحب سے مشورہ کر کے کوئی فیصلہ کرو گی۔ کیوں؟ میاں صاحب سے مشورہ کیوں؟"

"وہ... وہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔"

"اب میں تم سے پھر یہ سوال کرتا ہوں کہ وعدہ توڑنے کی دوسری وجہ کیا ہے؟ اب اگر تم نے صحیح جواب نہ دیا تو میں تمھیں تھانے لے جاؤں گا۔"

گھبراہٹ کے باعث اُس کا منہ کھل گیا، بولی: "وہ جی... بات یہ ہے کہ... میاں صاحب چاہتے ہیں کہ... میں اُن کے ساتھ شادی کر لوں۔"

میرا شک صحیح ثابت ہوا تھا۔ جب میاں علی نواز نے کہا تھا کہ منظور دو دفعہ حسینہ بیگم کا سودا کر چکا ہے تو مجھے اُسی وقت اس بات کا شک ہوا تھا۔ پہلی دفعہ اُس نے وزیر علی کے ساتھ سودا کیا تھا اور دوسری دفعہ میاں علی نواز کے ساتھ۔

"حسینہ بی بی، بات چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ تم بھی میاں علی نواز کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہو۔ ہے نا یہی بات؟"

قدرے توقف کے بعد اُس نے یہ بات تسلیم کر لی، بولی: "تو تھانیدار صاحب، میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ مجھے سہارے کی ضرورت ہے۔ منظور سہارا دینے کے قابل نہیں ہے۔ اگر میں نے اس کے ساتھ شادی کر لی تو وہ یہ مکان بیچ کر کھا جائے گا۔ میاں صاحب بہت دنوں سے شادی کے لیے اصرار کر رہے تھے۔ میں نے مجبور ہو کر ہاں کر دی تھی لیکن جب اختر علی نے مجھے دو کمرے دینے کا وعدہ کیا تو میری نیت ڈانواں ڈول ہو گئی تھی۔"

"کیا تم نے علی نواز سے اس بات کا ذکر کیا تھا؟"

"میں نے کھل کر انکار نہیں کیا تھا۔ اشارتاً یہ کہا تھا کہ اختر علی نے مجھے دو کمرے اور روٹی کپڑا دینے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ سُن کر میاں صاحب غصے میں آ گئے۔ بولے: 'تم پاگل عورت ہو۔ اس طرح کے سہارے پائیدار نہیں ہوتے۔ اختر علی کو جب موقع ملا وہ تمھیں نکال باہر کرے گا۔ خیر تم فکر نہیں کرو۔ اختر علی کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔'"

آہستہ آہستہ بات کھلتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا: "اس کا مطلب یہ ہے کہ علی نواز نے اپنے وعدے کے مطابق اختر علی کا بندوبست کر دیا۔ اب تم غور سے میری بات سُنو۔ ہم آج علی نواز کو گرفتار کر لیں گے۔ وہ لازماً تمھیں بھی اس قتل میں ملوث کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے جو کچھ تمھیں معلوم ہے وہ ابھی بتا دو۔ اگر بعد میں کوئی بات میرے علم میں آئی تو میں نرمی نہیں کروں گا۔"

"میں... میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔ میرا اختر علی کے قتل میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ قتل سے ایک روز پہلے میاں صاحب نے کہا تھا کہ میں رات کو صحن والا دروازہ کھول دوں لیکن مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ اُن کا دروازہ کھلوانے سے کیا مقصد ہے۔ میں اپنی بچی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں کہ میں بالکل بے گناہ ہوں۔ مجھے میاں صاحب کے منصوبے کا کچھ علم نہیں تھا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اور بتاؤ علی نواز سے اور کیا بات ہوئی تھی؟"

"انھوں نے اختر علی کے بارے میں بہت سی باتیں پوچھی تھیں کہ وہ رات کو کتنے بجے سوتا ہے، کہاں سوتا ہے اور اپنے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ تو نہیں رکھتا۔"

اسی لمحے دروازے پر دستک سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میاں علی نواز تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں حسینہ بیگم سے کہا: "شاید میاں علی نواز ہے۔ میں دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔ میرا ذکر نہ کرنا اور اطمینان سے بات کرنا۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمھاری بیٹی میرے ساتھ رہے گی۔"

میں ملکہ کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور درمیانی دروازہ بھیڑ دیا۔ وہ شام کا وقت تھا اور کمروں میں نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ملکہ گھبرا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ کسی وقت بھی رو پڑے گی۔ میں نے اُسے تسلی دی اور بستر پر بٹھا دیا۔

اتنے میں دوسرے کمرے سے میاں علی نواز کی آواز آئی: "حسینہ، سب خیر خیریت ہے نا؟ میں ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں، بیٹھوں گا نہیں۔ وہ تھانیدار بڑی اچھل کود مچا رہا ہے۔ آج اس نے مجھے تھانے بلایا تھا۔ اُسے ہم پر شک ہو گیا ہے۔ کل وہ تمھارے پاس آئے گا۔ گھبرانا بالکل نہیں۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ جو بیان پہلے دے چکی ہو، اس پر قائم رہنا۔"

"بہت اچھا، میاں صاحب۔" میرے کانوں میں حسینہ بیگم کی آواز آئی۔ میں دروازے کی جھری سے اُدھر دیکھ رہا تھا۔ "جیسے آپ کہیں گے میں ویسے ہی کروں گی۔"

"آج رات کے دس بجے میں تمھیں ایک چیز دے جاؤں گا۔ کل جب تھانیدار تم سے ملنے آئے تو یہ چیز اس کے حوالے کر دینا۔ کہنا کہ اُسے منظور نے رکھوایا تھا۔"

"چیز کیا ہے؟"

"تمھیں چیز کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں یہ سب کچھ تمھاری بھلائی کے لیے کر رہا ہوں۔ یہ لے، کچھ پیسے رکھ لے۔ تھانیدار کے ساتھ حوصلے سے بات کرنا۔ اگر اس نے زیادہ تھانیداری دکھانے کی کوشش کی تو اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ میری بہت اوپر تک پہنچ ہے۔ اچھا اللہ حافظ۔"

اُس کے جانے کے بعد حسینہ نے دروازہ بند کر دیا۔ میں کمرے میں گیا تو حسینہ چند نوٹ ہاتھ میں پکڑے پریشان کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی: "میاں صاحب نے کہا ہے کہ وہ رات کے دس بجے آئیں گے۔"

"میں نے ساری بات چیت سن لی ہے۔ رات کے دس بجے ہم بھی اِدھر ہی ہوں گے۔"

میں فوراً تھانے پہنچا اور دو سادہ لباس سپاہیوں کو حسینہ بیگم کے گھر کی نگرانی کرنے بھیج دیا۔ انھیں تاکید کر دی کہ حسینہ بیگم کو گھر سے باہر نہ جانے دیں۔

رات کے دس بجے تک چار آدمیوں کے ہمراہ حسینہ بیگم کے گھر میں موجود تھا۔ دو سادہ لباس آدمی گلی میں چھپے ہوئے تھے۔ تقریباً سوا دس بجے دروازے پر دستک سنائی دی۔ حسینہ بیگم میری ہدایت کے مطابق اُس وقت بیٹھک میں موجود تھی۔ دستک کی آواز سن کر وہ اٹھی اور دروازہ کھولا۔ اُس وقت بیٹھک کے سوا مکان کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ میں اندرونی دروازے سے بیٹھک میں جھانک رہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی میاں علی نواز کمرے میں داخل ہوا اور فوراً اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کینوس کا تھیلا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا "یہ تھیلا کسی محفوظ جگہ پر رکھ دو۔"

"اس میں کیا چیز ہے؟" حسینہ بیگم نے پوچھا۔ اُس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"اس کو کھولنا نہیں۔" علی نواز نے کہا۔ وہ بدستور اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ "ٹھہرو، میں خود اسے کسی جگہ پر رکھ دیتا ہوں۔ تم اسے تھانیدار کے حوالے کر دینا۔ ۔ ۔"

بات کرتا ہوا وہ سیدھا اس دروازے کی طرف آیا جس کی دوسری طرف میں اور میرے آدمی کھڑے تھے۔ میں نے ریوالور نکالا اور دروازہ کھول کر سامنے آ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بری طرح اچھلا اور تھیلا پھینک کر دروازے کی طرف بھاگا لیکن میرے آدمی باہر سے دروازہ بند کر چکے تھے۔

"میاں علی نواز! کھیل ختم ہو چکا ہے۔" میں اُس کے سر پر پہنچ گیا۔ "مکان کے باہر بھی میرے آدمی موجود ہیں۔ اب تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔"

وہ غصے سے حسینہ بیگم کی طرف جھپٹا۔ "ذلیل عورت! میں تیری بھلائی کے لیے پریشان ہو رہا ہوں اور تو مجھے اندر کروانے کی فکر میں ہے۔ میں تیرا بیڑا غرق کر دوں گا۔"

ایک حوالدار اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔

"ملک صاحب! میں اس عورت کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ دغاباز نکلی۔ اس نے منظور کے ساتھ مل کر اختر علی کو قتل کیا تھا۔ ثبوت اس تھیلے میں موجود ہے۔"

میں نے تھیلا کھول کر دیکھا تو اس میں کپڑوں کا ایک میلا سا جوڑا تھا جس میں ایک خون آلود خنجر لپٹا ہوا تھا۔ کپڑوں کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ منظور کے کپڑے تھے۔ یہ وہ کپڑے تھے جنھیں میں اس کے گھر میں کھونٹی پر لٹکا ہوا دیکھ چکا تھا۔ اب ان پر خون کے دھبے بھی موجود تھے۔ واضح طور پر وہ کسی مرغی یا بکری کا خون تھا۔

"علی نواز! اب جھوٹ سے کام نہیں چلے گا۔" میں نے کہا۔ "آج شام جب تم حسینہ بیگم سے ملنے آئے تھے تو میں اندر کمرے میں موجود تھا۔ میں نے تمھاری ساری بات چیت سن لی تھی اور یہ جو تم ثبوت لائے ہو اس کی حقیقت بھی مجھے معلوم ہے۔ یہ کپڑے منظور کے ہیں۔ واردات والی صبح جب ہم نے اُس کو گرفتار کیا تھا تو یہ کپڑے اُس کی کھونٹی پر لٹکے ہوئے تھے۔ اُس وقت ان پر خون کے دھبے نہیں تھے۔ یہ دھبے تم نے لگائے ہیں۔"

حوالدار نے میرے اشارے پر اُسے ہتھکڑی لگا دی۔ وہ بوڑھا آدمی تھا، کوئی مزاحمت نہ کر سکا۔

"علی نواز! میرے پاس تمھارے خلاف کافی شہادتیں جمع ہو چکی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اقرارِ جرم کر لو۔" میں نے اے ایس آئی سے کہا۔ "آس پاس رہنے والے چار معززین کو بلا لاؤ۔ یہاں کی ساری کارروائی اُن کے سامنے ریکارڈ ہو گی۔"

"ملک صاحب! شہر میں میں عزت دار آدمی ہوں۔ اگر آپ نے میرے خلاف کوئی کارروائی کی تو میں اپنی اولاد کے سامنے آنکھیں اُٹھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ میری ہتھکڑی کھول دیں۔ میں آپ کو قاتل کا نام پتا بتا دیتا ہوں۔ وہ اقبالِ جرم بھی کر لے گا۔ اس بات کی میں آپ کو ضمانت دیتا ہوں۔"

مجھے اندازہ تھا کہ قتل اُس نے خود نہیں کیا تھا کسی سے کروایا تھا۔ میں نے اس کی ہتھکڑی کھلوا دی۔ اس نے بتایا کہ قاتل اُس کا ایک مزارع تھا جس کا نام جمال دین تھا۔ میں نے علی نواز سے اُس کا پتا پوچھا اور دو آدمی اس کے پیچھے روانہ کر دیے جو تقریباً ایک گھنٹے میں اُسے گرفتار کر کے لے آئے۔

جمال دین بتیس چھتیس سال کا ایک صحت مند نوجوان تھا۔ اُس نے قتل کا سارا الزام اپنے سر لے لیا اور کہا کہ اختر علی کو اُس نے پرانی دشمنی کی بنا پر قتل کیا تھا۔

میں نے میاں علی نواز کو بھی شاملِ تفتیش رکھا مگر عدالت نے اُسے بری کر دیا کیونکہ کوئی شخص اس کے خلاف گواہی دینے پر تیار نہیں ہوا تھا۔ حسینہ بیگم بھی اپنے بیان سے منحرف ہو گئی تھی۔ جمال دین کو عمر قید ہو گئی۔